

اشفاق احمد

زاویہ





اشفاق احمد

گذریا، ایک محبت سوافسانے، وداع جنگ، ایک ہی بوئی، صحابے فسانے،
توتا کہانی، بندگی، طسم ہوش افزاء، اور ڈرامے، بیگنے پاؤں، مہماں رائے،
من چلے کا سودا، یا بآ صاحب، سفر در سفر، اپے بُرج لا ہور دے، تا بلی تھلے،
حرت قمیر، جنگ بجنگ، زاویہ، سفر بینا، ایک محبت سوڈرامے، حیرت کدہ، شاہلا کوٹ،
کھیل تماشا، گلدان، کھیاویا، دھینے کا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا،

بانو قدسیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چین، سدھراں، آسے پاسے،
دوسرا قدم، آدمی بات، دست بستہ، جوڑا کے نام، سورج کھی، پیا نام کا دیا،
آتش زیر پا، امرتیل، بیاز لشت، مردابریشم، سامان وجود، ایک دن، پرواء، موم کی گھیاں،
لگن اپنی اپنی، تماشیل، قٹ پاتھر کی گھاس، دوسرا دروازہ، تاقابل ذکر، پکھا اور نہیں،
حاصل گھاث،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

زادہ

اشفاق احمد

سنگ سیل پبلی کیشنر، لاہور

فہرست

7	- 1. "بہروپ"
14	- 2. بچوں کی نفیات
21	- 3. ناشر انسان
28	- 4. مایوسی
34	- 5. صاحبان علم
41	- 6. ایک استاد عدالت کے کنہرے میں
47	- 7. دیے سے دیا
55	- 8. بابا کی تعریف
62	- 9. کلچر
69	- 10. تعریف و توصیف
76	- 11. اندر کلی تبدیلی
84	- 12. محبوب کون؟
92	- 13. اللہ کا نظام
100	- 14. آروائے خان
107	- 15. اینڈر لیو
115	- 16. گومان ہالینڈ
122	- 17. احکام الہی
129	- 18. ایک معصوم بیٹی کی کہانی
137	- 19. موت کی حقیقت
143	- 20. شیرنگ
150	- 21. انسان کو شرمندہ نہ کیا جائے

157	22- اندر اور باہر کی شخصیت کی میچنگ
164	23- مسکلی
170	24- انا کی لٹھ
177	25- کوئی محروم نہیں ملتا جہاں میں
184	26- تائی کریم بی بی اور ایکنڈر فلیمنگ
192	27- حضرت صالح کی اونٹی اور پاکستان
198	We don't live in present but in future and past -28
205	29- دعا
212	30- قول اور عمل
219	31- باباجناح
225	32- احترام آدمیت
232	33- ریفارم ہر یہ زندگی
239	Snap Shot -34
246	35- قول اور نفس
253	36- انسانی اپنی خواہش پوری ہونے کی راہ میں خود حاکل ہو جاتا ہے
260	37- حقوق العباد کا بوجھ
265	38- خواب اور مججزہ
269	39- زبانی دعوے اور ضمیر کی آواز
275	40- دوستی اور تاش کی گیم
281	41- انسانی عقل اور رضاۓ الہی
287	42- اللہ کا فضل
293	43- صبر، سلپن اور آزادی کشمیر
298	44- بابے، جسم اور خیال کا کلا
303	45- چیزوں کی کشش اور ترک دنیا
309	46- ”دل کا معاملہ“
315	47- بابارتی ہندی کا سفر محبت

”بھروسہ“

یہ ایک بھروسہ برسات کا ذکر ہے۔ آسمان سے ڈھیروں پانی برس رہا تھا اور میری کیفیت اُس طرح تھی کہ جیسے میرے دل کے اندر بارش ہو رہی ہے، کچھ ایسا ہی مینہ بستی کے اوپر بھی برس رہا تھا۔ میں تھوڑا سا زخم خورده تھا۔ اس زخم کا مدعا میرے پاس نہ تھا، مساوائے اس کے کہ میں ڈیرے پر چلوں اور اپنے بابا کی خدمت میں اظہار کروں۔ بات یہ تھی کہ میرے ایک بہت ہی پیارے دوست جو میرے ساتھی بھی تھے، وہ افسانہ نگار تھے اور کالم بھی لکھتے تھے۔ انہوں نے کالموں میں میری بڑی کھچائی کی تھی۔ اور جب کالم نویس رگیدتا ہے تو جس کی کھچائی ہوتی ہے اس کے پاس کوئی اخبار نہیں ہوتا جس میں وہ جواب الجواب لکھ سکے۔ وہ بے چارہ غم زدہ ہو کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی انہوں نے کچھ ایسا ہی کیا تھا اور تباہ ہر توڑتین چار سخت حملے کیے تھے۔

میں اپنے دکھ کا اظہار کرنے کے لیے ڈیرے پر چلا گیا اور بابا جی سے کہا، ”میں بڑا کھی ہوں اور اس بات کی مجھے بڑی تکلیف ہے۔ اس شخص نے جو میرے بظاہر دوست ہیں، ہم سے محبت کے ساتھ ملتے ہیں اور ٹی ہاؤس میں ایک دوسرے کا ساتھ بھی دیتے ہیں اور لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اس طرح کی کارستانی میرے لیے کر سکتا ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟“

انہوں نے کہا: ”اوہ پت! آپ اس کو سمجھنے نہیں، یہ بڑی سمجھداری کی بات ہے۔ دو صوفی تھے۔ ایک بڑا صوفی ٹریننگ اور ایک چھوٹا صوفی انڈر ٹریننگ۔ چھوٹے صوفی کو ساتھ لے کر بڑا صوفی گلیوں، بازاروں میں گھومتا رہا۔ چلتے چلاتے اس کو لے کر ایک جنگل میں چلا گیا۔ جیسے کہ میں نے پہلے عرض کی، بڑی تباہ ہر توڑ بارش ہوئی تھی، جنگل بھیگا ہوا تھا اور اس جنگل میں جگہ جگہ لکڑیوں کے ڈھیر تھے۔ پتوں کے، شاخوں کے انوار تھے۔ اس بڑے صوفی نے دیکھا کہ شاخوں اور پتوں کے ڈھیر میں ایک سانپ کچھ مر جھایا ہوا، کچھ سنگھردا یا ہوا پڑا ہے۔ وہ پہلے آگ کی حدت سے زخم خورده تھا اور پھر اس پر جو بارش پڑی تو وہ زندہ سانپوں میں سے ہو گیا۔ صوفی کو بڑا ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سانپ کو اٹھا

لیا۔ چھوٹے صوفی نے کہا ”حضور کیا کرتے ہیں، سانپ ہے موزی ہے اس کو اٹھایا نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا: ”نہیں بے چارہ ہے، مجبور ہے، زخمی ہے، زخم خورده ہے اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی کچھ غور و پرداخت کرنی چاہیے۔“ تو وہ سانپ کو ہاتھ میں لے کر چلے۔ پھر دونوں باتیں کرتے کرتے کافی منزلیں طے کرتے گئے۔ جب تھنڈی ہوا گئی، چھولتے ہوئے سانپ کو تو اسے ہوش آنے لگا اور جب ہوش آیا تو طاقتور ہو گیا۔ طاقتور ہو گیا تو اس نے صوفی صاحب کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ جب ڈس اتو انہوں نے سانپ کو بڑی محبت اور پیار کے ساتھ ایک درخت کی جڑ کے پاس رکھ دیا کیونکہ وہاب ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہے۔ اب یہ یہاں پر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ریوایو (Revive) کر لے گا۔ جہاں بھی اس کا دل ہو گا، چلا جائے گا۔ چھوٹے صوفی نے کہا: ”دیکھیں سر! میں نے کہا تھا ناکہ یہ موزی جانور ہے، آپ کو ڈس لے گا۔ پھر کیوں ساتھ اٹھا کے لے جا رہے ہیں؟ آپ تو بہت دشمند ہیں، مجھے سکھانے پر مامور ہیں۔“ تو انہوں نے کہا: ”ڈس انہیں اس کے شکر یہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ سانپ اسی طرح شکر یہ ادا کیا کرتے ہیں۔“ ”یہ جو تمہارے خلاف لکھتا ہے، اس کا شکر یہ ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ تم ناراض نہ ہو۔“

میرے دل پر بڑا بھالکی بوجھ تھا، دور ہو گیا اور میں بالکل ہلاک پھول ہو گیا۔ تو خواتین و حضرات! یہ ڈیرے، یہ خانقاہیں یا جنگ کو تسلیکے کہہ لیں، یہ اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ دل کا بوجھ جو آدمی سے خود اٹھائے نہیں اٹھتا، وہ ان کے پاس لے جائے۔ اور ”بابے“ کے پاس جا کر آسانی سے سمجھ میں آنے کے لیے عرض کرے۔ فرض کریں ماڈرن دنیا میں کسی قسم کا ایک ڈیرہ ہو، جس میں کوئی سائیکل ایٹ رسٹ (Psychiatrist) بیٹھا ہو، لیکن وہ فیس نہ لے یا سایکالوجسٹ ہو۔ جس کے پاس وہ نجٹ نہ ہو جس پر لٹا کر Analysis کرتے ہیں، بلکہ بچانے کے لیے صرف ہو۔ اس پر ایسا سامان ہو کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کر سکیں۔ تو ان ڈیروں کو ان تکیوں کو شمالی افریقہ میں، الجزار میں، تیونس میں ”زاویہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کو ”زاویہ“ کہتے ہیں۔ کچھ ”رباط“ بھی کہتے ہیں وہاں پر، لیکن زاویہ زیادہ مستعمل ہے۔ حیران کن بات ہے باوجود اس کے کہ زاویہ ایک خاص اسم ظرف مکان ہے شمالی افریقہ کا، لیکن اندرس کے زمانے میں اندرس کی سر زمین پر زاویہ نہیں تھے۔ تیونس، الجزار میں رباط تھے۔ یہاں صوفی لوگ بیٹھ کر لوگوں کو، آنے جانے والوں کو ایک چھت فراہم کرتے تھے۔ رہنے کے لیے جگہ دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی، پانی دیتے تھے۔ کچھ دیر لوگ بیٹھتے تھے۔ دکھی لوگ آتے تھے۔ اپنا دکھ بیان کرتے تھے اور ان سے شفا حاصل کر کے ڈائیاگ کرتے تھے۔ سچ مجھ! جو سایکالوجسٹ کہا کرتے ہیں، وہ مہیا کرتے تھے، ہم نے بھی اسی تقليد میں پروگرام کا نام زاویہ رکھا ہے۔ اس لحاظ سے تو مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے۔ نقل بر طاق اصل ہے لیکن پرث (روح) اس کی وہی ہے۔ کوشش اس کی بھی ہے کہ اس طرح کی باتیں یہاں ہوتی رہیں اور طبیعت

کا بوجھ، جو اور پر گراموں میں اور کالموں اور کتابوں سے دور نہیں ہوتا، وہ کسی طور پر یہاں دور ہو سکے۔ آپ جب بھی کسی ڈیرے پر، کسی بزرگ سے ملنے کے لیے جائیں گے تو آپ کے لاشور میں ٹیکت کا ایک میٹر (Meter) ضرور ہو گا۔ میں دیکھوں، یہ کیسا آدمی ہے؟ آپ اکثر یہ کہہ کر چلے آتے ہیں کہ یار وہاں گئے تھے، وہ تو کچھ نہیں ہے۔ اپنے معیار کے ساتھ آدمی چیک کرتا ہے، لیکن جب آپ پوری طلب کے ساتھ، امتحان پاس کرنے کا انداز اختیار کیے ہوئے جائیں تو پھر آپ کو ان خاکستروں میں سے عجیب قسم کے لعل مل جاتے ہیں۔ مشکل تو ہو گی کہ وہاں سندھ چلے جائیں۔ تحریک کر کے ڈیزرت میں چلے جائیں یا روہی میں چلے جائیں۔ کچھ نہ کچھ آپ کو دانش کی بات مل جائے گی۔ دانش کی بات جو ہے، یہ ایسے ہی لوگوں سے ملتی ہے، کتابوں سے نہیں ملتی۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ زاویہ، باوجود اس کے کہ یہ اصل زاویہ نہیں ہے لیکن اس کی خوبی اس کی پرست و لیکی ہی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پرست سے یاد آیا کہ اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں ایک بہروپیا آیا اور اس نے کہا: ”باوجود اس کے کہ آپ رنگ و رامش، گانے بجائے کوبرا سمجھتے ہیں، شہنشاہِ معظم! لیکن میں فن کار ہوں اور ایک فن کار کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور میں بہروپیا ہوں۔ میرا نام کندن بہروپیا ہے اور میں ایسا بہروپ بدلتا ہوں کہ شہنشاہِ معظم، جن کو اپنے تحریر علمی پر بڑا ناز ہے، دھوکا دے سکتا ہوں، اور میں غصہ دے کر بڑی کامیابی کے ساتھ نکل جاتا ہوں۔

اور نگزیب عالمگیر نے کہا: ”یہ بات توضیح اوقات ہے۔ میں تو شکار کو بھی کاہر سمجھتا ہوں۔ یہ تم جو چیز میرے پاس لائے ہو، اس کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔“

اس نے کہا: ”نہیں صاحب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ اتنے بڑے شہنشاہ ہیں اور دانش میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں بھیں بدلوں گا، آپ پہچان کر دکھائے۔“

تو انہوں نے کہا: ”منظور ہے۔“

اس نے کہا: ”حضور آپ وقت کے شہنشاہ ہیں۔ اگر تو آپ نے مجھے پہچان لیا تو میں آپ کا دینے دار ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھے پہچان نہ سکے اور میں نے ایسا بھیں بدلا تو میں آپ سے پانچ سو روپیہ لوں گا۔“ ظاہر ہے اس وقت پانچ سو بہت ہوں گے۔ شہنشاہ نے کہا: ”ٹھیک ہے۔ پانچ سو میرے لیے کچھ نہیں ہے، منظور ہے، جاؤ۔“ تو وہ شرط طے کر کے چلا گیا اور پھر سونے لگا۔ گھر جا کر بھی پریشان ہوا کہ میں شخصی میں ایسی شرط بد کر آ گیا ہوں۔ میں کون سا ایسا روپ بدلوں کہ بادشاہ کو پتا نہ چلے۔ پھر تا پھر اتنا تحقیق و تفتیش کرتا رہا۔ لوگوں سے پتا چلا اور نگزیب عالمگیر سا تو تھا اندیا میں مر ہوں پر اور یہ کہنی سلطنتوں پر اکثر حملے کیا کرتا تھا۔ انہوں نے کہا، یہ سال چھوڑ کر اگلے سال پھر ان پر حملہ کرے گا۔ یہ خبر

بہر و پیے کو جو وقار نگار تھے، انہوں نے بتائی۔ اس نے کہا، صحیک ہے۔ چنانچہ وہ یہاں سے پاپیادہ سفر کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں بہمنی سلطنت تھی۔ وہاں جا کر اس نے ایک بزرگ کاروپ دھارا۔ ڈاڑھی بڑھا لی۔ بزرگ پڑے پہنچ لیے۔ بڑے بڑے منکے گلے میں ڈال لیے، اور اللہ کی یاد میں ایسا مستغق ہوا کہ بڑی دیر تک بہت دور تک لوگوں کو اپنے اس سحر میں بنتا کرتا رہا۔ اردو گرد کے لوگ جو تھے، بابا پیر کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ لوگ آنے لگے اور طرح طرح کے چڑھاوے چڑھانے لگے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کاروان ہے۔ دور دور تک اس کا نام آنے لگا۔ لیکن وہ بڑی استقامت کے ساتھ سال بھراں ریاضت میں مصروف رہا جو بزرگ کیا کرتے ہیں۔

ایک سال کے بعد جب اپنا لاڈ لشکر لے کر اور نگ زیب عالمگیر سا و تھا انڈیا پہنچا اور پڑا اور ڈالا تو تھوڑا سا وہ خوف زدہ تھا۔ اور جب اس نے مرہٹوں کے پیشوپر حملہ کیا تو وہ اتنی مضبوطی کے ساتھ قلعہ بند تھے کہ اس کی فوجیں توڑنے سکیں۔ پریشانی کا عالم ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ شاید اس کو ناکام اونٹا پڑے اور اس کی حکومت پر براثر پڑے۔ چنانچہ لوگوں نے کہا، یہاں ایک درویش ولی اللہ رہتے ہیں درخت کے نیچے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان سے جا کر ڈسکس کریں۔ پھر دعا کریں اور پھر نوٹ پڑیں۔ شہنشاہ پریشان تھا، بے چارہ بھاگا بھاگیا اُن کے پاس۔ سلام کیا۔ اور کہا: "حضور میں آپ کی خدمت میں ذرا....." انہوں نے کہا: "ہم فقیر آدمی ہیں۔ ہمیں ایسی چیزوں سے کیا لیں دیتا۔" شہنشاہ نے کہا: "نہیں عالم اسلام پر بڑا مشکل وقت ہے (جیسے انسان بہانے کیا کرتا ہے) آپ ہماری مدد کریں۔ میں کل اس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ تو فقیر نے فرمایا: "نہیں کل مت کریں، پرسوں کریں اور پرسوں بعد نماز ظہر۔" اور نگ زیب نے کہا جی، بہت اچھا۔ چنانچہ اس نے بعد نماز ظہر جو حملہ کیا اور ایسے زور کا کیا اور جذبے سے کیا اور پیچھے فقیر کی دعا تھی، اور ایسی دعا کہ وہ قلعہ ٹوٹ گیا اور فتح ہو گئی۔ مفتوح جو تھے وہ پاؤں پڑ گئے۔ بادشاہ مرہٹوں کے پیشوپر فتح مند کامران ہونے کے بعد سیدھا درویش کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باوجود کہ وہ ٹوپیاں اسی کے اور قرآن لکھ کر گزار کرتا تھا لیکن بزرگ کا بڑا سامعماںہ پہنچتا تھا بڑے زمر دا اور جواہر لگے ہوتے تھے۔ اس نے جا کر عمامہ اتارا اور کھڑا ہو گیا۔ دست بستہ کہ حضور یہ سب کچھ آپ ہی کی بدولت ہوا ہے۔

اس نے کہا: "نہیں جو کچھ کیا اللہ نے کیا ہے۔" انہوں نے کہا کہ آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا چاہتا ہوں حضور۔ درویش نے کہا: "نہیں ہم فقیر لوگ ہیں۔" اس نے کہا کہ دو پر گئے کی معافی دو بڑے تھے۔ اتنے بڑے جتنے آپ کے اوکاڑہ اور پتوکی ہیں۔ وہ ان کو دیتا ہوں اور زمین اور آئندہ پانچ سات پشتوں کے لیے ہر طرح کی معافی ہے۔

اس نے کہا: "بابا یہ ہمارے کس کام کی ہیں ساری چیزیں۔ ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ تیری بڑی

مہربانی۔" اور نگ زیب نے بڑا ذرائع لگایا، لیکن وہ نہیں مانتا اور بادشاہ مایوس ہو کے واپس آگیا۔ اس نے اپنے تخت کے اوپر متمنکن ہو کر ایک نیا فرمان جاری کیا۔ جب شہنشاہ فرمان جاری کر رہا تھا، عین اس وقت کندن بہروپیا اسی طرح منکر پہنچ آیا۔ شہنشاہ نے کہا:

"حضور آپ یہاں کیوں تشریف لائے۔ آپ مجھے حکم دیتے، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔" کندن نے کہا: نہیں شہنشاہِ معظم! اب یہ ہمارا فرض تھا، ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو جناب عالی میں کندن بہروپیا ہوں۔ میرے پانچ سورو پے مجھے عنایت فرمائیں۔" اس نے کہا: تم وہ ہو؟ اس نے کہا، ہاں وہی ہوں جو آج سے ڈیڑھ برس پہلے آپ سے وعدہ کر کے گیا تھا۔

اور نگ زیب نے کہا: "مجھے پانچ سورو پیدئے ہیں میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں، جب میں نے آپ کو دو پر گئے اور دو قبے کی معافی دی۔ جب آپ کے نام اتنی زیمن کر دی۔ جب میں نے آپ کی سات پشتوں کو یہ رعایت دی کہ اس میری مملکت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں رہیں۔ آپ نے اس وقت کیوں انکار کر دیا۔ یہ پانچ سورو پیدا تو کچھ بھی نہیں۔"

اس نے کہا: "حضور بات یہ ہے جن کا روپ دھارا تھا، ان کی عزت مقصود تھی۔ وہ سچے لوگ ہیں۔ ہم جھوٹے لوگ ہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا تھا کہ روپ پشوں کا دھاروں اور پھر بے ایمانی کروں۔" تو خواتین و حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارا یہ زاویہ دونبڑی سکی، بے شک بہروپ دور ہوتے رہیں جو کی اور طرح سے نہیں ہو پاتے۔

زاویہ کے پہلے پروگرام میں حاضرین کے جناب اشراق احمد سے کچھ سوالات اور ان کے جوابات:

سوال: اس طرح کی نشست تو رول ٹریڈیشن ہے ہماری۔ یہ بھی اسی کا ایک سلسلہ ہے۔

پرنٹڈ ورڈ (Printed Word) نے اس کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔

جواب: ہاں یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ Oral Tradition طاقتور ہے۔ پیغمبروں کا علم عام کرنے کے لیے Oral Tradition ہوتی ہے۔ پیغمبر بھی کھڑے ہو کر اپنی بات بیان فرماتے تھے۔ اسی لیے اللہ قرآن میں بار بار ہر پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے: "اے لوگو! دیکھو۔" اور اعتراض کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ کیسا پیغمبر ہے۔ یہ توبازاروں میں کھڑا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں سے باقیں کرتا ہے۔ فرعون نے بھی یہ کہا تھا کہ میں موی کو کیسے مان لوں، اس کے بازوؤں میں تو کلگن بھی نہیں ہیں۔ تو میں نہیں مانتا۔ Oral Tradition بالکل چلا اور میں یہ سمجھتا ہوں، میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ یہ

پر مخدود رہ کے راستے سے ہو کر الیکٹرائیک میڈیا کی معرفت Oral Tradition میں تبدیل ہو رہی ہے۔
ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس کا روپ بہروپ دیسا ہونا چاہیے جس طرح ابتدائی قدیم زمانے سے ہے۔

سوال: ماڑن ورشن میں میں سمجھتا ہوں اس کا روپ یقیناً ہو گا۔ لیکن یہ ہی میں Presence کی بات ہے۔ جو عوام تھے Oral Tradition میں موجود تھے اس کو تم کیسے Revive کریں۔
جواب: اس کو ہم Revive کر سکیں گے۔ بالکل دوبارہ جنم دینے سے کر سکیں گے۔ جہاں انسان انسان سے ملے گا۔ انسان انسان سعیات کرے گا۔ ورنہ ہم اپنی ہر سوچ کو (Realize) کرتے ہی رہ جائیں گے۔

سوال: سر! میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جب ہم کسی شخص کو Condemn کرتے ہیں یا اس کا بطلان کرتے ہیں یا کسی شخص کو برا بھلا کہتے ہیں تو کیا ہمارے ذہن میں یہ آرزو تو نہیں پوشیدہ ہوتی کہ ہم خود دیسا بننا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ حسین آدمی کو کم حسین آدمی رد کرتے ہیں۔ امیر آدمی کو کم امیر آدمی رد کرتا ہے۔ طاقت و رکم صحت مند کھلاڑی کو رد کرتا ہے تو کیا اس کے پیچھے کوئی ایسی آرزو تو نہیں ہوتی کہ کاش میں بھی ایسا بن جاتا۔

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یقیناً اس میں ہے۔ اگر کوئی محروم شخص ہے کسی بھی اعتبار سے تو پھر وہ کندھ م تو کرے گا، لیکن اس کی محرومی کے پیچھے کچھ اسباب ہیں کہ جو جائز نہیں ہیں، مناسب نہیں ہیں یا جس کو معاشرہ دور کر سکتا ہے یا کرنا چاہیے تو پھر اس کے کندھ م کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالص انسانی بات ہے کہ جو بنیادی محرومی ہے، کسی بھی حوالے سے وہ ایک ری ایکشن (عمل) تو جزیٹ کرے گی، تو اب اس سے کیسے بچا جائے۔

سوال: پختے کی بات بعد میں آتی ہے۔ کیسے پتا لگایا جائے کہ یہ شخص جس بات کا اظہار کر رہا ہے اس کے پیچھے عوامل جو تھے، وہ مختلف ہیں، بجائے اس کے کہ وہ ان کوچھ کچھ کندھ م کر رہا ہے۔ ان کے پیچھے یہ آرزو ہے کہ میں بھی ایسا ہوتا جب اس مقام پر بندہ پہنچتا ہے۔ اس مقام کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ دیے ایکٹ نہیں کرے گا۔ وہ دوسرے نیچے اتار دیں گے۔ جو بندہ غریب ہوتا ہے، دیسا کام نہیں کرے گا تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ جب بندہ امیر ہوتا ہے، اس کے پاس پیسا آتا ہے، دولت آتی ہے۔ دیسا Behave نہیں کرے گا تو لوگ اس سے چھین لیں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ جب غریب تھا تو بہت اچھا ہوتا تھا۔ اللہ میاں نے اسے دولت دی ہے تو بہت غلط ہو گیا ہے۔

جواب: برخوردار! یہ آدمی جو امروں کو Run down کر رہا ہے کوئی کھوچی کتنا ظالم ہے۔

سوال: یہ سر! کہیں ایسا تو نہیں کہ حسد بول رہا ہو؟

جواب: حسد بھی بولتا ہے۔ اگر حسد بولتا ہے تو پھر وہ خود ہونا چاہتا ہے نا۔ میں ڈرتا ہوں۔

میرے منہ میں خاک۔ میں کہیں جرأت نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ مارکس پکجھ اور تھا۔ کوئی بھی نظریہ آدمی جو دیتا ہے، کوئی فلسفہ ہے یا کوئی بات۔ اس کے پچھے اصل حرکات کیا ہیں، اس بندے کی ذات کے اندر وہ پکجھ اور ہی ہو سکتے ہیں۔ مطلب جو اس کے ظاہری نظریات ہیں، وہ بالکل مختلف ہو سکتے ہیں، مثلاً یہ بچپن کی محرومی اور شدید غربت مارکسزم کی طرف لے جاتی ہے یا پکجھ اور وقت اس نے گزارا ہے۔ کسی اور طریقے سے تو ممکن ہے کہ وہ کوئی اور نظریہ اختیار کر لے تو اب وہ اس بندے کی شذی بن جائے گی۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ جو اس نے پیش کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس کو الگ سطح پر جانچیں۔ آپ کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں اگر Human Dignity Ensure کر لیں، ہر آدمی کی عزت کو بحال کر دیا جائے تو پھر ایسی صورت حال بن جائے گی۔ پھر کنڈم کرنے کا سلسلہ کم ہو جائے گا۔

میرے خیال میں بھی پکجھ کم ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود بھی ایک بے چینی تو انسان میں رہے گی۔ ہمیشہ رہے گی۔ مثلاً ایک بہت اچھا Player Game کھلتا ہے۔ اچھی کھیل سکتا، میں تو ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے چاہیے کہ میں خوش ہوں۔ واہ جی واہ، کیا اچھا کھلتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تو پکجھ بھی نہیں، فضول ہے۔ اس میں کیا ہے۔

انسان میں اپنی کمزوریاں اور اپنے اندر جو خامیاں ہوتی ہیں، ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں جو ہے، وہ مجھ میں کیوں نہیں، تو ایک حد کہہ سکتے ہیں یا انسان کی شخصی کمزوری کہہ سکتے ہیں۔ پکجھ قدرتی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ پکجھ لوگ قدرتی طور پر خوب صورت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ مار جن (Margin) لے کر آتے ہیں اور جس کے پاس مار جن نہیں، وہ کیا کرے؟ صورت کو ایک معیار بنادیا گیا ہے۔ آدمی جتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا اس کا ظرف ہو جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو برداشت بھی کر لیتا ہے۔ سن بھی لیتا ہے۔ کنڈم بھی نہیں کرتا۔ اگر ایسی صورتِ حال پیدا کی جائے کہ ہر آدمی کو عزت نفس ملے۔ اس کو بڑا ہونے کا احساس دیا جائے تو پھر وہ کنڈم نہیں کرے گا۔

بڑا ہونے کے لیے جولیور (Lever) آپ اسے عطا کر رہے ہیں، وہ عزت نفس کا ہے۔ دولت یا شہرت یا حسن ہی سب پکجھ نہیں ہیں۔

ابھی تک تو ہماری سوچ کا جو ر斧 ہے، وہ ذرا سا مختلف ہے جس کی ہمیں پریکش ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آہستہ آہستہ جب یا انٹرائیکشن بڑھے گا جو آپ نے سوال کیا تھا، انسانی یوں کے اوپر اس کے اندر پہنچ کر سوچنے۔

آپ کا بہت بہت شکریہ اور مہربانی کہ آپ تشریف لائے اور آپ نے اس پروگرام کو رونق بخشی۔ انشاء اللہ پھر بھی آپ کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

بچوں کی نفیات

آپ سب کی خدمت میں میر اسلام پہنچے۔

بچے کی نفیات کے بارے میں بہت سی دلیلیں ایک دوسرے کے مقابلے بھی ملتی ہیں کہ یہ بچے کام کرتا ہے یا نہیں کرتا، تو میر اس سے کوئی ایسا تعارف نہیں تھا۔ اور میں سایکالوگی کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتا تھا جتنا کہ میرے ہم سفر جانتے تھے۔ میرا یہ واقعہ 1952ء کا ہے اور یہ مجھے شہزادی فرماش پر پھر یاد آ رہا ہے۔ بہت دیر کی بات ہے۔ میں 1952ء میں ملک روم میں تھا۔ روم یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ساتھ فرانسیسی اور اطالووی پڑھتا تھا۔ وہاں پر ہمارا ایک دوست تھا مسودی ریاک۔ وہ بہت اچھا مصور تھا۔ میری بہت اچھے سے مراد یہ کہ اس کی تصویر یہیں گا ہے بگا ہے بک جاتی تھیں اور وہ ہمارا دوست تھا۔ دوست تھا تو اس کے ساتھ ادھر الیے تملے کرنے میں روم میں گھوم پھر لیتا تھا۔ وہ اچھا شریف آدمی تھا۔ ہمیں بہت آسانی ہوتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ میے ہوتے تھے۔ ہم تین دوست تھے۔ ریاک، میں اور ایک ہری چند، جو ہندوستان کا تھا۔ ہم اس تاز میں رہتے تھے کہ کوئی اچھا ساموق کتنی دیر یورپ میں رہنا ہے۔ تو ان دونوں 31 دسمبر 1952ء کو ریاک کی ایک تصویر بک گئی تو اس نے کہا، میں تمہاری دعوت کروں گا۔ ویسا ویسی تو کے اوپر جہاں پر ایک بیسیر ہیں۔ بہت قسمی سڑک ہے جسے ہمارے ہاں شارع قائدِ اعظم ہے۔ اس ریسٹوران میں جس کا نام علی بابا چالیس چور تھا۔ وہ ایک بہت بڑا ریسٹوران تھا۔ ایک ہائی سمنٹ میں۔ ریسٹوران میں بڑے خوبصورت چالیس مرتبان تھے، ستونوں کی جگہ بننے ہوئے۔ اور اس کے اوپر چھت اٹھائی ہوئی تھی اور اس کے اندر آرکسٹرا بڑا خوب صورت بجا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ وہاں عام طور پر ایک شرلوگ زیادہ جاتے تھے۔ عام آدمی کی وہاں اتنی پہنچ نہیں تھی کہ وہاں پہنچ سکتا یہ جو ہمارا انھوئی کوئی تھا، اس کو وہاں آنے کا بہت شوق تھا۔ انھوئی کوئی کی ایک بڑی عجیب و غریب عادت تھی کہ عورتوں جیسا مزاج تھا اس کا۔ ہر وقت اپنے ساتھ ایک شیشہ رکھتا تھا، دو

مئت بعد نکال کے تھوڑی لپ سک لگاتا تھا۔ اتنا نازک مزاج اور یوں کر کے بال۔ انھوں کوئن سے ہم بہت متاثر تھے۔ وہاں کے لوگ بھی متاثر تھے۔ اور پھر اس سے وہاں ملنا ہوا۔ انہی دنوں ہمارے مشرقی پاکستان کے ربیع الدین وہاں پر فلم ڈائریکشن کی کچھ تعلیم لینے آگئے۔ ہماری ایونگ کلائیں ہوتی تھیں، اس لیے میں انہوں نے کہا، چھ میٹنے کا کورس ہے اس میں آپ کو پتا چلے گا کہ ڈراما کیسے لکھا جاتا ہے۔ ایونگ کیسے کی جاتی ہے۔ تو چینی چتا ہم جانے لگے۔

ہمارے جو استاد تھے، پرنسپل تھے ریکٹر تھے وہ تھے و کٹوریہ ڈسیکل۔ ان کی ایک بہت مشہور بائیکل تھی۔ تو ڈسیکل صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تھے کیا۔ لیکن ہم ڈسیکل صاحب سے نہ تو اتنا ڈرست کیونکہ ان کا مزاج اچھا نہ تھا، اور نہ ان سے اتنے زیادہ متاثر تھے جتنے ان ایکٹروں سے جن کا کہ پینٹر اور طرح کا تھا۔ تو ایک دفعہ انہوں نے ہم سے کلاس میں سوال پوچھا: ”بھی بتاؤ کہ سب سے زیادہ مشکل روں کوں سا ہے جو ایکٹر کر سکتا ہے؟“ مجھے بات یاد آگئی۔ ہم سب نے ہاتھ کھڑے کیے تقریباً اڑ کے لڑ کیوں کا مشتر کر جواب تھا کہ بخ بیک آف نوٹرے ڈم بہت مشکل روں ہے۔ تو استاد محترم نے فرمایا، دنیا میں سب سے آسان روں بخ بیک آف ناسٹرڈم کا روں ہے۔ کیونکہ توئی ہوئی ناک، گندی شکل، بد نصیر آدمی، ساری بھروسیاں اس کے ساتھ، وہ روں تو کوئی بھی آدمی کر سکتا ہے۔ وہ تو سب سے آسان ہے۔ بخ بیک آف نوٹرے ڈم، اگر کسی نے کیا ہے تو آپ اسے ہر ایکٹرنہ مانیں۔ مشکل ترین روں یہ ہے کہ عام گھرانے کا ایک عام باپ ہے۔ نوپی اتار کے رکھتا ہے، چھتری پکڑ کر رکھتا ہے۔ دفتر سے آتا ہے اور پھر اس کو اپناروں کرنا ہے جو سب سے مشکل ہے۔ وہ کیا کرے، اس کے پاس کوئی سہارا نہیں؟

یہ بات دوسری طرف چلی گئی، تو ہم چلے گئے علی بابا چالیس چور والے ریஸورٹ میں۔ 13 دسمبر کی رات میں تمہاری وہاں لگواؤں گا، اور تم دیکھو گے کہ دن کس طرح طلوع ہوتا ہے اور سال کس طرح ختم ہوتا ہے۔ کیا کیا کچھ ہنگامہ ہوتا ہے۔ ہم ہرے خوش تھے۔ ہم وہاں چلے گئے تو جا کے جب دیکھا تو چھا چھم بینڈ بائے نج رہے ہیں اور دنیا جہاں کے ایکٹر ایکٹر ایکٹر آئے ہوئے ہیں۔ سارے تقریباً وہاں پر موجود تھے اور وہ ہر اچھا زمانہ تھا۔ جب پوسٹ واصل میں اٹلی کی بن رہی تھیں عمارتیں، جب وہاں گئے تو وہاں سُنج کے اوپر بلیک نیگر و تھے۔ اس زمانے میں بلیک ڈرم کا بہت روانج تھا۔ اب نہیں رہا۔ بیٹ بہت پیاری تھی۔ ہر ایک کان اپنے کو دل کر رہا تھا۔ اچانک ریاک اخھا، ہم سمجھے شاند کوئی اپنی چیز ڈرٹک کوئی سگریٹ لینے گیا ہے۔ جا کر ان سے ملا، میوزک والوں سے۔ پھر لوٹ کر واپس آگیا تو اچانک ایک اعلان ہوا۔ سینوری سینوری بوئیرا پے اون کاشن تے پاکستان و ترادی نصرالی میں تو یہی سمجھا کہ ہمارے درمیان کوئی پاکستانی موجود ہے جو ہر اچھا گاتا بجا تا ہے۔ میں نے

کہا، شائد ہوگا۔ میں تھوڑا سا کانپا بھی۔ اعلیٰ اے ای پروفسورے اعلیٰ اونستی زاوی روماسواتا مے کاغذ اٹھایا اشفاق احمد۔ جب انہوں نے یہ کہا تو میری جان عذاب بن گئی۔ مجھے گانے کا پتا ہی نہیں ہوتا کیا ہے۔ شائداب یاد ہو۔ اب یہ وہاں نہیں ہو سکتا کہ میرا گلا خراب ہے۔ یوں ہے وہ ہے میں نہیں آ سکتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ برالگتا ہے۔ یا اللہ مجھے کچھ ایسی بات یاد دلا کہ میں کیا گاتا، ہمیں لب پر آتی ہے دعا بن کے وہ اس پر ذرمنہیں بجا سکتے تھے۔ کچھ میوزک نہیں نج سکتا۔ پھر ڈانس تو الحمد للہ میں گاؤں کا رہنے والا تھا اور ہمارے سکھ علاقے میں بولیاں دو لیاں بہت چلتی تھیں۔ میں اپنی کرسی سے سُنج پر جاتے ہوئے سوچتا گیا۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ اچانک ایک بولی یاد آ گئی، شائد بھی کچھ کام دے جائے۔ سُنج پر پہنچ گیا تو سُنج فیر (Stage Fear) ختم ہو گیا۔ کچھ پہلے بھی، ریڈ یوکی دنیا سے تعلق تھا میرا وہاں پہنچ گیا۔ اپنے کان پر ہاتھ رکھا، شائل اپنا جو ہوتا ہے، میں نے کہا ”بودی والا چڑھیا کار کار ہوں۔ وچارا گیراً گناہ میں پیالا لیا روپ پینڈاراں ہزار ہائیڈاں چار دیاں، بے قدر اس دیاں ناریاں ہائیڈاں چار دیاں“، جب یہ شروع ہوا تو انہوں نے لہر اٹھا لی۔ جناب اوہر سے جم چکھدار جم چھکھدار شروع ہو گئے۔ مجھے خالی بھی بند یاد آ رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں آ رہا، میں یہ گاتا رہا آدھا گھنٹہ تک اب once More شروع ہو گیا۔ میں وہاں کا ہیرو بن گیا۔ اچھے اچھے گانے والے آئے ہوئے تھے۔ نامور گانے والے پیچھے ہو گئے۔ انہوں نے کہا، نہیں سینورے نہیں اشفاق احمد دے نی وے دنال ترلووتا اعلیٰ کنٹار۔ میں نے کہا، مجی بس میرا اتنا ہی گانا تھا۔

اب جب میں بیٹھ گیا تو میں نے کہا، تم سے بعد میں بدلے لوں گا۔ اب چونکہ مجھے اپنی اتنی ہیٹک مل رہی ہے تو لوگ آگئے مجھ سے دستخط کروانے آٹو گراف کے لیے، میں اس کو دے رہا ہوں، اس کو دے رہا ہوں۔ اشفاق احمد۔ میں جس میز پر بیٹھا ہوں، وہاں پر ایک بہت معزز چودھری بنا ہوا تھا۔ دور ایک میز تھی۔ اس پر ایک نہایت گریسیں فل خاتون تھی۔ اکیلی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تو انہوں نے پلٹ کر ایسے میری طرف دیکھا تو میری بالکل سٹی گم ہو گئی۔ یعنی اس کا کچھ ایسا چارم تھا اس کی اتنی بڑی تھی۔ میں اس کے پاس پہ ادب چلا گیا۔ Personality

اس نے کہا۔ ”سی کم وا“، میں بیٹھ گیا تو اس نے کہا Give me Sign مجھے بھی دیں آٹو گراف۔ میں نے اس پر لکھا، بخدمت ملکہ عالیہ انگرڈ برگ مان اور یچے اپنانام لکھا۔ اب اس کے بعد وہ انگریزی میں پوچھتی ہے? What you have Written I have written your name your name تو میں نے کہا Thank you very much بڑی آرٹ کو دیکھنے کی حرمت تھی۔ تو آپ کی خدمت میں آ گیا وہ کہنے لگی Thank you very much میں نے کہا، ”سینور یو بیر تو رسنی سے بھی ملنے کو میرا بڑا جی چاہتا ہے۔ وہ اس کے خاوند تھے جو

رسیلنی۔ تو اس نے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا، مجھے رنگ کریں۔ میں آپ کو وقت دوں گی، فلاں دن اور پھر آپ آئیں۔ تو میں نے وہاں سے آ کر سب کو بتایا۔

ایک دن میں نے ٹیلی فون کیا۔ اس نے کہا، آپ آئیں اور دوپھر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ رسیلنی باوجود اس کے کہ وہ سیٹ پر ہوں گے، لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ میں آ جاؤں گا اور کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ ہم کو ایک گھر کا ہی بندہ بھجتے ہیں۔ میں نے کہا، جی I am honoured عزت افزائی کی بات ہے۔

تلوجی میں وہاں پہنچا، کار چلاتا۔ پولین اسے کہتے تھے۔ تو پولین کے معنی ہیں، چوہیا۔ چوہیا کار۔ صابن دانی تو آپ لوگوں نے یہاں نام رکھا ہے۔ اسی کو تو پولین چوہیا کا رکھتے ہیں۔ اب میں تو پولینوں میں وہاں پہنچا۔ Villa کوئی روم سے 21-22 کلو میٹر کے فاصلے پر۔ جب میں وہاں پہنچا تو میرا خیال تھا کہ امیر لوگ ہیں تو اچھا خاصاً برداساً گھر ہو گا۔ لیکن جی وہ تو اتنا بڑا گھر تھا اور اتنے ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا کہ میری سُنی گم ہوئی اس کو دیکھ کے۔ باہر کھڑے دربان نے پوچھا، آپ کو کس سے ملتا ہے۔ سینور یو پاکستان میں نے۔ کہنے لگا، سی کلائن دا، اس نے وہاں سے ٹیلی فون کیا۔ اندرستے اسے کہا گیا، ہاں بڑا گیٹ کھول دو، آنے دو اندر۔ اب جب میں نے وہاں بڑا گیٹ کھول کے چھوٹی کار اندر داخل کی تو یہ زندگی کی شرمند گیوں میں سے ایک تھی۔ انہوں نے گڑ۔ ڑ۔ ڑ۔ ڑ۔ بڑا دروازہ کھولا کر کوئی مٹے والا ہے تو اس میں چوہیا جا رہی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا، یا اللہ یہ ایسی کار۔ کاش اس وقت کے لیے اور بڑی مل جاتی، کم از کم یک میونسین ہوتی۔ میں نے جا کے اس کو روکا۔ اس چوکیدار نے کہا، ابھی آپ کو تھوڑا سا پیدل چلنا پڑے گا۔ آگے آپ کو ایک اور برک انداز ملے گا، باور دی۔ وہ آپ کو لے جائے گا، تو میں نے کہا، بہت اچھا۔ میں پیدل چلتا رہا بڑی کے اوپر۔ دونوں طرف بہت خوب صورت لان تھے۔ آگے گئے تو ایک اور باور دی آدمی ملا، اس نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ اس نے کہا، آئیے میرے ساتھ، وہ لے کے چلا۔ ایک بڑا مدد بخوبصورت اور اس کے اوپر بلیں لٹکی ہوئیں۔ اس نے وہاں جا کر کہا، میری حد یہاں ختم ہوتی ہے۔ آپ اب ایک اور صاحب کے ساتھ چلے جائیں۔ ایک اور صاحب جو کہ عورت اور مرد تھے تو ان کو میں Greet کر کے ان کے ساتھ چلا، تو انہوں نے کہا، میڈم بہت خوش تھیں۔ سب کو بتایا تھا کہ ہمارا ایک معزز مہمان آرہا ہے۔ میں آگے گے چلا گیا جا کر ایک بڑے بال میں، انہوں نے مجھے اس خاتون نے اس مرد نے بخدا دیا۔ ایک لمبی اسی میز تھی۔ کالی سیاہ رنگ کی اور اس کے اوپر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ تو انہوں نے کہا، ہم نے میڈم کو انا ونس کر دیا ہے، وہ آتی ہوں گی۔ میں نے کہا، بہت خوشی کی بات ہے۔ انہوں نے کہا، وہ مغدرت کر رہی ہیں کہ تھوڑا سا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اب بیٹھے بیٹھے مجھے کوئی مشکل سے چار پانچ منٹ ہوئے ہوں گے اور میں تھوڑا سا بور بھی ہو

رہا تھا۔ وہاں سیڑھیاں تھیں آٹھ دس وہاں سے ٹپ ٹپ کرتا ہوا ایک لڑکا، جس نے نیلی نیکر پہنی ہوئی، کالے سیاہ بوٹ اور کتنے سارے ہننوں والی ایک جیکٹ سی پہنی ہوئی وہ نیچے اترा۔ لڑکا کوئی سات آٹھ سال کا تھا۔ نیچے اترنا کھٹ کھٹ کرتا مجھ تک پہنچا۔ میں نے اس کو مسکرا کر کہا، بخوبی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سیدھا میرے پاس آ کر کھڑا ہو کے غور سے میری شکل دیکھنے لگا۔ اب میں بڑا ایمپریس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو کہا How are you? You belong to a rich class اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے کہنی رکھ کے میز کے اوپر جہاں میں تھا، ایسے میری شکل دیکھی۔ اب ایک آدمی کا چہرہ اتنا قریب ہو، اس اینگل پر ہو، بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے اس زمانے میں میں نے تھوڑی تھوڑی موجھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک آرٹسٹ تھا ذاں، وہ اپنی موجھوں کو مووم لگا کے ذرا اونچی رکھتا تھا۔ میں نے بھی ذاں کے فیشن میں موجھیں اور پرکی تھیں تو جب اس نے چہرہ قریب کیا تو وہ میرے بہت نزدیک آ گیا۔ سیدھے کھڑے ہو کے اس نے میری ایک موجھ کو پکڑا اور زور سے کھینچا۔ میرا ہونٹ سارا اور کوکھنچ گیا اور دوسرا سے ہاتھ سے اس نے ترماخ سے ایک چھانٹا دیا میرے، اتنے زور کا کہ میرا یہ سارا ہونٹ نیچے گر گیا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ ایک ملازم آ گیا اور مجھے آ کے کہنے لگا، یہ رسیٹنی کا بڑا ایٹھا ہے اور میڈم کا بڑا الاڈا پچھے ہے۔ میں نے کہا، ہاں ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ تھپٹر مار کے زور سے وہ بھاگ گیا، کہیں کھیلنے۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ میں نے کہا، یا اللہ حقنی خوش خوشی میں آیا تھا اور جتنا میرا دبدبہ تھا، جو کچھ میں نے سنا تھا، یہ کیا ہوا میرے ساتھ۔ خیر رنج تو ہوا، آج تک ہے۔ یہ ہو کیا گیا میرے ساتھ۔ وہ چلا گیا اور میں بیٹھا رہا، اتنے میں میڈم آ گئی اور معدرت کرنے لگی، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے ابھی رسیٹنی کو فون کیا ہے، اس نے کہا، میرا ایک آخری شاٹ رو گیا ہے، I hope بالکل صحیح ہو جائے گا۔ جب تک ہم بیٹھے کے با تیس کریں گے۔ کہنے لگی Would you like outside میں نے کہا، نہیں اندر ہی صحیح ہے۔ اندر میری کافی مرمت ہو گئی ہے۔ میں دوبارہ باہر جا کے پھر کسی کے سامنے پیش ہوں گا۔ تو بیٹھے کے با تیس کرنے لگ گئی۔ پاکستان کے بارے میں اس کو اتنا معلوم تھا کہ چھوٹا سا ملک ہے۔ دوڑھائی سال کا۔ ابھی ہنا ہے۔ میں نے کہا، ہاں ابھی ہنا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیلات پوچھتی رہی۔ اس نے کھانے کو پوچھا تو میں نے کہا، آپ کے شوہر آئیں گے، ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھر وہ معدرت کر کے چل گئی۔ اس کا ایک تیلی فون آ گیا تھا۔ میڈم کو ٹیلی فون بہت آتے تھے۔ چلی گئی تواب میں بہت Conscious ہو کے بیٹھا ہوا ہوں۔ یا اللہ وہ ظالم کا پچھہ پھر نہ آ جائے۔ ایک ڈر ہوتا ہے نا آدمی کو کہ ایک گھوم رہا ہے آفت کا پرکالہ۔ بعد میں یہ پتا چلا کہ رسیٹنی نے کہا، آپ کھانا کھائیں، میں آپ کو Join کیونکہ میں Delay ہو گیا۔ میرا شاٹ تیار نہیں ہوا تو میں پھر اشفاق سے ضرور ملوں گا۔ یہ بات طے ہے، پھر اس نے کہا، Would you

میں نے کہا، جیسا کہیں تھیک ہے۔ وہ ڈونگے لے کر آنے لگے۔ ان کے ملازم پا اور دی دستانے پہنچے ہوئے چیزیں لارہے ہیں۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی کہ وہ چھپری کا نئے سے کھاتے تھے۔ مجھے آج تک سمجھنہیں آئی کہ کیسے کھانا ہے۔ جب بھی کبھی وہ آلو میرے آگے بھاگتا رہتا ہے، پکڑنہیں جاتا۔ نہیں آتا، تو میں ڈراہوا ہوں۔ ایسی جگہ پر خاص طور پر بندے کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چیزیں آگئیں۔ اتنے میں وہ جو چھوٹا آفت کا پرکالہ تھا، اس کے بجائے پھر ایک اور نکل آیا۔ چار سال کا چھوٹا پرکالہ سا۔ تو میدم نے کہا، یہ میرا چھوٹا بچہ ہے۔ دوان کے بیٹے تھے۔ تو میں نے کہا ہیلو ہائے ویری کیوٹ۔ جیسے کہتے ہیں۔

تو وہ چھوٹا آگیا۔ اس نے کری میرے اس طرف ڈال لی اور میرے قریب بیٹھ گیا، اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتا جا رہا ہے کہ یہ کیا چیز ہے، عجیب و غریب سی۔ کیسے کپڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ کس قسم کا آدمی ہے۔ باوجود اس کے کہ دونوں بچے بہت اچھی اثاثیں بولتے تھے۔ میں بھی تھیک شکاک بولتا تھا۔ با تمیں ہم کرتے رہے۔ جب کھانا لگ گیا بڑے طلائی اور زریں برتوں میں۔ تو ہم نے شوربہ ڈال دیا، جو آغاز کرنے والا شوربہ ہوتا ہے۔ تو وہ جو چھوٹا بچہ کھاتا تھا، دوسرا بڑا اور ہر بیٹھا تھا، دوسرا بھی آگیا۔ کھانا تو کھانا تھانا ساتھ۔ تو چھوٹے نے کیا کیا، وہ دہی کا ایک پیالہ اس کو لے میرے شوربے میں ڈال دیا اور چھپے لے کر اس میں ہلا دیا اور اپنی چیز کچھ کھانے لگا۔ تو میں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ شوربے میں دہی پڑا ہے۔ اس میں کیا خرابی ہو سکتی ہے تو میں نے ایک آدھے چھل لیا تو میدم نے کہا: I am sorry misbehave کیا آپ کے ساتھ۔ ہم بچوں کو نہ کہتے نہیں ہیں۔ ہم ان کو نفیا تی طریقوں پر پال رہے ہیں، کیونکہ اگر بچوں کو نہ کا جائے، ان کو منع کیا جائے تو ان کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ یہ نئی نئی تحقیق آئی ہے۔ ہم سارے لوگ یورپ کی اس تحقیق پر چل رہے ہیں۔ ہمارے جیسے پڑھے لکھے والدین اس معاملے میں بہت ہی محتاط ہیں۔ ہم بچوں کو کچھ نہیں کہتے۔ ملازم سے کہا کہ یہ پلیٹ اٹھادو۔ اس کی جگہ اس نے نئی لا کر رکھ دی تو میں نے شوربہ ڈالا تو اس کے بڑے بیٹے نے کچپ کی ساری بوتل۔ پلیٹ میں اندھیل دی۔ تو میں نے کہا، میں کھاتا نہیں ہوں۔ میں ڈراہی چکن اور آلوگوں سے کئے ہوئے، وہ لے لیتا ہوں۔ وہ ڈال دیئے تو وہ جو بڑا بیٹا تھا، اس نے دیکھا کہ یہ بڑے شوق سے کھانے والا ہے۔ ابھی ایک نوالہ لیا تھا کہ اس نے اپنا آلو چڑھایا فور کے اوپ اور یوں تلکا کے ٹھک کر کے جیسے غلیل نہیں ہوتی، میری ناک کے اوپ، میں بہت اچھے کپڑے پہن کے گیا تھا، مٹھنا مٹھن مرچیں ڈال کے، آلو وہ گیا۔ اس نے کہا، میں پھر معدترت چاہتی ہوں۔ اگر ہم ان کو کچھ کہیں گے، منع کریں گے تو ان کی شخصیت پر اثر پڑے گا۔ ہم نہیں چاہتے بچے کی شخصیت خراب ہو یوں آگے چل کر وہ بہتر انسان بتتا ہے۔ تو میں نے کہا، ہاں کوئی بات نہیں۔ (پھر میں نے ہاتھ ایسے کیے) جو بھی آدمی

Protection کر سکتا ہے، لیکن ہونیں سکی۔ ہاتھ ایسے کیا تو چھوٹے نے کھڑے ہو کر میرے پاؤں کے اوپر اپنا پاؤں بڑے زور سے مارا۔ اس کے نیچے لوپے کے وہ لگئے ہوئے تھے نیلوں میری چیخ نکلی خوفناک قسم کی۔ میں نے سوچا کس لیے یہاں آ گیا۔ دفع کرو، لعنت بھیجو، یا یکشرون کے گھر ہوتے ہیں۔ میں کہاں پھنس گیا۔ اتنے میں رسیلنی کا ٹیلی فون آ گیا تو ملازم نے آ کر اعلان کیا۔ اس نے کپڑا رکھا تک نک کرتی اوپر چھی گئی۔ اب میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں، اوپر جا رہی ہے کہ اب جا کے ٹیلی فون سننے لگ گئی ہے۔ جب وہ ٹیلی فون سن رہی ہوگی، بچے دونوں تاک میں بیٹھے تھے۔ میں نے گالی دی۔ کہ سور میں تیرا گہنا اتار دوں گا کتے۔ اس بے چارے نے کبھی گانی نہیں سنی تھی۔ اتنی گندی گالیاں جتنی مجھے آتی تھیں، جو کہیں بھی نہیں آ سکتیں تو وہ کانپ گیا۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسا دیکھا نہیں تھا، وہ بے چارے ذر گئے اور رنگ فتح ہو گیا۔ میں نے کہا، اگر تم نے آواز نکالی تو کوئی اتنا لین نہیں، کوئی انگریزی نہیں۔ خالص پنجابی ”بے توں فیرا یہہ کیجا نا گل وڈ کے تھالی وچ رکھ دیاں گا۔“ اور اب چہرے سے پتا چل گیا اور دہشت آ گئی ان پر۔ اتنے میں وہ اپنا فون سن کے واپس آ گئی اور انہوں نے کہا، وہ پھر معدوم کر رہے ہیں۔ کوشش میں کر رہا ہوں، موقع مجھے اگر مل جائے تو جانے نہ دینا، جان ضرور کروں گا۔ میں نے کہا، ہر ہی مہربانی۔ پھر وہ کھانا کھانے لگی۔ اور دونوں بچے بھی۔

ہم بھی کھاتے رہے تو کھانے کے دوران جب ہم اختتام پر بچے تو میدم نے کہا، پروفیسر! دیکھا آپ نے، اگر بچوں کو ڈاٹانہ جائے تو شخصیت کیسی ہوتی ہے۔ پر سکون ہوتی ہے۔ کس شرافت سے کھانا کھا رہے ہیں۔

ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ نفیات کا اچھا اصول ہے۔

سایکا لو جست کہتے ہیں چونکہ بچے میں اگریشن (Aggression) ہوتا ہے تو وہ اس کو نکالنے کے لیے تکیے لے کر ڈنڈے کے ساتھ ستون کے ساتھ باندھ کے چیخ مارو۔ کسی پر لکھ دو، ”اماں جی،“ کسی پر لکھ دو ”ابا جی،“۔ اماں پر غصہ آئے تو اماں پر ابا پر غصہ آئے تو ابا پر خٹھاٹھا۔ اور اس طرح سے اگریشن نکل جاتا ہے۔ یہ ان کا خیال ہے۔ چنانچہ پوری ایک دہائی سے۔ میں کہوں گا، سایکا لو جی اس بات پر مصروف ہے کہ ان کا اگریشن نکل جانا چاہیے۔ ماں باپ کے خلاف اگریشن تو ہوتا ہی ہے، بہتر یہی ہے۔ جو طریقہ اب خاص طور پر برٹش سایکا لو جی میں ہے، یہ کہتے ہیں، ڈاٹنائز پننا، اس کو اس کا مقام بتانا بہت ضروری ہے۔

ناشکر انسان

بہت ساری چیزیں طبیعت پر بوجھ دلتی ہیں اور تسلسل کے ساتھ دلتی رہتی ہیں، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ چیزیں جو خدا کی طرف سے ہوتی ہیں، اور جو ہماری طبیعتوں کے اوپر بوجھ دلتی ہیں، ان میں تسلسل کا رنگ آ جاتا ہے، اور وہ بہت دور تک دریتک پھیل جاتی ہیں۔ ہم اسے اللہ کی مصلحت کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ کر پکنے کے بعد بھی تسلی نہیں ہوتی انسان کی، اور وہ زیادہ جانتا چاہتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا اور کیوں ہوتا رہتا ہے؟ مثلاً یہ کہ چھوٹا بچہ ہے۔ اس کو یونیورس ہو گیا ہے تو انسان بڑا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کا کیا قصور تھا، کیا کوتا ہی تھی۔ لیکن اس کا قصور یا کوتا ہی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ عقل مطلق ہے۔ جانتا ہے کہ کہاں پر کیا ہونا چاہیے۔ اس کے بارے میں مغرب کے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ولایت کا ادب اس موضوع سے مالا مال ہے۔ اور لظم میں، نشر میں Plays میں۔ مجھے Thonken Wilter کا ناول یاد آ رہا ہے The Eight Man اس نے بھی اس میں یہ موضوع لیا ہے، بلکہ اس نے تو زندگی بھر جتنی بھی کتابیں لکھیں، اوت لوت کر پلت پلت کر اسی موضوع پر لکھیں۔ اس کی کہانی مختصر یہ ہے کہ آٹھ آدمی دریا عبور کر رہے تھے۔ (لوہے کے رے والا دریا) آٹھوں آدمی ایک دوسرے کے پیچے جا رہے تھے اور خدا کا کرنا کیا ہوا کہ درمیان میں وہ رستا لوت گیا اور وہ تھا تھیں مارتے ہوئے پہاڑی دریا میں گرے اور فوت ہو گئے، اور ان کا نام و نشان تک نہ ملا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایک آدمی گھر سے نکلا جامت بنانے کے لیے اور وہ ابھی سیلوں میں داخل نہیں ہو سکا کہ ایک اندھی گولی امریکہ میں عام رواج ہے اس کو آ کر گئی۔ ایک عورت جو بس شاپ پر کھڑی اپنی سیلی سے باٹیں کر رہی تھی اور اس کی سیلی کو کسی بندے نے نشانہ بنایا ہوا تھا، سیلی تو چلی گئی، نشانہ وہ معصوم عورت بن گئی جس نے روک کر اسے پوچھا تھا کہ تمہارے میٹے کا کیا حال ہے اور تم کہاں ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایک بیوہ نے اپنا بیٹا بڑی آرزوں اور امنگوں کے ساتھ پالا تھا۔ ایک ہی اس کا بیٹا تھا۔ پلا بڑھا اور جوان ہوا اور اس نے

C.S.S کیا، وہ C.A لگا۔ ماں کے ہاں تو شب برات ہو گئی۔ اس نے گھنٹی سنی اور دروازہ کھولا، اور دروازے سے اس کی لاش گھر آئی۔ کچھ ایسا ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ تو تھامن یہ کہتا ہے کہ ایک غاییچے کو آپ دیکھو، اس کے اوپر ایک پھول بنانا ہوا ہوتا ہے اور بڑا خوب صورت پھول ہوتا ہے جو آپ اتنے مہنگے بھاؤ اس کو خرید کر لاتے ہیں، لیکن اگر آپ اس غاییچے کو اٹھا کر دیکھیں تو وہ کچھ لمبے دھاگے کچھ چھوٹے دھاگے کے ہو گئے ہو گئے جنم کے دھاگے ایسے ہوتے ہیں، ان پر زگاہ ڈالنے کو دل نہیں کرتا۔ لیکن ہوتا ایسے ہی ہے کہ پھول بننے کے لیے کچھ ایسے عمل کی ضرورت ہے، جو کہ آپ کو غاییچے کے لیے درکار ہے۔ ہاں بہت اچھی بات ہے لیکن انسان بے چارہ کیا کرے، اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے وہ ایسی باتیں کرتا ہے، لیکن اس کی تسلی ہونہیں سکتی۔ میرکلیش (Macleish) کا معروف ڈراما B.J. جو حضرت ایوب کی زندگی کے بارے میں ہے، اور جسے پڑھ کر ہم نے سبقاً سبقاً بہت کچھ سیکھا۔ شیکسپیر کے Play آپ کے سامنے ہیں۔

مغرب نے اس پر بہت کچھ لکھا، اور وہ کہتے ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جس کا کوئی فیصلہ، کوئی ”تک“ نہیں بنتا، ایسا کیوں؟ لیکن ہوتا رہتا ہے۔ وہ جو عالم مطلق ہے۔ جو مالک ہے سب کا، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے، کرتا ہے، اور اس کی مرضی میں کوئی راز ہوتا ہے تو پھر ہم پوچھتے ہیں، اس میں کیا راز ہے؟ کچھ ہم بھی تو دانش رکھتے ہیں، عقل رکھتے ہیں۔ ہمارے باہم کہتے ہیں، اگر کوئی چار پانچ سال کا بچہ اتفاق سے ہسپتال کے کسی آپریشن تھیز میں چلا جائے، اور دروازہ کھلا ہوا ہو اور سرجن کام کر رہے ہوں ایک بندے کے اوپر، ان کے ہاتھ میں چھریاں، اور نشرت پکڑے ہوں اور ان کے منہ پر رہڑ چڑھائی ہوئی ہو، ماسک وغیرہ تو وہ چیزیں مارتا ہوا باہر نکلے گا اور کہے گا کہ ظلم ہو رہا ہے، اچھے بھملے آدمی کا پیٹ کاٹ رہے ہیں، چھریوں کے ساتھ۔ اے لوگو! جاؤ اور بچاؤ۔ تو کچھ ایسا ہی حال انسان کا ہے۔ وہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ میری عقل و دانش کے مطابق ہے۔ میں نے جیسے پچھلی مرتبہ کہا تھا کہ چیزوں جیسے ایک سمندر کو نہیں سمجھ سکتی، انسان اللہ کے راز، افعال اور اس کے کام اور قانون کو نہیں جان سکتا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نے ہمیں احکام دیئے ہیں۔ بڑی خوش قسمتی ہے۔ میں نے اپنے ایک پروگرام میں عرض کیا تھا کہ میں تو اس دنیا میں آگیا، اپنی مرضی کے خلاف حکم دیا کہ تم چلو، ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ یہاں آکر ایسے گھر میں پیدا ہو گیا جو غریب سا گھر تھا، میں ایم گھرانے میں پیدا ہونا چاہتا تھا۔ میری آرزو تھی کہ فرش کلاس موڑیں ہوں، لیکن جہاں حکم ہوا، وہاں آگیا، اور میں جمعرات کو پیدا ہونا چاہتا تھا، ہفتہ کو پیدا ہو گیا۔ تاریخ مجھے یہ پسند نہیں تھی، ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک کیا۔ جب یہ بر سارا کوزہ (میں) بن گیا تو کوزہ گر (خدا) سے دست بدست پوچھا کر اے کوزہ گر اس میں ڈالنا کیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔ میں تو بن کے یہاں آیا ہوں۔ تو پھر اس کی مہربانی ہے، اس کا کرم ہے کہ اس نے فرمایا کہ میں نے انسان

بُنی کے ذریعے سب کچھ جان چکنے، سمجھ لینے کے لیے ایک پروگرام، ایک فریم ورک دے دیا گیا ہے۔ تو کچھ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جن کو ہم بہت قریب سے جا کر دیکھتے ہیں۔ میں ان کو بڑے شوق سے دیکھتا ہوں، اور میں ان کو بابے کہتا ہوں کہ اللہ کے دینے ہوئے احکام کو کس خوش دلی کے ساتھ اور کس محبت کے ساتھ وہ مانتے ہیں، مانتے چلے جاتے ہیں۔ کوتا ہی ہوتی ہے تو پھر انھوں کرماننا شروع کر دیتے ہیں۔

میں حرم شریف میں جب پہلی مرتبہ گیا، بڑی دیری کی بات ہے۔ جب حرم شریف کی شکل و صورت ایسی نہیں تھی جیسی اب ہے۔ ماشاء اللہ جب بھی پیاری تھی لیکن اس کے اندر رخت پتھر تھے۔ کھڑے ہونے کے لیے کچار استھنا، وہاں پر زم زم کے پاس، کسی نے زم زم سے اپنی پگڑی دھو کے ان پتھروں پر ڈالی ہوئی تھی سوکھنے کے لیے۔ تو میں وہاں بیٹھا تھا۔ مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ حرم شریف میں کپڑے سوکھنے کے لیے، لیکن لوگ ڈالتے تھے، کہہ بھی کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ آدمی جب پگڑی سوکھی ہوئی اٹھانے کے لیے آیا، تو میں نے پوچھا، بھائی صاحب آپ کہاں کے ہیں؟ کہنے لگا، میں پاکستان سے ہوں۔ میں نے کہا، بڑی خوشی کی بات ہے۔ پگڑی سے اندازہ لگایا تھا کہ آپ وہیں کے ہوں گے۔ ویسے آپ کون سے علاقے سے ہیں؟ کہنے لگا، سائیں میں سندھی ہوں۔ میں نے کہا، بڑی برکت والی بات ہے۔ چونکہ آپ مدھب کے بہت قریب ہوتے ہیں، بڑے ماننے والے لوگ ہوتے ہیں، اور ان میں بڑی محبت اور جذبہ ہوتا ہے، تو میں نے کہا، سائیں آپ یہاں کب سے ہیں۔ کہنے لگا، بابا میں تو اٹھارہ برس سے ہوں۔ تو میں نے کہا، آپ یہاں کیا کرتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کسی خاص پروجیکٹ کے ساتھ آئے ہیں۔ کہنے لگا، ہم ایسے ہی چل کے آگئے تھے یہاں رہنے کے لیے۔ صحیح سوریے انھ کے منڈی میں بوجھ ڈھوتے ہیں۔ اس کے دو چار پانچ روایاں جاتے ہیں۔ اس سے ہم اپناروٹی کھانا کرتے ہیں۔ پھر ہم آکے حرم میں بیٹھ جاتے ہیں اور اس پر نگاہ لگا کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ جب یہاں آ جاتے ہیں اور حرم میں بیٹھتے ہیں تو آپ حرم میں کیا کرتے ہیں، یعنی..... کہنے لگا، سائیں ہم یہاں گرپڑتے ہیں اور پھر انھوں کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر گرپڑتے ہیں اور پھر انھ کے کھڑا بھی گرپڑے اور انھ کے کھڑا بھی ہو جائے۔ پھر گرپڑے، پھر انھ کے کھڑا ہو جائے، تو یہ بڑی برکت کی بات ہے۔ ان ماننے والے لوگوں کی جو تسلیم کر لیتے ہیں اس بات کو، جو ہمیں فریم ورک عطا کیا گیا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ مناسب ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنی زندگی کو بسر کریں گے۔

لیکن اس کے ساتھ انسانی کمزوری ہے۔ گرنے والا جو مقام آتا ہے تو وہ بھی ساتھ چلتا ہے۔ اس وقت آدمی یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہ میرے ساتھ، میرے دوستوں کے ساتھ، میرے عزیزوں کے

ساتھ کیا ہوا؟ تو اس میں عزیز ان گرامی زیادہ کوتا ہی اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان جو ہے وہ بڑا بے صبر اور ناشکر ہے، اور اس کی ایک خاصیت ہے۔ چھوٹے سے دھبے کو پھیلا کرنے صرف اپنی زندگی پر نہ صرف اپنے علاقے پر بلکہ ساری دنیا پر محیط کر لیتا ہے اور خود اس کے دائرے کی پیش میں آ جاتا ہے۔

اگر آپ غور کریں گے تو مصائب اور مشکلات اتنی ہی شدید ہوتی ہیں، جتنا کہ آپ نے ان کو بنادیا ہوتا ہے، اور وہ آپ کی ساری زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ ساری زندگی نہیں ہوتیں، ہندہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ساری کی ساری میری زندگی ہے اور وہ برباد ہو گئی، تباہ ہو گئی۔ مجھے یاد آیا، آپ سے بات کرتے ہوئے ایک منگ بادشاہ کے عہد میں ایک غریب آدمی تھا۔ گاؤں کا رہنے والا۔ بہت ہی غریب آدمی تھا، لیکن تھا وہ صوفی آدمی۔ روحانیت سے اس کا گہرا اعلق تھا۔ تو اس غریب آدمی کے پاس ایک خوب صورت گھوڑا تھا، اعلیٰ درجے کا گھوڑا۔ دنیا سے دیکھنے کے لیے آتی۔ اس نے بڑے پیار کے ساتھ اپنے گھر کے قریب ایک چھوٹا سا اصطبل بنانے کے رکھا ہوا تھا۔ اس کا عشق اور پچھلے نہیں تھا، اس کے پاس اور پچھلے نہیں تھا۔ ایک گھوڑا ہی تھا اس کے پاس۔ بادشاہ وقت کو پتا چلا کہ ایک گھوڑا اس کے پاس ہے جو کہ بہت اعلیٰ درجے کا ہے تو یہ حاصل کرنا چاہیے۔ تو بادشاہ اپنے حواریوں کے ساتھ امروں، وزیروں کے ساتھ اس کے پاس آیا۔ کہنے لگا، ”اے فقیرِ مالگ کیا مانگتا ہے اس گھوڑے کے بدے؟“ اس نے کہا، ”حضور یہ بکاو مال نہیں ہے۔ یہ شوق سے رکھا ہوا ہے۔ یہ تیچا نہیں جا سکتا۔ یہ تو بیچنے والی چیز ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا، نہیں، ہم تجھے منہ مانگی قیمت دیں گے۔ اس نے کہا، نہیں جی میں نے بیچنا نہیں ہے۔ اس نے کہا، پھر غور کر لے۔ ہم تجھے ایک پر گز ایک ریاست دیں گے۔ اس کے بدے تو ہمیں یہ گھوڑا دے دے۔ وہ پھر بھی نہیں مانتا۔ ضدی آدمی تھا۔ سودا چلتے چلتے معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اس نے کہا، ”آدمی سلطنت لے لے، گھوڑا مجھے دے دے۔“ اس نے کہا، ”جنابِ عالیٰ! میں نے بتایا کہ اس کا مول کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ بکنے والی چیز ہوتی تو میں دے دیتا آپ کو، لیکن یہ بکنے والی چیز نہیں ہے۔“ تو اس نے کہا، اچھا تیری مرضی۔ جب بادشاہ چلا گیا تو گاؤں کے لوگوں نے کہا تو کتنا نالائق، بے وقوف اور کتنا جامل ہے کہ بادشاہ وقت تیرے پاس آیا۔ اس نے آدمی سلطنت آفرکی۔ اگر ظالم تجھے مل جاتی تو ہم بھی مزے کرتے۔ سارے گاؤں کے مزے ہوتے۔ تو ہمارا بادشاہ ہوتا۔ ظالم تو نے یہ بڑی حماقت کی ہے۔ کتنی بڑی خوش نصیبی کو گھر آئے، دھکا دے دیا، باہر پھینک دیا۔ تو اس نے کہا، وہ عجیب و غریب آدمی تھا۔ کہ میرا گھوڑا ہے۔ اس نے اس کا مول لگایا، میں نے نہیں دیا۔ اس میں خوش نصیبی یا بد نصیبی کی کیا بات ہے۔ یہ تو میری زندگی ہے۔ میرا گھوڑا ہے۔ خوش نصیبی تم کدھر سے نکال رہے ہو۔ میں نہیں دیتا۔ انہوں نے کہا تو ضدی آدمی ہے۔ تو شروع ہی سے ایسا ہے اور تیرا مزاج ہی ایسا ہے۔ یہ کہہ کر چلے گئے۔

تحوزے عرصے بعد کیا ہوا۔ صحیح اٹھا چارہ ذاتے کے لیے تو وہاں دیکھا کر اصطبل میں گھوڑا نہیں تھا۔ اصطبل خالی تھا۔ گاؤں کے لوگ آئے، روتے پیٹتے۔ کہنے لگے ہمارے گاؤں کا حسن تباہ ہو گیا۔ تجھ سے کہا تھا ناکہ بادشاہ وقت کے ساتھ زور آزمائی نہیں کرتے۔ تیرا گھوڑا تیرے پاس نہیں رہا۔ تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا تو تباہ ہو گیا، بر باد ہو گیا۔ اس نے کہا، میں کہاں سے تباہ ہو گیا۔ کہاں سے بر باد ہو گیا۔ ایک گھوڑا تھا، چھوٹی سی چیز تھی۔ میری زندگی تو بہت بڑی ہے۔ یہ اس کا ایک حصہ تھا۔ حصے کے اوپر میری ساری زندگی کو کیوں پھیلا کر کھہ رہے ہو، کہ چونکہ تمہارا گھوڑا چلا گیا، اس لیے تم بر باد ہو گئے۔ معمولی سی بات ہے۔ انہوں نے کہا، نہیں تو بے وقوف آدمی ہے۔ تجھے اللہ نے عقل ہی نہیں دی۔

وہ پھر واپس چلے گئے۔ کوئی ایک مہینا گیارہ دن کے بعد اس کا گھوڑا انہنہا تاہو اواپس آگیا۔ اس کے ساتھ گیارہ نئے جنگلی گھوڑے تھے۔ وہ کہیں بھاگ گیا تھا جنگل میں، اور جنگل میں جا کر انہیں سیٹ کرتا رہا اور وہ سارے اس کے عشق میں بیٹلا ہو گئے۔ تو گیارہ گھوڑے نئے اعلیٰ درجے کے ساتھ لے کر آگیا۔ جب اس نے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ انہوں نے رسمی ڈال کر سب کو وہاں کھڑے کر دیا۔ گاؤں کے لوگ آئے۔ انہوں نے کہا ”تو بڑا خوش نصیب ہے۔ تیرا گھوڑا کھو گیا تھا اور دیکھے کمال کی چیز لا کر دی۔“ اس نے کہا، میری کہاں خوش نصیب ہے۔ گھوڑا تھا، چلا گیا تھا۔ واپس آگیا۔ تو میری ساری زندگی کچھ اور ہے، اور تم ایک واقعہ پکڑ لیتے ہو۔ تم اتنے نالائق لوگ، سمجھتے نہیں ہو۔ تم آ کر کہتے ہو، کیا خوش نصیب ہے۔ وہ جو گھوڑے جنگل سے آئے تھے اور وہ جنگلی گھوڑے تھے۔ اب ان کو سدھانا بڑا مشکل کام تھا۔ تو اس آدمی کا ایک اکتوتا بیٹا تھا۔ بہت پیارا، جی جان سے عزیز تھا۔ ایک باب تھا، ایک بیٹا تھا۔ اس نے کہا، باب یہ جنگلی گھوڑے ہیں۔ میں ان کو سدھاؤں گا۔ بریک ان کروں گا ان ہارمز کو۔ چنانچہ اس نے ایک کورس پہنک کر پکڑا۔ پکڑ کر اس کے منہ میں لگام دے کر اس کے اوپر چڑھا۔ چڑھ کے سب سے صحت مند جنگلی مند زور گھوڑے کو سدھانے کی کوشش کی۔ اس کو لے کر گیا۔ بھگایا جنگل میں چکر لگایا۔ دوسرے دن پھر جب اس پر چڑھا تو گھوڑے سے گر گیا اور اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کا باب آیا، اس کو اٹھا کر لے گیا گھر۔ گاؤں کے لوگ روتے پیٹتے آئے، تیری بدستی ہے۔ تیرا ایک ہی بیٹا تھا تو تو مارا گیا۔ تباہ ہو گیا۔ بر باد ہو گیا۔ ہم تو رونے، سیاپا کرنے آئے ہیں۔ اتنا جو اس سال بیٹا اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب یہ تیرے کسی کام کا نہیں رہا۔ اس نے کہا، بھائی اس میں میری بدستی کدھر سے آگئی۔ یہ میری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ایک بیٹا ہے۔ بیٹے کی ران ٹوٹ گئی ہے۔ مشکل آئی ہے تو نہیک ہے۔ تم مجھے سارے کے سارے کیوں کہہ دیتے ہو کہ تو تو مارا گیا، تو تو بر باد ہو گیا۔ تیرے گھر میں تو بد نصیبی آگئی ہے۔ تاؤ ایک مذہب ہے۔ اس کے پیروکار بڑے وحدانیت کے قائل ہوتے ہیں۔ One ness کے ماننے والے۔ تو یہ جو ٹوٹے آتے ہیں، ان کو نہیں مانتے۔ پوری زندگی کو

مانتے ہیں اب وہ بدنصیب باپ اور بدنصیب بیٹا اور ان کے بارہ گھوڑے رہ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد بادشاہ کی قریبی ہمایہ بادشاہ سے جنگ لگ گئی اور گھسان کا رن پڑا۔ جنگ طول اختیار کر گئی تو بادشاہ وقت کو جری بھرتی کی ضرورت پڑی۔ اس نے ڈنکا بجا دیا گاؤں گاؤں میں ڈونڈی پھیر دی اور جو نوجوان بچے تھے، ان کی زبردستی جری بھرتی کے لیے وہ گاؤں میں آگئے۔ جتنے خوب صورت تگڑے مضبوط بچے تھے، ان کو کان سے پکڑ کر جنگ میں لے گئے۔ اس کے بیٹے کی ناگز ٹوٹی ہوئی تھی، وہ کسی کام کا ہی نہیں تھا وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس آ کر کہنے لگے، یا رہمارے تو پیارے بیٹے تھے، سب کو ہائک کر لے گئے۔ تو بہت اچھا رہا، خوش قسمت ہے۔ اس نے کہا، یا ر تم بندے اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ رہا جائے۔ یہ گاؤں ہی نالائق لوگوں کا ہے جو زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے کو ساری زندگی پر پھیلا کر اس کا نتیجہ نکال دیتے ہیں۔ تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں تمہارے درمیان نہیں رہوں گا اور میری اور تمہاری جداوی ہے۔

چنانچہ وہ اپنے گھوڑے اور بیٹا لے کر کسی اور گاؤں چلا گیا۔ اس کا یہ فلسفہ چینی فلسفہ ہے۔ دائرے کا ایک بہت بڑا حصہ بنا کر زندگی کو سمجھنے اور جانچنے کے لیے اور اس کو آنکنے کے لیے، ایک فناء کر اس کا دائرہ کارٹے کرنے کے لیے۔ کبھی مت کہیے۔ آپ کی زندگی میں اگر کوئی براواقعہ ہوا ہے۔ کوئی ایک دھبا آیا ہے کہ وہ ساری کی ساری آپ کی زندگی پر محیط ہو گیا ہے لیکن انسان کا یہ خاصا ہے کہ جب ذرا سی تکلیف پڑتی ہے تو وہ چیختا چلتا ہے۔ جب ذرا سی خوشی کا لمحہ آتا ہے وہ اس کو بھی پھیلاتا ہے کہ میں سارے کا سارا خوش ہو گیا۔ حالانکہ اس میں خامیاں، کمزوریاں، کوتا جیاں بدستور موجود ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ خوشی کا لمحہ آگیا ہو۔

مجھے آپ سے بات کر کے اچانک یاد آیا۔ میرا یوتا چھوٹا، وہ آرہا تھا، گھبرا یا ہوا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کے بازو پر بٹھایا۔ میں نے کہا، دیکھو یا رکیسا اچھا موسم ہے ذرداد کیجے باہر نکل۔ اس دون موسم بہت اچھا تھا۔ ہمارے بڑے بڑے شیشے تھے۔ آگے درخت لہلہمار ہے تھے۔ پودے لگے ہوئے تھے بانس کے، جوز یادہ خوب صورت لگتے تھے۔ کالے سیاہ بادل تھے۔ ان کے اندر سے باولوں کی قطاریں جاری تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ میرے پوتے کو حسن و جمال میں دلچسپی ہو۔ وہ دیکھے اور اس کو پسند کرے بجائے اس کے کہ، وہ تکڑی کے اور پلاسٹک کے واہیات کھلونوں سے کھیلے، جن میں زیادہ قاتل اور حملہ کرنے والے ہیں۔ پتا نہیں، آج کل ان کو کیا کہتے ہیں، عجیب و غریب۔ ان سے کھیلتا رہتا تھا۔ جب میں نے اسے گود میں اٹھا کر کہا، دیکھو باہر کا منظر اور اس کا حسن یہ بادل اور پرندے اور یہ درخت اور یہ لہلہماتی شاخیں، تو وہ بالکل نہیں دیکھ رہا تھا اور گھنٹن سی اس کے اندر ہے، اور ایک ہی جگہ اس کی نگاہ ہیں مرکوز ہیں، اور گھبرا یا ہوا ہے، اور میری گود میں چڑھا ہوا ہے۔ میں نے جب اس کی نگاہوں کو

غور سے دیکھا تو وہ شیشے کے پار ہی نہیں جا رہی تھیں۔ میں نے کہا، یہ کیا مسئلہ ہے۔ اتنا مقصوم بچہ اور یہاں پر پھنسا ہوا ہے۔ تو خواتین و حضرات! میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو بڑا سائیشن، جس میں سے میں اُسے جمال اور خوب صورتی سے متعارف کروارہا تھا، اس شیشے کے ساتھ ایک مری ہوئی مکھی چکلی ہوئی تھی۔ مر گئی ہو گئی کب کی۔ جیسے ہم کہتے ہیں چھپی چھپی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ساری کائنات چھوڑ کر سارا حسن و جمال چھوڑ کر اپنی نگاہیں اس چھپی چھپی پر مرکوز کی تھیں، اور منہ بسور کے بیٹھا ہوا تھا کہ یہ دنیا جو ہے ساری کی ساری، چھپی چھپی ہے، اور مری ہوئی مکھی ہے اور نالائق چیز ہے اور میں ان ساری چیزوں سے لطف اندوں نہیں ہو سکتا جن سے میرا دادا کرنا چاہتا ہے۔

توجہ مشکلات اور مصیبیں آتی ہیں، تو اگر آپ ان کو غور سے دیکھیں کہ ان کا ایک حصہ بالکل چھوٹا سا فریکشن، آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن ہم نے وہ دھبا پھیلا کر اتنا وسیع تر کر لیا ہوتا ہے کہ پھر وہ اپنے ہمارے اختیار میں نہیں رہتا، اور وہ پھر پھیلا ہوا دھبا ہمارا حکمران بن جاتا ہے، اور جہاں جہاں چاہتا ہے، ہم کو اٹھانے پھرتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مرتبہ کہا، اگر اللہ کی ذات اور اس کے افعال کو جاننے کی آرزو ہے تو پھر اس کے احکام کے اندر داخل ہونا پڑے گا، اور اس فریکونسی کو حاصل کرنا پڑے گا جس فریکونسی کو پکڑ کر اچھی طرح سے اختیار کر کے ہم ان افعال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

مایوسی

یہ جو مایوسی کا بھنور ہوتا ہے۔ یہ بڑا ظالم گردا ب ہوتا ہے۔ اس کے کنارے کنارے پر آدمی گھومتا رہے تو بچنے کی سچھ امید ہوتی ہے۔

لیکن جب بہت گہرا اتر جائے تو پھر بچنے کی کوئی آس باقی نہیں رہتی۔ میں ابھی ایک ایسی محفل سے انٹھ کر آیا ہوں جہاں تو جوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہے تھے، اور ان کے اندر مایوسی اور ناامیدی کی ویسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جیسی کہ کسی زمانے میں جب ہم ان کی عمر میں تھے، ہمارے اندر پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے زمانے میں چونکہ کوئی Psychiatrist، کوئی ڈاکٹر، کوئی ماہر نفسیات نہیں تھے، اس لیے ہم اپنے دکھ کا مداوا کرنے کے لیے ان بڑوں کی طرف بھاگتے تھے جن کے پاس کوئی ایسا پوشیدہ نسخہ ضرور موجود ہوتا تھا، جس کو آپ ہمارا ”بایا“ کہہ لیں، تو وہ ہماری مشکلات کے حل ڈھونڈ کر ہمیں دے سکتے تھے۔ جب ہم بابوں سے پوچھتے تھے کہ آپ ایسا نسخہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟ تو وہ کہتے تھے کہ آپ بھی یہ فتن، طب روحانی کا علم سیکھ سکتے ہیں کیونکہ نسخہ سائل کے پلے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو صرف کھولنا ہوتا ہے اور اس کے حوالے کر دینا ہوتا ہے۔ آدمی اس کے ساتھ بھگڑا کرتا ہے، تکرار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ڈائیاگ میں شریک ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے پلو میں بندھا ہوا نسخہ کھولنا مشکل ہو جاتا ہے، اور اس کا پھر کوئی علاج نہیں ہو پاتا۔ ہم بڑی گھری مایوسی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا، آپ کو کم از کم مایوس ہونے کا اور ناامید ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ لوگ جو آپ سے پہلے گزر گئے یا جن کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہا، جن کے بارے میں لوگ جانتے نہیں ہیں یا جن کا صفحہ رہتی پر کوئی مواد تحریر نہیں، ان کو تو مایوس ہونے کا حق ہے، لیکن آپ کو حق نہیں ہے۔ میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ جو ہیں، آپ کے جو بڑے پرداوات تھے وہ پورس کی فوج میں ملازم تھے اور وہ سکندر اعظم سے لڑے، اور انہوں نے بڑی داوی شجاعت دی اور ان کا ایک بازو کٹ گیا، لیکن زندہ وسلامت گھر پہنچے، اور ان کے گھر جو بیٹا پیدا ہوا، اور اس کے ہوئے بازو والے سور مایوسی

کے گھر میں جو کہ آپ کا جبڑا دادا تھا، وہ اس دنیا میں آیا اور زندہ رہا، سلامت رہا۔ اس کی نسل آگے چلی اور جو آپ کا سکردا دادا تھا، وہ پانی پت کی دوسری لڑائی میں شامل ہوا۔ اور خوب بے جگری کے ساتھ لڑا اور فاتح ہو کے واپس آیا، لیکن اس کے گھر جو بچہ پیدا ہوا، وہ جوان، تو انہا، خوب صورت تھا، اور وہ طاغون کے ہاتھوں مارا گیا، لیکن اس کے گھر ایک بچہ پیدا ہو چکا تھا، جو آگے بڑھتا پھولتا پھولتا رہا، اور آپ کے اس جبڑا دادا کے متوازی ایک اور آپ کا کھنگ نانا تھا جس کے گھر ایک عورت، بیٹی پیدا ہوئی جس کی شادی اس پورس والے سے ہوئی۔ ایک ستم بنائے لارہے ہیں۔ کہتے ہیں قدرت لگیر لگیر کے ان کو زندہ و سلامت رکھ کر کے آپ کو یہاں تک اس ذمیت تک لا لی ہے، اور وہ لوگ جو قدرت کو منظور نہیں تھے جنہیں وہ زندہ نہیں رکھنا چاہتا، وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی نیست و نابود ہو گئے۔ ان کے والدین پہلے مر چکے تھے، ختم ہو چکے تھے۔ نابود ہو چکے تھے۔ آپ جو اس دنیا میں میرے سامنے موجود ہیں، تو آپ نہایت محترم، نہایت اعلیٰ نہایت پسیر یعنی نہایت Strong نہایت Important لوگ ہیں۔ ورنہ قدرت ایسی غلطی ایسی حماقت کبھی نہ کرتی، اور آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آپ ماہیں ہوں اور اس نعمت کا شکر یہ اس طرح سے ادا کریں جیسے کہ آپ کرتے ہیں۔

ہمارے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ انہوں نے کہا آپ اتنی ارفع قوم ہیں، اور آپ کے ارد گرد چلنے والا یہ تانگے والا، یکے بان، ویلڈ نگ کرنے والا، یہ ترکھان، یہ لوہار، یہ پروفیسر، یہ ڈاکٹر یہ سارے کے سارے اگر یہ موجود ہیں، اگر آج ہیں، تو قدرت چھانٹ چھانٹ کر ان کو لائی ہے اور کچھ لوگوں کو اپنی چھلنی میں سے گزارتے ہوئے لے آئی، تو آپ کیسے ماہیں ہو گئے۔ بڑی بے حیائی کی بات ہے کہ اگر آپ ماہیں میں ناامیدی میں یا نامرادی میں داخل ہوں۔ ہم نے کہا، لیکن ہم تو ہو جاتے ہیں، اور کوئی لمحہ ہم پر ایسا نہیں گزرتا کہ ہم ماہیں نہ ہوں، گھبرائے نہ ہوں۔ باوجود اس کے کہ اللہ بار بار فرماتا ہے۔ میری رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اس میں بڑا کوئی راز ہے تو فرمایا ہے، فرمائے والے نے کہ چونکہ آپ کی زندگیوں میں خواہش، آرزو، Desire اتنی گہری اتر چکی ہے کہ آپ سوائے ماہیں کی بیٹری کا چارج لینے کے، اس Desire کو رکھ لیتے ہیں، کیونکہ ہر لمحہ آپ کے اندر کسی نہ کسی شے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور وہ ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے آپ ماہیں کے ساتھ چلیں گے۔ جب خواہش کم ہوتی چلی جائے گی، اور آپ کی وہ جائز Desires آپ کے ساتھ رہیں گی، وہ خواہشیں رہیں گی، وہ آرزو میں رہیں گی جو کہ رہنی چاہیں پھر آپ کو کبھی ماہیں نہیں ہو گی۔ آپ ایسے ہی پھر میں گے جیسے ایک بلبل ہوتا ہے، جس طرح ایک چڑیا چپھاتی ہے۔ آپ کو پتا ہے، باہے کہتے ہیں کہ بلبل کو پہاڑیں ہوتا کہ موت آ رہی ہے۔ وہ گانا گارہی ہوتی ہے، اور موت آ جاتی ہے۔ آپ ہر روز مرتے ہیں، ہر روز خوف زده ہوتے ہیں۔ خوف کے مارے آپ کا دم وقت سے پہلے ہی نکلا ہوتا ہے،

بلکہ "Every moment every day you keep on them" چیزیا کو اس کا نہیں پتا، گھوڑے کو نہیں پتا، شیر کو نہیں پتا۔ وہ بڑے ہرے سے آزادی کے ساتھ چلے جاتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر یہ Desire نہیں ہے جو ہمارے اندر اشتعال پیدا کرتی ہے۔ یا ہمارے اندر تصویر پیدا کرتی ہے۔ تصویر ہمارے ہاں منع ہے، اور عام طور پر سمجھ داریا نے بڑے کہتے ہیں۔ یہ کیوں منع ہے؟ تصویر آپ کے اندر خواہش، اور انگیخت پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مجھ سے پوچھتے ہیں میرے پچھے کہ بابا تصویر اگر آپ کہتے ہیں، نہیں چاہیے۔ تو ہم پاسپورٹ پر کیا الگائیں گے؟ میں نے کہا، وہ تصویر نہیں ہے۔ وہ تمہارے دستخط ہیں، وہ تمہارے تصویری دستخط ہیں۔ یہ وہ تصویر نہیں ہے جو ان رسالوں میں تھی ہے جن کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ تصویر یہ آپ کو بہت مایوس کرتی ہیں۔ بہت خرابیاں گناہی ہیں۔ اگر ان سارے رسالوں سے جو آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں۔ آپ کے گھروں میں بھی ہیں، میرے گھر میں بھی ہیں، پڑے ہوئے ہیں۔ بہت بہت رنگین چیزیں ان میں ہوتی ہیں۔ ایک لمبے کوسوچے ان میں رنگین تصویر بھی نکل گئی، اور صرف متن رہ گیا تو آپ کی زندگیوں میں سے میری کیلکولیشن (Calculation) کے مطابق میری سوچ کے مطابق آپ کی زندگیوں میں سے 50⁶⁰ فیصد ناامیدی اور مایوسی کم ہو جائے گی۔

خیریہ بات عرض کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ہمارے ساتھ اتنی ساری کالک کیوں لگ جاتی ہے۔ جب ہم اٹھتے ہیں تو اندر باہر کا لک گئی ہوتی ہے۔ کہنے لگے اس کالک کو دور کرنے کا فن آپ کو آنا چاہیے۔ اس کے سیاہ دھبے زندگی کے اوپر حاوی ہوتے رہتے ہیں۔ کس طرح سے؟ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں، آپ نے بھی محلوں، گلیوں میں وقت گزارا ہو گا، ہمارے محلے میں دیکھیاں قلعی کرنے والا ایک شخص آیا کرتا تھا۔ وہ عین گلی کے اندر اڑا جما کے گیلی مٹی لگا کے دھونکنی فٹ کر کے اپنے چڑے کو باندھتا۔ وہ ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا، ہم سکول جانے کے بجائے اس کے گردھرے ہو جاتے۔ کالی سیاہ دھونکنی۔ کوئی دیکھی جن کی شکل دیکھنا آپ گوار نہیں کرتے، ان کو ذرا سادھو کر کوئلوں کے اوپر لانا کرسوکھنے دیتا۔ دھونکنی سے ہوا دے کر وہ قلعی کے ساتھ قلعی کی ایک جھریٹ (خراش) دیتا تھا، اور اس کے پاس ایک لوگڑ ہوتا تھا جس کو نوشادر کے ساتھ لگا کر وہ اس کا مانجھا دیتا تھا، اور وہ دیکھی دیکھتے دیکھتے بُقُعہ نور بن جاتی، اور جی چاہتا تھا کہ آدمی اس کو دیکھتا ہے، اور دیر تک دیکھتا ہے۔ ہماری ساری کالک جو ہے، وہ یوں دور ہو سکتی ہے کہ میں کہوں، اے اللہ میں اس سیاہی کو شکریہ کے برش کے ساتھ، اور شکر گزاری کے لوگڑ کے ساتھ، جس کے ساتھ نوشادر لگا جائے، میری تسلیم و رضا کا، میں اس کو چکا سکتا ہوں، اور میں ان کو اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں، جہاں پر، اور چیزیں دکھی جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ بات یہ ہے کہ انسان بہت کچھ جانے کے باوصف شدید احساسِ کتری میں رہتا پسند کرتا ہے۔ میں، اور آپ، اور ہمارے ساتھی جوز نمہ وسلامت ہیں، جن کو احساسِ کتری میں

اترنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، جو احساسِ سکتمی میں خود اترتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ خواہشیں پوری ہوتیں، کچھ نہیں پوری ہوتیں، اور زیادہ بھی آدمی پوری نہ کر سکے تو کوئی بات نہیں، لیکن تھوڑا سا مسکرا تو سکتا ہے۔ مثلاً آپ بہت اعلیٰ درجے کے صابن سے نہیں نہا سکتے تو ال صابن ہے نا تو اس سے نہا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خرابی کی بات نہیں ہے، لیکن جب آدمی مجبور کرتا ہے، اور اس کے ساتھ والے مجبور کرتے ہیں کہ دیکھو تمہارے پاس یہ ہے۔ اس نے کہا، تم تو کنگے ہو۔ وہ ذر تارہتا ہے، کاغذ تارہتا ہے، خوف زدہ رہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پاس بہت ساری صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کو سہارا بنا کروہ بڑی آسمانی کے ساتھ ان لوگوں کو منہ توڑ جواب دے سکتا ہے۔ اپنے وجود سے اپنے ہونے سے اپنی Entities سے کہ دیکھیے! یہ بات میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جو آپ کرتے ہیں۔ اب میں جانتا ہوں، زندگی میں، ماہی میں، ناامیدی میں اگر بہت زیادہ تاریکی ہے۔ اگر ہم یہ پروگرام دیکھیں اور اس کے بعد سو جائیں گے۔ پھر ایک بڑی کاملی سیاہ رات ہم پر چھا جائے گی، اور پھر اس تاریک سیاہ کاملی رات کے اس کنارے سے اس کے کنارے سے اندر سے روشنی کی ایک کرن پھوٹے گی۔ وہ روشنی کی کرن ابھی پہنچی نہیں ہو گی کہ میرے گھر کے پاس نیم کے درخت میں ایک بلبل گھونسلے میں بیٹھی ہے۔ وہ اپنی گردان پیچھے اکٹا لے گی۔ ابھی روشنی نہیں پہنچی، اور وہ چچھانا شروع کر دے گی۔ پتا نہیں اس کا کیا کنٹش ہے اس کے ساتھ۔ میں اکثر غور سے دیکھتا ہوں۔ ابھی روشنی آئی نہیں ہے لیکن وہ بد بد ہے، وہ بدھا ہو گیا ہے۔ پاکیزہ، نیک لمبی چوچ والا گردان کو پیچھے کھینچتا ہے، اور اس کے بعد چچھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی چچھا بہت کے ساتھ ہی پھر اس کے دوسرے ساتھی دیے ہی شریک ہو جاتے ہیں چچھانے میں۔ جیسے ماہیں آدمی کی محفل میں بیٹھئے ہوئے لوگ بھی ناامیدی ماہی میں اگھرے سمندر میں اترنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن اگر آدمی تگڑا ہو، اور یہ سمجھے کہ میں اتنا لبا سفر طے کر کے اتنی مشکلات سے اتنی بیماریوں کو چھلانگتا ہو، سمندروں کو عبور کرتا ہوا پہاڑوں کو چھیرتا ہو، بے شار جنگلوں میں شریک ہوتا ہوا، نسل درسل پیڑھی درپیڑھی یہاں تک پہنچا ہوں تو میں نہایت اہم ہوں۔ میں نہایت قیمتی چیز ہوں۔ میں اور آپ یقین کریں، اور جتنے آدمی آپ بھی بیٹھے ہیں، اور آپ جو اس پروگرام کو دیکھ رہے ہیں، اتنے قیمتی ہیں۔ آج اگر آپ کاغذ لے کر Calculate کریں تو اپنے فیملی شجرہ نسب نامہ ہونے کے باوصف پیچھے چلتے جائیں تو پھر آپ کو پتا چل جائے گا کہ آپ کتنے اہم ہیں۔

ہمارے وہاں روم کے پاس ایک جھیل تھی ”لا گو بر اشانو“ اسے کہتے تھے۔ بڑی خوب صورت جھیل تھی۔ لوگ وہاں سیر و تفریح کے لیے جاتے تھے۔ ہم کو بھی جب دو تین چھٹیاں اکٹھی ہوتی تھیں تو وہاں پہنچ جاتے تھے۔ ایک دن موسم گرم میں بڑی اچھی ہوا چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ وہاں آئے ہوئے تھے اور انکھیلیاں کر رہے تھے۔ آپ جانتے ہیں انہیں لوگ بہت موج میلا کرتے ہیں۔ ایک

نوجوان تھا، بڑا اچھا خوب صورت سا۔ وہ کشتی کے پتوار پر چڑھ کے کچھ دل انس سا کرنے لگا۔ کشتی ڈال گئی، اور ڈولی، اور وہ اپنا تو ازن قائم نہ رکھ سکا۔ جھیل میں گر گیا۔ اب اس کو تیرنا نہیں آتا تھا تو اس نے چینیں مارنا شروع کر دیں۔ اس کو میں نے بھی دیکھا لیکن ہم لوگ زیادہ بھحدار ہوتے ہیں۔ بھمنی خطرے کا معاملہ ہے، ہم اس میں خواہ کیوں پڑیں تو میرے ساتھ باسٹھ تریسٹھ سال کا ایک بدھا آدمی بیٹھا تھا۔ میں اس وقت نوجوان تھا۔ میری 27 برس عمر تھی۔ اس نے کوٹ اتارا، اپنی پتلون سمیت، اور بولوں سمیت اس نے چھلانگ لگا دی، اور میں نے اپنی چالاکی لوگوں کو دکھانے کے لیے اپنے بوٹ کے تھے کھولنے شروع کر دیئے تاکہ تھوڑی سی شمولیت میری بھی رہے۔ لوگ کہیں گے اچھا آدمی ہے، لیکن مجھ سے بوٹ کے تھے کھل نہیں سکے۔ اس نے اس کو جا کر پکڑا۔ الحمد للہ اس کا سرو غیرہ اندر نہیں گیا تھا، بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کو شہوڑی کے نیچے دیتے ہوئے وہ بابا تیرتا ہوا اس کو کشتی کے پاس لے آیا، اور لا کر اس کو سہارے سے کشتی میں داخل کر دیا اور بیٹھ گیا۔ ہم نے بڑے زور زور سے تالیاں بجا لیں۔ اب وہ جو گرنے والا تھا، وہ بڑا شرمندہ ہوا، اور پریشان بھی تھا۔ خوفزدہ بھی تھا، تو اس نے بڑی دلی ہوئی مری ہوئی آواز میں کہا، میں آپ کا بڑا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اتنی بڑی فیور کی ہے۔ مجھے بچایا۔ تو اس بابے نے کہا، No No。 یہ کیا بات تم نے کی، کچھ نہ کہو مجھے۔ اس میں شکر یہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہو ہی اتنے قیمتی کہ جب گرتے کوئی بھی تمہیں بچاتا۔ اس میں کیا بات ہے شکر یہ ادا کرنے کی۔ تو مجھے آج آپ سے باتیں کرتے ہوئے یہ واقعہ یاد آ گیا، تو وہ بابا بیٹھ کے آرام سے اپنے کپڑے سکھاتا اور نچوڑتا رہا۔ اپنا Underwear (زیر جامہ) اور بوٹ کھول کے سکھاتا رہا۔ تو جب آپ کے ذہن میں یہ بات طے پا جائے کہ ہم جب اتنا مبارف طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ کسی بھی صورت میں کسی بھی حالت میں کسی بھی صحت کے ساتھ کسی بھی شکل کے ساتھ کسی بھی رنگ و روپ کے ساتھ تو پھر ہم اہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کی بڑی توقیر فرمائی ہے، اور بہت عزت عطا کی ہے۔ یہ غالباً شیطان ہے جو آدمی کو مایوس کرتا رہتا ہے، اور وہ بہت تھیک ٹھیک اس میں کامیاب بھی ہوتا ہے لیکن اگر آدمی کو اپنے آج کے اوپر پورا بھروسہ ہو، اگر وہ آج سے اپنے صحانے (آنے والا کل) اپنے Tomorrow کو، اپنی گرفت میں اچھی طرح لینے کی صلاحیت رکھتا ہو، پھر اس پر یہ کیفیت طاری ہوئی ہے۔ مجھے صحانے کا لفظ اس لیے پسند ہے کہ میں سندھ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ سندھ ہمارا ایک بہت پیارا صوبہ ہے۔ اس کے لوگ بڑے پیارے بیٹھے لوگ ہیں۔ اچھے سائیں لوگ گانے بجائے والے اد ب کرنے والے۔ میں نے وہاں بڑا وقت گزارا ہے۔ تھر پار کر میں، میں انہیں آج بھی یاد کرتا ہوں۔ میرے دوست جو بھی نہال چند پانیں کیے ہوں گے کا پیٹری خان تھے۔ انہوں نے مجھے بڑی محبت دی۔ میں اس کا بدل نہیں دے سکتا۔ میں کبھی کبھی ایسے الفاظ ڈھونڈھ کے استعمال کرتا ہوں۔ ”صحانے“

ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں آنے والی کل۔ ہمارے پاس چونکہ نہیں ہے اردو میں۔ میں صحانے لفظ استعمال کرتا ہوں۔ آنے والی کل میں، اور یہ اپنے جلو میں، اور اپنی جھوٹی میں بہت ساری خوشیاں، ڈھیر ساری نعمتیں لے کر تیار رہتی ہے لیکن اگر آدمی صحانے سے آنے والی کل سے خوف زدہ ہو جائے تو اس کی جھوٹی میں وہ کچھ نہیں پڑتا جو کچھ پڑنا چاہیے۔ میں ابھی یہاں آنے سے پہلے ایک بڑا اچھا سایب کھارہاتھا سایب کھانے کے بعد بڑی براق اور سفید طستری میں اس کا ایک بیج، سایب کا بیج بڑا چمکدار سا ہوتا ہے، مجھے بڑا اچھا گا۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا تو میں نے کہا، دیکھو بی بی یہ تو بیج ہے۔ اس میں صحانے کا سایب پوشیدہ ہے۔ ایسی بات کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگی، آپ کون سے سایب کی بات کر رہے ہیں۔ اس بیج میں تو تین چار سو سایب پوشیدہ ہیں، یہ آپ کس سایب کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ اچھی بات ہے کہ اس آنے والی کل کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ اور مایوسی کی بات یہ ہے کہ اس میں سے نکلنے کے لیے بہت ساری چالاکیاں اختیار کی جا سکتی ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں، اور میرے باپوں نے یہی بتایا ہے کہ اگر آپ اپنی خواہش کو، اپنی تمنا کو اپنی آرزوؤں کو، ذرا ساروں سکیں، جس طرح آپ اپنے پیارے ڈوگی کو کہتے ہیں، تم ذرا بہرہ بہیز پر ٹھہر، میں اپنا کام کرتا ہوں۔ پھر میں تمہیں لے کر چلوں گا۔ تو Desire کو سنگھی ڈال کر چلیں، اور Desire کو جب تک آپ پیار نہیں کریں گے، کتنے کی طرح سنگھی ڈال کر سیر نہیں کروائیں گے، اسے نجا میں گئے نہیں، اس کو گلتان کی سیر نہیں کروائیں گے، وہ چمٹ جائے گی۔ آپ اس کے ساتھ ڈیچ رہیں۔ ایک آپ، اور ایک آپ کے محبوب کے درمیان ایک چھوٹی سی سنگھی ہوتی ہے، اور ایک عجیب طرح کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ کی Desire کے، اور آپ کے درمیان ایک فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس کو کھلا کیں، ساتھ ساتھ رکھیں، لیکن Desire کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں۔ یہ سب سے ضروری، اور مشکل امر ہے، اگر آپ شروع کر دیں سنگھی تو پھر کوئی مشکل بھی نہیں۔ ایک Pet کی، ایک لمبی کہانی یاد آئی تھی۔ پھر کسی وقت عرض کروں گا، لیکن اس کا گہر اتعلق Desire سے انسان سے انسان کی ذات سے ہے۔ کسی طرح سے وہ پا توجانور آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

صاحبان علم

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ جن بابوں کا میں اکثر ذکر کیا کرتا ہوں، اور جن میں خاص طور پر بابا نور والے کا ذکر رہتا ہے۔ ان کے بات کرنے کا انداز، اور بات کو سیئنے کا پیش کرنے کا جو روایہ تھا، عام لوگوں سے بے حد مختلف تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں، ان کی باتیں کوٹ ایبل کوٹس، افور سیزم کا درجہ رکھتی تھیں۔ مثلاً کہا کرتے تھے: جو خیر کو قبول نہیں کرے گا، خیر اس کے لگے پڑے گا۔ کہتے تھے: نماز کی قضائے، خدمت کی قضائیں۔ پھر ایک اور اسی طرح لمبا بیان جس کے اوپر ہم ذرا الجھے گئے تھے، اور اب میں اس الجھن سے تھوڑا سا آزاد ہوا ہوں، وہ یہ تھا: سمجھنے والے نے انسان کو کسی کام کے لیے، کسی عمل کے لیے بھیجا ہے، صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو عمل سمجھتے ہیں، وہ عمل کے لیے دیا گیا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب یہ بڑی بوجھلی بی بات تھی۔ ہم لوگ جو لکھنے لکھانے والے تھے پڑھنے پڑھانے والے تھے ان کے لیے گویا یہ ایک بہم شیل تھا۔ لیکن ایمانداری سے سوچا جائے، اس پر غور کیا جائے۔ ذیرے پر بیٹھ کر اس قسم کی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ جس قسم کی ہم تی وی پر بیٹھ کر یا پروگرام میں یا یونیورسٹی کی کلاسوں میں یا کالج کے کمروں میں کیا کرتے ہیں۔ ہم نے اس پر غور کیا، اور غور کرنے والوں میں حبیب جالب مرحوم بھی تھے۔ وہ بھی وہاں آیا کرتے تھے، اور خاص طور پر صدر میر وہ بھی مرحوم ہو گئے ہیں، وہ بحث میں شریک تو نہیں تھے لیکن موجود تھے۔ پھر ہمارے سا فر صد لیقی۔ سوچتے سوچتے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جو ریت آف لٹریسی ہماری شرح تعلیم ہے، اور اس کے بارے میں ہم نے قول فیصل دیا ہے کہ شرح تعلیم 17-20-21-21-20-18-17 فیصد ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے۔ تو بابا جی نے کہا کہ جس تعلیم کو یا جس علم کی شرح آپ یہاں محدود کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق پاکستان میں شرح تعلیم جو ہے، وہ 90 سے 92 فیصد ہے۔ اب یہ ایک عجیب و غریب بات تھی۔ انہوں نے کہا جب آپ تعلیم کو جانچتے ہیں، آنکھتے ہیں، بیٹھ کے تو لتے ہیں تو آپ صاحبان علم کو نہیں لیتے، صاحبان قلم کو لیتے ہیں۔ اور صاحبان علم میں، اور صاحبان قلم

میں آپ تخصیص کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کو ملائکر رکھنا چاہیے۔ صاحبان علم میں وہ سارے لوپار، ترکھان ویلڈر، پینشن، دھوپی، اعلیٰ درجے کے درزی خاص طور پر شامل ہیں۔ اسی طرح گاڑی والے سب اونگ شامل ہیں، کیونکہ ان کے پاس اپنا ایک علم اتنی شدت، اور اتنی ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے جس طریقے کا دوسرا علم۔ لیکن ہم لوگ صرف اہل قلم کو یا حرف شناس کو ہی صاحبان علم سمجھتے ہیں۔ یہ زیادتی کی بات ہے تو وہاں سے کچھ متاثر ہو کر جب میں آیا، گھر پہنچا تو میں نے اپنی بیوی (بانو قدیمہ) سے بات کی۔ انہوں نے کہا لا جوں والا قوتہ یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ صاحبان علم تو ہم ہیں، کیونکہ ہم لکھتے ہیں، ہم رائٹر، ہم ادیب ہیں۔ ہماری تو کتابیں چھپتی ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ ایک بڑھی جو ہے، وہ بھی ایسا ہے تو وہاں ہمارے ایک پرنسپل صاحب بیٹھے تھے جو کہ اب بھی ایک بہت بڑے کالج کے پرنسپل ہیں۔ اشغال یہ بالکل زیادتی کی بات ہے، انہوں نے کہا۔ ہم ان کو کیسے صاحبان علم کہیں۔ میں نے کہا، آپ کا کیا شعبہ ہے۔ انہوں نے کہا، کیمسٹری۔ وہ کیمسٹری کے پروفیسر تھے۔ میں نے کہا، دیکھیے پروفیسر صاحب اگر کیمسٹری کے شعبے کے، اور آپ کی لیبارٹری کے دروازے خراب ہو جائیں، اور آپ انہیں تبدیل کرنا چاہیں تو آپ کس کو بلا کیں گے۔ تو انہوں نے کہا، ترکھان کو بلا کیں گے، بڑھی کو بلا کیں گے۔ کارپینٹر کو بلا کیں گے تو جب وہ کارپینٹر آئے گا، اس کا جائزہ لے گا تو وہ کہے گا، دیکھیے یہ تین دروازے ہیں، آپ ڈھائی مکسر لکڑی منگوالیں۔ اب آپ کا سارا کالج بتا دے کہ ڈھائی مکسر لکڑی کتنی ہوتی ہے۔ وہ ایک پورا علم ہے نا اس کا۔ اب جب وہ ڈھائی مکسر لکڑی کہہ چکے گا تو پھر کہے گا۔ پرنسپل صاحب چونکہ یہ دروازے اندر کے ہیں، اور ان کو بارش کا چھانڈا یورش نہیں ہوگی، اور جب ہم یہاں دیار لگانے کے بجائے پرتری استعمال کریں گے تو بہتر ہے کہ آپ ڈھائی مکسر لکڑی پرتری کی منگوالیں، اور جب آپ کا اکاؤنٹ آفیسر جانے لگے گا تو پھر وہ کہے گا۔ یہ پورے چھٹے فٹے دروازے نہیں ہیں، سائز ہے پانچ فٹ ہیں۔ اس لیے آپ شہتیری نہ لیں، پھازا لے لیں۔ تو یہ کچھ دے گا تو وہ صاحب علم ہے یا نہیں۔ کہنے لگے ہم تو صاحب علم نہ کہیں گے لیکن ہم اسے اپنے فن کا ماہر کہیں گے۔ ویسے آپ بھی اپنے فن کے ماہر ہیں، وہ بھی ہے۔ آپ اسے تسلیم کریں۔ لیکن ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل تھا۔

پھر تھوڑے دن ہوئے، میں یہ بوجھ لے کر، یہ بہت بڑا بوجھ ہے۔ میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ ایک یہاں پر ہماری محفل تھی۔ ایک ہوٹل میں تو حکیم سعید مر جوم کیا کرتے تھے۔ وہاں بڑے دانشمندوں کیٹھے ہوتے تھے۔ وہاں میں نے کہا، یہ ایک مسئلہ ہے۔ آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم ہے؟ تو وہاں ایک بچہ صاحب ریٹائرڈ تھے۔ کہنے لگے اشغال صاحب! آپ خدا

کا خوف کریں۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک معمار، مستری، راج، چنانی کا کام کرنے والا صاحب علم ہے۔ میں نے کہا، جناب میں ان کو صاحبِ علم نہیں کہتا۔ میں ان کو آپ کے، اور اپنے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ اتنی تعلیم کا مالک ہے جتنے ہم ہیں۔ کہنے لگے خدا کا خوف کریں۔ بڑے پریشان ہوئے۔ کہنے لگے، آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ وہ کیسے اس درجے میں آسکتے ہیں؟ میں نے کہا، دیکھیے نجح صاحب پاکستان میں جتنی بھی باتی کورٹس ہیں، ان کے نیچے بیٹھنے والے نجح جن چھتوں کے نیچے بیٹھتے ہیں جو ان پڑھ مسٹریوں نے بنائی ہوئی ہیں، اور آپ اپنے فیصلے لکھتے ہیں۔ آپ ان کو کہاں پلیس کریں گے۔ خدا کا خوف کریں۔ کہنے لگے چیز یہ بات ہے تو تمیک ہے لیکن یہ بڑا مشکل ہے، اس کو اس حد تک برداشت کرنا۔ پھر انہوں نے کہا دیکھیے میں آپ کو یہ رعایت دیتا ہوں۔ پروفیسر کہنے لگے، آپ ان کو Skilled Labour کہہ لیں۔ میں نے کہا، آپ انہیں ٹینکنیشن کہیں۔ جب بھی آپ بات کرتے ہیں، بڑے بڑے مضمون لکھتے ہیں۔ سائنس اینڈ تکنیکالوجی کی بات کرتے ہیں۔ سائنس تک آپ پہنچتے ہیں۔ تکنیکالوجست تک آپ نہیں پہنچتے تو پھر اس ملک کا کیا بننے گا۔ ہاں کیوں کہیں گے ان کو Skilled Labour کیوں کہیں گے؟ کہنے لگے، نہیں۔ اس بات پر کچھ دیر جھگڑا چلا۔ وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے اشفاق صاحب دیکھیے اتنی رعایت آپ کو دے دی ہے کہ Skilled Labour کہہ لیں۔ میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب آپ کے خوب صورت ہسپتال کے اندر جہاں آپ بارث کا پائی پاس کرتے ہیں۔ اس کے باہر ایک ولیدہ رہے۔ وہ ولیدہ بھی نانکاگاتا ہے۔ آپ بھی نانکاگاتے ہیں تو آپ میرے حساب سے دونوں برابر ہیں۔ دیکھیں ولیدہ بھی تو کمال کا کام کرتا ہے۔ کہنے لگے، یہ برابر کیسے ہو گئے۔ میں نے کہا، دیکھیے۔ میں ولیدہ کی گن آپ کو دے دیتا ہوں۔ کتنے بڑے آپ ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کہتا ہوں، مجھے ایک نانکاگا کروے دیں تو آپ نہیں لگا سکتے۔ تو کہنے لگے، یہ تو بھی ہم نے سوچا ہی نہ تھا، اس کے بارے میں اب کیا فیصلہ کریں۔ میں نے کہا اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ آپ اتنے بڑے اپنے صاحبان علم کو کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔ اپنے، اور ان کے درمیان بڑی خلیج پیدا کر رہے ہیں جس نے آپ کے ملک کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کیا آپ ان لوگوں کو وہ عزت نفس لوٹا کے دینا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وہ Self Respect جس کے وہ حق دار ہیں۔ جیسا کہ ولایت کے مہذب ملکوں میں ان کو تنخوا ہیں زیادہ نہیں ملتیں۔ پیسے ان کو زیادہ نہیں ملتے، لیکن عزت تو ان کو وہی ملتی ہے جو بونڈز مژریٹ کے ایک لارڈز کو ملتی ہے یا جنی کے ولیدہ کو ملتی ہے۔ کہنے لگے ہمارے ہاں چونکہ ایک ہندو کا نظام ذہنوں میں چلتا آ رہا ہے، منوں کا براہمنوں، کھشتري، ولیش، شودر، وہ نکل نہیں سکا ہے، اس لیے اس پر بڑی شدت سے غور کیے جانے کی ضرورت ہے۔

شروع میں ذیرے پر بابا جی علاج بالغذاء بھی کرتے تھے، ہمارے بابا لوگ کرتے ہیں علاج تھیں۔ (تبدال ادویات) سے۔ وہیں اس کا پتا چلا۔ وہاں کچھ لڑکیاں آئی ہوئی عورت تھی۔ ساتھ ایک بابا تھا۔ وہ اس کا علاج کروانے کے لیے آئی تھیں تو میں نے بابا جی سے پوچھا، یہ کون بچیاں ہیں جو اپنا علاج کروانے کے لیے آئی ہیں۔ انہوں نے کہا اپنے تائے کو لے آئی ہیں، اور یہ بچیاں وہ ہیں جو بہاؤ پور، ملتان میں کائن (Pickers) کپاس چننے والی ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی وہ خواتین ہیں جو کپاس چنتی ہیں یا رائس پلانتر ہیں۔ یہ خواتین ہیں جن کا نام اخباروں میں آتا ہے یا جو روز اپنی برتری کے دعوے کرتی ہیں۔ نہ نہ نہ وہ تو ہمارے جیسی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کے ہیں۔ یہ آپ کا پاکستان جس کی ساری اکانومی کا دار و مدار کائن کی اکانومی پر ہے، اور جو آپ کے لیے اتنے سارے ڈالر پاؤ نڈوچ مارک میں حاصل کرتی ہیں، وہ وہی لڑکیاں ہیں جو Cotton Pickers ہیں۔

میری چونکہ تھیس کی عادت ہے تو میں نے پوچھا، یہیو! یہ کپاس چننے کا کام اتنا مشکل ہے؟ ہاں جی بابا! یہ جو پھنسی چگنا ہوتا ہے، برداشت کی مشکل ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا، تمہاری بڑی شیخی ہے یعنی میری نگاہوں میں تمہاری عزت سب سے زیادہ ہے۔ اخبار والی عزت نہیں۔ اس نے کہا، نہیں آپ کی بڑی مہربانی۔ میں نے کہا، مجھے یہ بتاؤ، یہ جو تم کائن چنتی ہو تو کیا یہ مشکل کام ہے۔ کیا میں یہ نہیں کر سکتا؟ تو کہنے لگی مرد یہ کام نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا، کیوں۔ کہنے لگی: ”ان کی انگلیاں موٹی ہوتی ہیں، وہ پھنسی نہیں پہنچتے پورا جو ناپٹ کے لے جاندے نہیں۔“ تو اگر مردوں کو یہ کام دے دیا جائے خدا نخواست تو آپ کی اکانومی جو ہے، یہ جو آپ تھوڑا بہت فارن اپکچیخ کرتے ہیں، یہ بھی نہ ہو۔ اسی طرح یہ جو رائس پلانت کی بات ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا، گاؤں میں دیکھا ہوگا۔ وہ عورتیں جو پانی میں کھڑی ہو کے لگاتی ہیں اور وہ پیچھے کو چل رہی ہوتی ہیں تو پیچھے کو جب آپ دیکھتے ہیں۔ حیرانی سے کہ وہ لائن بالکل سیدھی ہوتی ہے۔ پھر وہ پیچھے ہتھی جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنا گانا گائے جاتی ہیں۔ پھر وہ اس میں پلانت کرتیں ہیں تو وہ کم از کم میرے حساب سے رائس پلانتنگ کی یا رائس ایگر لیکچر کی ایم ایس سی ہوتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ جو بوڑھے کام کرنے والے ہوتے ہیں، وہ Ph.D کا حق رکھتے ہیں، تو ان لوگوں کو جو ہمارے ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، اور جو صاحبان علم ہیں جو صاحبان قلم نہیں ہیں۔ اب ہم یہ چاہیں گے۔ ان صاحبان علم کو جن میں عملی طور پر علم موجود ہے، ان کو کوئی ایسی صورت پیدا کریں کہ ان کے پاس یہ جو تحریری، اور حرف شناسی کا علم ہے، وہ بھی پہنچ جائے۔ پہنچ اس لیے نہیں رہا کہ ان کو ہم نہیں مانتے۔ اس بارے جہاں جہاں میرا جھگڑا اچلا صورت حال ایسی ہی تھی۔ ایک فوجی تھے وہ کہنے لگے کہ

یہ آپ کی باتیں عجیب عجیب سی ہیں، ہم ان کو کیسے مان لیں۔ میں نے کہا، سر آپ اپنے سازھے 32 لاکھ کی موڑ محمد صدیق ان پڑھ مستری کو دے آتے ہیں، اور ان سے کہتے ہیں، دو دن میں ٹھیک کر دیں۔ وہ کہتا ہے نہیں دو نہیں تین دن لگیں گے۔ یہ کمپنی بے عقل ہے، اس کو بنانی نہیں آتی۔ تو اب میں آپ لوگوں سے آپ کی وساطت سے اپنے سارے حضرات سے پوچھتا ہوں، کیا پاکستان میں یہ وقت آسکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے لیے اپنے آپ کو طاقتو رکھنے کے لیے ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں۔ ان کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں کرنی۔ ان کے ساتھ کوئی محبتیں نہیں کرنی۔ ان کے ساتھ کوئی پیسے میں ترقی نہیں، لیکن جب آپ جائیں تو ان کو اتنی عزت ضرور عطا کریں جتنی جب آپ ولایت جاتے ہیں تو ایک یکسی ڈرائیور کو عطا کرتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں یہ سوال پیش کر رہا ہوں، اور اپنے ناظرین، اور سامعین کی خدمت میں بھی کہ اس کو کیسے حل کیا جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کل غروب آفتاب سے پہلے ہم سارے مل جائیں، اور اس مضبوطی کو اپنالیں جو آپ بڑے فخر یہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ ہوتا ہے، وہ ہوتا ہے میرے خیال میں ہم کوئی ایسا ذہانچہ بنائیں جس میں صاحبان قلم کے ساتھ تھوڑا سا عملی طور پر ان کو اپنے کام کرنے کا موقع ملے۔ انہیں تھوڑے سے حروف وہ بتائے جائیں کہ آپ جو عمل کر رہے ہیں۔ ایک بندہ تیسا چلا رہا ہے زندہ مار رہا ہے، اس میں اس کو پتا چلے کہ اس میں کیا کیا دنیا نے کمال دکھایا ہے، اور کیا کیا کام ہو رہا ہے۔ تھوڑی سی حروف شناسی بھی آئی چاہیے۔ اشفاق صاحب! جیسے انہوں نے پیچھے سے شروع کیا تھا۔ کئی وفع حکومت نے تعلیم بالغاء۔ ا۔ ب۔ پ سے شروع کر دیتے ہیں، اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر اس لائن میں جیسا آپ نے فرمایا، جو عملی کام کرتے ہیں۔ اب ان کو Push کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کے لیے کوئی ادارہ یا کوئی نظام قائم کیا جائے۔ واقعی یہ ان کی تھوڑی سی کمی ہے جو عملی طور پر سب کچھ جانتے ہیں۔ اب یہ ہے دوسروں کو سمجھانے کے لیے یا کچھ کرنے کے لیے، یہی چیز وہ کوئی صاحب علم ہو جیسے کہ مجھے نے کہا، ہم اپنے علم پر تھوڑا سا فخر کرنا شروع کریں گے تو ہم میں تقویت آئے گی۔ ابھی ہم تھوڑا سا ذرے ہوئے ہیں۔ میری بھائی ہے وہ M.Sc ہے۔ پروفیسر ہے ہوم اکنامکس کی، اور اس نے سپیشلائز کیا ہے کھانا وغیرہ پکانے میں۔ لیکن ہمارے گھر میں جب کوئی دعوت ہوتی ہے تو ہم صدیق باورچی کو بلا تے ہیں۔ ایک مرتبہ شادی پر دریکی بات ہے بیالیں دیکھیں پکانی تھیں، اور وہ باورچی بیالیں دیکھوں کو کس ترتیب سے تیار کر رہا تھا، اور کتنی مستعدی سے، اور اس کے پاس کتنا علم تھا۔ آپ اس کا انداز نہیں لگا سکتے۔ تو میں یہ درخواست لے کر آیا تھا۔ آپ کی خدمت میں کہ لوگوں کو Self Respect جو کہ ان کا حق ہے، جوان کی تو قیر ہے، وہ ان کو لوٹا دینی چاہیے۔ بہت ضروری ہے، ورنہ پھر ہم اُسی غلط فہمی، اور کوتاہی میں بنتا رہیں گے جس میں اب ہیں۔ یہ تو میری بات

تھی جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کر دی۔ کچھ ابھنیں میری بھی ہوتی ہیں جس سے میں آپ کو زحمت دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک بہت ہی ذہین انسان، غیر معمولی ذہین انسان، بہت زیادہ۔ کیا بات ہے وہ عام لوگوں سے مل نہیں سکتا۔ ان کے درمیان زندگی نہیں بسر کرتا۔ ان سے کچھ کثا کثا کثا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنی تخلیقی قوتوں میں اتنا مگن ہوتا کہ اس کو شاید دنیا کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید یہ بات ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کثا رہنا چاہتا ہے، لیکن وہ اپنے میں اتنا مگن ہے جس طرح ہمارے ملک بابا ہیں۔ وہ اتنا پر سکون ہے کہ وہ باہر کی دنیا میں آنا چاہتا ہی نہیں۔ جہاں تک ذہانت کا تعلق ہے جس کی نہیں کر رہا۔ اس کا مطلب ہے اس کی ذہانت میں کوئی خرابی ہے، میرا خیال ہے کہ اس کو اپنی ایک مکمل دنیا ملی ہوئی ہے، ایک انخلکچہ میل ڈسکورس اپنے ساتھ کر رہا ہے۔ وہ جینہیں کی بات کر رہا ہے۔ غیر معمولی ذہانت کی بات ہے۔ جس طرح آپ نے شروع میں مثال دی ہے، بابا جی نور والے کی جو کبھی سکول نہیں گئے تھے۔ کبھی کانج نہیں گئے تھے، لیکن جوان کا ناج تھا، اس کی بنیاد پر شاعر، اور آپ جیسے سکارا ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے، اور شیئر کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے ان میں ذہانت اوس طا زیادہ تھی۔ وہ آپ لوگوں کو متاثر کرتے تھے اور وہ پوری طرح لوگوں کے اندر گھلے ملے بھی رہتے تھے، انہوں نے پوری طرح ایڈ جسٹ بھی کیا خود کو، اپنے آپ کو۔ یا آخری فقرہ آپ کا غور طلب ہے کہ گھلے ملے رہتے تھے، بلکہ گھلنے ملنے کے بغیر ان کا علم نکلتا ہی نہیں تھا۔

یہ کیوں ہے؟ میں نجمہ کی بات یہاں تک تو مانتا ہوں، یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ وہ اپنے آپ میں اپنے کام میں اپنی لگن میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ اپنارابطہ قائم نہیں رکھ سکتا لیکن اگر وہ ملک بابا ہے تو پھر وہ (Irritant) کیوں ہوتا ہے؟ ملک بابا (Irritant) نہیں ہوتا۔ میں آپ سے سوال یوں نہیں کر رہا کہ اس کا جواب یوں دیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے، لیکن یہ لوگوں سے میل ملاقات کرنے میں لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں وہ اتنا کیوں پابند ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے اندر وہ آگے نہیں چل سکتا۔ اگر وہ ملے تو بہت کچھ فائدہ پا سکتا ہے۔ اس کی ذات کو بھی معاشرے کو بھی۔ یہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی پیچیدگیاں ہیں جو کہ انسان کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں، لیکن ان پر غور کیا جانا بہت ضروری ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ڈیریوں میں، تکلیفوں پر زاویوں ہر ایسی باتوں کا بڑا پالن ہوتا ہے، اور ان پر غور کیا جاتا ہے، اور آپس میں مل کے بات کی جاتی ہے۔ اور ہمارے بائے جو ہیں، میں آخری بات عرض کر دوں۔ ان میں جو بالکل صحیح بائے ہیں، وہ علم کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ ڈیرے کو مانتے ہیں۔ یہاں علم ملتا ہے۔ یا پھر وہ سائنس لیبارٹریوں کو مانتے ہیں، جہاں سائنسدان کھڑا ہو کے کام کرتا ہے۔ یہاں ڈائی سیک ٹنک ٹبل ہے جہاں پر کام ہو رہا ہے۔ جہاں پر سر الیگزینڈر فلیمنگ بیٹھا ہوا ہے۔

اس کی بابے بہت عزت کرتے ہیں، اور سامنہ دانوں کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی وہ مینا فرگس کی عزت کرتے ہیں۔ خواتین و حضرات اتنی ہی فرگس کی عزت کرتے ہیں۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ بڑا شکر یہ آپ کا۔ انشاء اللہ پھر کسی اگلی نشست میں ملاقات ہو گئی تو کچھ اور چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کر کے پھر آپ سے فائدہ اٹھاؤں گا، اور پھر اس کو مجتمع کر کے آئندہ کسی وقت میں کچھ اور لوگوں کو دینے کی کوشش کروں گا بشرط زندگی۔ اللہ حافظ۔

ایک استادِ عدالت کے کٹھرے میں

علم کے بارے میں انسان ہمیشہ سرگردان رہا ہے، اور آج کے دور میں حصول علم کے لیے بہت سی کوششیں صحیح، غلط، کمزور، پیچیدہ، خمیدہ صورت اختیار کی جا رہی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، یہ جو ساری کوششیں ہیں، یہ انسان کے ایک بہتر مستقبل کی نوید کے لیے یقیناً مدد و معاون ثابت ہوں گی۔

علم حاصل کرنے کے لیے جب ہم بھائی اپنے گاؤں سے لا ہو رائے، تو ہمارے ابا جی نے ایک گھر لے کر دیا، فلیمنگ روڈ پر۔ وہاں اختر شیر انی رہتے تھے۔ میں تو چونکہ فرست ایئر کا طالب علم تھا، اس لیے ان کے نام سے یا ان کے کام سے اتنا آشنا نہیں تھا، لیکن میرے بڑے بھائی ان کو جانتے تھے اور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ بہر حال جہاں ہمارے ابا جی نے، اور بہت ساری مہربانیاں کی تھیں، وہاں یہ کہ ایک خانام بھی دیا تھا جو ہمارا کھانا پکاتا تھا۔ اس کا نام عبدل تھا۔ عبدل کو زندگی میں دو شوق بڑے تھے، ایک تو انگریزی بولنے کا، انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا جیسے آج کل بہت زیادہ انگریزی ہی کو علم سمجھا جاتا ہے، اور انگریزی کے حصول کے لیے ہی جان لڑائی جاتی ہے۔ عبدل کو بھی اس کا بہت بڑا شوق تھا۔ دوسرے اس کو اچھی کنوئیں کا بڑا چسکا تھا۔ چنانچہ کبھی اسے بھائی خط پوسٹ کرنے کے لیے جی پی او بھیجتے تو وہ کہتا تھا، اگر آپ اپنی سائکل دے دیں تو میں بڑی خوشی سے جاؤں گا، اور بڑی خوشی سے آؤں گا۔ ان کی سائکل کے قریب سے جب ہم گزرتے تھے سلام کر کے، لیکن ہم نے بھی اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، تو عبدل پر وہ کبھی مہربان ضرور ہوتے تھے، اور وہ سائکل لے کر ان کا خط پوسٹ کرنے کے لیے فلیمنگ روڈ سے جی پی او جاتا تھا۔ اور میرے حساب کے مطابق چار ساڑھے چار منٹ میں واپس آ جاتا تھا، اور اس حالت میں سانس اس کی پھوپھوی ہوئی اور ما تھے پر پسینہ ہوتا تھا۔

میں اس کی مستعدی سے بہت خوش تھا کہ یہ جو اپنی وہی کل ہے اس کو اتنے شوق سے، اور اتنی مستعدی سے استعمال کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے دیکھا بازار میں وہ واپس آ رہا تھا

جی پی او سے خط پوست کر کے۔ اس طرح کہ سائیکل کا ہینڈل اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے اوپر سوار نہیں تھا۔ تو میں نے اسے روک لیا۔ میں نے کہا، عبدال یہ کیا۔ کہنے لگا، ”میں بھاگی و اخط پا کے آیا تے جلدی واپس آیا۔“ میں نے کہا تو سائیکل لے کر گیا تھا۔ کہنے لگا ہاں جی۔ تو میں نے کہا، اس پر سوار کیوں نہیں ہوا۔ کہنے لگا، عزت کی خاطر لے کر جاتا ہوں۔ سائیکل مجھے چلانی نہیں آتی۔ تو آج بھی تقریباً ہمارا معاملہ عبدال جیسا ہی ہے۔ دوسرے اس کو جب چھٹی ملتی تھی، وہ انگریزی فلم دیکھنے جاتا تھا۔ مال روڈ پر یہاں دو سینما تھے، جن میں انگریزی فلم لگاتی تھی۔ اس کو اس کی بڑی دیوانگی تھی، انگریزی سیکھنے کا چکا، اور انگریزی سیکھنے کی لگن۔ آج ہی نہیں اس وقت بھی بہت زیادہ تھی تو جب وہ فلم دیکھ کے آتا تھا تو میرے بھائی پوچھتے، کیسی تھی۔ کہتا بہت کمال کی تھی۔ اس میں ایک مس تھی، وہ تیرتی بہت اچھا تھی۔ دیری یوٹی۔ لیکن وہ فلم میں دیکھ دیکھ کے اندازے لگاتا مگر اس میں اتنی استعداد نہ تھی کہ سمجھ سکتا۔ کوئی لفڑا سے انگریزی کا سمجھ نہیں آتا تھا۔ نہ ہی وہ اس کا تلفظ ادا کر سکتا تھا، نہ ہی اس کو بیان کر سکتا تھا، لیکن ایک دن میرے بھائی نے پوچھا کہ تو اتنا وقت ضائع کرتا ہے اتنے پیسے ضائع کرتا ہے، اور اس توجہ، اور لگن کے ساتھ اپنی زندگی مستغق کی ہوئی ہے اگر تو مجھے انگریزی کے چار حرف بتا دے، پورے چار۔ چار الفاظ، تو میں تمہیں پورا ایک روپیہ دوں گا۔ تو اس نے کہا کہ میٹرو گولڈ ون میسر۔ انہوں نے کہا یہ تو چار نہیں ہوئے تین ہوئے ہیں۔ کہنے لگا ”اوں“ چوتھا بھی اس نے ادا کر دیا۔ تو وہ انگریزی جو جانتا تھا، وہ اس قسم کی تھی اب بھی ہم کوشش کر رہے ہیں، اور انگریزی کے اندر کچھ ایسے ہی سچنے ہوئے ہیں۔ شیر کی بھوگی مارتے ہیں۔ انگریزی چلتی نہیں۔

یہ تو تھی بات جو بر سیل تذکرہ آگئی۔ میرا آج کا جو موضوع تھا وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ پروفیسر صاحب یہاں آج تشریف فرمائیں۔ جس زمانے میں میں روم میں یونیورسٹی، روم یونیورسٹی میں، اور میں سب سے Youngest پروفیسر تھا۔ یونیورسٹیوں میں چھٹیاں تھیں، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دو پہر کے وقت ریڈ یونیشن پر مجھے اردو براڈ کاستنگ کرنی پڑتی تھی۔ لوٹ کے آ رہا تھا تو خواتین و حضرات روم میں دو پہر کے وقت سب لوگ قیلولہ کرتے تھے۔ 4 بجے تک سوتے تھے، اور روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوئی تھیں، اور کار پوریشن نے یہ انتظام کر کھا تھا کہ وہ وہاں پر پانی کے حوض لگا کر سڑکیں دھوتے ہیں، اور شام تک سڑکیں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، خوشگوار بھی ہو جاتی ہیں، صاف بھی ہو جاتی ہیں۔ تو وہ سڑکوں کو دھورہ ہے تھے۔ اکادمی کوئی ٹرینک کی سواری آ جا رہی تھی۔ تو میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اب دیکھیے انسان کے ساتھ ساتھ ایک دیسی مزاج چلتا ہے آدمی کہیں بھی چلا جائے، تو میں گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گول دائرہ ہے اس کے اوپر سے میں چکر کاٹ کے آؤں گا۔ پھر میں اپنے گھر کی

طرف مزدود گا تو یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ نیچے میں سے چلتے ہیں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے، دوپھر کا وقت ہے۔ تو میں نیچے میں سے گزراؤ ہاں ایک سپاہی کھڑا تھا، اس نے مجھے دیکھا، اور اس نے پروانہیں کی۔ جانے دیا کہ یہ جارب ہے یہ نوجوان تو کوئی بات نہیں۔ جب میں نے دیکھا شستہ میں سے گردن گھما کے کچھ مجھے تھوڑا سایاد پڑتا ہے۔ میں طنز مسکرا دیا۔ کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔ میں نے خوشی منانے کے لیے ایک مسکراہٹ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس نے میری یہ عزت کی ہے تو اس نے سیٹی بجا کے روک لیا۔ اب وہاں پر سیٹی بجتا موت کے برابر تھی اور رکنا بھی میں رکا، وہ آگیا، اور آ کے کھڑا ہو گیا۔ پہلے سلیوٹ کیا، ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی آپ کا چالان کرتے ہیں۔ آپ کو پکڑنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے آ کر سلیوٹ مارتے ہیں۔ تو اس نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا اب میں اندر تھر تھر کا نپ رہا ہوں۔ شیشہ میں نے یچھے کیا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ کا لائسنس۔ تو میں نے اس سے کہا میں زبان نہیں جانتا۔ اس نے کہا، چنگی بھلی بول رہے ہو۔ میں نے کہا، میں نہیں جانتا تم ایسے ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تو نہیں جانتا ہوں۔ اس نے کہا، نہیں آپ اپنالائسنس دیں۔ تو میں نے کہا، فرض کریں جس کے پاس اس کا لائسنس نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے۔ اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا چالان کر دیتا ہوں۔ پرچھی پھاڑ کے تو یہ آپ لے جائیں اور جرمانہ جمع کروادیں۔ میں تو ایسے ہی مالگ رہا تھا۔ میں نے کہا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا غلطی ہو گئی تھی تو چلے جاتے۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھھے کاپی نکالی اور چالان کر دیا، اور چالان بھی بڑا سخت، بارہ آنے جرمانہ۔ میں نے لے لی پرچھی۔ میں نے کہا، میں اس کو لے کر کیا کروں۔ اس نے کہا اپنے کسی بھی قریبی ڈاکخانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروادیں۔ بس وہاں پکھری نہیں جانا پڑتا، وہ کہنے لکھنے پڑتے۔ بس آپ کا جرمانہ ہو گیا، آپ ڈاکخانے میں دیں گے تو بس۔ میں جب چالان کروا کے گھر آگیا تو میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے کہا، میرا چالان ہو گیا ہے۔ کہنے لگی، آپ کا۔ میں نے کہا، میں کیا کروں۔ اب ان کو ایسے لگا کہ ہمارے گھر میں جیسے ایک بڑا مجرم رہتا ہے۔ اور اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہو گیا ہے۔ بدھی مائی تھی۔ ان کی ایک ساس تھی اس کو بھی بتایا، سارے روئے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ میں بڑا اور اکہ یا اللہ یہ کیا۔ کہنے لگے تو شریف آدمی لگتا تھا۔ اپنے خاندان کا اچھے گھر کا لگتا تھا۔ ہم نے تجھے یہ کرانے پر کرا بھی دیا ہوا ہے لیکن تو ویسا نہیں نکلا خیر گھر خالی کرنے کو تو نہیں کہا۔ جو بڑھی مائی تھی، ان کی ساس، اس نے کہا۔ ہو تو گیا ہے برخوردار چالان۔ لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محلے داری کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو پتا چل گیا کہ اس کا چالان ہو گیا ہے تو بڑی رسوائی ہو گی۔ لوگوں کو پتا چلے گا۔ میں نے کہا، نہیں میں پتا نہیں لگنے دوں گا۔ میری لاابالی طبیعت، 26 سال کی عمر تھی۔ چالان جیب میں ڈالا اور نکل گیا دوستوں سے ملنے۔ اگلے دن مجھے جمع کروانا تھا،

بھول گیا۔ پھر سارا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے اصولاً جمع کروادیا چاہیے تھا تو میں نے کپڑے بدلتے تو اس پر اనے کوٹ میں رہ گیا۔ شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کہ محترمی جناب پروفیسر صاحب فلاں فلاں مقام پر فلاں چورا ہے پر آپ کا چالان کر دیا گیا تھا، فلاں سپاہی نے۔ یہ نہ ہے آپ کے چالان کا۔ آپ نے ابھی تک کہیں بھی چالان کے پیسے جمع نہیں کروائے یہ بڑی حکم عدالتی ہے۔ مہربانی فرمائ کر اسے جمع کروادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ تقریباً 21 روپے کا تار تھا۔ میں نے سارے لفظ گئے۔ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں پھر بھول گیا، اور ان کا پھر ایک تار آیا۔ اگر آپ اب بھی رقم جمع نہیں کروائیں گے تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش کر دینا پڑے گا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی، نہیں جاسکا۔ تب مجھے کورٹ سے ایک سمن آگیا کہ فلاں تارخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں، اور یہ جو آپ نے حکم عدالتی کی ہے، قانون توڑا ہے، اس کے بارے میں آپ سے پورا انصاف کیا جائے گا۔ ان کی بولی، چونکہ رومن لاء و ہیں سے چلا ہے تو بڑی تفصیل کے ساتھ۔ اب میں ڈرا، میری سئی گم ہوئی۔ پریشان ہوا کہ اب میں دیا ہر غیر میں ہوں۔ کوئی میرا حامی و ناصر مدگار نہیں ہے۔ میں کس کو اپنا والی بناؤں گا۔ میرا ذاکر تھا۔ ذاکر بالدمی اس کا نام تھا، نوجوان تھا۔ میں نے اس سے کہا، مجھے وکیل کر دو۔ اس نے کہا، میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا، یہ تھوڑا سا یقیدہ ہو جائے گا۔ اگر میں گیا عدالت میں۔ بہتر یہی ہے پروفیسر صاحب جائیں، اور جا کر خود Face کریں عدالت کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ میں چونکہ اس قانون کو تھیک طرح سے نہیں جانتا تھا۔ میں یہاں پر ایک غیر ملکی ہوں تو مجھے معافی دی جائے۔ میں ایسا آئندہ نہیں کروں گا۔

میں نے کہا تھیک ہے۔ چنانچہ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔ اگر آپ کو روم جانے کا اتفاق ہو تو ”پالاس آف دی جستی“ Palace of Justice وہ روم زمانے کا بہت بڑا وسیع و عریض ہے اسے تلاش کرتے کرتے ہم اپنے نجح صاحب کے کمرے میں پہنچتے تو وہ وہاں تشریف فرماتھے۔ مجھے ترتیب کے ساتھ بلا یا گیا تو میں چلا گیا۔ اب بالکل میرے بدن میں روح نہیں ہے، اور میں خوفزدہ ہوں، اور کاپنے کی بھی مجھے میں جرأت نہیں۔ اس لیے کشخ جیسی کیفیت ہو گئی تھی، انہوں نے حکم دیا، آپ کھڑے ہوں اس کٹھرے کے اندر۔ اب عدالت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا چالان ہوا تھا، اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ بارہ آنے ڈاک خانے میں جمع کروائیں، کیوں نہیں کروائے؟ میں نے کہا، جی مجھ سے کوتاہی ہوئی، مجھے کروانے چاہیں تھے، لیکن میں..... اس نے کہا، کتنا وقت عملے کا ضائع ہوا۔ کتنا پولیس کا ہوا، اب کتنا ”جستیک کا“ ہوا (جس عدالت کا ہو رہا ہے) اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ہم اس کے بارے میں آپ کو کڑی سزادیں گے۔ میں نے کہا، میں یہاں پر ایک فارز ہوں۔ پردیسی ہوں۔ جیسا ہمارا بہانہ ہوتا ہے، میں کچھ زیادہ آداب نہیں سمجھتا۔ قانون سے میں واقف نہیں ہوں

تو میرے پر مہربانی فرمائیں۔ انہوں نے کہا، آپ زبان تو محکم بھاک بولتے ہیں۔ وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں تو میں چپ کر کے کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ عدالت آپ سے پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں، اور آپ کا پیشہ کیا ہے؟ میں نے کہا، میں ایک تیپر ہوں۔ پروفیسر ہوں۔ روم یونیورسٹی میں۔ تو وہ نجح صاحب کری کو سائینڈ پر کر کے کھڑا ہو گیا، اور اس نے اعلان کیا Teacher in the Court. Teacher in the Court. جیسے اعلان کیا جاتا ہے، اور وہ سارے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ فتحی، تھانیدار، عمل دار جتنے بھی تھے، اور اس نے حکم دیا کہ Chair should be brought for the teacher. A teacher has come to the court.

اب وہ کٹھرا چھوٹا سا، میں اس کو پکڑ کر کھڑا ہوں۔ وہ کری لے آئے۔ حکم ہوا کہ تو ہے، کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تو پھر اس نے ایک بانی پڑھنی شروع کی۔ نجح نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترم انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت کا، اور عدل کا حکم دیا ہے، اور آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے، اور آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر برا جمان ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔ عدالت نے جو ضابط قائم کیا ہے، اس کے تحت آپ کو چیک کریں، باوجود اس کے کہ میں اس بات کی شرمندگی ہے، اور ہم بے حد افسردہ کہ ہم ایک استاد کو جس سے محترم، اور کوئی نہیں ہوتا، اپنی عدالت میں ہرائل کر رہے ہیں، اور یہ کسی بھی نجح کے لیے انتہائی تکلیف دہ موقع ہے کہ کورٹ میں، کٹھرے میں ایک استادِ مکرم ہو اور اس سے Trial کیا جائے۔ اب میں شرمندہ اپنی جگہ پر یا اللہ یہ کیا شروع ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، حضور جو بھی آپ کا قانون ہے، علم یا جیسے کیسے بھی آپ کا ضابط ہے، اس کے مطابق کریں، میں حاضر ہوں۔ تو انہوں نے کہا، ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ، اور نہایت دکھ کے ساتھ، اور گھرے الام کے ساتھ آپ کو ذبل جرمانہ کرتے ہیں۔ ذبیحہ روپیہ ہو گیا۔ اب جب میں اٹھ کے اس کری میں سے اس کٹھرے میں سے نکل کر شرمندہ، باہر نکلنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ وہ جو نجح، اس کا عملہ تھا، اس کے فتحی تھے وہ سارے جناب میرے پیچے پیچھے (A teacher in the court) جا رہے تھے کہ ہم احترامِ فائقہ کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ میں کہوں، میری جان چھوڑیں۔ یہ باہر نکل کر میرے ساتھ کیا کریں گے۔ آگے تک میری موڑ تک مجھے چھوڑ کے آئے۔ جب تک میں وہاں سے شارت نہیں ہو گیا، وہ عملہ وہاں پر ایسے ہی کھڑا تھا۔ اب میں لوٹ کے آیا تو میں سمجھایا اللہ میں بڑا معزز زادی ہوں، اور محلے والوں کو بھی آ کر بتایا کہ میں ایسے گیا تھا، اور وہاں پر یہ یہ ہوا۔ وہ بھی جناب، اور میری جو لینڈ لیڈی تھی، وہ بھی بڑی خوشی کے ساتھ محلے میں چوڑی ہو کے گھوم رہتی تھی کہ دیکھو ہمارا یہ تیپر گیا، اور کورٹ نے اتنی عزت کی۔ اس کی عزت افزائی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گا، دیسی آدمی

جو ہے نا وہ چاہے پھر بھی ہو، وہ گریڈ کا ضرور سوچے گا۔ کتنی بھی آپ عزت دے دیں، کتنا بھی احترام دے دیں، وہ پھر بھی ضرور سوچے گا کہ مجھے کہیں سے چار پیسے بھی ملیں گے کہ نہیں، میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا، تو اس نے کہا، نہیں تխواہ یہاں پر فیسر کی اتنی ہی ہے جتنی تمہارے پاکستان میں ہے۔ وہ کوئی مالی طور پر اتنے بڑے نہیں ہیں، لیکن عزت کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں۔ رتبہ ان کا بہت زیادہ ہے، اور کوئی شخص یہاں کوئی یورو کریٹ ہو، یہاں کوئی نج ہو۔ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ یہاں کا تاجر ہو، یہاں کا فیوڈل لارڈ ہو، وہ استاد کے رتبے کے پیچھے اسی طرح چلتا ہے، جیسے روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔ مالی طور پر وہ بھی بے چارے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے کہ مالی طور پر کمتر ہیں، لیکن رتبے کے اعتبار سے بہت اونچے ہیں جیسے ستر اط جو تھا، وہ اپنے کھنڈروں میں، اور فورم میں کھڑا ہو کے نگے پاؤں بات کرتا تھا، لیکن اس کا احترام تھا۔ وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا۔ میرا باس کہا کرتا تھا۔

You have changed your profession for a handfull silver

دیے سے دیا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں نیاز نیا ولایت سے آیا تھا، تو اس بات کی وہ سن سوار تھی کہ کسی سے ہمارے یہاں جسے Wisdom of the East کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں، تو اس سلسلے میں مجھے مختلف علاقوں میں، مختلف جگہوں پر، مختلف کونوں کھدروں میں جانا پڑا۔ خاص طور پر میں نے ایسے ڈیرے تلاش کیے جہاں بابے لوگ رہتے تھے، اور آپ نے یہ لفظ میرے منہ سے بارہا سنا ہو گا تو میں حضرت شاہ صاحب کے ڈیرے پر جاتا تھا، اور ان سے اس علم کے بارے میں جائز کاری حاصل کرنے کی کوششیں کرتا تھا جو علم کتاب میں موجود نہیں ہے، اور وہ میرے علم کے ساتھ بڑی بڑی طرح سے نکراتا تھا، کیونکہ میں ایک اور طرح سے تیار کیا گیا تھا علم کے معاملے میں۔ وہاں کا علم ایک اور طرح کا علم تھا لیکن مجھے اس میں دلچسپی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک خرابی تھی کہ جو میرے ساتھی، اور میرے عصر ادیب تھے، لکھنے والے تھے، اس بات کو بہت برا سمجھتے تھے کہ ہمارا ایک پڑھا لکھا آدمی سیانا بیانا نہیں دو رہے ہو کر آیا ہے، ولایت میں پڑھتا بھی رہا۔ یہ کس بے ہودہ کار و بار میں لگ گیا ہے اور ان کو بڑی تکلیف بھی ہوتی تھی، اور میرے خلاف بڑے کالم بھی لکھنے گئے۔ میری بیوی بہت ناراض ہوئی کہ آپ یہ کیا کام کرتے ہیں۔ تو میں جھپپ چھپا کے ڈرڈ رہ کے جاتا تھا۔

ایک دن میں شام کے وقت گیا اور ہم وہاں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے تو بابا جی میرے ساتھ کھڑے تھے۔ مولوی صاحب نماز پڑھا رہے تھے تو ایک آدمی روتا چیختا چلا تا ہوا آیا۔ کہنے لگا کہ جلدی چلو یونس کو تو مرض الموت ہو گیا، اور اس کا گھنگھرو نج رہا ہے، اور وہ مرنے کے قریب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ بابا جی کو بلا کر لاؤ۔ وہ میرے سرہانے بیٹھ کر سورہ یسین پڑھیں۔ اس وقت ہم نماز پڑھ رہے تھے۔ تو بابا جی نے مجھے کہنی مار کے کہا، جیسا نیت توڑ دو۔ نماز پڑھتے ہوئے نیت کیوں توڑی جائے؟ میں پہلے ان کی اس بات کو نہیں سمجھا، لیکن انہوں نے کہا، نیت توڑ دو۔ میں نے کہا، اچھا جی۔

میں چونکہ اندر رینگ تھا تو میں نے کہا جیسے یہ کہتے ہیں بھیک ہے۔ کہنے لگے، دیکھو اعلان ہو گیا ایک آدمی مشکل میں ہے۔ پہلے اس کی مشکل دور کی جانی چاہیے، پھر آ کر ہم نماز پڑھ لیں گے۔ بعد میں پڑھ لیں گے، کیونکہ نماز کی قضاۓ۔ خدمت کی قضاۓ نہیں۔ کوئی آدمی سائکل سے گرجائے، زخمی ہو جائے۔ آپ کہیں میں مغرب پڑھاؤں، پھر آ کر انتھا تھا ہوں۔ یہ بھیک نہیں۔ اب یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی، اور عجیب تھی۔ خیراٹھے، جس گھر جانا تھا گے۔ وہ بھی دیکھا۔ خیر وہ ایک لمبی کہانی ہے، میں آپ کو پھر کبھی سناؤں گا، اور وہ دلچسپ ہے۔ واپس اپنی جگہ پر ہم لوٹ کے آئے۔ رکشہ سے اترے تو میں نے رکشہ والے کو کچھ پیسے دیے۔ اس کے کوئی تین روپے اسی پیسے مبتے تھے۔ میں نے اس کو چار روپے دے دیئے۔ وہ یہ سمجھا کہ میں نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے تو بابا جی نے پوچھا، پت پیسے دے دیئے؟ میں نے کہا، دے دیئے۔ کہنے لگے کتنے دیئے؟ میں نے کہا چار روپے تو کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا، اس کے تین روپے پچاس پیسے یا اسی مبتے تھے میں نے اسے چار دے دیئے۔ انہوں نے کہا، نہیں پنج دے دینے سی۔ میں نے کہا، پانچ؟ مجھے بڑا دھوکا لگا کہ پانچ کیوں دے دوں۔ میں نے کہا، ”کیوں؟“ کہنے لگے تسلیں وی تاں دتے و چوں دینے سی، تسلیں کھڑے پلیوں دینے سی” (خدا کے دیئے ہوئے پیسوں میں سے دینے تھے کوئی سے اپنا جیب سے ادا کرنے تھے)۔ پھر اس نے مجھے تھوڑا سا ہلا کیا، لیکن میں نے اس کو سمجھا عقلی طور پر۔ اقتصادی طور پر۔ Emotionally میرے اندر نہیں اتری وہ بات لیکن اس کے بارے میں سوچتا رہا، غور کرتا رہا۔

اگلے دن ہمارے اک دوست بہت پیارے دوست ابن انشا، وہ کراچی سے آئے۔ وہ مجھے گھر ڈھونڈتے رہے پھر انہیں پتا چلا کہ میں اس وقت کہیں اور جگہ موجود نہیں ہوں۔ کسی لا ابھری میں نہیں۔ انہوں نے سوچا میں (اشفاق) ضرور ڈیرے پر گیا ہو گا۔ چنانچہ وہ اتنا ایک بڑا اڈنڈا لے کر، وہ بانس کا تھا، مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا ڈیرے پر آ گیا۔ اسے پتا تھا۔ اب اندر تو داخل نہیں ہوا، باہر کھڑا رہا۔ اس کو تکلیف بھی تھی، شرمندگی بھی کہ یہ آدمی کس جگہ پر آ کر بیٹھتا ہے۔ میں اندر بیٹھا رہا۔ میں ڈر اہوا تھا۔ اس نے کہا، باہر آؤ تم۔ خیر ڈرتا ہوا صاحب اس کے قریب پہنچا۔ اس نے کہا تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے، یہ زمانہ سائنس اور نیکنا لو جی کا ہے۔ تم کس فضول جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے ہو، اور کیا سکھتے ہو یہاں پر۔ میرے دو دوست تھے۔ ایک ابن انشا، اور ایک ان۔م۔ راشد۔ یہ سائنس اور نیکنا لو جی سے بہت مرعوب تھے، اور کہتے تھے، کمال ہی کر دیا ہے سائنس نے۔ میں O.N.U میں گیا۔ ان۔م۔ راشد کے دفتر میں۔ اوپر کی منزل سے کوئی بیالیسویں منزل تھی۔ جب نیچے اترے تو میرے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے تو جب ہم ایک ڈاکخانہ پر رکے، تو کہنے لگے، خیر آ گئے ہوتم گاؤں سے، نہ تمہارے پاس تعلیم ہے، نہ حسن ہے، نہ صحت ہے۔ تم لوگ کس طرح سے زندگی گزارتے ہو۔ تم

نے یہ ڈاکخانہ دیکھا ہے؟ میں نے کہا، جی دیکھا ہے۔ امریکا کا ڈاکخانہ ہے۔ واقعی بڑا خوب صورت ہے۔ کہنے لگے خوب صورتی کی بات نہیں ہے۔ یہ دیکھو تمہیں آواز آ رہی ہے۔ کر۔ کر ز۔ کر ز ز۔ اس میں سے آواز آ رہی تھی۔ پتا ہے یہ کیا ہوا ہے۔ یہ نکشوں کو مہریں لگ رہی ہیں، اور مشین خود بخود لگا رہی ہے۔ نہ کوئی آدمی ہے نہ کوئی بندہ ہے۔ نہ کوئی پرندہ ہے۔ یہ دیکھو وہاں پر لا کر پیکٹ رکھ دیتے ہیں۔ ٹرزاڑ۔۔۔ اسی طرح سے Sorting ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں نوٹ گنے کی مشین دکھاتا ہوں۔ میں نے کہا، راشد صاحب ان چیزوں سے اتنا متاثر نہ ہوا کریں۔ کہنے لگے، نہیں۔ تم گھامڑ لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں۔ تو یہ خیر مجھے پہچ میں یاد آ گیا، اللہ بخشے ہوئے پیارے آدمی تھے دونوں۔ تو اب انشاء کو غصہ تھا اس بات کا، تو وہ مجھے ہٹانا چاہتا تھا۔ باہر کھڑے اسی طرح سے بانس کا وہ باریک سا ڈنڈا لیے۔ کہنے لگے مجھے یہ بتاؤ یہاں کیا ہے، جو تمہیں کسی کتاب میں کسی لا جبریری میں نہیں ملتا۔ کوئی چیز ہے۔ میں نے کہا انشاء کچھ خاص نہیں، کچھ ایسی چیزیں مشاہدے سے گزرتی ہیں جو مختلف ہوتی ہیں۔ کہنے لگا، کیا۔ میں نے کہا، کل ہم گئے تھے۔ اس طرح سے رکشہ کا کرایہ دیا۔ اس رکشہ میں سے اترے۔ اس طرح سے میں نے پیے دیئے۔ اس طرح سے بابا جی نے کہا، تو نے پانچ ہی دے دینے تھے، تو کیا تھا۔ تو نے ”دئے سے دینا ہے۔ تو نے کون سا پلے سے دینا ہے۔“ تو انشا خاموش ہو گیا یہ سن کے۔ اب وہ شاعر آدمی تھا۔ اس کی روح بہت پیاری تھی۔ وہ یہ تو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ بڑی اچھی بات ہے، لیکن اس نے سن لی، ختم ہو گیا یہ میں۔

اس کے کوئی دو میئنے بعد میں کراچی گیا تو انشا جی کے دفتر ملنے پہنچا۔ انشا بیٹھا کام کر رہا ہے، ہم گپ لگا رہے ہیں۔ ادھر کی باتیں ادھر کی باتیں، بہت خوش۔ ایک لڑکی آئی۔ اس کی صحبت بہت خراب تھی، اس کی آنکھوں میں یقان اتنا نمایاں تھا کہ جیسے رنگ بھرا ہو پیلا۔ اس نے چھپانے کے لیے اپنی آنکھوں میں سرمے کی بہت موٹی تہہ لگا رکھی تھی تو کالا برقع اس نے پہنا ہوا، آ کر کھڑی ہو گئی انشاء جی کے سامنے۔ اس نے ایک خط ان کو دیا وہ خط لے کر رو نے لگا۔ پڑھ کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر میز پر رکھا، پھر دراز کھولا۔ کہنے لگے بی بی میرے پاس اس وقت یہ تین سورو پے ہی ہیں۔ یہ تو تم لے لو، پھر بعد میں بات کریں گے۔ کہنے لگی، بڑی مہربانی۔ وہ پچھلی سی ہو گئی بیچاری، اور ڈری گئی، گھبرا سی گئی۔ اس نے کہا، بڑی مہربانی دے دیں۔ وہ لے کر چلی گئی۔

جب چلی گئی تو میں نے انشا سے کہا، انشاء یہ کون تھی۔ کہنے لگا پتا نہیں۔ میں نے کہا، اور تمہے سے پیسے لینے آئی تھی۔ تو نے تین سورو پے دے دیئے تو اس کو جانتا نہیں۔ کہنے لگا، نہیں میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ یہ خط ہے۔ اس میں لکھا تھا۔ محترم انشا صاحب میں آپ کے کالم بڑے شوق سے پڑھتی ہوں، اور ان سے بہت خوش ہوتی ہوں، اور میں یہاں پر لیاری میں ایک پر ائمہ کوکل میں ٹھپر ہوں،

اور میری 130 روپے تجوہ ہے۔ میں اور میرا بابا ایک کھولی میں رہتے ہیں، جس کا کرایہ ایک سو سانچھے روپے ہو گیا ہے، اور تم وہ اونٹیں کر سکتے، اور آج وہ بندہ سامان انھا کے باہر پھینک رہا ہے۔ اگر آپ مجھے 160 روپے دے دیں تو میں آہستہ آہستہ کر کے 10-10 روپے کر کے اتار دوں گی۔ میں کراچی میں کسی اور کوئی نہیں جانتی سوائے آپ کے، وہ بھی کالم کی وجہ سے۔ میں نے کہا، اونے بے وقوف آدمی اس نے تجوہ سے ایک سو سانچھے روپے مانگے تھے تو نے تم سودے دیئے۔ کہنے لگا، میں نے بھی تو ”تو“ میں سے دیا ہے، میں نے کون سا پلے سے دیا ہے، اس کو بات کی سمجھا آگئی تھی۔ یہ نصیبوں کی بات ہے یعنی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں جو بڑے دھیان سے جاتا تھا، ذکریشن لیتا تھا، کوششیں کرتا تھا جانے کی۔ میں نے کہا، اونے یہ فقرہ تو میں نے کہیں سنا ہوا ہے۔ کہنے لگا، میں نے کچھ کالم لکھے تھے یہ ان کا معاف وضہ تھا۔ یہ تم سو روپے میرے پاس ایسے ہی پڑے تھے۔ میں نے دے دیئے۔

تو کوئی آٹھ مینے کے بعد میری پھر اس سے ملاقات ہوئی۔ لاہور آیا تو کہنے لگا، وہ جو فلسفہ تیرے بابا کا ہے، بڑا خوفناک ہے، اور بہت بڑا ہے۔ اس میں سے تو آدمی باہر نہیں نکل سکتا۔ میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا، میں نے اس لڑکی کو تین سوروپے دیئے تھے تو میری جان عذاب میں پڑ گئی میں نو کیوں ایک مینگ انینڈ کرنے گیا تھا۔ وہاں مجھے یونیکو سے خط آیا۔ تمہارے ایک ہزار ڈالر ہمارے پاس پڑے ہیں، وہ بتائیں، ہم آپ کو کہاں پہنچیں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا، میں چونکہ سرکاری ملازم ہوں، اور سرکاری حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس لیے میری گورنمنٹ نے مجھے سارا A.T.D.A دے دیا تھا۔ انہوں نے کہا اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہماری طرف سے ہے جو سارے Participants کو تھے میں دی ہوئی رقم ہے، تو میں نے فوراً خط لکھا کہ خبردار اس کو ہاتھ نہ لگانا، وہیں رکھنا۔ اس زمانے میں یہی حالات تھے، ڈالر کے، جو آج کل چل رہے ہیں۔ میں دہاں آ کر لے لوں گا۔ اس کی یہ کیفیت ہوئی، اس ایک سال کے اندر اندر یورش ہو گئی پیسوں کی۔ ایسی جگہ سے آنے شروع ہو گئے کہ اس نے سوچا تک نہیں تھا۔ دو سال اس کی یہ کیفیت رہی۔ پھر وہ وہی ڈنڈا لے کر میرے گھر آیا۔ لڑائی کرنے کے تو نے مجھے یہ بڑی لعنتی بات بتادی ہے۔ میں اتنا تک آ گیا ہوں، اس سے اتنے پیسے میرے پاس آنے لگے ہیں کہ میں بھرتا نہیں ہوں۔ اب میں نے دینے بند کر دیئے ہیں۔ خدا نہ کرے، میرے سامنے کوئی ترپ کر مر جائے۔ میں کچھ نہیں دیتا یہ تو عذاب ہے، دیتے جاؤ تو آتے جاتے ہیں۔ دیتے جاؤ تو آتے جاتے ہیں۔ What is this میں نے کہا، اس کا علم تو مجھے بھی نہیں۔ میں تو ابھی پوچھ رہا ہوں، اور یکھر رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ تو میں نے یہ بات زندگی میں عجیب و غریب دیکھی کہ اگر آپ دیتے ہیں تو وہ لوٹ کر آپ کے پاس آتا ہے۔ یہ صدائے بازگشت ہے جو کہ لوٹ کرو اپس آتی ہے۔ آدمی سوچتا ہے۔ یہ 70 روپے تھے۔ اس میں سے میں نے 30 روپے

دے دیئے تو میں نے ابھی تھیس لکھنا ہے۔ Ph.D کرنی ہے تو بعد میں خرچ کرنے ہوں گے۔ کہاں سے آئیں گے۔ حالانکہ یہ بات اس طرح نہیں ہے۔ اب اللہ میاں کا عجیب و غریب System ہے۔ وہ یہ کہ جو کچھ آپ دیتے رہتے ہیں، وہ کچھ آپ کا جمع رہتا ہے، اور اللہ میاں وہ رجسٹر کبھی نہیں دیکھتا۔ وہ دوسرا مجرم مانگتا ہے جس میں سے آپ چھوڑ آئے ہوتے ہیں، اور چیچھے رہ گیا ہوتا ہے۔

مجھے یاد آ گیا، حضرت مجدد الف ثانی۔ وہ بہت سخت اصولی بزرگ تھے، لیکن ایک بات میں ان کی کبھی نہیں بھولتا۔ انہوں نے فرمایا، جو شخص تجھ سے مانگتا ہے، اس کو دے۔ کیا یہ تیری انا کے لیے کم ہے کہ کسی نے اپنا دست سوال تیرے آگے دراز کیا۔ بڑے آدمی کی کیا بات ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی ہے، اور وہی سرچشمہ ہے پھر فرماتے ہیں، اور عجیب و غریب انہوں نے یہ بات کی ہے کہ جو حق دار ہے، اس کو بھی دے، اور جو ناحق کام اٹانے والا ہے، اس کو بھی دے، تاکہ تجھے جو ناحق کامل رہا ہے، کہیں وہ ملنا بندہ ہو جائے۔ دیکھیں نا، ہم کو کیا نا حق کامل رہا ہے۔ اس کی ساری مہربانیاں ہیں، کرم ہے اور ہمیں اس کا شعور نہیں ہے کہ ہمیں کہاں کہاں نا حق مل رہا ہے۔ کبھی آپ آرام سے بیٹھ کر اپنی زندگی کو اپنے کام کو اپنے آپ کو ہیلنگ شیٹ بنانے کی کوشش کریں، تو آپ کو پتا چلے گا 90-80 فیصد تو ایسے ہی آ رہا ہے۔ یہ میرا استحقاق نہیں بتا، لوگ ایسے ہی رو تے ہیں کہ میرا حق، اور میں اپنے حق کی خاطر لڑوں گا، اور مروں گا۔ یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔ ایسا کبھی ہوتا نہیں بعض اوقات ایسی جگہ سے آ جاتا ہے جہاں آدمی تصور نہیں کر سکتا بلکہ یہ شتر ایسے ہوتا ہے، اور آتا چلا جاتا ہے، لیکن آدمی گھبرا تا ہے کہ اگر میں کچھ دے دوں گا اور دتے میں سے دے دوں گا، کمی ہو جائے گی، ہوتی نہیں، لیکن وہ ہمارے جیسے پڑھے لکھے لوگ سیانے اس قسم کی بات کرتے ہیں۔

ایک ہمارے ماذل ٹاؤن میں قلعی گرتا تھا، بہت اچھا، امیر دین قلعی گر ہمارا بہت پیارا تھا۔ بھائیوں وغیرہ قلعی کرتا تھا۔ فوت ہو گیا تو مولوی صاحب نے مسجد میں اعلان کیا کہ امیر علی فوت ہو گیا ہے اس کی دعا کروانی ہے مغرب کے بعد علاقے کے سب لوگ بلاک میں اکٹھے ہوں، تو ہم ابھی کچھ پڑھ ہی رہے تھے کہ ایک لڑکا آ گیا، اور اس نے آ کر کہا، جی میرا والد تو بہت بیمار ہے۔ اس نے امیر علی قلعی گر کے لیے دعا بھیجی ہے۔ تو ہم نے کہا، دعا بھیجی کیا ہوتا ہے۔ دعا تو آدمی آ کر کرتا ہے۔ اس نے کہا میرا والد، اس کا بڑا یار تھا، دونوں بہت پکے دوست تھے۔ اس کو درد ہے، شیائیکا پین (Sciatica) میرا والد، اس کا بڑا یار تھا، دونوں بہت پکے دوست تھے۔ اس کو درد ہے، شیائیکا پین (Pain) وہ چل پھر نہیں سکتا۔ میں اس کی دعا لے کر آیا ہوں۔ تو ہم نے کہا، دعا کیا لے کر آیا ہے، ہم لوگ گٹھلیاں وغیرہ پڑھ رہے تھے، اٹھ کے ایک آدمی نے باہر دیکھا تو اڑ کاڑ ریکٹر لے کر آیا تھا، چیچھے ٹرالا تھا اور اس کے باپ نے دو بوری گندم، آٹا، ایک بوری چاول، گڑ کا پورا ایک گٹھا، اور اس قسم کی چیزیں تھیں۔ کبھی اس قسم کی باتیں سوچنے کا دینے کا، بھینے کا، یعنی درویش کا یہ طریقہ ہوتا ہے۔

میری بہو ہے، بڑی اچھی پیاری نیک۔ اُس کو خیال آیا کہ کچھ خیرات کرنی چاہیے، لیکن اس کو طریقہ نہیں آتا، یہ بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اب کیا کریں خیر وہ اپنا پرس لے کر، اور اس میں کچھ پسیے ڈال کر چلی گئی۔ جھگیوں میں کواڑز میں۔ وہاں جا کر کھڑی ہو گئی تو ایک بی بی آئی اس کے پاس۔ اس نے کہا، ”کڑیے کس طرح آئی ایں“ (لڑکی کس کام کو آئی ہو)۔ اس نے کہا، میں آئی ہوں، آپ لوگوں سے ملنے تو میں کچھ آپ لوگوں کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ تو اس نے کہا، تو اندازی معلوم ہوتی ہے۔ کہنے لگی، ہاں جی۔ کہنے لگی، ”مٹھر جا میں تیری مدد کرنی آں“ (میں تمہاری مدد کرتی ہوں)۔ تو وہ جھگیوں میں سے ایک کری کھینچ کر لے آئی۔ کہنے لگی ”اس پر بیٹھ جا۔ سانوں پنج چار حد یہاں سنا۔ دس بارہ نیک گلاں سنا۔ سانوں اچھے رہن دی تعلیم دے تے اک اک روپیا پھر اجا ساریاں نوں“ (آپ اس پر بیٹھ جائیں، ہمیں چار پانچ احادیث سنائیں۔ دس بارہ اچھی اچھی نیکی کی باتیں سنائیں اچھے رہن کہن کی تعلیم دیں اور سب کو ایک ایک روپیہ دے دیں)۔ تو اصل میں یوں بی بی آئی ہوگی، اور ساری بیباں ایسی آتی ہیں۔ نیکی بھی سکھاتی ہیں، یہ ان کا کریکٹر ہے۔ اس طرح سے بھی ہوتا ہے کہ آدمی داد ددھ میں اپنا آپ بھی پروجیکٹ کرتا ہے۔

ہم جو اپنے آبا و اجداد سے، بزرگوں سے، اپنے بڑوں سے سنتے آئے، کتابوں میں بھی بھی بھی پڑھنے کو مل جاتا تھا۔ ہم اپنی اس ثقافت کو کہیں رکھ کے بھول گئے ہیں، یا ہم نے دانستہ ان سے نظر بچالی ہے، ہٹالی ہے، کسی نئی ترقی کی جانب۔

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ہم رکھ کے بھول نہیں ہیں، اور نہ ہی دانستہ نظر بچالی، ہماری مصروفیت کا عالم کچھ اس طرح سے ہو گیا ہے کہ آپ اپنے آپ کو گروئی رکھ چکے ہیں۔ ہر طرح کی مصروفیات کے ہاتھوں ضروری بھی غیر ضروری بھی۔ آپ چانچتے، اور آنکنے بیٹھے ہوں گے تو آپ دیکھیں گے کہ غیر ضروری مصروفیات ضروری مصروفیات سے کہیں زیادہ ہیں۔ میرا پوتا ہے اس کو ہم نے سکول ابھی داخل کرواایا ہے۔ ابھی سے مراد چھٹیوں سے چار پانچ میں پہلے۔ تو اسے کاغذ تختی دغیرہ سب کچھ لے کر دے دیا، وہ سکول جاتا رہا، آتا رہا۔ تو ایک دن اس کے والد کہنے لگے، یا رجھے سکول میں داخل کرواایا ہے تو کبھی پڑھتا نہیں۔ کہنے لگا کیا کروں، ڈیڈی نائم ہی نہیں ملتا، نائم نہیں ملتا، ڈیڈی کیا کروں؟

حاضرین میں موجود ایک صاحب بولتے ہیں: آپ کی خیرات سے مجھے اپنی دادی کا واقعہ یاد آیا۔ وہ بچپن میں ہمیں کہا کرتی تھیں کہ مٹھی کو آپ جتنا کس کے بند کریں اس میں اتنی چیز کم آتی ہے۔ اگر مٹھی ڈھیلی بند کریں گے تو اس میں زیادہ آئے گا تو خیرات دینے کا یہی ہے کہ ہم جتنا اپنا پیسا کس کے رکھتے جائیں گے۔ اللہ میاں اس میں اتنی کمی کرے گا۔

یہی تو آذر کھہ رہے ہیں۔ یہ جو چیزیں تھیں، ہماری قسمت سے نکلی جا رہی ہیں۔ (حاضرین میں موجود ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے)

دیکھیں ناخان صاحب نے بات شروع کی، اس وقت کچھ ذکر آیا تو انہوں نے اپنی تعلیم کا حوالہ دیا پھر یہاں کے باہوں کی بات کی، جو ان پڑھ لوگ ہوتے تھے، خان صاحب آپ اجازت دیں تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ ایک کچھ لوگ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ پڑھا لکھا ہو، لیکن وہ جو ہمارے بزرگ ہوتے تھے، بڑے لوگ ہوتے تھے، بابے ہوتے تھے، یہ پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے۔ ان کا مشاہدہ ہر چیز کو جانچنے کا، ان کا طریقہ، گھرائی میں جانا، اور پھر تجزیہ کرنا اپنے طور پر، اور وہ تجزیہ سو فیصد درست ہوتا۔

آپ کے بھی نواسے پوتے انہی کے ہیں۔ نسل چلی آرہی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، ایک سوال میرے ذہن میں آگیا۔ میں نے آپ سے اتنی باتیں کیں تو آپ بھی میری مدد کریں کہ انسان جس شخص پر تنقید کرتا ہے، اور جس میں کیڑے نکالتا ہے، اور جس کو بہت برا سمجھنے لگتا ہے، کیا خود اس جیسا ہونا چاہتا ہے یا آپ کے مشاہدے میں آیا ہے کہ اس کے جیسا ہو جایا کرتا ہے۔ ہاں ہے تو یہی اگر آپ نگاہ ڈالیں اور دیکھیں۔ آپ کا کوئی سیاستدان ہے جو آپ کی وزارت داخلہ پر تنقید کر رہا ہے۔ پھر آپ دیکھتے ہو کہ پلٹ کر خود وہ ہوم منٹری میں آ جاتا ہے، ہے نبات۔ میں نے یہ سوال آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ مجھے یہ دقت ہو رہی تھی مگر ارڈر دیکھتا ہوں کہ غریب امیر آدمیوں پر بڑی تنقید کرتا ہے۔ لیکن ہم ان کو کوئی مارکسزم وغیرہ لَا کے دیں کہ اس میں تمہاری بڑی بہتری ہو گی تو وہ اسے فیل کر دیتے ہیں۔ وہ خود چاہ رہے ہوتے ہیں۔ خود موقع ملے تو ہم بھی امیر ہو جائیں۔

(انسان کی فطرت میں لاشعور میں ہے تا، وہ اک بات جو اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ بنیادی طور پر تنقید کی ایک وجہ، یہ بھی ہے۔ انسان کے لاشعور میں ایک بات ہوتی ہے۔ کوئی Aim ہوتا ہے، Goal ہوتا ہے۔ اس کو نہیں حاصل کر سکتا تو جو اس کو حاصل کر چکا ہوتا ہے، اس پر وہ تنقید کرتا ہے)۔ مثلاً لڑکیاں دیکھیں کسی دوسری لڑکی کو دیکھ کر کہتی ہیں۔ کیا شکل اس کی کوچھ سی لگتی ہے۔ اکثر لڑکیاں تو یہ کہتی ہیں۔ اس کے کان چھوٹے ہیں وغیرہ، رنگ نہیں گوار لیکن فرض کریں کہ وہ اچھی نہیں ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ وہ تنقید کر رہی ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہ رہا ہوتا ہے کہ جو جو کچھ خوبیاں بیان کر رہی ہوں میں ویسی بن جاؤں، اور اس میں اس کو کچھ کچھ خوبیاں محسوس ہوتی بھی ہیں۔ ہمارے گھروں میں رشتہ وغیرہ کے لیے جاتے ہیں جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیا دیکھ کے آئی ہیں۔ جواب ملتا ہے، اگر ملا جلا کر دیکھیں تو خوب صورت لگتی ہے۔ اک اک چیز تو کچھ بھی نہیں تھی۔ لا حول ولا قوۃ یہ کیا بات

کرتی ہیں۔ نہیں نقش، تو مجھیک تھی۔ یہ جو Cosmatics کی اتنی بڑی انڈسٹری ہے جو کہ سٹائل بعد دنیا میں دوسری بڑی انڈسٹری ہے، تو شاید اس خوف سے تو نہیں پیدا ہوئی کہ دیکھو میں تنقید کرتی ہوں یا کرتا ہوں اور پھر اس کے بعد مجھ میں یہ چیز پیدا ہو جائے تو میں ذاتی طور پر ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنقید کر رہا ہوتا ہے، وہ آرزو مند اس بات کا ضرور ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں فرمائے۔ آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ مہربانی۔ اللہ حافظ۔

بابا کی تعریف

ہم زاویہ کے بیشتر پروگراموں میں بابوں کی بات کرتے ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ بابوں کی Definition سے یا ان کی تعریف سے یا ہدایتِ ترکیبی سے آپ یقیناً بہت اچھی طرح واقف ہوں گے، لیکن میرا یہ اندازہ بالکل صحیح نہیں تھا۔ اب میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں، اور اس کی ایک چھوٹی سی تعریف بھی کروں، بابا کی۔

بابا وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے انسان کو آسانی عطا کرے۔ یہ اس کی تعریف ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ بابا ایک بھاری فقیر ہے۔ اس نے سبز رنگ کا کرتا پہنا ہوا ہے۔ گلے میں منکوں کی مala ہے۔ ہاتھ میں اس کے لوگوں کو سزا دینے کا تازیانہ پکڑا ہوا ہے، اور آنکھوں میں سرخ رنگ کا سرمدہ ڈالا ہوا ہے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ ایک تحری پیس سوت پہنے ہوئے اعلیٰ درجے کی سرخ رنگ کی ٹالی لگائی ہے۔ نیچے میں سونے کا پن لگائے ہوئے ایک بہت اعلیٰ درجے کا بابا ہوتا ہے۔ اس میں جس کی بھی قید نہیں ہے۔ مرد، عورت، بچہ، بوزھا، اور ہیڑنو جوان یہ سب لوگ کبھی نہ کبھی اپنے وقت میں باہے ہوتے ہیں، اور ہو گزرتے ہیں۔ لمحاتی طور پر ایک دفعہ کچھ آسانی عطا کرنے کا کام کیا۔ اور کچھ مستقل انتخاب کر لیتے ہیں اس شیوے کو۔ اور ہم ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ میری زندگی میں بابے آئے ہیں اور میں حیران ہوتا تھا کہ یہ لوگوں کو آسانی عطا کرنے کافی کس خوبی سے کس سلیقے سے جانتے ہیں۔ میری یہ حرست ہی رہی۔ میں اس عمر کو پہنچ گیا۔ میں اپنی طرف سے کسی کو نہ آسانی عطا کر سکا نہ دے سکا اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ نہ ہی آئندہ کبھی اس کی توقع ہے۔

جب ہم تحریڈ ایئر میں تھے تو کرپال سنگھ ہمارا ساتھی تھا۔ ہم اس کو کرپال سنگھ کہتے تھے۔ یجاڑہ ایسا ہی آدمی تھا جیسے ایک پنجابی فوک گانے والا سکھ ہوتا ہے۔ لال رنگ کا لباس پہن کے بہت ٹیڑھا ہو کے گایا کرتا ہے۔ ایک روز ہم لاہور کے بازار انارکلی میں جا رہے تھے تو سیشنزی کی دکانوں کے آگے ایک فقیر تھا۔ اس نے کہا بابا اللہ کے نام پر کچھ دے تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ پھر اس نے کرپال سنگھ کو

مخاطب کر کے کہا کہ اے بابا سائیں کچھ دے۔ تو کہنے لگا کہ بھاجی اس وقت کچھ ہے نہیں، اور اس کے پاس واقعی نہیں تھا۔ تو فقیر نے بجائے اس سے کچھ لینے کے بھاگ کے اس کو اپنے بازوں میں لے لیا اور گھٹ کے جھٹی (معافانہ) ڈال لی۔ کہنے لگا، ساری دنیا کے خزانے مجھ کو دے دیئے، سب کچھ تو نے لئا دیا۔ تیرے پاس سب کچھ ہے۔ تو نے مجھے بھاجی کہہ دیا۔ میں ترسا ہوا تھا اس لفظ سے۔ مجھے آج تک کسی نے بھاجی نہیں کہا۔ اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

ان دنوں ہم سارے ہوٹل کے لڑکے چوری چھپے سینما دیکھنے جاتے تھے۔ تو لاہور بھائی کے باہر ایک تھیڑ تھا اس میں فلمیں لگتی تھیں۔ میں اروندہ، غلام مصطفیٰ، کرپال یہ سب۔ ہم گئے سینما دیکھنے رات کو اونٹے تو انارکلی میں بڑی تجربت سردی تھی، یعنی وہ کرس کے قریب کے ایام تھے سردی بہت تھی۔ سردی کے اس عالم میں کہرا بھی چھایا ہوا تھا۔ ایک دکان کے تختے پر بھٹا جو ہوتا ہے، ایک دردناک آواز آرہی تھی ایک بڑھیا کی۔ وہ رورہی تھی اور کراہ رہی تھی، اور بار بار یہ کہے جا رہی تھی کہ ارے میری بھوٹھے بھگوان سمیئے تو مر جائے نی، مجھے ڈال گئی، وہ بھو اور بیٹا اس کو گھر سے نکال کے ایک دکان کے پھٹے پر چھوڑ گئے تھے۔ وہ دکان تھی جگت سنگھ کو اتر اکی جو بعد میں بہت معروف ہوئے۔ ان کی ایک عزیز و کھنگی امر تا پر یتم، جو بہت اچھی شاعرہ بنی۔ وہ خیر اس کو اس دکان پر پھینک گئے تھے۔ وہاں پر وہ لیشی چیخ و پکار کر رہی تھی۔ ہم سب نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی کہ دیکھو کتنا ظالم سماج ہے، کتنے ظالم لوگ ہیں۔ اس غریب بڑھیا بیچاری کو یہاں سردی میں ڈال گئے۔ اس کا آخری وقت ہے، اور بیٹا بھی کتنا ظالم تھا، اس کی بھوٹھی دیکھیں کتنی ظالم تھی کہ اٹھا کے اس کو ڈال گئے۔ یہ کیا نیا طریقہ ہے۔ وہاں اروندہ نے بڑی تقریر کی کہ جب تک انگریز ہمارے اوپر حکمران رہے گا، اور ملک کو سوراج نہیں ملے گا ایسے غریبوں کی ایسی حالت رہے گی۔ پھر وہ کہتے حکومت کو کچھ کرنا چاہیے۔ پھر کہتے ہیں۔ انا تھے آشرم (کفالات خانے، مقیم خانے) جو ہیں وہ کچھ نہیں کرتے۔ ہم یہاں کیا کریں۔ تو وہ کرپال سنگھ وہاں سے غائب ہو گیا۔ ہم نے کہا، پیچھے رہ گیا یا پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔ تو ابھی ہم تقریریں کر رہے تھے۔ اس بڑھیا کے پاس کھڑے ہو کے کہ وہ بائیسکل کے اوپر آیا بائیسکل پسینہ پسینہ سردیوں میں، فقہوا، سانس اور پریخے لیتا آگیا۔ اس کے ہوٹل کے کرے میں چار پائی کے آگے ایک پرانا کمبل ہوتا تھا جو اس کے والد بھی گھوڑے پر دیا کرتے ہوں گے۔ وہ ساہیوال کے بیدی تھے، تو وہ بچھا کے نا اس کے اوپر بیٹھ کر پڑھتے وڑھتے تھے۔ بد بودار گھوڑے کا کمبل جسے وہ اپنی چار پائی سے کھینچ کر لے آیا بائیسکل پر، اور لا کر اس نے بڑھیا کے اوپر ڈال دیا، اور وہ اس کو دعا میں دیتی رہی۔ اس کو نہیں آتا تھا وہ طریقہ کہ کس طرح تقریر کی جاتی ہے۔ فنِ تقریر سے ناواقف تھا۔ بابا نور والے کہا کرتے تھے انسان کا کام ہے دوسرا کو آسانی دینا۔ آپ کا کوئی دوست تھا نے پہنچ، اور وہ تھا نے سے آپ کو نیلی فون

کرے کہ میں تھا نے میں آگیا ہوں تو کبھی یہ مت پوچھو کر کیا ہوا، کس طرح ہوا، کیسے پہنچے۔ یہ پوچھو کون سے تھا نے میں ہو۔ بس یہ آسانی عطا کرنے کا طریقہ ہے، اور یہ فن ہم نے سیکھا نہیں تھا۔ ہمارے کوئی میں، کتاب میں اس قسم کی چیزیں ہی نہیں تھیں تو میرے ایک بھائی ہیں۔ میرے تیازاد میری عمر کے۔ تو وہ مجھ سے تھوڑے دن ہوئے خفا ہوئے۔ اس نے کہا، یہ تم نے کیا پروگرام شروع کیا ہے۔ دنیا ترقی کر رہی ہے، زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اور تم پہنچے مرد کے بابوں کی طرف لیے جا رہے ہو۔ جب آدمی ترقی کا مطلب لیتا ہے تو وہ بہانہ، اور سہارا دوسروں کا لیتا ہے۔ اپنی زندگی بنانے کا صرف اکیلا خواہش مند ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اس میں کسی اخلاق یا مورثی کی ضرورت نہیں، تھوڑا وانسان کو۔ اب تم کوئی ایسا کام کرو جو نیکنا لو جی کے ساتھ تعلق رکھتا ہو، اور علم عطا کرو، اور ان کو بتاؤ۔ تو جب وہ مجھ سے بات کر رہے تھے، مجھے اپنے بابا جی کا زمانہ یاد آ رہا تھا کہ یہاں پر بھی میں ایک میلہ ہوتا ہے۔ سالانہ مویشیوں کا میلہ وہ ہمارے پاکستان میں بہت مشہور ہے۔ میلہ، بہت اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے وہاں کے کچھ لوگوں نے مجھے خط لکھا، بڑی محبت کے ساتھ کہ ہمارا بھی آپ کے اوپر کوئی حق ہے، تو آپ بھی اشفاق صاحب یہاں پر تشریف لا میں۔ تو میں نے ساتھا کہ بھی میں بہت گرمی ہوتی ہے، اور میں کیا کروں گا جا کر۔ میں کچھ نال جاتا تھا۔ خط تقریباً چار سال تک آتا رہا۔ پھر مجھے بہت شرمندگی ہوئی، اور ضمیر نے ملامت کی۔ بھی ایسی کوئی مصیبت ہے آپ نہیں جاسکتے میں نے کہا، میں تیار ہوں جانے کے لیے۔ میں نے ارادہ باندھا تو میں نے قادری بابا سے جا کر پوچھا۔ اجازت لینے کے لیے۔ ہم زور لگا کے یہ رسم سیکھ رہے تھے، ورنہ کون اجازت لیتا ہے۔ میں نے کہا، سرکار وہ مجھے بھی جانا ہے۔ کہنے لگے بہت خوشی کی بات ہے۔ بڑی اچھی بات ہے، ضرور جاؤ۔ میں نے کہا، جی وہاں کے لوگوں نے بلایا ہے۔ کہنے لگے نہیں اس میں تو پوچھنے کی بات ہی کوئی نہیں، اور تم جانا، اور ضرور جانا۔ میں نے کہا، جی آپ کی طرف سے اجازت ہے۔ کہنے لگے ضرور ہاں بالکل اجازت ہے۔ میں بلکہ بہت خوش ہوں۔ تو میں ان سے اجازت لے کر چلا۔ ابھی میں ذیرے سے دروازے تک نہیں پہنچا، باہر جھاڑ جھنکار کی جسے کہتے ہیں تا ایک بارگی ہوئی تھی، وہاں سے مجھے آواز دے کر پھر بلایا۔ کہنے لگے بیٹا بات سنو، جب میں لوٹ کے آیا تو مجھے ہے کہنے لگے، بھی جا رہے ہو، بڑی خوشی کی بات ہے۔ وہاں جا کر لوگوں کو اپنا علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا، ان کو محبت دینا۔ میں نے کہا، سر محبت تو ہمارے پاس گھر میں دینے جوگی بھی نہیں، وہ کہاں سے دوں۔ میرے پاس تو علم ہی علم ہے۔ کہنے لگے نہ انہیں علم نہ دینا۔ انہوں نے محبت سے بلا یا ہے، محبت سے جانا اگر ہے تو لے کر جانا، لیکن ہم تو ظاہر علم سکھاتے ہیں کہ اتنا اوپنچار و شدن دا ان رکھو، مویشی کو اندر مت باندھو، ناک سے سانس لو، منہ سے ایک سیل کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ محبت! میں نے کہا، جی یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میں کیسے یہ کر سکوں گا۔ میں گیا کوششیں بھی کیں، لیکن

بالکل ناکام اوتا، کیونکہ علم عطا کرنا، اور تھیجیں کرنا بہت آسان ہے، اور محبت دینا برا مشکل کام ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بابے وہ ہوتے ہیں جن میں تھیجیں نہیں ہوتی۔ اگر آپ زندگی میں کبھی کسی شخص کو آسانی عطا کر رہے ہیں تو آپ بابے ہیں۔ اگر آسانی نہیں عطا کر رہے تو پھر آپ اپنی ذات کے ہیں۔ ان بابوں کی بات کیا کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ اس میں جنس کی بھی تھیجیں نہیں ہوتی، قید نہیں ہوتی، عمر کی، Age کی۔ میری چھوٹی پوچی نے اس دفعہ گرمیوں کی تھیجیوں میں ایک عجیب و غریب بات کی جو میں تو نہیں کر سکا، اس نے سکول کی تھر ماں لے کے اس میں سلیخین بنائی۔ بہت اچھی سختی، اور برف ڈالی، اور اس کو جہاں ہمارا یعنی بس لگا ہے، درخت کے ساتھ ہے، اس درخت کی کھوہ میں رکھ دیا۔ اور ایک خط لکھ کے پن کر دیا اس کے ساتھ۔ اس نے لکھا، انکل پوسٹ میں۔ آپ گرمی میں خط دینے آتے ہیں، تو آپ بایک کل چلاتے ہو، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے لیے یہ سلیخین بنائی ہے۔ یہ آپ پی لیں۔ میں آپ کی بڑی شکر گزار ہوں گی۔ ہاں جی تو دو پھر کو تم روز زبردستی سلاادیتے تھے بچوں کو۔ شام کو جب جاگی تو وہ لے آئی، تھر ماں دیکھا تو وہ خط تھا اس کا۔ اس کے اوپر ہر کارے نے جو خاص کان میں رکھتے ہیں بال پوائنٹ، ان کا خاص انداز ہوتا ہے، تو اس نے لکھا تھا، پیاری بیٹی تیرا بہت شکریہ۔ میں نے سلیخین کے دو گلاں پیئے، اور اب میری رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ میں ایک پیڈل مارتا ہوں تو دو کوٹھیاں آسانی سے گزر جاتا ہوں، تو جیتی رہ۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔ کل جو بنائے گی، اس میں چینی کے دوچھ زیادہ ڈال دینا۔ یہ اس کی محبت ہے نا۔ یہ بچی جو ہے چھوٹی سی خواتین و حضرات اس نے بیبا کی طرح آسانی دی تھی۔ اس نے ایک Relatedness ایک تعلق محسوس کیا اس سے۔ اسی طرح سے میں کہا کرتا ہوں کہ ہماری زندگیوں میں ہمارے اس جلتے ہوئے ماحول میں تکلیفوں بھرے ماحول میں آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ دفاتر، سرکاری دفاتر سے یورو کریسی سے کوئی خیر نہیں پڑتی۔ لوگ بہت دکھی رہتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارا ایک ملکہ ایسا ہے جو خیر بانٹتا ہے، اور میں اس سے بہت خوش ہوں۔ وہ ڈاک کا ملکہ ہے یعنی آپ بڑی آسانی کے ساتھ اپنی چیز لے جائیں، اور ٹھپا لگا کر آپ کو سید دیتا ہے میں دعا کرتا ہوں۔ آپ یقین کریں میں بچی بات عرض کرتا ہوں کہ جس طرح سے لوگ کسی درگاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے سلام کرتے ہیں، میں جب بچی کسی ڈاک خانے کے پاس سے گزرتا ہوں، چاہے میں گاڑی میں جا رہا ہوں میں انہیں سلام ضرور کرتا ہوں کہ میں آپ کی، اور کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ اب آپ کہنے والے ہوں گے۔ جناب یہ منی آرڈر چوری کر لیا تھا، انہوں نے اخبار میں آتی ہیں ایسی چیزیں۔ میں مجموعی طور پر بات کر رہا ہوں۔ وہ بڑی خوبی کے مالک ہوتے ہیں، اور وہ آپ کو آسانیاں عطا کرتے ہیں۔ آپ اپنا پارسل لے کر جائیں، اور وہ بایو جو میٹھا ہوا کہے، جناب اس پر پیلا کاغذ لگا کر لا گیں۔ یہ نیلا

نہیں قابل قبول۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرایہ کہ ذوری اس پر سرخ باندھیں۔ یہ جو سیا (دھاگہ) آپ نے باندھا ہے یہ قابل قبول نہیں۔ کچھ بھی اعتراض کر سکتا ہے، یعنی آپ دیکھئے ایک چیز جو میرا استحقاق ہے جس پر مجھے پورا حق ہے، اور جس پر ریاض صاحب، قادری صاحب کوئی بھی اس کے اوپر حق نہیں رکھتے۔ اتنی وہ چیز میری ہے کہ اس دنیا میں اس کرہ ارض پر، اور کسی کی نہیں، اور اس میں شامل ہی نہیں، اور وہ میرا نام، اور میری تاریخ پیدائش ہے۔ اگر مجھ کو وہ خدا نخواستہ تاریخ پیدائش دفتر سے لینی پڑے۔ کئی دفعہ Date of Birth نکلوانی پڑتی ہے نا۔ تو وہ کہتے ہیں، اشفاق صاحب چھ مینے کے اندر اتنی جلدی آپ کو کیسے نکال دیں گے۔ اب رویے کی بات ہے۔ وہ آسانی کے بجائے Objection لگادیتے ہیں اس کے ساتھ۔ وہ لگائیں اپنا شناختی کارڈ، وہ لگایا، پھر کہا، جی اس کی دو کاپیاں کر کے لائیں، کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تو میں بڑی دعا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں، اور یہ جو بابا پن ہے، ڈاکخانے نے اپنا قائم رکھا ہوا ہے، اور جس میں بلکل کوتا ہیاں آتی رہتی ہیں۔ اللہ کے واسطے وہ انہیں دور کریں، تاکہ ہم فخر کے ساتھ اس کو دنیا کے اور اداروں کے ساتھ موازنے اور مقابلے میں پیش کر سکیں۔

میں جب نیانیا آیا ولایت سے آیا تو میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ ذیرے کیا ہوتے ہیں۔ میں نے وہاں جو پہلی بات نوٹ کی، وہ تھی کہ ہم لوگ اندر بیٹھے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ بابا سے باٹیں ہو رہی ہیں تو جب ہم باہر نکلتے تھے تو ساروں کی جوتیاں ایک قطار میں ہوتی تھیں، اور ان کا رخ باہر کی طرف ہوتا تھا۔ آدمی جوتی اتار دیتا ہے۔ اوپھی پنجی پڑی رہتی ہیں تو ڈریوں پر اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میں نے جب دیکھا تو یہ مبارح، اچھا فعل ہے۔ لوگوں کی جوتیاں نھیک کرنا، اور مجھ میں کیونکہ تھوڑا سا استکبار تھا، گھمنڈ تھا کہ میں ولایت سے پڑھ کے آیا ہوں، بڑا کو ایفیکیشن والا ہوں، ہوتا ہے عام طور پر۔ میں نے ہمت کر کے جوتیاں سیدھی کرنے کی کوشش کی۔ یہ مشکل کام تھا، لیکن میں نے زور لگا کے، اور آنکھ پچا کے (میری بھی عزت کا سوال تھا)۔ تین چار پانچ نھیک کی تھیں تو اوپر سے بابا جی آگئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا (کہ نہ نہ پت تسلیم ایہہ کم نہ کرو۔ بالکل نہیں کرنا)۔ آپ نے نہیں کرنا۔ میں نے کہا نہیں جی۔ میں شرمende ساتھا، اٹھا لیا مجھے۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں، مجھے منع کر دیا، منع تو ہو گیا۔ لیکن میری طبیعت پر بڑا بوجھ رہا، اور میں یہ سوچتا رہا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ میں ایک اچھے فعل میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ہاں جی میرے ساتھ یہ کیوں کیا تو دوپھر کے وقت ہم اسکیلے تھے۔ میں نے کہا، جی میں عرض کروں ایک بات، کیونکہ میری طبیعت پر اس کا بڑا بوجھ ہے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ انہوں نے کہا، نیھیک ہے جو علم آپ کو عطا کرنا ہے، وہ زیادہ بہتر ہے۔ میں نے کہا، لیکن وہ سر میں تو اچھا کام کر رہا تھا۔ کہنے لگے آپ کے لیے اس لیے ضروری نہیں تھا کہ ایسا فعل آپ کے تکبر

میں، اور اضافہ کر دیتا ہے، کیونکہ چند لوگ دیکھتے کہ جناب سبحان اللہ اشراق صاحب یہ کام کر رہے ہیں۔ آپ نے، اور ”پائٹے خان“ بن جانا تھا۔ آپ اس کو دیکھیں ہمارے ذہن میں بات نہیں آتی نا۔ بڑی دور کی بات ہے۔ نہیں آتی تو اس لیے ہم نے ان لوگوں کی خدمت میں یہ عرض کیا، ہم ہرگز ہرگز پیچھے کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ ہم تو بہت آگے ڈرایزیاڈ Advance جا رہے ہیں۔ ہم لوٹ کے آنا چاہتے ہیں۔ اس استحکام، اور مضبوطی کی طرف جو کسی زمانے میں ہمارا طرہ امتیاز تھا۔

ہمارے ایک بھائ پروفیسر تھے۔ بہت اچھے سایکالوجی کے بھلے آدمی۔ میرا بھانجاں سے پڑھتا تھا تو ایک دن وہ آیا، کہنے لگا، ماموں وہ ہماری ایکٹریا کلاسیں لیتے ہیں شام کے وقت اور دس ان کے پاس بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ اسی تو پیسے نہیں دے سکتیں، ابو کا ہاتھ پچھے ٹنگ ہے۔ تو آپ ایسے کریں کہ پروفیسر صاحب سے مل کر پچھے طے کریں۔ ابو کہتے ہیں کہ ہم ان کو 500 روپیہ دے سکتے ہیں، تو میں ان پروفیسر صاحب کے پاس گیا۔ شام کے وقت گھاس پر پرانے انداز میں بیٹھے ہوئے پڑھا رہے تھے۔ بڑے انہاک، اور لگن کے ساتھ۔ تو میں نے گستاخی کی۔ میں نے کہا، پروفیسر صاحب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ کہنے لگے، اچھا۔ وہ چھوڑ کے آئے۔ میں نے کہا، میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں۔ کہنے لگے، ہاں جی ہاں آپ کو بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ تو میں نے کہا آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ یہ میری بہن زیادہ صاحب حیثیت نہیں ہے وہ صرف پانچ سور روپیہ آپ کو دے سکیں گے۔ کہنے لگے اشراق صاحب مجھے پڑھانے کے پیسے تو ملتے ہیں۔ میں نے کہا، وہ دوسرے لڑکے آپ کو زیادہ دیتے ہوں گے۔ کہنے لگے، نہیں نہیں مجھے سرکار سے ملتے ہیں۔ میری تھواہ ہے۔ میں نے کہا، وہ تو کانچ میں پڑھانے کے ملتے ہیں یہ تو آپ ایکٹریا پڑھا رہے ہیں۔ کہنے لگے نونو نونو All the time Teacher is Teacher وہ صبح پڑھائے یا شام۔ اس کے پیسے تو مجھے سرکار دیتی ہے۔ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ میں 500 روپیہ لیتا ہوں۔ آپ تو مجھے شرمدہ کر رہے ہیں۔ یہ تو میرا فرض ہے، اور یہ میری محبت ہے، اور یہ بڑی محبت کے ساتھ لوگ آئے ہیں۔ تو وہ پروفیسر تھے جو آسامی عطا کرتے تھے، اور ان کے پاس، اور کلاسیں آتی رہیں، میں ان کو دیکھتا رہا، اور ان کو سلام کرنے جاتا رہا، کیونکہ وہ بھی ایک بابا تھے، جس طرح میری پوتی ایک بابا ہے۔ میں اسے سلام کرتا ہوں، ڈاکخانہ ایک بابا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جس میں سچ پچ لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن ذرا سا جھٹکا اس لیے لگتا ہے کہ اس میں ایک پورا زمزدہ ضرور آہی جاتے ہیں۔ جعلی بندے شامل ہوئی جاتے ہیں جس طرح کئی دفعہ ٹھنگ جو ہوتا ہے، وہ فوجی مجرمی وردی پہن کر دکان چیک کرنے چلا جاتا ہے کہ تمہارے کیا حساب و کتاب ہیں، اور لگنے میں سے ہزار روپیہ کھسکا کے لے آتا ہے تو آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جو مجرم ہوتا ہے، وہ ٹھنگ ہوتا ہے اس لیے آرمی میں سے مجرم کارینک

نکال دیں۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ایک پوشرز جو ہے، وہ اپنے انداز کا ہے، ویسا ہی رہے گا۔ آپ کو اب یہ دیکھنا ہے، اور ذرا سا اس کا آسان نیست یہ جو آپ اپنی ذات پر بھی Apply کر سکتے ہیں کہ اس نے کسی سطح پر کسی طرح سے کسی طریقے سے بنی نوع انسان کو آسانی عطا کی یا نہیں۔

آپ نے اپنے بچپن میں دیکھا ہوگا۔ آپ کے محلے کے آپ کے گاؤں کے، اور آپ کے قصبے کے یا آپ کے شہر کے بزرگ جو تھے وہ جب راہ چلتے تھے تو اپنی چھٹری کے ساتھ کوئی کیلے کا چھکا کا پڑا ہوا ہے یا کوئی ایسی گری پڑی چیز اینٹ، روڑا ہتا تے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی ایسا نہیں کیا۔ بدُصیبی ہے جس دن اپنی چھٹری کے ساتھ ایک اکیلا آدمی اس آلاش کو دور کرتا چلا جائے گا، اور مجھے یقین ہے کہ وہ پچھے چلنے والے آتے جائیں گے، اور ملتے رہیں گے۔ ہماری یہ کوتا ہی رہی ہے کہ ہم اس کے بارے میں علم عطا کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ بابا جی نے جو کہا تھا کہ علم عطا کرنے نہ میٹھے جانا، ان کو محبت دینا۔ آپ کو مجھ سے محبت دینے کی ضرورت ہے ورنہ علم اندر نہیں جاتا۔ وہ پروفیسر جو گھاس پر میٹھے کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا، اس کا علم جاری رہا تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کے پاس ایک ایسا پر نالہ تھا جو محبت کا تھا، اور پھسل پھسل کر لڑکوں میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ اس کے بغیر نہیں ہوگا۔ خواتین و حضرات آج ہلکی سی وضاحت یہ بابے کی ہوئی، اور آپ کے ذہن سے بہت سے شکوک، میرا خیال ہے دور ہوتے رہیں گے، نہ ہوتے ہوں تو کوئی ایسی یہی بات نہیں۔ شکوک کو ساتھ لے کر چلنا ہی اچھی بات ہے۔ کیونکہ شک جو ہے خلاف ایمان نہیں ہے۔ ایمان کا ایک حصہ ہے، کیونکہ اس کے ذہن میں شک پیدا ہوگا جو ایمان والا ہے، اللہ کو مانتا ہے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں، لیکن مجھے خوشنی ہے کہ ہر ہفتے آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے، اور کچھ ایسی باتیں ہو جاتی ہیں، جو میں اپنے لیے جانا نہیں چاہتا، کیونکہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

کلچر

زاویہ پروگرام میں بڑی دیر سے ہم بابوں کی باتیں کرتے رہے ہیں، اور یہ بابے اپنے عہد کے فلسفی، اور دانشور، اور ضمیر کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے لوگ تھے، جنہوں نے اپنے اردو گزداچنے ماحول سے اپنے زمینی ماحول سے بہت ساری خوشیاں، اور آسانیاں اکٹھی کر کے ہمارے حوالے کیں، اور ورنے میں ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ مجھ سے خاص طور پر فرمائش کی گئی کہ کلچر کے بارے میں کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ اس اعتبار سے شاید آج کا پروگرام تھوڑا مختلف ہو، لیکن میں کوشش ضرور کروں گا کہ آسانی سے ان مشکل مراحل سے گزر جاؤں جو ہماری زندگی کے کلچر کی تلاش کے سلسلے میں یا کلچر کو Define کرنے میں پیش آتے رہے ہیں، یا آتے ہیں۔

خواتین و حضرات کلچر کے بارے میں تقریباً 62 کے قریب مختلف Definitions یا اس کے بارے میں باتیں میری نظر سے گزری ہیں، لیکن ماہرین علم انسان، اور علم معاشریات کی خاص حصی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ یعنی ہماری بہت لائق ایتھر و پالوجیست "Benedict" جیسی خاتون یا فرانس کے بہت بڑے عالم "لیوی شاس" سے اور پھر ادبی لیول پر "ثی۔ ایس۔ ایلیٹ" ان سب نے اس کی Definition کی ہے لیکن میں، کچی بات یہ کہ جو صدی کر کے، اور دل پر پھر رکھ کے بڑی جرأت کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ مغرب والوں کو کلچر کی صحیح Definition یوں کرنی نہیں آتی کہ وہ کلچر کو انسانی زندگی کے ساتھ ہی وابستہ سمجھتے ہیں۔ یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں، لیکن اس کے لیے اس زندگی کو دور تک پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جب تک آپ زندگی کو جس کا تعلق پیدائش اور موت کے درمیانی حصوں سے نہیں، بلکہ زندگی کے اس لامتناہی سفر کے ساتھ ہے، جو Hereafter سے Hereafter تک چلا جاتا ہے تو ان بے چاروں کو یہی زندگی اور اسی کا علم ہے، اور اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس لیے وہ اکثر و بیشتر یہی کہتے رہے کہ کسی طے شدہ، کسی مخصوص، کسی گروہ انسانی کے آپس کے تعلقات، ان کے اعتقادات، ان کے کھیل کھلوٹ، ان کا انہنا بیٹھتا، ان کی جرأت و صداقت۔ ان کے کلچر کا حصہ ہیں،

اور حصہ بنتے ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ واقعی یہ بات ٹھیک ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں جب تک زندگی کے ساتھ آپ موت کو شامل نہیں کریں گے۔ اس وقت تک زندگی کا پورا مقصد وزن واضح نہیں ہوتا۔ یہ بہت اہم چیز ہے، اور خاص طور پر ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت ہی آسان ہے، جہاں پر ہم اپنی زندگی کا نذر رانہ پیش کر کے موت خریدتے ہیں، اور اس پر Hereafter Believe کرتے ہیں۔ اس Definition میں ہم اگر بہت پچھے جائیں، اور اس کو شنوونے کی کوششیں کریں کہ کچھ دراصل کیا ہے تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ میلاد آدم سے لے کر اب تک انسان قدیم زمانے میں پھر و دھات کے زمانے سے بھی پہلے زمانے میں انسان پہلی دفعہ اکیلا بیٹھ کے یہ سوچنے پر مجبور ہوا، اور اس نے اپنی ذات کے ساتھ پانچ بہت اہم سوال کیے، اور اس کا جواب نکالنے کی کوششیں کرتا رہا۔ پہلا سوال اس کا یہ تھا کہ

”یہ جو میرے ارد گرد کائنات ہے، یہ سورج، چاند، بادل، ستارے، بھلی، زلزلے، طوفان، سمندر یہ کیا ہے؟، اور یہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟، اور کیسے آئی ہیں؟“ دوسرا سوال نے یہ سوچا کہ ”میں خود کون ہوں، اور میں کہاں سے آیا ہوں، اور ان ساری چیزوں کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟ اور کس Relatedness کے ساتھ میں ان کے درمیان زندگی بس رکر رہا ہوں۔“

تیرا سوال اس نے یہ سوچا کہ:

”ابھی جو میرے ساتھ پھیلی پکڑنے جایا کرتا تھا، میرا ماں، میری ماں کا بھائی، وہ کہاں چلا گیا اچانک، اور میری ماں کیوں روئی رہتی ہے، اور ہم اس کو پھر وہ میں رکھ کے واپس چلے آئے ہیں۔ وہ کیا ہوا۔ اور اگر وہ اس طرح کا زندہ نہیں رہا، تو کیا اس طرح کا زندہ ہے جس کا میں، شعور نہیں رکھتا اور اگر وہاں اس کی زندگی بھی کچھ ہے، تو کیا اس زندگی میں کوئی Audit Objection ہوتا ہے کہ پچھے کیسی زندگی بس رکر کے آیا ہوں یا نہیں۔“

یہ پانچ سوال انسان کی زندگی کے گرد گھوٹتے ہیں۔ میرے، آپ کے، ہمارے۔ ہمارے پرکھوں کے، ہمارے بزرگوں کے، اور انہوں نے ان پانچ سوالوں کے جواب اپنی اپنی استعداد، اور اپنی اپنی سوچ، اور اپنے اپنے مشاہدے، اور تجربے کے مطابق نکالے۔

اب خواتین و حضرات! میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس گروہ انسان نے ان پانچ چھ سوالوں کے جواب ایک طرح کے نکالے ہیں۔ ان کا کچھ ایک ہے، اور جنہوں نے اس کے جواب، اور طرح سے نکالے ہیں۔ ان کا کچھ مختلف ہے۔ یہ سیدھی سی ایک تقسیم ہو گئی۔ ہم سے کوتاہی یہ ہوئی ہے، اور ہوتی رہی ہے، کہ ہم طرزِ بودو باش کو، زندگی بس رکرنے کو، رہنم سہن کو، معاشرت کو، کچھ سمجھتے ہیں، اور آج تک یہی سمجھتے چلے آئے ہیں کہ معاشرت یہ ہے کہ ہم کیسے رہ رہے ہیں۔ گانا، بجانا، مہندی یا اسی کو کچھ سمجھتے

ہیں۔ یہ یقیناً کچھ کا ایک حصہ ہو سکتا ہے، لیکن سارا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پانچ سوال جو ہیں، وہ اس سے مختلف ہیں، اور اس سے ماوراء ہیں۔ اب جب پانچ سوالوں کے جواب آپ نے تو نہیں نکالے، آپ کے بڑوں نے نکالے ہیں، اور روتے کے طور پر دے دیئے تو پھر آپ کے لیے یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ مل کر رہ ہیں اس طرح سے، جس طرح سے، ان لوگوں کے گروہ نے سوالوں کے جواب نکالے، آپ کے اپنے ہیں، ان کے اپنے ہیں۔ آپ ایک زمین پر بڑی آسانی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں، لیکن سوالوں کے جواب کے حساب سے آپ کا کچھ اور ہو گا، ان کا کچھ اور ہو گا۔ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں۔ کوئی کہہ گا کہ بابا دیکھو ہم بھی وہی گانے گاتے ہیں۔ ہمارے فوک Folk song بھی وہی ہیں۔ ہم بھی گانا گاتے ہیں۔ ”جتنی کھل دی مردی مرنیں جھل دی“۔ وہ بھی یہی گاتے ہیں۔ ہم بھی مہندی پر وہی گاتے ہیں تو ہمارا کچھ ایک ہی ہوا۔ نہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے فوک گیت ایک جیسے ہیں۔ آپ کے رہنمے سبھ کا آپ کا بود و باش کا طریقہ ایک ہو سکتا ہے۔ آپ کا لباس لیکن ہرگز ہرگز آپ کا کچھ جس کو آپ ثقافت کا نام دیتے ہیں، وہ وہ نہیں ہے، اور بالکل مختلف ہے۔

پھر آپ سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یا آپ خود اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ”کیا ایک ہی سرز میں میں رہتے ہوئے، اور ایک ساپانی پیتے، ایک سی روٹی کھاتے ہوئے، اور ایک ہی معاشرت برقرار ہوئے، اور ایک انداز زیست اپناتے ہوئے، کیا ہمارے اندر ایک ہی Intervene نہیں کر جاتا۔ آپ اس میں مغم نہیں ہو جاتے ان کے ساتھ۔ تو آپ اسے جب بھی آپ کو موقع ملے۔ غور سے دیکھیں گے کہ باوجود اس کے معاشرتی انداز، رہنمے سبھ کا طریق، یہ بالکل ایک جیسا ہے، لیکن پیچھے، پس منظر میں ہمارے لاشعور سے بھی بہت پیچھے ہمارے آرکی ناچپ (Archetype) نے جو طے کیا تھا، ہم اس کے مطابق زندگی برقرار ہے ہیں۔ باوجود اس کے ہمارا روزمرہ کا چلن بظاہر نظر آتا ہے کہ ہم اس طرح کے لوگ ہیں جس طرح کے ہیں۔ اب آپ کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ گزرا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب کسی عظیم بڑے کچھ کا دباؤ آپ پر پڑا۔ آپ پر خاص طور پر اس کیونٹ پر، جس میں آپ رہ رہے ہیں، اور اس نے اسے قبول کیا، اور اپنے کئی سوالوں کے جواب نکالے ہوئے چھوڑ کے اس نے نئے سوالوں کے جواب اپنالیے۔ اور اس سے کہا، آج سے میرا ایمان یہ ہے، جو سوالوں کے جواب ہیں تو آپ میں بالکل تبدیلی پیدا ہوگی۔ اب کتنی بڑی تبدیلی پیدا ہوئی کہ جس طرح سے ایک نہایت ترش آم کے اوپر شر بہشت کا پیوند لگتا ہے۔ اکثر لوگ آپ سے یہ کہتے ہیں، ہماری Grass roots، ہمارا جو درخت ہے اس کی روتیں تو وہی چلی آ رہی ہیں، اور اس کا تنا بھی وہی ہے لیکن اب ہم پیچانے جاتے ہیں کہ شر بہشت کے درخت کے طور پر اب ہم کھٹی امی نہیں ہیں۔ تو جب بھی کوئی کسی سے کہے گا، یہ شر بہشت کا درخت ہے، اور جب آپ پھل لائیں گے، ہر سال پھل دیں

گے۔ جب جب بھی دیں گے تو اس کا پھل اس پھل سے مختلف ہو گا جو پہلے ہوا تھا۔ اب یا اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا دوسرے پلجر، اپنے پلجر پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دوسرے رہن سکن بود و باش تو اثر انداز ہوتے ہیں، اور وہ تو آپ اپنی روزمرہ زندگی میں تبدیلیاں کر لیتے ہیں، لیکن آپ کے پلجر کا جو مضبوط تنا ہے، وہ قائم رہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ خواتین و حضرات آپ کی جڑیں جو ہیں، وہ پرانی چلی آ رہی ہیں۔ میں نے پیوند کی مثال دی، یہ ذرا سی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اگر بھی ایک خطہ زمین پر، ایک پھونٹ سے خطہ زمین پر، پانچ مرلے کی جگہ پر دو درخت ہوں، ایک جامن کا ہو، ایک آم کا ہو، اور دونوں درختوں کے پتے، اور شاخیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوں، اور دونوں درخت کا رہن ڈالی آ کسائید کھا کے تنومند ہو رہے ہوں، اور آ کیجتن چھوڑ رہے ہوں۔ دونوں درخت اتنے قریب ہوں کہ شاید نیچے ان کی جڑیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوں، اور چکر کاٹتی ہوں۔ اتنی قربت اور پر بھی، نیچے بھی، ہوا کے لینے میں بھی، نشوونما حاصل کرنے میں بھی پانی بھی اسی جگہ کا لے رہے ہوں، اور یہ سب چیزیں لینے کے باوصف آم جب اپنے سوالوں کے جواب نکالے گا تو، اور نکالے گا، جامن جب اپنے سوالوں کے جواب نکالے گا تو اور نکالے گا۔ حالانکہ وہ ایک ہی جگہ پر ہیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہو گا کہ جڑوں کے آپس میں ملنے پر کوئی کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی فرق تبدیلی نہیں آ سکتی۔ شکل و صورت، اس کے پتے چھال سب جیسے نظر آئیں گے۔ آپ کہیں گے، لیکن جواب نکالنے میں فرق پڑ جائے گا۔ جواب وہی ہو گا اس کا، جو چلا آ رہا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا، اور کہا جاتا ہے کہ اگر ہم اپنے پرکھوں کو دیکھیں، تو ان میں یہ بات آپ کو نظر آئے گی کہ ان کی تہذیب، ان کا تمدن جو ہے وہ آپ کے اور اثر انداز ہوتا ہے ان جڑوں کے ذریعے سے۔

تو ایک روز میں نے اس پاتال میں جانے کی کوشش کی جو شش کے Grass Roots کے حوالے سے مجھ کو نیچے لے جا سکتا تھا۔ تو میں بہت نیچے اتر گیا۔ اتنی دور کہ میں ہر پہ بھی کراس کر گیا۔ مونجوداڑ و بھی کراس کر گیا، اور آگے جا کر میں نے دیکھا، ایک بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس کا دروازہ، اور وہاں ایک چوبدار گیٹ پر تھا۔ اس نے کہا، تم کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا، میں اندر جا رہا ہوں۔ اس شہر میں داخل ہونے۔ اس نے کہا، نہیں تمہیں پہلے بتانا پڑے گا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا، میں انسان ہوں۔ اس نے کہا، انسان کوئی شناخت نہیں۔ تم بتاؤ تم کس نسل سے، کس ورن سے تعلق رکھتے ہو۔

میں نے کہا، میں انسان ہوں۔ اس نے کہا، نہیں، یہاں تم براہمن ہو یا کھتری ہو یا ولیش ہو یا شودر۔ تو بتاؤ تم کون ہو؟ تو میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں براہمن ہوں۔ میں نے کہا، میں ولیش ہوں۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ آپ اندر چلے جائیں، اور آپ کو اجازت ہے۔ آگے ایک، اور چوبدار کھڑا تھا۔ اس

نے کہا، بہت اچھا تو آ گیا۔ مہاراج اور اج کا جو ہاتھی ہے، وہ نکلنے والا ہے جو چکر لگائے گا تو اس کے پیچھے ڈھولک بجا تا مل بجا تا جا، کیونکہ مہاراج کی پوجا جو ہے، وہ ضروری ہے ہمارا حصہ ہے۔ تو میں نے اس کے ہاتھ سے گھڑیاں لے لیا، اور اس کے پیچھے پیچھے بجا تا چلا، اور بھی نوجوان لا کے تھے۔ مہاراج کے ساتھ سارے شہر کا جو چکر تھا، وہ ہم نے پورا کیا۔ واپس آ گئے۔ تھکا ہارا شام کے وقت جب میں اپنے گھر گیا تو میری ماں نے مجھ سے کہا کہ تیری بہن کا شوہر یعنی تیرا بہنوئی فوت ہو گیا تو تیری بہن جوان ہے، طاقتو رہے۔ تیرا باب پڑھا ہے۔ ہم نے اس کو انھا کر چتا میں پھیلنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ ماننی نہیں ہے۔ تو آ گیا ہے اس کو پکڑ۔ اس کو چتا میں پھینک، تو میں نے اس کو انھایا، میں طاقتو آدمی تھا اور لے جا کر جلتی ہوئی چتا میں اس کے خاوند کے ساتھ بھسم کر دیا، اور یہ سین اپنے بہت پاس سے دیکھ رہا تھا۔ جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا، یہ تفریق انسانوں کے ساتھ اس نیزی کے ساتھ چلی جا رہی ہے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھ کو یہ حکم لے چکا ہے کہ گورے کو کالے پر، اور کالے کو گورے پر، عجمی کو عربی پر، اور عربی کو عجمی پر کوئی فوکیت حاصل نہیں ہے، اور آج سے چودہ سو برس قبل، یہ ڈیموکریسی تو آج آئی ہے نا، ہم مانیں یا نہ مانیں۔ اب یہ بات الگ ہے کہ ہم اس پر عمل کر سکیں، یا نہ کر سکیں۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے۔ جس دن ہمارا پیوند لگا تھا میر بہشت کا، اس کے ساتھ ہی یہ پرچی ناک دی گئی تھی میں یہ سمجھتا ہوں، ہماری امت اتنی مختلف ہے۔ دنیا کی ساری امتیوں سے کہ اس کے اوپر ایک، اور ثقاافت کا اثر ہوا، اور شدت کے ساتھ ہوا، اور یہ پورے کے پورے ان کے ساتھ 90 ڈگری کے اوپر گھوم گئے، اور انہوں نے ان سوالوں کے جواب کو اپنالیا۔ اپنی خوشی کے ساتھ، اور اپنی ایمانداری کے ساتھ، اور اپنے دل کی لگن کے ساتھ کہ آج کے بعد ہم سی۔

اب ایک مشکل پیدا ہوتی ہے۔ مجھ سے کبھی پوچھتے ہیں کہ جی آپ یہ بتائیں اس طرح سے تو بہت دھچکا سالگتا ہے نا جی، کیونکہ ہم اکثر یہ سوچتے رہے ہیں کہ یہ ہمارا لچکر ہے تو جو ہمارے ارد گرد کے لوگ ہیں جن میں ہم رہتے بنتے رہے ہیں، وہ کس طرح سے ایک دم سے ہم سے مختلف ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں، نہیں وہ بالکل مختلف نہیں ہوتے۔ اس کو میں، اور آسانی کے لیے آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ فرض کریں ہم جہاز کے اوپر سمندر کا سفر کر رہے تھے، اور اچانک سمندر بچھر گیا، اور طغیانی آ گئی۔ اور لہروں کی لپیٹ میں جہاز آ گیا، اور جیسا کہ کہانیوں میں ہوتا ہے، جہاز بالکل تخت تخت ہو گیا، اور ہم لوگ ایک ایک تختے پر چھٹ کر ایک جزیرہ قریب تھا، وہاں آ گئے۔ اب مختلف قوموں کے لوگ مختلف بولیوں کے لوگ وہاں جمع تھے تو ظاہر ہے کہ میں نے اس گروہ کی قربت اختیار کی جو میری بولی سمجھتا تھا۔ اس سے آسانی ہوتی ہے اور میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا تھا، اور جو یہ گانے پسند کرتے "جُتی گھل دی مژوڑا نہیں جھل دی" تاکہ مجھے آسانی رہے۔ سارا دن میں ان کے ساتھ گزارتا تھا اور ساری رات۔ تو

زندگی اس آس میں اچھی بس رہو ہی تھی کہ اب کوئی ہمیں آئے گی باہر سے مدد۔ تو ہم شاید اپنے گھروں کو واپس جائیں، لیکن بہت زیادہ وقت وہاں پر گزر رہا تھا۔ میں دن تو ان کے ساتھ گزارتا تھا، اور اپنا سارا وقت بھی ان کے ساتھ گزارتا تھا، لیکن جب مجھے یہ خدشہ محسوس ہوا کہ میرے آخری ایام آگئے، اچانک مر نے لگا ہوں تو میں نے اپنے انہی لوگوں سے کہا کہ اس گروہ کو جوانہ و نیشاں والے ہیں، اور جن کی بولی میں نہیں سمجھتا، ان کے حوالے کر دینا، اور جو سلوک وہ میرے ساتھ کریں مجھے قابل قبول ہے، تو وہ ان کے پاس میرا سفر جو Here after کی بات کر رہا تھا، وہ میں ان کے حوالے کرتا ہوں، کیونکہ ان لوگوں نے سوالوں کا جواب وہی نکالا ہوا ہے، جو ہم نے نکالا ہوا ہے۔

میں آپ کے ساتھ زبان کے حوالے سے بات چیت کرتا ہوں اور میں بڑا خوش ہوں۔ بڑا احترام بھی کرتا ہوں آپ کا اور آپ سے ملتا جلتا بھی ہوں۔ چنانچہ جب بڑا فیصلہ آئے گا، میرا یا میری نسل کے بڑھنے کا معاملہ ہو گا تو پھر میں ان کے ساتھ تعلق پیدا کروں گا، لیکن جہاں تک بات چیت کرنے کا تعلق ہے، میں بسم اللہ حاضر ہوں تو میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ پھر کام سلکہ ہمارے لیے یا کم از کم میرے لیے اتنا پیچیدہ، اور مشکل نہیں ہے، اور سوالوں کے جواب سمجھ جانے کے بعد یا ان کو ذہن لشین کرنے کے بعد ذرا آسانی کے لیے میں نے یہ عرض کیا ہے۔ یہ آئندہ کے لیے، اور آپ کے لیے اس میں کوئی زیادہ الجھن نہیں رہنی چاہیے۔ زندگی کے بارے میں اکثر ہم یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ

“Matter of life and death where it is matter of birth and death.”

کیونکہ Life کا جو ریلا ہے، وہ چلتا چلا جا رہا ہے۔ یہ جو موت ہے، میں نے پہلے اس کا ذکر کیا۔ اس کی بڑی اہمیت ہے، جو Warrior (جنگجو) ہوتا ہے، جو صاحب سیف ہوتا ہے، وہ بڑا مضبوط آدمی ہوتا ہے، اور وہ اپنی موت کے ساتھ ایک رشتہ، اور ایک تعلق ہر وقت قائم رکھتا ہے۔

خواتین و حضرات! اگر آپ نے بہت قدیم فرقوں کے بارے میں، بہت قدیم نسلوں کے بارے میں، کچھ ایشٹھر و پالوجیکل شڈی کی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جو Red Indian تھے، امریکہ کے اصل بائی، ان میں بڑی عجیب و غریب صلاحیتیں موجود تھیں، وہ ہماری طرح سے یا ہم سے تھوڑا اسا زیادہ ہی اپنی موت کے ساتھ وابستہ رہتے تھے۔ ایک ایشٹھر و پالوجیٹ کارلوس کا سپیزرا جو تھا، وہ گیا کچھ ایسی تحقیق کرنے کے لیے پرانے ساتھ امریکی سے ملنے۔ اپنے دشمن سے۔ یہ لمبی کہانی ہے، مختصر عرض کروں، اس نے جو باتیں بتائی ہیں یا بیان کی ہیں، یہ سب اچھی ہیں۔ اس کا نام ڈان جوان ہے۔ امریکی اسے کہتا ہے! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ ہماری زندگیوں میں ہم جو شہری لوگ ہیں، جن کا تعلق امریکہ کی طرز زندگی سے ہے، ہم بہت گھبرا جاتے ہیں۔ ہمارے اندر تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں، تو بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتے تو اس کا کیا

کریں، اس ریڈ انڈین نے کہا، سوال اتنے چیزیں تو نہیں ہیں جتنے تم نے بنائیے ہیں۔ اس نے کہا، دیکھو فرض کرو۔ میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اور میری زندگی میں ایک، دوسرا لڑکی آگئی۔ اب میں فیصلہ نہیں کر پاتا، اور میں اپنے آپ کو بے ایمان بھی نہیں تھہراانا چاہتا۔ میں دنداغہ (Confusion) میں بھی ہوں۔ میں کیا کروں؟ تو آپ مجھے رائے دیں۔ اس وقت کیسے کرتے ہیں، اور آپ لوگ جو قدیم Red Indian ہیں، اور جو ایک Seprate Reality کے حامل ہیں۔ اس نے کہا، اوہ ہو یہ تو بڑا سیدھا سامعاملہ ہے، جب ایسی مصیبت پیش آئے، جب کبھی ایسی دنداغہ میں ہو تو ہمیشہ اپنی موت سے پوچھو۔ اب مسئلہ آگیا، اس سے وہ کیسے پوچھیں؟ اس نے کہا، ہر آدمی کی موت جو ہے، وہ پانچ فٹ کے فاصلے پر لفت ہینڈ سائیڈ پر ساتھ ساتھ چلتی ہے، کیونکہ وہ اس کو protect کرتی ہے۔ جو خدا نہ خواستہ فوت ہو جائے تو موت پاس موجود نہ ہو تو وہ تو مارا گیا۔ لائن حاضر ہو گیا تو اس کی موت کا فرض ہے ساتھ رہے۔ چنانچہ کہنے لگے، اس سے پوچھا جانا بہت ضروری ہے، تو تم کبھی بھی اس سے سوال کر کے پوچھو۔ اس نے کہا، کیسے جواب دے گی۔ تو کہا، پہلے تو تمہیں Emotionally Vibration کا پتا چلے گا۔ پھر ایسا موقع بھی آنے لگا ہے کہ ہمارے بڑوں کی زندگی کو وہ بالکل Vocal ہو کر بات بتادیتی ہے کہ کرنا ہے یا نہیں کرنا۔

تو انسانی زندگی کو اس زندگی تک محدود نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ Here after، اور جب ملتا ہے تب جا کر یہ سفر مکمل ہوتا ہے یا زندگی یا حیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی، اور شکریہ آپ کا بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

تعریف و توصیف

میں آپ کی خدمت میں اپنا، اور اپنے ساتھیوں کا سلام تو پہنچا دیا کرتا ہوں، لیکن میں نے جائزہ لیا کہ شکریہ ادا کرنے کے معاملے میں میں بھی تھوڑا سا بخیل ہوں اور جن لوگوں کے درمیان میں رہتا ہوں، ان میں بھی یہ عادت بیدار نہیں کی جاسکی۔ اس کی پتانیہیں کیا وجہ ہے۔ ہم بہت اچھے لوگ ہیں، پیارے لوگ ہیں۔ اچھی خوش بخشی کا سامان مہیا کرتے ہیں ایک دوسرے کے لیے، لیکن تعریف و توصیف کے معاملے میں بخشنے سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ رواج ابھی بن نہیں سکا اور ہم نے اس کے بارے میں غور نہیں کیا کہ تعریف و توصیف بھی واجب ہے۔ کہیں واجب نہیں ہے تو بھی کی جانی چاہیے تاکہ انسانوں کے درمیان اتحاد، اور ہم آہنگی، اور ایک Unity پیدا ہو۔ بدستقی سے ہمارے یہاں آدمی کے چلنے جانے کے بعد اس کی تعریف ہوتی ہے۔ اگر آپ لاہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں جا کر دیکھیں تو بہت سے کتبے آپ کو ایسے نظر آئیں گے جن کے اوپر مر حوم کا نام، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات لکھی ہوگی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ توصیفی کلمات بھی ہوں گے۔ اب وہ بے چارہ باہر نکل کر تو نہیں دیکھ سکتا کہ کتبے پر کیا لکھا ہے، یہ تو اس کے کام نہیں آیا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کی کچھ تعریف و توصیف ہو جائے تو اس کو کچھ سہارا ہو۔ اس کو پتا چلے کہ میرے ارد گرد رہنے والے لوگ جو ہیں، وہ بہت تقویت عطا کرنے والے لوگ ہیں۔

ایک واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ صحابی آئے۔ کچھ صحابی وہاں پہلے تھے۔ نئے آنے والوں نے عرض کی، یا رسول اللہ یہ جو آپ کے صحابی ہیں۔ یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں اور یہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں ان سے زیادہ متعارف تو نہیں ہوں، لیکن یہ بہت دل والے ہیں۔ حضور اکرم نے فرمایا کہ کیا آپ نے ان سے یہ بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جی میں نے تو نہیں کہی تھی۔ کہنے لگے فوراً جائیے۔ ان کے پیچھے، اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہیے، آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، مجھے پیارے لگتے ہیں۔ تو وہ ان کے پیچھے بھاگے، اور جا کے کہا کہ میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ تو۔

انہوں نے ظاہر ہے، محبت کا جواب محبت سے دیا ہوگا۔ ہمارے ہاں کچھ کچھ محبت کی کمی ہو رہی ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہمارے دلوں میں تو کافی محبت ہے۔ ہمارے لوک گیت، اور لوک داستانیں بتاتے ہیں۔ ہم بڑی محبت کرنے والے لوگ ہیں، لیکن زبان سے اظہار نہیں کر سکتے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے، اور تعریف، اور تو صیف کا اظہار بے اختیار، بے ساختہ ہونا چاہیے۔ کتابوں کی رومنائی ہوتی ہے۔ تعریف و تو صیف کی جاتی ہے مصنف کی۔ کتاب کی۔ وہ ایک طرح سے زبردستی کی تعریف ہوتی ہے۔ اچھی بات ہے، وہ بھی ہونی چاہیے۔ اب دیکھیے کسی نے کتاب لکھی ہے جیسے کہ وہ صاحب اولاد ہوا ہے، صاحب کتاب جو ہوا ہے، تو جو صاحب اولاد ہو، اس کے گھر جا کر ودھائی تو دینی پڑتی ہے نا، اور بعض اوقات تو یہ تعریف و تو صیف آپ کا سہارا بھی بنتی ہیں، آپ کی مدد بھی کرتی ہیں۔ آپ کو محفوظ بھی رکھتی ہیں۔

ہمارے ایک پروفیسر تھے۔ وہ یہ کہا کرتے تھے، دیکھو جب آپ ہوٹل میں جائیں یا ریسٹوران میں جائیں، اور کھانا کھائیں، اور آپ کسی وجہ سے ناراض ہوں تو آپ بلا کر ہوٹل کے میجر کو جو چاہے کہہ لیں، کوئی اس میں بری بات نہیں ہے۔ ریسٹوران کے مالک کو بلا کر اس کو ذلیل و خوار کر لیجے کوئی بات نہیں، لیکن خدا کے واسطے کبھی یہرے کے ساتھ سختی سے پیش نہ آئے گا، کیونکہ اگر آپ یہرے سے سختی سے پیش آئیں گے تو اس کا نتیجہ بڑا خطرناک نکل سکتا ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ میں نے دیکھا، یہاں ایک بڑے ہوٹل میں دو یہرے اپنی اپنی سمنی جو ہوتی ہے، تھالی لیے چوکھ کے ساتھ لگے کھڑے تھے، اور ایک صاحب بڑے جنتلمن کھانا کھار ہے تھے۔ ایک یہرے نے دوسرے یہرے کو بلا کر کہا، وہ دیکھو کھا گیا، کھا گیا۔ پتا ہی نہیں لگا اس کو تو۔ تعریف و تو صیف اس اعتبار سے فائدہ پہنچانے والی چیز بھی ہے۔ ہمارے ہاں البتہ اس کی بہت کمی ہے جس کی طرف میرا خیال ہے توجہ دی جانی چاہیے۔ دکاندار کے، اور گاہک کے درمیان شکریہ کا جو چلن ہے وہ نہیں ہے۔ جب آپ پڑول لیتے ہیں تو اس لڑکے سے جس نے آپ کا پڑول ڈالا ہے، کبھی آپ نے شکریہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ آپ بڑے آدمی ہیں، تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے شکریہ ادا کرنے کی۔ کیونکہ ہمارے یہاں پر بڑے عرصے سے حکمرانی رہی ہے بڑے بادشاہوں کی، پھر کمپنی بہادر کی، اور ہم نے یہ طریقہ کار، اور چال چلن سیکھا ہی انہی سے ہے۔ شکریہ ادا کرنے سے آدمی خود مفرج ہوتا ہے، اور اس کی روح پر، اور اس کے وجود پر، اور اس کی شخصیت پر، اور اس کی فردیت پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہ ہمیں ہمارے بڑوں نے ہمارے استادوں نے سکھایا ہی نہیں۔ ان کو Thank you کہنا سکھایا ہی نہیں گیا۔ اگر بتایا جاتا تو ہم یقیناً اس کا پالن کرتے۔ جو ہمارے پروفیسر تھے جن کا میں نے ذکر کیا، وہ پروفیسر نہیں تھے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، یعنی استاد الاصح مذہ، اور استادِ مکرم تھے، یعنی پروفیسر کے اوپر کی ڈگری تھی، وہ تشریف اسی لیے لائے تھے کہ

شاف روم میں پروفیسر حضرات سے ملیں، اور ان کو زندگی آموز، اور زندگی آمیز چیزوں سے روشناس کرائیں۔ تو وہ کہا کرتے تھے کہ دیکھو یہ انسانوں کی بات ہے۔ جب کبھی پودا بھی زمین سے الھاڑو تو پہلے اس سے اجازت لو کر میں تمہیں الھاڑنے لگا ہوں، اور میں تمہارا بڑا احترام کرتا ہوں، اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں الھاڑوں گا۔ تمہیں اپنے استعمال میں لاوں گا، لیکن اس کے ساتھ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔ میں جب مٹ جاؤں گا، میں جب کھاد بن جاؤں گا تو تیری نسل کے تیرے خانوادے کے کام آؤں گا۔ یہ بڑے لوگوں کی بات ہے۔ تو ہمیشہ اس سے اجازت لے کہ اس سے محبت کی گفتگو کر کے الھاڑو، اور پھر فرماتے تھے کہ اس سے ہمیشہ اوپھی آواز میں بات کرو۔ ”من من“ کر کے نہیں تاکہ اوروں کو بھی سنائی دے کہ آپ اس کے شکرگزار ہو رہے ہیں۔ اسے الھاڑر ہے ہیں۔ وہ خیا کے پوڈے، پوڈینہ ہے، بے شمار چیزیں ہیں۔ میں نے کہا، سر کبھی میں نے تو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کیا یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جب میں غور سے دیکھتا ہوں تو ہمارے معاشرے میں ہماری معاشرت میں بھی کبھی بھی ایسے آدمی مل جاتے ہیں جن کے اندر تشكیر کا جذبہ ہوتا ہے۔

کئی سال کی بات ہے، میرے پاس ایک سائیکل ہوتی تھی جو پڑول سے چلتی تھی۔ جسے N.S.U Quickly کہتے تھے۔ وہ میں نے 925.35 میں خریدی تھی، اور وہ بڑی طاقتور تھی۔ آج کل کے موڑ سائیکل سے بہت آگے نکل جاتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب پڑول ختم ہو جاتا تھا تو اس سائیکل کی طرح پیڈل ماکر چلا سکتے تھے۔ جرمنی کی بنی ہوئی تھی مجھے بڑی مہربانی سے ڈائریکٹر آف انڈسٹری نے پرمت دیا تو ہم نے 1935 روپے اکٹھے کر لیے، ساتھ کچھ پیسے دیئے اور خریدی۔ یہ کافی دریکی بات ہے 61-1960 کی تو میں اس کو چلاتا تھا۔ ایک دفعہ چلاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بڑے فخر کے ساتھ بڑی اچھی سواری تھی۔ لوگ پیچھے مڑڑ کے دیکھتے تھے کہ کتنا عزت والا آدمی ہے۔ اس کے پاس Quickly موڈر سائیکل ہے۔ ایک دفعہ میں آ رہا تھا تو سنپل جیل کے پاس ایک نوجوان تھا۔ اس نے مجھے روکا۔ وہ بشرث پہنے تھا۔ پاؤں میں اس کے چپل تھی، اور پرانی وضع کی ایک جیز پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا، جی مجھے آپ جتنی دور تک بھی لے جاسکتے ہیں، لے جائیں۔ میں نے کہا تھیک ہے آئے بیٹھیے۔ لیکن وہ مجھے تھوڑا سا مشکوک سا گاتو میں نے کہا، آپ یہاں کہاں تھے؟ تو اس نے کہا، جی میں اپنے کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔ یہاں سے جیل سے۔ میں پرسوں رہا ہوا تھا مگر میں اپنی چیز بھول گیا، پتا نہیں کیا چیز تھی۔ میں نے کہا، یہاں آپ قید تھے؟ کہنے لگا، ہاں جی میں بہت مشہور جیب تراش ہوں۔ گرد کٹ۔ وہ کہنے لگا جی میرا علاقہ جو ہے وہ مصری شاہ ہے۔ مصری شاہ ایک علاقہ ہے لاہور کا میں وہاں کا ہوں۔ مجھے پکڑ کر انہوں نے زبردست مقدمہ کر دیا میرے اوپر۔ حالانکہ میرے

خلاف لوگوں کی گواہیاں بھی نہیں تھیں۔ میں نے کہا۔ تم گرہ کٹ ہو تو سکی۔ کہنے لگا، ہاں ہوں تو سکی لیکن اس مقدمے میں میرے ساتھ بے انتہا نا انصافی ہوئی، اور مجھے تو مہینے کی سزادے دی تو میں تو مہینے کی سزاد پوری کر کے اب گھر جارہا ہوں۔ میں نے کہا، اچھا پھر تو آپ بڑے محرز آدمی ہیں۔ جب آپ نے شرافت کے ساتھ دیانت داری کے ساتھ یہ سارا واقعہ سنایا ہے۔ آپ بنیھیں۔ وہ پیچھے بینچ گیا تو ہم چلتے رہے۔ جب ہم فیروز پور روڈ پر ہاں پہنچے جہاں فیروز پور روڈ آگے جا کر لشناں روڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے، تو ہاں پر جا کر اس نے کہا، آپ ادھر سے چلیں ٹمپل روڈ کی طرف سے۔ میں ادھر چلا آگے۔ درمیان میں پہنچے۔ اس سڑک پر تو سپاہی کھڑا تھا سیئی بجا کے روک لیا۔ تو اس نے کہا، یہ تو ون وے ہے۔ میں نے کہا، سریہاں کوئی بورڈ وغیرہ تو ہے نہیں۔ اس نے کہا، نہیں، سرکار کا یہ کام نہیں کہ بورڈ لگائے۔ اس کا کام حکم دینا ہے۔ سرکار نے حکم دیا ہے، یہ ون وے ہے تو آپ ادھر سے کیوں آئے۔ میں تو آپ کا چالان کروں گا۔ میں نے بڑی ان کی منت خوشنامد کی کہ آپ چالان نہ کریں، وہ جو تھامیرا ساتھی، وہ بھی اتر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا، سنتری بادشاہ جانے دیں۔ یہ کیا ہے، غلطی ہو گئی ہم سے، پتا نہیں تھا۔ اس نے کہا، نہیں میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے کچھ بحث کرنے کی کوشش کی کہ آپ کو باہر بورڈ لگانا چاہیے تھا۔ آپ نے بورڈ نہیں لگایا، اس نے کہا بورڈ لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ کسی اور محکمہ کا کام ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ اس نے کہا، قانون سے نا آشنا کی جو ہے، وہ ہمارا قصور نہیں ہے۔ آپ کا قصور ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ لا ہور کی کون سی سڑکیں وان وے ہیں، اور کون سی نہیں ہیں۔ تو میں نے کہا، اب کیا جا سکتا ہے۔ کافی بحث و مباحثے کے بعد اس نے کاپی ٹکالی۔ کاربن رکھا، اور میر انام پوچھ کے لکھ کے چالان کر کے پھاڑ کے کاغذ مجھے دے دیا، اور کاربن اگلے کاغذ کے نیچے رکھ کے وہ کاپی جو تھی، اپنی بشرت کی جیب میں ڈال لی۔ اب وہ جو میرا ساتھی تھا، جس کو میں پیچھے بٹھا کے لا رہا تھا، وہ بے چارہ ظاہر ہے بڑا پریشان ہوا کہ میری وجہ سے۔ یہ ہوا تو اس نے ہاتھ پاندھ کر کہا، سنتری بادشاہ یہ صاحب کا قصور نہیں ہے۔ یہ میرا قصور ہے۔ میں ان کو اس طرف لے آیا تھا، تو آپ ان کو خدا کے واسطے معاف کر دیں۔ اس نے کہا، نہیں، قانون قانون ہے۔ وہ میرا ساتھی اس کے لگ کے جیھی ڈال کے پھر کھک کے نیچے پاؤں میں بینچ گیا۔ پاؤں سے پھراو نچا اٹھا، پھر اس کو دیئے خدا کے واسطے۔ اس نے پرے دھکیل دیا۔ تو اس نے کہا، ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔ کوئی بات نہیں۔ سپاہی نے بتا دیا کہ فلاں مجسٹریٹ کی عدالت میں بدھ کے روز حاضر ہونا ہے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ تو جب پھر میں سوار ہو کر موڑ سائکل چلانے لگا تو ہم دونوں ہی بڑے پڑھر دے تھے۔ پھر اس نے کہا مجھے بھائی کی طرف لے چلیں۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے، جہاں چاہو لے چلو۔ بھائی کے باہر اتار دیں۔ پھر وہاں سے میں اپنا کوئی بندوست کر کے چلا جاؤں گا۔ تو جب میں بھائی پہنچا۔ تو اس نے کہا، میں آپ کا بڑا

شکرگزار ہوں۔ آپ نے بڑی محبت کے ساتھ، محنت کے ساتھ، اور بڑی دید کے ساتھ مجھے یہاں تک پہنچایا۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، اور اس نے کہا، میں آپ کی خدمت میں کیا شکرانہ پیش کروں، اور پھر اس نے جیب سے نکال کر سپاہی کی کاپی مجھے دے دی، وہ جس کے اوپر چالان لکھتے ہیں نا، جس میں نیا کاربن بننا کے رکھا ہوا تھا جس میں میرے بھی چالان کی نقل تھی، یہ آپ کی۔ جب وہ مجھی ڈال رہا تھا، اس کے نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ اب گردہ کٹ بھی کمال کا تھا۔ انہوں نے کہا، جی میری یہ یادگار آپ رکھیں۔ سارے چالان پاس رکھیں۔ ایسے ہی مجھے یہ واقعہ یاد آگیا۔ ایک آدمی کے اوپر جب کسی نے کوئی چھوٹا معمولی سا بھی کرم کیا ہو، اس کا ایک بوجھ پڑتا ہے۔ اس بوجھ کی ادائیگی جو ہے، فوری طور پر بہت ضروری ہے کہ کر دی جانی چاہیے۔ کم از کم شکریہ ادا کرتا چاہیے۔ جی بالکل کم از کم شکریہ ادا کر دینا چاہیے۔ ہمارے ہاں روانج نہیں ہے جی، سکھایا نہیں کسی نے۔ اگر ہمیں سکول میں سکھایا گیا تو ٹھیک، اور شوہونک کا جو تعلق ہے یا بڑوں کے ساتھ ہے یا کہیں سے آپ کا کام ہو گیا ہے، لیکن ان چھوٹی چھوٹی جگہوں کے اوپر جہاں میں نے دیکھا ہے، دکانوں کے اوپر کبھی ہم نے شکریہ اور کیا ہی نہیں۔

اگر ہمیں یہ بات بتائی جائے تو ہم کریں گے۔ جیسے ہمیں السلام علیکم کہنا بتایا گیا ہے۔ وہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں، میں صحیح سیر کرنے جاتا ہوں تو آدمی سلام کیے بغیر ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے ہیں، ورنہ آپ جا کر دیکھیں فرانس میں خاص طور جانتے نہیں ہیں ایک دوسرے کو، لیکن کہتے چلے جاتے ہیں بدستور۔ بڑی محبت، بڑی دلجمی کے ساتھ کہتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں میں نہیں سمجھتا کہ کسی قسم کا بوجھ ہے یا کوئی اس کے اوپر ہمارے اندر جیلی ہے یا کوئی جھگڑا۔ ہمارے اندر ایک بات البتہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس مرتبے کا سمجھتا ہے کہ وہ کہتا ہے، میں اس کا کیا شکریہ ادا کروں۔ مثلاً آپ سڑک سے گزر رہے ہیں تو سڑک پر سے گزرتے ہوئے خاکروب جو ہے وہ جہاز و دے رہا ہے، خاکروب عام طور پر اپنے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ جہاز و روک لیتا ہے، اور آپ گزر جاتے ہیں۔ تو آپ کبھی اس کو شکریہ، مہربانی نہیں کہتے ہیں۔ ہمارے بابا جی نور والے فرماتے ہیں کہ مجھے خاکروب سے بات یاد آئی کہ جب بھی کبھی دھول اڑاتے ہوئے سڑکیں صاف کرتے ہوئے خاکروب یا خاکروبوں کے گروہ کے درمیان سے گزرو تو کبھی ناک کے اوپر رومال نہ رکھو یا ہاتھ نہ رکھو، کیونکہ وہ بھی انسان ہیں جو یہ کام کر رہے ہیں، اور آپ ناک پر رومال رکھ کے ان کی تذلیل کر رہے ہیں کہ دیکھو میں ایک بڑا سپیریز آدمی ہوں۔ میں ایک افضل آدمی ہوں۔ میں جب سانس لیتا ہوں تو اس گرد میں نہیں لیتا جس میں تم لیتے ہو تو اس لیے وہاں سے ویسے ہی گزو۔ ہم چونکہ ہمیشہ بیچ میں جست کی بات کوئی نہ کولا کرتے تھے، تو ہم کہتے تھے کہ حضور۔ ہمارے بڑے کہتے ہیں کہ آسیجن کو Inhale کرنا چاہیے، گرد و غبار سے بچنا چاہیے۔ کہنے لگے، زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ جب ان کے

درمیان سے گزر تو سانس روک کر گزرو، لیکن یہ نہیں کرنا چاہیے کہ آپ اپنی مشھی بنا کر ناک پر ہاتھ رکھ کر گزریں۔ ان کو انسان سمجھیں۔ ہمارے لیے یہ نیادرس تھا کہ ان کو انسان سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں یہ بتایا نہیں تھا کسی نے، کیونکہ ہمارا ایک برصغیر ستم ہے جو ہندوؤں سے مستعار لیا ہے، ہم نے۔ کیونکہ برصغیر، کھتری، ولیش، شودر یہ سلسلے ہیں ارفع آدمی ہونے کے۔ ایک چھوٹا ہوتا ہے، اور ایک اس سے چھوٹا ہوتا ہے، جبکہ ہمارے ہاں یہ جو حکم دیا جا چکا ہے، آج سے سائز ہے چودہ سو برس پہلے کہ بنی نوع انسان ایک نفس ایک آدمی کی اولاد ہیں، اور عربی کو بُنگی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقيت حاصل نہیں، نہ گورے کو کالے پرنہ کالے کو گورے پر، لیکن بد قسمتی سے ہم اس درس کے قریب ایک صاحب حال ہونے کی حیثیت سے نہیں گزرے، صرف اکتسابی طور پر ہم نے پڑھا ہے یا کتابوں میں پڑھا ہے، اسی کو لے کر آگے چلتے رہے ہیں۔ مجھے اپنے وہ استاد ما سٹر و یاد آر ہے ہیں کہ کئی دفعہ چھٹی کے دن یا جب آدمی چھٹی ہوتی تھی، یونیورسٹی میں تو ہم پروفیسر ان سے درخواست کرتے تھے کہ آپ ہم کو ساتھ لے کر چلیں، اور ہم آپ کی معیت میں گھومنا چاہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کے اندر سے لے کر گزرتے ایک نالہ آتا تھا۔ ایک برساتی نالہ کہہ لیں، اس کے اوپر کوئی پندرہ میں فلم باپل ہوگا۔ پرانی وضع کا جیسے آپ نے دیکھا ہوگا، ہمارے شمالی علاقوں میں۔ تو جب ہم اس کے اوپر سے گزرے باقیں کرتے ہوئے، انکھیلیاں کرتے ہوئے، پگیں کرتے ہوئے تو ما سٹر و بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم گزر پکے اس پل پر سے تو وہ گھوٹے۔ کہنے لگے Thank you very much. شکریہ ادا کیا، تو میرے رو تکنے کھڑے ہو گئے۔ وہ جب بھی کبھی پل پر سے گزرتے تھے یا کسی ایسی مشکل اوگھٹ گھٹائی سے تو اس کا شکریہ ضرور ادا کرتے تھے۔ میں اس سے گزرنا ہوں تو ان کی محبت کا یہ پہلو، اور ان کی نرت اتنی خوب صورت ہوتی تھی کہ جب وہ پلٹتے تھے ناہاتھ اٹھاتے شکریہ ادا کرنے کے لیے، جی چاہتا تھا کہ ہماری راہ میں ایسی مشکلات آتی رہیں، اور ما سٹر و ہمارے ساتھ چلتے رہیں، اور وہ شکریہ ادا کرتے رہیں، اور ہم اس سے سیکھتے رہیں کہ شکریہ ادا کرنے کے لیے کیسے کیسے رہوں ہیں، اور اس کے کتنے لکنے زاویے ہیں، اور کیسے کیسے ان کے پہلو ہیں۔

میں یہ آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ہمیں بد قسمتی سے بتایا نہیں گیا۔ سکھایا نہیں گیا، ورنہ ہم کافی اپنے ہو گئے۔ میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم میں کافی خوبیاں ہیں، ہم مختنی لوگ ہیں۔ آپ نے دیکھا، چاہے گھر میں ہم محنت نہ کریں، باہر جا کر بحرین، امریکہ، دو بیٹی میں ہم نے وہاں اپنا سکے کمال دکھایا ہے۔ یہاں بھی بڑی تیزی کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اور انشاء اللہ تعالیٰ اپنے ملک کو بھی Build کر کے رہیں گے۔

میں معافی چاہتا ہوں۔ ہمارے سیاستدانوں نے ہماری ایک ہی ٹریننگ کی کہ اپنا حق حاصل

کروں اور کرنے کے لیے لڑو، اور کوشش کرتے رہو۔ کسی نے اپنے فرانچس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ اگر آج سے، اس تاریخ سے یعنی 1999ء میں یہ شروع کر لیا جائے کہ کچھ ہمارے حقوق ہیں، کچھ ہمارے فرانچس ہیں، اور یہ ہم پورے کریں گے، اور پھر ہم اپنے حقوق مانگیں گے تو فائدہ ہو گا۔ میں پھر دبی زبان میں عرض کروں گا کہ ہمارے سیاستدانوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ اگر دی ہوگی تو دوسری طرف لے جانے کی دی۔ اب اگر ان کو خیال آ جائے، اور ہم پر مہربانی فرمانا چاہیں تو ہم کو فرانچس کی طرف بھی متوجہ کریں۔ میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ آپ کی طرف سے، اور سارے Viewer's کی طرف سے کہ ہم اپنے حق ادا کرنے میں بھی خدا کے فضل سے فرانچس ادا کرنے میں بھی دیے ہی ثابت ہوں گے، جیسے کہ ہم اپنے حقوق مانگنے کے لیے بے چین رہتے ہیں

اکثر کہا جاتا ہے ستم میں خرابی ہے۔ ستم میں خرابی نہیں۔ ستم میں بے خیالی ہے ان ذیفنس (Indifference) ہے۔ اگر آپ یہ پورا تہبیہ کر لیں ایک فریم ورک کے اندر اندر میں آپ ہم سارے تو پھر وہ ستم جو کہ خراب ستم ہے وہ رہتا ہی نہیں، اور وہ روایں دواں قافلہ ہوتا جاتا ہے تخلیقات کی طرف۔ لیکن لڑکیاں تو شکر یہ ادا کرتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کا شکر یہ ادا کرتی ہیں یا نوکروں کا بھی کرتی ہیں۔

آپ کا بہت بہت شکر یہ کہ آپ یہاں تشریف لائے، اور خواتین و حضرات کا اس سے بھی زیادہ شکر یہ کہ آپ نے اس پروگرام کو برداشت کیا۔ پھر انشاء اللہ، اگلی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، اور کچھ مزید ایسی ہی باتیں کریں گے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اندر کی تبدیلی

یہ ایک بڑی خوشنگوار صبح کا ذکر ہے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بڑی شدت کا جائز اتحا اور بڑی روشن صبح طلوع ہو چکی تھی۔ ہم ڈیرے پر موجود بابا جی نور والے سے ان سے کچھ باتیں سننے کی آرزو لے کر بیٹھے تھے۔ جب میں آپ سے ”ڈیرے“ کا یا ”بابا“ کا ذکر کرتا ہوں تو آپ کو سمجھنے میں بڑی وقت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اگر اس کے بجائے یہ کہتا کہ ہم ایک روز انسٹینیوٹ آف ہیومن ریلیشن کے لान میں بیٹھے تھے، اور ہمارے ڈائریکٹر مسٹر بشکنی ہم کو Relatedness ٹو ہیومن ریلیشن کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے تو آپ کو سمجھنے میں غالباً آسانی ہوتی۔ بات یہ ہے کہ الفاظ کی بھی اپنی دنیا ہے۔ پہلے واضح طور پر، الفاظ کے معانی ہوتے ہیں۔ جیسے گل کے معنی پھول ہیں یا آہن کے معانی لوہا ہیں، یا بال جبریل کے معانی جبریل کے پر ہے۔ لیکن الفاظ کے معنی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی اپنی ایک شخصیت بھی ہے۔ ان کا ایک قدر و قامت بھی ہوتا ہے۔ ان کا ایک مزاج بھی ہوتا ہے۔ ان کی تخلی بھی ہوتی ہے، اور ان میں شفقت بھی ہوتی ہے، اور ان کی ساری شخصیت، اور ساری ترتیب جو ہوتی ہے، وہ اپنے طور پر پڑھنے والے، اور سننے والے پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اس لیے ڈیرے کا لفظ اپنے تمام Connotation کے پاؤ جوہ ہماری گرفت میں اس لیے نہیں آتا کہ ہم نے دیکھا نہیں، ہم وہاں سے گزرے نہیں۔ وہ ہمارا کبھی مصرف نہیں رہا۔

تو ہم وہاں بیٹھے تھے، اور اپنے اپنے انداز میں پاکستان کی بہتری اور بھلائی کے لیے کچھ تجاویز پیش کر رہے تھے۔ کچھ پروگرام بنارہے تھے۔ وہاں پر مولوی مولی آف دی مسٹری (Mystery) ہوتے تھے۔ بڑے تیز و طرار، اور بڑے دانشور، اور اللہ نے ان کو ایسا ذہنِ رسادیا تھا کہ بہت جلد بات کو سمجھ جاتے تھے۔ بہت جلد پیش کر دیتے تھے اپنی رائے۔ کونے میں ہمارے ڈائریکٹر اشرف صاحب بادام روغن نکال رہے تھے۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ ڈیرے پر چونکہ لوگوں کا علاج بالغذاء ہوتا تھا، غذا دے کر بیماری کا علاج کیا جاتا تھا، اور بابا جی یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی غذا کیس پیدا کی

ہیں، جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں، ان میں سے ہر جڑی بولی ہر غذا، ہر اتناج ہر گوشت کی قسم ایک خاص بیماری کے لیے مفید ہے، تو بادام روغن جو نکلتا تھا، وہ مشین سے نہیں نکلتا تھا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مشین سے نکالا جائے تو لو ہے کے دو پہیوں کے درمیان آ کر residue (کچھ حصہ) لو ہے کا کچھ شامل ہو جائے گا اور وہ خالص نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہاں پر بادام روغن ہاتھ سے نکالا جاتا تھا۔ اچھا یہ بات میں نے جب پہلی بار سنی تو یقین نہ آیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پہلو ان آتا ہے، بادام کی گریاں لے کر، اور یوں دباتا ہے، اور چورا ایک دھار نکلتی ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ بادام کو کوئتے ہیں۔ کوٹ کر ایک خاص نپر پچھر پر گرم کرتے ہیں۔ پھر اسے پرات میں رکھتے ہیں، اور پرات کا ایک حصہ اونچا کر دیتے ہیں۔ کچھ تو ان گرم ہوئے ہوئے سیدھے باداموں میں سے قطرے ٹکنے لگتے ہیں خود بخود، اور کچھ ان کو آنا گوند ہٹنے کے انداز میں بعد میں نکالا جاتا ہے، اور وہ تقریباً اتنا ہی نکل آتا ہے جتنا کہ ایک مشین نکالتی ہے لیکن اس کی رنگت، اس کی خوبیوں یقیناً بہت اچھی ہوتی ہے۔

یہ تو میں درمیان میں آپ سے ضمنی بات کر گیا، تو وہاں پر جو رائے پیش کی جا رہی تھی، ان میں ہم نے بڑے پروگرام بنائے۔ جیسے آپ ہم سب جب بھی مل بیٹھتے ہیں، پاکستان کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں، اور ہم سوچتے ہیں اگر یہ کیا جائے تو ہمتر ہو گا، اگر یہ کیا جائے وغیرہ۔ تو بابا جی یہ باتیں سنتے رہے تو انہوں نے کہا انسان کو راستی پر لانے کے صرف وہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو خرابی ہو، جو خطہ ہو، جہاں جہاں پر کوئی خامی ہو، جہاں پر کوئی نیکی بھی پوانت ہو، اس کو دور کیا جائے۔ سیاستدان اور حکمران، اور جہاں بان یہ سارے اس طرح سے علاج کرتے ہیں کہ جہاں پر کوئی خرابی ہو، اسے دور کرنے کے لیے وہاں پہنچا جائے، اس کو دور کر سکتے ہیں یا نہیں، یہ اب اللہ کے اختیار میں ہے۔ انہیا کا طریقہ کار بابا جی نے کہا، اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ وہاں پر جو بھی خرابی ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ وہاں کے رہنے والے انسانوں کے اندر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ جب ان کا اندر تبدیل ہو جاتا ہے تو وہ خود خود اپنی اس خطہ کو ٹھیک کر لیتے ہیں، اپنی خامی کو دور کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان کوویے کا ویسے ہی رہنے دیں، اور ان کی کوتا ہیاں دور کرنے کی کوششیں کرتے رہیں تو اب تک یہ سلسلہ چtar ہے گا، اور آپ دیکھتے رہیں گے کہ آپ کے ہاں بڑی خرابی ہے اسے دور کیا جائے۔ تو اندر کا درست کیا جاتا بہت ضروری ہے، اور وہاں پر بھی بیہی تعلیم ملیتی تھی کہ باہر سے تم جیسے کیسے بھی ہو، اندر سے ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے، اور جب تک اندر ٹھیک نہیں ہو گا، اس وقت تک کوئی بھی مشین ٹھیک نہیں چلے گی۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ ان کے ابا مخدوم صاحب کے پاس ایک کار ہوتی تھی کر اسکر۔ پتا نہیں اب ہے کہ نہیں، ختم ہو گئی ہو گی۔ بڑی سبک، خوبصورت سی اچھی۔ مخدوم صاحب کے پاس

سارے بہاولپور میں نواب صاحبان کے بعد ان کی کاریں ہوتیں۔ ہمارے دوست رفیق ان کے صاحبزادے تھے۔ وہ کارچلاتے رہے اور ایک عرصہ گزر جانے پر جب اس کا معین وقت آیا تو گاڑی چلنے سے انکاری ہو گئی۔ اب مخدوم صاحب نے اسے اختیاط کے ساتھ ادب کے ساتھ عزت افزائی کے ساتھ اسے ایک چھپر کے نیچے اینٹوں کے اوپر کھڑا کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد مخدوم صاحب فوت ہو گئے، اور رفیق نے یہ سوچا کہ یہ اتنی اچھی کار ہے، اور اس کا انداز، اور اس کی ساخت بہت بہتر ہے، تو اسے چلایا جانا چاہیے۔ تو وہ کوششیں کرتے رہے۔ جہاں بھendar لوگ ہوتے ہیں جو بڑے صاحب کی خواصمد وغیرہ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا، صاحب ایسے کریں کہ اس کارنگ بدلتے دیں۔ جب تک اس کے اوپر اچھا، اور نیارنگ نہیں ہو گانا، یہ تھیک نہیں ہو گی۔ ہمارے بھی گھروں میں اکثر جب خواتین اصلاح کریں، سب سے پہلے کہا جاتا ہے ذرائع روم بدلتے دیں۔ کریاں ادھر رکھیں۔ میز ادھر چلا جائے تو پھر سب تھیک ہو جائے گا۔ اکثر آدمی بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہی رائے دی۔ انہوں نے کہا، یہ بات بالکل تھیک ہے۔ انہوں نے سارے رنگ اتردا کہ اس پر نیارنگ کروایا تب شارت کی، لیکن شارت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ نیلے رنگ سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں کے ایک پتواری تھے انہوں نے کہا کہ کر اسلہ کارنگ نیلا نہیں ہوتا، سیل گرے ہوتا ہے، عام طور پر یا کالا ہوتا ہے، تو آپ اگر اس پر سیل گرے کریں تو اچھا ہے۔ تو سیل گرے کروا یا گیا، تو پتا یہ چلا جب تک اس کا اندر تھیک نہیں ہو گایہ۔ ہماری بھی یہی کیفیت ہے۔ ہم اپنے اوپر سیل گرے رنگ کروا کے گھوم رہے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ نے دیکھا ہو گا یا سی جماعتیں آتی ہیں، آتی رہتی ہیں، چلی جاتی ہیں، اور ہر ایک یہ دعویٰ کر کے آتی ہے بڑی راستی سے نیک نیتی سے کہ جناب ہم آئیں گے تو تمہاری کایا پلٹ دیں گے۔ اچھا وہ آتے ہیں تو ان کا بھی طریقہ کاروباری ہوتا ہے۔ اتنا صبر ان میں ہوتا نہیں کہ وہ انہیا کا راستہ اختیار کر سکیں، اور لوگوں کو تبدیل کر سکیں۔ چھوٹے سے گروہ کو تبدیل کر دیں، نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں چلیے ہم یہ کر دیں گے، یہاں مرک بنادیں گے۔ پل تعمیر کر دیں گے یہ کوچے آپ کے تھیک کر دیں گے۔ صفائیاں کر دیں گے۔ لگئے رہتے ہیں بے چارے لیکن ہونیں پاتا، کیونکہ وہ گروہ انسانی جو اس کی کے مقام پر رہتا ہے، جب تک وہ تھیک نہیں ہو گا اس وقت تک وہ مقام تھیک نہیں ہو گا، چاہے کچھ بھی کر لیں۔ اور آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے اندر کجی کب کیسے کیوں واقع ہوئی۔ وہ بھی سمجھتا رہتا ہے کہ میرے اردوگرد کے ماحول کی ساری خرابی ہے۔ میری کوئی خرابی نہیں۔ اپنی خرابی پر کوئی غور نہیں کرتا ہے اور وہ ساری ذمہ داری دوسروں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے یہ ہونا چاہیے وہ ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے یہ کریں، ان کو چاہیے وہ کریں۔ بولی مافیا کیوں ہوتا ہے۔ اس کو ختم کیا جانا چاہیے۔ فلاں چیز کیوں ہوتی ہے، اس کا ازالہ ہو، لیکن اگر بیٹھ کے آدمی کبھی مراقبے کے انداز

میں سوچ، اور غور کرے، اور اپنے سلیف کو جانے، اور نکھارنے کی کوششیں کرے تو پھر اس کو پتا چلے گا کہ میرے اگر سلیف (Self) کے اوپر کی کندھی اس چھلکی کو پھنسا لے تو پتا چلے گا۔ اس کے اندر بہت سی کوتا ہیاں، اور خامیاں موجود ہیں جو میں اگر دور کر دوں گا، جیسے کہ بابے نے کیا تھا تو میرا ماحول ٹھیک ہو جائے گا۔ آدمی کو یقین نہیں آتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنا آپ ٹھیک کر لوں، اور ارد گرد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

میرے پاس ایک بڑا چھا کلاک تھا۔ پرانی وضع کا۔ میرے ابا جی کا تھا۔ انہوں نے بڑے شوق سے اپنے بچپن میں اپنے باپ سے کہہ کرایا اپنے دادا سے کہہ کر لیا تھا۔ آہنوں کی لکڑی تھی، اور لمبی لٹکن جو تھی پنڈولم۔ اور ہند سے جو تھے وہ رومن ہند سے تھے جیسے ریلوے سینئنوس پر گھر بیوی میں ہوتے ہیں۔ بالکل کالی سیاہ سوئی، اور لگا ہوا وہ گھر میں بڑا چھا، اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے، اور اس کا ارتقاش جب وہ گھر بیال بجاتا ہے تو دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔ اچانک اچھا بھلا چلتا چلاتا وہ کلاک ایک دن رک گیا تو مجھے بڑی تشویش ہوئی، اور پریشانی ہوئی۔ میں نے اس کو کھول کے اس کا جو لٹکن تھا، اس کا جو پنڈولم تھا اس کو ہلا کیا، جو آدمی کیا کرتا ہے تو وہ چلا، تو سات بجے میں نے ہلا کیا، سوا آٹھ تک چلا۔ پھر بند ہو گیا۔ اکثر آپ کو تجربہ ہوا ہوگا۔ پھر مجھے کسی سیانے نے بتایا کہ اس کی اندر کی سوئیاں گھما میں تو پھر یہ ٹھیک ہو گا۔ تو میں نے پنڈولم کو بھی چلا دیا، سوئیوں کو بھی چھیڑا، وہ بھی چلا تو بجائے ایک گھنٹے کے چلنے والے دو گھنٹے چل گیا۔ اب سوئیوں کی حرکت سے فرق پڑا لیکن پھر بند ہو گیا۔ تو میں نے اس کو اتار کے بڑی احتیاط کے ساتھ بڑی محبت کے ساتھ، مزید کوشش بھی کی۔ یا اللہ یہ کیسے ٹھیک ہو گا۔ اس کو پھر میں لے گیا ایک بہت بڑے گھر می ساز کے پاس جو مال روڈ پر ہے۔ ان کو جا کر میں نے دکھایا۔ انہوں نے دیکھا اور کہا، اشفاق صاحب یہ بہت پیچیدہ کلاک ہے، اور یہ پرانے زمانے کا ہے، اور اس کی مشینی جو ہے، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے میں اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔ مجھے افسوس ہے آپ اسے ایک تاریخی چیز سمجھیں، اور عجائب گھر کا ایک حصہ بنالیں۔ یہ چلے گا نہیں اسے تو نوادرات سمجھیں۔ میں جب بہت مایوس ہوا، اور اس نے میرا دا اس پھر و دیکھا تو اس نے کہا، آپ اسے چھوڑ جائیں، میں اسے دیکھوں گا۔ شاید اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہو کہ خود ہی مجھے بتا دے اپنی طرف سے ورنہ میرے پاس کوئی کاغذ نہیں ہے، نہ میرے استاد نے مجھے پڑھایا ہے۔ میں اسے چھوڑ آیا۔ دوسرے دن میں شام کو گیا تو اس کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور کھٹا کھٹ چل رہا تھا۔ اتنی خوش ہوئی مجھے، تو میں نے کہا، ٹھیک ہو گیا؟ کہنے لگا باب جی۔ میں نے کہا، اب تو نہیں رکے گا؟ کہنے لگا، نہیں بھی۔ میں نے کہا کہ آپ تو کہہ رہے تھے، پیچیدہ ہے۔ باب جی پیچیدہ بدستور ہے۔ تو میں نے کہا، بڑی مہربانی بتائیے اس کی کیا اجرت، کتنے پیسے ہوئے؟ کہنے لگا کوئی پیسا نہیں۔ میں نے کہا، کیوں، آپ کیا فرمائی ہے ہیں؟ اتنا پیچیدہ کلاک

آپ نے ٹھیک کیا ہے۔ اس کی کوئی اجرت نہیں لے رہے۔ کہنے لگا، دیکھیے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں نے کھول کے دیکھا تو اس کی گراریوں میں ”پھوس“، ”کھڈڑا“، ”جھاڑا“ و دینے سے جواز تا ہے، پچھیں سالوں کا وہ گرد و غبار وہ سارے پھنسنے ہوئے تھے۔ وہ میں نے صاف کر دیا اور کچھ نہیں کیا۔

حاضرین میں سے بات تو سراس کی ہے جو دیدہ پینا کی ہے، جو انسان اپنی خامی دیکھ سکے۔ اشFAQ صاحب: بجا بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بھی آپ کو بتا سکتا ہے۔ لیکن یا آپ کے ارادے پر محصر ہے، آیا کہ آپ اپنی اصلاح کرنے کی خواہش رکھتے ہیں یا نہیں۔ میں اتنی عمر کا، آپ سب سے بڑا ہوں عمر میں۔ میں نے بھی ایسی خواہش نہیں کی کہ میں تو کہتا ہوں کہ لوگ ٹھیک کریں، لوگ ٹھیک ہو جائیں۔ میں تو اکثر یہ کہتا رہا۔ اب جا کے مجھے سمجھ آئی لیکن اب نائم تھوڑا رہ گیا ہے۔ اب ہم اپنے آپ کو Correct کرنے سے معدود ہوئے ہیں۔ تو جب کلاک چل گیا تو میں نے لگا دیا، گھر آ کے تو میں بیٹھ کے سوچنے لگا کہ میری ذات کے اندر بھی بڑا ہدڑ پھوس جمع ہوا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے نہیں چل رہا ہوں، اور جگہ جگہ رک جاتا ہوں۔

حاضرین میں سے جب ہر بندہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے تو پھر یہ سارا ہو سکتا ہے، اندر کی صفائی ممکن ہے۔

اشFAQ صاحب: میں سمجھتا ہوں کہ جب بندہ تہبیہ کر لے، اس کو سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بہت سی چیزوں جو ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے یہ غلط ہے۔ لیکن میرا تہبیہ نہیں بن رہا، ارادہ مضبوط، کہ میں نے اب اس کو سیٹ رائٹ کرنا ہے۔ جس طرح ایک جرنیل ہوتا ہے، ناتو وہ بزن کر کے لشکر میں گھس جاتا ہے۔ وہ ایک ارادہ، اور تہبیہ ہوتا ہے ایسا نہیں بنتا۔

حاضرین میں سے مجھے ایک بندے نے کہا، میں اچھا ہونا چاہتا ہوں۔ اندر کی جوں ہی گرد ہے، اس کو صاف کرنا چاہتا ہوں، اور معیت کرنا چاہتا ہوں کسی بھی بزرگ کی، اور میں ڈھونڈ رہا ہوں، تو یہ کہاں تک ٹھیک ہے کہ ڈھونڈنے سے یہ ہوتا ہے یا پہلے تہبیہ تو بندہ کرے۔

اشFAQ صاحب: دیکھیں وہ تو صاحب جو ہیں، میں یہ نہیں کہتا خدا نخواستہ کہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ ان کو سمجھنے نہیں آ رہا اور وہ بیعت کرنے سے یا کسی آدمی کا ہاتھ پکڑنے سے اپنے آپ کو ٹھیک سمجھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایسا پروگرام پہلے سے موجود ہے جو ٹھیک راستوں پر ان کو لے جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ساری زندگی مجھے بھی یا بھجن نہیں ہوئی کہ کلام پاک میں کوئی چیز ایسی چیزیں ہے جو سمجھ میں نہ آتی ہو۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ میرا دلکھ یہ ہے جو چیزیں میری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مجھ سے ان پر عمل نہیں ہوتا۔ باقی میں دوسری طرف جاتا ہی نہیں۔ مثلاً پچھلے 75 برس سے مجھے ایک بات سمجھ میں آئی ہے کہ قول الناس حنا: لوگوں کے ساتھ

اچھی بات کرو، اور میری یہ حسرت ہی چلی آ رہی ہے کہ مجھ سے اچھی بات ہونیں پاتی۔ غصہ آ جاتا ہے۔ طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے، اور طرح کا ایک دم کا نشان تبدیل ہو جاتا ہے تو جب ایک آدمی کا تہیہ ہو جائے کہ میں نے اس راستے سے اُس راستے پر جانا ہے تو اللہ پھر اس کو برکت دیتا ہے، اور پھر وہ آدمی جس کی تلاش میں ہوتا ہے، وہ ایک دن خود صحیح پانچ بجے آ کے اس کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تہیہ ہو تو پھر ہوتا ہے۔ اگر نہ ہو، پھر مشکل ہے۔ پھر آدمی ڈھونڈنے کا تاریخ تھا ہے کہ بتائیں اشناق صاحب کوئی اچھا سا بابا ہے نا، کیونکہ ابھی اس کا ارادہ نہیں، اس کا صرف پروگرام بھی پوچھنا ہے کہ نارووال کو گازی کب جاتی ہے۔ کہیں جانا ہے، کہیں گا، میں نے جانا تو نہیں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔

ہمارے بارے جس کو کہتے ہیں تلاوت الوجود، جب آپ اپنے وجود کی تلاوت شروع کرتے ہیں، اور پھر دیکھیں کیا عجیب نرم (Term) ہے۔ پھر آپ کو پتا چلنے لگتا ہے۔ ہم نے تو کبھی کی نہیں۔ ہم تو اپنے وجود سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ اس کو قریب نہیں آنے دیتے۔ آپ کبھی اپنے ساتھ اکیلے بیٹھ کے دیکھیں، پندرہ منٹ کو ٹھڑی بند کر کے۔ پتا ہے، قید تہائی سب سے خوفناک سزا ہوتی ہے۔ اپنے ساتھ بیٹھو گے تو بہت سارے بچ آ کر آپ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ آدمی بچ مارتا ہے، بھاگتا ہے۔ یہ بڑے ارادے اور جیسے والوں کا کام ہوتا ہے، جو ایسی بات کریں کہ مجھے اپنے اندر کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نپولین اعظم جب فریڈرک کی قبر پر گیا تو اس نے دیکھا کہ فریڈرک کی قبر کے اوپر اس کی تکوار لٹک رہی ہے۔ بڑی روشنی اس پر پڑ رہی ہے۔ اس نے حکم دیا اپنے جرنیل سے کہ تکوار کو اتار کر پیرس کے عجائب گھر کی نذر کر دو تو وہ تکوار اتاری گئی، اور بعد میں اتار کے نپولین کے حکم پر اس کو پیرس کے عجائب گھر میں رکھوا دیا گیا۔ بہت بڑے بادشاہ کی یہ تکوار ہے۔ جرنیل کے شدت سے نہیں کہیں گے کہ میں، اور یہ میری تکوار ہم دونوں ایک ہیں تو پھر آپ کسی اور طرف نہیں جھانکیں گے۔ تو میں عرض کر رہا تھا، کیا کبھی ایسا ہوا، کیا کبھی ایسا ہو سکے گا۔ میں اسلام صاحب سے جو۔

ہمارے بہت بڑے شاعر ہیں، اور اخبار نویس بھی ہیں، ماشاء اللہ اسلم صاحب بھی میں اپنے طور پر ایسے سوچتا ہوں کہ ہم لیٹریچر والیہ لیٹریچر لکھتے ہیں، اور اس میں اکثر و بیشتر شکایات ہوتی ہیں کہ ہمارے ہاں گند کے ڈھیر پڑے ہیں۔ توجہ نہیں دی کار پوریش و والوں نے، اور حالانکہ ان کے ایکشن بھی ہو گئے، اور بالکل بیٹھے ہیں، اور کچھ نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہاں ستم میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے ہاں

یہاں پر نقل بڑھ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا کبھی آپ کے نہاں خانوں یا آپ کے خیال میں یا آپ کی یادداشت میں کبھی کوئی ایسا خط نو دا ایڈیٹر لکھا گیا ہے۔ محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ ہمارے یہاں پر گندگی کے ڈھیر پچھلے دس ہفتوں سے پڑے ہیں، اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مہربانی فرمائی کر اپنے شاف میں سے کوئی نیک، اور دردمند بندہ بھیجیں جو آ کر ہمارے دلوں کو تبدیل کر دے، اور ہم گند اٹھانے والے کے بجائے خود اس کی صفائی کریں۔ میرے خیال میں ایسا لیٹر کوئی چھپا نہیں کہ ہم دردمندی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ خرابی پیدا ہو گی۔ آپ ایسا کریں کہ آپ ہم کو ایسا بندہ بھیج دیں جو ہمارے اندر وہ سویا ہوا جو ہر جو ہے، اس کو جگادے، اور پھر ہم اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہے یہ۔ یہ امتحان دینا، یہ سکول میں بیٹھنا، یہ آگے چلا، یہ صفائی رکھنا۔ اب دیکھیں تا سرخ بیتی پر کھڑے ہونا ہمارے لیے جان کا عذاب بنارہتا ہے۔ اب ہم چاہیں گے کہ ہم کسی اخبار کے ایڈیٹر کو ضرور خط لکھیں۔ آج کے بعد کہ مہربانی فرمائی کر کوئی ایسا آدمی ہمارے درمیان بھیجیں جو ہمارے اندر یہ بات پیدا کر دے، جائزیں کر دے کہ ہم نے سرخ بیتی پر کھڑے ہونا ہے۔ بالکل کچھ اس طرح سے۔ میں کچھ عرض کروں جیسے کہ بابا جی نے کہا تھا، انبیا کی تعلیم میں کیا فرق ہے؟ ہم جیسے لوگوں کو جب آپ کے سامنے ہماری کوتا ہیاں، خرابیاں، آپ کے پاس موجود ہیں، آپ جانتے ہیں، میں جانتا ہوں، لیکن ان کی تعلیم کا اثر کیسا چلا آ رہا ہے۔ ہم اپنی تمام تر خرابیوں کے باوصف تمام تر کوتا ہیوں کے ہوتے ہوئے جب انبیا کے بتائے ہوئے حکم پر روزہ رکھ لیتے ہیں تو ہم کبھی غسل خانے میں، کوٹھڑی میں جا کر کچھ نہیں کھاتے۔ حالانکہ سپاہی کھڑا ہوتا ہے تھا وہاں پر گورنمنٹ کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی چالان ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گرمیوں کے جب روزے آتے ہیں، پیاس سے مر جاتے ہیں، کھپ جاتے ہیں، بری حالت ہو جاتی ہے۔ غسل خانے میں جا کر تین تین مرتبہ نہایا کرتے تھے، لیکن وہاں بڑے مزے سے چلوگا کر آدمی پانی پی لے، کون دیکھ رہا ہے، کون روک سکتا ہے، لیکن نہیں پیتا۔ وہ یہ کہ اندر تبدیل ہوتا ہے۔ لیکن اب جب آتے ہیں۔ اب جب اندر تبدیل نہیں ہوتا، اور ارد گرد تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو بابے کہتے ہیں، جب ارد گرد تبدیل ہوتا رہے گا، آپ مر ہوں منٹ رہیں گے لوگوں کے، اور آپ کی زندگیوں میں وہ استقامت، اور استواری پیدا نہیں ہو گی جو کہ ہوتی ہے۔ تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ آئندہ سے ہم ایسے ہی ایک دو لیٹر نو دا ایڈیٹر لکھیں۔ ہاں ایک رسم پڑنی چاہیے کہ جناب ہم ٹھیک ہونا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ پوچھ رہے تھے کیسے؟ ایک دفعہ کسی بزرگ نے دیکھا کہ بغداد کی دانہ منڈی کے باہر ایک پتھر کے اوپر شیطان بیٹھا رہا ہے تو بزرگ بڑے حیران ہوئے۔ وہ اس کے قریب گئے، اور کہنے لگے کہ ابلیس کیا ہے تو رہا ہے؟ اس نے کہا، جی میرا بہت برا حال ہے۔ انہوں نے کہا، ن بھی نہ تو تونہ رو۔ تمہیں تو اتنے کام بگاڑنے ہیں لوگوں کے۔ اگر تو ہی رونے لگ گیا تو

زاویہ

کیا ہوگا؟ اس نے کہا، بابا جی میرا دکھ۔ انہوں نے کہا، دکھ کیا ہے؟ کہنے الگ جی میرا دکھ یہ ہے کہ میں اچھا ہونا چاہتا ہوں، اور مجھ سے ہوانہیں جاتا۔ تو یہ تو دکھ ہم سب کا ہے۔ ہم زور تو لگاتے ہیں، بڑی کمال کی بات کی۔ اس نے کہ ہم اچھے ہونا چاہتے ہیں، ہوانہیں جاتا۔ چاہیے کہ ہم ہونے کی کوشش تو کریں، یہ خواہش تو کریں کہ ہم اچھے ہو جائیں تو اس سے برا فرق پڑ جاتا ہے۔

ہماری بات تو ہوتی رہتی ہے۔ گفتگو بھی ہوتی رہتی ہے، لیکن ہم روئے کبھی نہیں۔ اپلیس ہم سے بہتر تھا کہ چیج رویا۔ وہ بازی لے گیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب اس گفتگو کے بعد ہم ضرور یہ کوشش کریں گے کہ لوٹ کے اپنی ذات تک صرف اپنی ذات تک کہ ہم اپنا کلاک جو ہے، اس کے اندر جو کھڈڑ پھوس پھنس گیا ہے، اس کو نکالیں گے۔

آپ کا بہت شکر یہ خواتین و حضرات۔ مہربانی اس پروگرام کو دیکھنے کی۔ آپ کا بھی بہت بہت شکر یہ، ہم سب آپ کے ہڑے ممنون ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

محبوب کون؟

خواتین و حضرات جب عید آتی ہے تو اس کی اپنی خوشی ہوتی ہے۔ ایک اس کے ساتھ بہت بھی چھوٹی چھوٹی عیدیں وابستہ ہوتی ہیں جو ماضی میں ایک پرانی لڑکی کے ساتھ لعنتی رہی ہیں۔ ایک زمانہ ہوتا ہے، یا ایک زمانہ تھا، جب ہم اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر عید پڑھنے جاتے تھے۔ پھر یہ وقت آیا ہم انگلی چھڑوا کے بالکل آزاد ہو کے نوجوان، لڑکوں کی طرح اکیلے اکیلے عید پڑھنے جانے لگے اپنے دوستوں کے ساتھ۔ پھر یہ وقت آیا اپنے بچوں کی انگلی پکڑ کے بہت ساری عیدیں ہوئیں۔ پھر یہ وقت آیا کہ اپنے بچوں کے بچوں کو ساتھ لے جا کر، اور انہوں نے پیچھے مژمڑ کر اپنے باؤں کو یہ کہہ کر کہ دادا بہت پیچھے رہ گیا، آہستہ چلو۔ پھر بھی ہم عیدیں پڑھنے گئے۔ اس عید کے رشتے سے مجھے بات یاد آئی، آج سے تھیک بائیس برس پہلے میں اپنی مسجد کی چار دیواری سے عید پڑھ کے نکل رہا تھا، اور ہم لوگوں سے مل رہے تھے، جب آپ عید کی نماز پڑھ کر ہوتے ہیں تو پھر اپنے دوستوں، ساتھیوں، عزیزوں، دوسرے نمازیوں سے گلے ملتے ہیں، اور ایک خاص انداز کا معافہ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ترا دھرا ایک دفعہ دھر کرتے ہیں، تو یہ کرتے کرتے جب ہم باہر نکلے، بہت سارے پرانے دوست ملے، تو مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ ہم اپنے دوستوں کو تو ملتے ہیں جن کو جانتے ہیں، اور جو اس مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر ہمارے دوست نہیں ہوتے، لیکن ان کا ہماری ذات کے اوپر کسی نہ کسی حوالے سے احسان ضرور ہوتا ہے تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں ماذل ناؤن میں رہتا ہوں، اس علاقے کا جو تھانیدار ہے، جورات کو سیئی بجائے والے سپاہی بھیجا ہے، جو بائیکل پر گشٹ کرتے ہیں۔ وہ کون ہیں؟ مجھے ان کے ساتھ بھی جا کر عید ملنی چاہیے، اور ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ ہمارے محافظ ہیں، اور آپ اس کے لیے اتنی ساری کوششیں، اور ”کھچیل“ کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے پتا نہیں تھا کہ ہمارا تھانہ کہاں ہے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا، اے بلاک میں۔ تو میں گاڑی لے کر وہاں گیا کہ ان سے ملوں۔ جب میں گیا تو اس تھانے میں ہو کا عالم تھا۔ سب

لوگ اپنی اپنی نماز ادا کرنے کے لیے جا چکے تھے، جوانوں کو چھٹی دی گئی تھی۔ تھانیدار صاحب ایس ایچ او صاحب اپنی پرانی وضع کی میلی، سلوٹوں سے بھری درودی پہن کر، اور یہاں انگلی میں پھنسا کے سکریٹ اور چکنی بجا کر گل جھاڑنے کے لیے کرسی پر بیٹھنے تھے۔ انہوں نے اپنے پاؤں میز کے اوپر رکھے ہوئے تھے، اور وہاں تھا کوئی نہیں۔ میں جب اندر داخل ہوا تو میں نے کہا، جناب اجازت ہے۔ کہنے لگے، فرمائیے جناب اعلیٰ۔ میں نے کہا، نہیں میں تو آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ کہنے لگا، جی حکم۔ انہوں نے پاؤں نیچے اتار دیئے میز سے، اور بیٹھ گئے۔ تھانے والے جناب عالی یا جناب اعلیٰ کہہ کر بلا تے ہیں۔ ان کا ایک انداز ہے۔ تو کہنے لگے، جناب عالی کیا کام ہے۔ میں نے کہا، کوئی کام نہیں۔ میں تو ایسے ہی آیا ہوں۔ کہنے لگا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی تھا نے میں آئے، اور اس کو کوئی کام نہ ہو۔ میں نے کہا، نہیں آج میں اس غرض سے نہیں آیا۔ آپ ایس ایچ او ہیں۔ کہنے لگا جی میں ایس ایچ او ہوں۔ میں نے کہا، میں آپ سے عید ملنے کے لیے آیا ہوں تو وہ بڑے حیران سے ہوئے اور کہنے لگے، بڑی مہربانی و علیکم عید مبارک۔ میں نے کہا، پہنچیے تھانیدار صاحب و علیکم عید مبارک ایسے تو نہیں ہو جاتی۔ آپ کو اٹھ کر کھڑے ہونا پڑے گا، اور پھر میرے ساتھ عید ملنی پڑے گی۔ یہ تو کوئی طریقہ نہ ہوا عید ملنے کا۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں۔ ان کو میری بات سمجھنے میں نہیں آئی تو میں نے گستاخی کرتے ہوئے ان کے کندھوں سے پکڑ کر جہاں ان کے شارز لگے ہوئے تھے ان کو اوپر اٹھایا تو کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہو کے میں نے ان کو ایک ”نچھی“ ڈالی تو وہ ذرا سا گھبرائے۔ جب میں نے دوسری طرف سر کر کے معاف مقام کیا جو انداز ہوتا ہے، تو انہوں نے اتنی زور سے رونا شروع کیا۔ آس او آس کر کے کہ میں ڈر گیا۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ بہت اوچھی آواز میں۔ اتنا بڑا تھانیدار، بھاری بھر کم جسم کا آدمی اوچھی آواز میں رونے لگا۔ تو میں بالکل لرزہ بر انداز ہو گیا تو وہ جو تیرا معاف مقام کیا ہوتا ہے، وہ میں نہیں کر سکا، کیونکہ میں گھبرا یا ہوا تھا، رو تے ہوئے انہوں نے کہا، جناب عالی اگر آپ پچھے آدمی ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں برس کی سروں میں یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی شخص مجھے عید ملنے آیا ہے۔ کسی نے آ کر مجھے نچھی ڈالی ہے۔ ورنہ میں اور میری ساری قوم جو ہے تھانے کی، اچھوت ہے، ہم چند اال ہیں، اور ہم چور ہیں، اور ہم کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔ انہیں برس کی سروں میں آج پہلی مرتبہ مجھے انسان سمجھا ہے۔ اگر آپ..... میں نے کہا، بالکل میں اتنی دور سے چل کر آیا ہوں، اور آپ جیسا، اور کوئی انسان ہے بھی نہیں، لوگوں نے ہمارے درمیان بہت بڑا خلا، اور بہت بڑی خلیج پیدا کر رکھی ہے۔ لوگ ہمارے قریب نہیں آتے۔ ہم لوگوں کے قریب نہیں جاتے۔ یہ غلطی پتا نہیں کہاں سے شروع ہوئی ہے، اور کیوں ہوئی ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم میں، لیکن ہمارے اوپر ایک ایسی شرمندگی کی چادر تھی ہوئی ہے کہ ہم مل نہیں سکتے۔ آپ لوگ چونکہ بڑے لوگ ہیں، اس لیے آپ ہمارے قریب نہیں آتے۔ تو پھر بار بار مجھ سے پوچھتے، کیا آپ پچھچجھ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تو میں نے کہا، میں پچھچ

آپ سے ایمانداری سے اللہ رسول کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں، میں مسجد سے لکھا ہوں۔ ابھی میں گھرنہیں گیا۔ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ تو پھر کہنے لگا، آپ بنیس میرے ساتھ چائے پین۔ میں نے کہا، میں ضرور بنیس کا اور ضرور چائے پینوں گا۔ اس سے اچھی، اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

جب میں ان سے مل کر چلا، تو میرے دل میں خیال آیا، گھر جاتے جاتے کہ یہ محبت کی وہ کمی ہے جس کی آمد و رفت ہمارے درمیان میں رک چکی ہے، اور ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں ہیں، اور ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں ہیں، اور اس میں بہت بڑی اونچی دیواریں ہیں جو ہمارے درمیان کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنے اویب دوستوں کو صحافیوں کو، اور دانشوروں کو بلا کے، اور تھانے کے ان لوگوں کو جو پولیس کے مجھے سے تعلق رکھتے ہیں، ملاؤں گا، اور ان کی آپس میں گفتگو کرواؤ گا تاکہ ان میں ارتباٹ باہمی پیدا ہو، اور وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں، تو اس کا انتظام کیا گیا۔ ہمارے ہاں لاہور میں ایک جگہ ہے الفلاح، ہمارا ایک ففتر تھامیشنل ری لنسر کشن کا۔ تو وہاں ایک ہاں تھا۔ اس میں بندوبست کیا۔ تو پولیس والے بہت خوش ہوئے وہ اپنی نئی نئی وردیاں اچھی کلف لگی ہوئی اسٹری کی ہوئی، اچھے بوٹ چکا کے آگئے۔ ان میں ڈی آئی جی، ایس ایس پی، انسلکر، ایس ایچ او، اور کافی ہاں جو تھا، بھرا ہوا تھا۔ پھر الگ کر سیاں بھی تھیں، اور ہم لوگ جو تھے، ہمارے ساتھی دانشور، اویب، صحافی وہ بھی موجود تھے۔ یہ ہمارے درمیان بڑا خلا ہے، اور بہت بڑی خلیج ہے۔ اس کو پُر کرنا چاہیے، اور اس کو Bridge Over کرنا چاہیے تو میں نے ان کو زحمت دی ہے۔ آئیں، آپ بھی کچھ بات کریں۔ یہ بھی کریں۔ اچھی ہے یہ ابتدا جس طرح دنیا کے دوسرے ممالک میں خاص طور پر انگلستان میں جو ”بوبی“ محبت کی نظروں سے دیکھتا ہے، ”بوبی“ جو سماں ہوتا ہے، اس کا بچوں نے پیارے نام ”بوبی“ رکھا ہوا ہے، اور جتنے بچے سکول جاتے ہیں، اور راستے میں کوشش کرتے ہیں کہ بوبی ان کو ملے جو نریفک کنٹرول کر رہا ہوتا ہے، وہ اسے ہاتھ ملا کر جائیں۔ بوبی کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ سکول جاتے بچوں کو ساتھ چمنا کے تھکی دے کے، اگر اس کی جیب میں کوئی میٹھی گولی، یعنی ڈرائپ ہو، وہ رکھتا ہے جیب میں۔ وہ ان کو ضرور دیتا ہے۔ ان کے درمیان محبت کا بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو راستے پوچھنے والے کوئی بھی، آپ کو مشکل ہو تو آپ اپنے بوبی سے پوچھتے ہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

میں لندن میں تھا تو ایک مالی بذھی ہمارے یہاں کی، کوئی اس کو زبان بھی نہیں آتی تھی تو وہ بوبی اس کے ساتھ بے چارہ لگا رہا۔ اب وہ بول رہی تھی پنجابی وہ انگریزی۔ اب باہمی گفتگو جاری تھی۔ وہ ایک ہی بات کہہ رہی تھی کہ برہمی گاؤں میں جانا ہے۔ برہمی گاؤں جانا ہے وہ سمجھتا نہیں تھا۔ میں نے بھی مالی سے پوچھا میری بیوی بھی ساتھ تھی کہ ”تو اتنے تھے کہے برہما کر رہی ایں“۔ ”سینیں مینوں میرے پت نے کہیا سی اونتھے ہے گا۔ میں سارا بھلاں گی۔“ تو وہ بعد میں پتا چلا کہ وہ بر منگھم جانا چاہتی تھی اور

برہمی گاؤں ملاش کر رہی تھی، تو اتنا ہمیں پتا چل گیا۔ اس نے کہا Thank you very much میں اس مشکل سے نکل گیا ہوں۔ وہ بر مفہوم گاؤں جانا چاہتی تھی۔ I would help her آپ گھبرا میں نہیں۔ میں نے کہا، کیسے۔ اب نہ اس کے پاس نکلت ہے۔ لندن تک تو وہ پہنچ گئی جہاز نے اتار دیا۔ کہنے لگا، Now it is my duty تو میں اس کو لے کر جاؤں گا۔ تو میں نے کہا، آپ کیسے جائیں گے۔ کہنے لگا، نہیں ہمارے پاس روزمرہ کے اخراجات میں سے سرکار نے اتنے پیسے دیئے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی مشکل میں ہو تو اس کی مدد کریں۔ تو میں لے جاؤں گا۔ اپنا بھی نکلت خرچ کروں گا، اس کا بھی کروں گا اور اس کو منزل تک پہنچاؤں گا تو اگر اس کا بیٹا جس کا پیدا اس نے بتایا ہے، اس کے ہاں سے پیسے مل گئے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں آ کر اپنے محلے کو بتا دوں گا۔ تو میں یہ چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان بھی اس قسم کا رشتہ قائم ہو تو کیسی محبت کی بات ہے۔ ہاں میں یہ بات کر چکنے کے بعد پھر میں نے اپنے ایک جو سینٹر دوست تھے، ان سے کہا کہ آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ آئے رو سڑم کے اوپر۔ مایک پر کھڑے ہو کے انہوں نے کہا، بڑی خوشی کا موقع ہے۔ اشفاق صاحب نے یہ بندوبست کیا ہے، ہم بہت خوش ہیں۔ آج بہت سارے پولیس والوں سے ملنے کا اتفاق ہو گیا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آج کل رشوں کا کیا ریٹ ہے تو سارے کیے دھرے پر انہوں نے پانی پھیر دیا۔ ایک ہی بات کہہ کے۔ انہوں نے کہا، اچھا اش فاق صاحب، السلام علیکم، بڑی مہربانی آپ کی، آپ نے ہمیں بلا یا تھا، اور اس طرح سے ذیل و خوار کر کے بھیج دیا ہے۔ اب ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔ میں نے بڑی کوشش کی۔ بڑی ان کی منتیں کیں، لیکن وہ سارے سیٹوں سے اٹھ گئے، اور کہا، یہ ہمارے ساتھ ہونا تھا۔ اس کو بھی کہا، بابا ہم یہ تو آپس میں محبت پیدا کرنے کی کوششوں میں تھے۔ کہنے لگا نہیں جی نہیں۔ یہ نامعقول لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ محبت کی نہیں جا سکتی۔ تو پھر مجھے خیال آیا۔ کہ یہ جو محبت کا معاملہ ہے اس کو بھی ہم لوگ اچھی طرح سمجھنے نہیں ہیں۔

میری بیوی اپنے بیٹے کو، جو سب سے بڑا بیٹا ہے، اس کو غالباً پڑھا رہی تھی، وہ سٹوڈنٹ تو تھا سائنس کا، اردو اس کا آپشنل مضمون تھا۔ غالباً وہ پڑھا رہی تھی تو وہ اوپر بیٹھا کچھ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہماری ایک میانی کی ہے اس پر بیٹھ کر پڑھ رہے تھے تو میری بیوی نے آواز دے کر شکایت کی کہ دیکھو جی یہ شرارتیں کر رہا ہے، اور کھل رہا ہے کاغذ کے ساتھ، اور توجہ نہیں دے رہا۔ میں اس کو پڑھا رہی ہوں۔ تو اس نے کہا، ابو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ امی کا قصور ہے۔ اس سے پوچھ رہا ہوں۔ امی محبوب کیا ہوتا ہے، اور یہ بتا نہیں سکتیں کہ محبوب کیا ہے۔ میں نے کہا، بیٹے میں بتاتا ہوں کہ محبوب وہ ہوتا ہے جس سے محبت کی جائے۔ کہنے لگا، یہ تو آپ نے ٹرانسلیشن کر دی۔ ہم تو سائنس کے سٹوڈنٹ ہیں، ہم اس کی Definition جانا چاہتے ہیں کہ محبوب

کیا ہوتا ہے۔ یہ امی نے بھی نہیں بتایا تھا۔ آپ ایک چھوڑ کر دوادیب ہیں۔ دونوں ہی ناقص اعقل ہیں کہ آپ سمجھا نہیں سکے۔ میں نے کہا، یہ بات تو نحیک کہہ رہا ہے۔ یہ تو ہم نے اس کا ٹرانسلیشن کر دیا، لیکن محبوب کی Definition تو نہیں دے سکے اسے۔ میں نے کہا با نقد سیہ اور وہ میرا بینا پنجے اتر آئے۔ میں نے کہا، چلو بابا جی کے پاس چلتے ہیں ڈیرے پڑھاں سے پوچھتے ہیں۔ یہ محبوب کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا، چھوڑیں آپ ہر بات میں بابا کو لے آتے ہیں۔ وہ بے چارے ان پڑھا آدمی ہیں۔ بکریاں و کریاں رکھی ہیں، گذریا قسم کے، وہ کیا بتائیں گے۔ میں نے کہا نہیں، مجھے جانے دیں پلیز ضرور۔

بانوقد سیہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی لے کر ہم نکلے، وہاں پنجے۔ انفتری روڈ پر۔ بابا جی بانڈی وغیرہ پکانے میں مصروف تھے۔ دال پکار ہے تھے۔ ساتھ تو نہ تھا۔ روٹیاں لگوانے کے لیے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، تو یہ میری بیوی اتری جلدی سے جیسے آپ پنجابی میں کہتی ہیں اگلے واہنڈی پہلے ہی پنجے کے، اس نے جلدی سے اوپنجی آواز میں یہ کہا کہ جو باہر مجھے سنائی دی۔ میں تالا لگا رہا تھا گاڑی کو۔ اس نے اوپنجی آواز میں کہا، بابا جی محبوب کیا ہوتا ہے۔ تو بابا جی کی عادت تھی کہ وہ انگلی اٹھا کر بات کرتے تھے۔ جب کوئی Definition دینی ہوتی تھی، کوت استبل کوٹ ہوتی تھی تو ہمیشہ انگلی اٹھا کے بات کرتے تھے، اور انہوں نے ایک انگریزی کا لفظ، پتا نہیں کہاں سے سیکھا تھا۔ نوٹ (Note) تو ہم اٹینجے (Attentive) ہو جاتے تھے کہ اب اس کے بعد کوئی ضروری بات آ رہی ہے، تو انہوں نے ڈولی چھوڑ دی جو پھیر رہے تھے۔ کہنے لگے نوٹ ”محبوب وہ ہوتا ہے جس کا نہ نحیک بھی نحیک نظر آئے۔“ یہ Definition چیز نہ نحیک ہوتی ہے۔ پھر کی کافی چیزیں نہ نحیک ہوتی ہیں، لیکن ماں اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کی ہر چیز نہ نحیک ہوتی ہے۔ محبوب وہ ہوتا ہے جس کے نہ نحیک کا پتا ہوتا ہے کہ نہ نحیک ہے، لیکن نحیک نظر آتا ہے۔ میں نے کہا، آ جاؤ بھی! تو ہم یہ جو پڑیا تھی ساتھ لے کر آئے۔ میرے ذہن پر اس کا اثر تھا۔ جب میں نمازِ عید پڑھنے گیا، تھانیدار صاحب سے ملنے، تو میں نے یہ سوچا کہ باوجود اس کے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ نحیک آدمی ہے، لیکن اب اگر کوئی ہم کو محبت کی پڑیا دینا چاہرہ ہے ہیں تو ان کو نہ نحیک والوں کو نحیک سمجھ کر دی اپروچ کی جا سکتی ہے نا، تو یہ ہی کوششیں کی، لیکن ابتداء میں ایسا نہ ہو سکا۔

پھر مجھے آہستہ آہستہ پتا لگنے لگا کہ یہ طبقاً پنے طور پر بڑا مظلوم ہے۔ میں ان سے ملتا رہا۔ اپنے اس دوست سے، جس سے نئی نئی دوستی پیدا کی تھی۔ تو میں نے کہا، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ تو وہ مجھے کہنے لگے، اگر آپ کو کبھی موقع ملے تو ایک دستہ کاغزوں کا تھانے میں دے دیں۔ ایک دستہ کاغزوں کا بارہ آنے کا آتا تھا، اور دو پسلیں جس کے پیچے رہ لگا ہوا ہو۔ تو میں نے کہا، آپ کو شیشڑی نہیں ملتی سرکار کی طرف سے۔ کہنے لگے ملتی ہے۔ سارے تھانے کی گیارہ روپے مہینے کی

سیشنری ہوتی ہے ساری، (اور وہ صحنیاں بھر بھر کے جوان کا شائل ہے، لکھنے کا بے شمار کاغذ بھرتے ہیں) تو میں نے خود اپنے دوستوں سے کہہ کے ان کو تھفتہ سیشنری جتنی بھی ہم مہیا کر سکتے تھے، انہیں دیتے رہے، اور وہ خوش ہوتے رہے۔ پھر میں سوچتا تھا، ان کو ”بولی“ میں کیسے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو بہت مشکل بات ہے کہ ہم نے پورا تعلق ہی ان سے توڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ہم سے توڑا ہوا ہے۔ کسی وجہ سے ٹوٹ گیا، تواب استوار ہونیں ملتا۔

پھر میں نے دیکھا، میرا دفتر مال روڈ پر تھا۔ میاں میر پل پر وہاں سپاہی سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہوتے تھے، اور کسی سربراہِ مملکت کو ایک پورٹ جانا ہوتا تھا۔ وہ گورنر ہاؤس سے نکلا تھا۔ ایک پورٹ جاتا تھا، اور گرمی میں دھوپ میں بری حالت میں کھڑے ہوتے تھے۔ اب پتا نہیں وہ کب نکلے سربراہِ مملکت صدر ہو یا وزیرِ اعظم۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ صحیح دس بجے کے کھڑے شام کے تین نج گئے، میں دو تین دفعہ دفتر سے نکلا۔ میں نے دیکھا تو ان سے پوچھا، گزر انہیں صاحب ایک پورٹ کو جانے کے لیے۔ انہوں نے کہا، جی وہ نکلے تھے گورنر ہاؤس سے، پھر ان کو کچھ کام پڑ گیا، اور پھر واپس چلے گئے۔ وہاں کوئی پیغام ٹیکس آگیا۔ وہ وہاں پر بیٹھے ہیں مینگ ہو رہی ہے۔ تو میں نے کہا، آپ یہاں کھڑے ہیں، بہت زیادہ گرمی ہے۔ آپ کیسے کھڑے ہیں۔ کہنے لگے ہم بل نہیں سکتے۔ میں نے کہا، آپ نے پانی پیا ہے۔ کہنے لگنہیں جی، ہمارا کوئی ایسا بندوبست نہیں ہے۔ میں اپنے دفتر گیا تو ہمارے پاس فضول پر اپنی بالکلیاں گندی قسم کی تھیں، ان میں پانی جو گھڑے کا تھا، سخندا بھی نہیں کر سکے، کوئی ایسا انتظام تھا ہی نہیں، ڈال کے، دو گندے مندے گلاس لے کر آیا۔ ان کو پانی پلایا تو بے چارے بڑے شکر گزار ہوئے۔ وہ مجھے بہت اچھا، اور نیک آدمی سمجھنے لگے کہ لا ہور میں ایک اچھا آدمی ہے۔ ورنہ ان کو پانی کون پلاتا ہے۔ جب شام ہمارا دفتر بند ہوا، اور ہمارے سربراہِ مملکت چلے گئے تو پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی اس جگہ سے ملتے ہوئے واپس جانے لگے، تو میں جا رہا تھا گھر کو۔ جب میں نے ان کو دیکھا تو پوچھا، آپ کے جانے کا کوئی بندوبست ہے، تو انہوں نے کہا، ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔ صحیح ہم کو پھینک جاتے ہیں یہاں پر۔ ہم ظلم کر کے ڈنڈا کھا کے کسی کو روک لیتے ہیں کہ ہمیں سڑک پر یہاں اتار دو۔ ہماری یہاں ڈیوٹی ہے۔ شام کو واپس جاتے وقت کوئی ہمارا انتظام نہیں ہے، تو پھر میں نے گاڑی روکی اور کیریئر اور انہیں کہا کہ بیٹھیں۔ اب وہ پچیس تیس سپاہی، اور آپ نے اگر چھوٹی کیریئر گاڑی چلائی ہو، اور اس میں پیچھے اتنا لوڈ ہو، اور آپ مزیں ایک دفعہ تو آپ گرتے گرتے بچیں۔ وہ کہنے لگے اگر آپ ہم پر بہت مہربانی کرنا چاہتے ہیں تو آپ چیئر نگ کر اس تک پہنچاویں۔ وہاں سے ہم کوئی بندوبست کر لیں گے تو انہیں لے کر وہاں گیا۔ یہ بات جو تھی میرے لیے بڑی تکلیف دہ جب بھی تھی، اب بھی ہے۔ اور میری آرزو جب بھی تھی، اب بھی ہے کہ ان کو میں ”بولی“ سے بھی

بہتر روپ میں دیکھوں، اور ہمارے، اور ان کے درمیان ایک محبت کا رشتہ قائم ہو۔ یہ نہ ہو سکا، لیکن یہ آرزو میرے اپنے طور پر پروان چڑھتی رہی۔ تو پھر ایک آئی جی آئے۔ بہت ادیب نواز تھے۔ چودھری سردار محمد ان کا نام تھا۔ ان سے جب بات ہوئی تو انہوں نے کہا، جی۔ بسم اللہ آپ آئیں، اور ان کو ایڈر لیں کریں، اور ملیں۔ کچھ اور ادیبوں کو بھی ساتھ لے کر گیا۔

ان کے ساتھ بات چیت ہم نے شروع کی۔ تو ان کو یہ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ یہ عطاۓ الحق قائمی ہیں، یہ امجد اسلام امجد ہیں، یہ اصغر ندیم صاحب ہیں۔ بڑا حوصلہ ہوا ان کو، اور یہ ہماری عزت افزائی کے لیے آئے ہیں، تو انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ گوجرانوالہ آکے ہم سے بات کریں۔ گوجرانوالہ جا کے ان سے گفتگو ہوئی، وہ اتنے خوش ہوئے، اتنے متاثر ہوئے۔ وہاں پر ایک حملہ کر دیا تھا ذا کوڈ نے او جلد کالاں ایک جگہ تھی، جہاں پر ان کی جگہ ہے، وہاں پر مقابلہ ہوا، اور آئندھ پولیس آفیسر جو تھے، وہ شہید ہوئے۔ انہوں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ ہم تیار ہیں۔ اگر ہمیں عزت کی دولت ملتی ہے۔

تو خواتین و حضرات! ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ لوگوں کو پیسے کی روپے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی، جتنی احترام کی عزت نفس کی، تو قیرزادات کی ہوتی ہے، اور ہمارے ملک میں بد قسمتی سے اس کا رواج بڑا کم ہے، اور ہم نے کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ آپ حیران ہو کے سوچتے ہوں گے کہ وہ لوگ جو پیسا کرتے ہیں، چراتے ہیں، رشوت لیتے ہیں، اور ہم نے ان کو انترو یوکر کے پوچھا ہے کہ آپ کیوں رشوت لیتے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آپ ایسے قبیح فعل میں داخل ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، ہم بہت سارا روپیے لے کر اکٹھا کر کے اس سے عزت خریدتے ہیں۔ پیسا زیادہ ہو گا تو دیکھیے تا پھر آپ ان کو سلام کریں گے۔ وہ عزت خریدتے ہیں، ناجائز طریقے سے، اور جب خرید کھتے ہیں تو پھر معتبر نہتے ہیں۔ بڑی کار میں بیٹھتے ہیں، ہاتھ میں ٹیلی فون اٹھاتے ہیں، دوسرا میں کلاشکوف ہوتی ہے، اور آپ کہتے ہیں، سلام چودھری صاحب! اگر یہ سب کچھ یہے بغیر صاحبان عزت کو عزت عطا کی جائے یا جو آدمی جس مقام پر ہے، اس کو عزت عطا کر کے اتنا زیچ کر دیا جائے، زیچ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ کوئی بدل کر ہی نہیں سکتا کہ میں ایک صاحب عزت آدمی ہوں، تو ترقی یافتہ معاشروں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے کہ انہوں نے لوگوں کی Due عزت عطا کر دی ہے اور وہ لوگ اپنی عزت کی تکوار اپنے پہلو کے ساتھ لٹکا کر کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتے، جو ان کو تذلیل کی طرف، بے عزتی کی طرف مائل کرے۔ وہ کہتے ہیں ہم عزت دار آدمی ہیں، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ جس طرح میں پچھلی مرتبہ عرض کر رہا تھا کہ جب آپ روزہ رکھتے ہیں تو آپ روزے داروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی عزت اپنی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ پھر چاہے آپ کہیں بھی ہوں، غسل خانے میں ہوں، بند کوٹھوں میں ہوں، چھپے ہوئے ہوں، پانی چوری نہیں پیتے، کوئی چیز نہیں کھاتے، کوئی آپ کے اوپر سپاہی نہیں ہوتا،

تحانیدار نہیں ہوتا۔ کوئی اس کی قدغن نہیں ہوتی کہ یہ بندہ جو ہے اس کے اوپر نگاہ رکھی جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری حکومتیں جو ہیں، ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جائی چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں حکومتیں تو بڑی بے معنی، اور لا یعنی سی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی بیمار پر سی ایک دوسرے کی مزاج پر سی انسان ہی کرتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے کا پالن کر سکتے ہیں۔ وہی ایک دوسرے کو سہارا دے سکتے ہیں۔ حکومتیں کبھی نہیں دی سکتیں، تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ چیز بذریعہ کم ہو رہی ہے، اور ہمیں ایسے مرکز کی، اور ایسے ذریوں کی ضرورت ہے، جہاں چاہے ہمیں تعلیم نہ ملے جہاں چاہے ہم کو گراہمنہ سکھائی جائے، جہاں چاہے ہم کو درس نہ ملے، لیکن لوگوں کی تکریم ضرور ہے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہ صاحب علم نہیں ہے، اس لیے ہم عزت نہیں کرتے۔ ہم یہ کہیں گے، چونکہ یہ انسان ہے، اور یہ حضرت آدم کی اولاد ہے، اس لیے ہم اس کی عزت ضرور کریں۔

ہمارے ذریعے پر ایک وفعہ ایک نوجوان آیا، اسلامیہ کالج کا مستودعہ تھا، بڑا چھا، اور وہ سائیکل پر چڑھا ہوا سائیکل کے ساتھ ہی اندر آگیا تو جہاں بابا جی بیٹھے تھے چارپائی کے اوپر وہاں پائے پر پیر کھکھ کرنے لگا کہ ”اوہ باتوں کیا لوگوں کو غلط تعلیم دے رہا ہے، اور ان کو الہی اولیٰ باعثیں پڑھا رہا ہے۔“ اس پر ہم بہت ناراض ہوئے کہ جناب یہ کیا بات ہوئی۔ تو اس نے کہا، ”تجھے پتا ہے کہ انسان جو ہے یہ Evolution کے ساتھ انسان بنتا ہے۔ پہلے انسان بندر ہوتا تھا۔“ بابا جی نے کہا، پیٹا تم کم از کم یہ بات نہ کرو۔ ہماری تو عزت افزائی ہوئی ہے تو تو پیغمبروں کی اولاد سے ہے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ کہنے لگے، یہ بابا آدم کا بیٹا ہمارے پاس تشریف لایا ہے۔ اپنے آپ کو کبھی بھی بندروں کی اولاد نہ کہنا۔ تم نبیوں کی اولاد ہو۔ اب جب اس نے یہ بات سنی کہ وہ نبیوں کی اولاد ہے تو وہ اس بات پر بہت خوش ہوا اور پھر ایک اور طرح سے ایک اور رخ لے کر چلا گیا۔

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ یہاں تشریف لائے، باعثیں سنیں، اور آپ کا بھی جو ہم سے کچھ دور ہیں، لیکن دلوں کے قریب ہیں۔ اللہ آپ سب کو آسمانیاں عطا فرمائے، اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ کا نظام

ہم جو یہ اپنے زاویے کی محفل سجاتے ہیں، اور آپ تک پہنچتے ہیں تو یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ ہم سے لکھنے خوش ہیں، کیونکہ یہ یک طرفہ معاملہ ہے، اور یہ بات میں آپ کو بتاؤں کہ ابلاغ کی دنیا میں یہ جو ہم نے نئی ہڑکی کھولی ہے۔ اس کے بارے میں لوگ اکتسابی طور پر، کتابی طور پر تو یقیناً بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کا یہ حال رہا ہے کہ انہوں نے بابوں کے ساتھ بلا واسطہ طور پر رابطہ قائم کیا، اور ان سے کچھ پوچھا، اور علم حاصل کیا۔ ولایت کے لوگوں نے ایسے کام کیے ہیں، لیکن ہماری سطح پر ایسا نہیں ہوا، لیکن ایک دردناک بات بھی اس کے درمیان یہ ہے کہ ہم جوان کے پاس جاتے رہے تو ہم بھی پورے طور پر ان کی خوشنودی کا باعث نہیں بن سکے، کیونکہ میں اکثر اپنے بابا سے لا پڑتا تھا۔ کچھ معاملات ایسے آجاتے تھے کہ وہ میری دنیاداری کی راہ میں حائل ہوتے تھے، اور یوں بھی ہوا کہ دس دس مہینوں تک میں بھی ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا یا ان سے جا کر کچھ پوچھا نہیں۔ بڑے مسائل ہوتے تھے۔ پھر بات یہ تھی کہ ان کی سوچ کا انداز، اور ان کی زندگی بسر کرنے کا رو یہ ہماری سوچ سے، اور ہمارے چلن سے بالکل مختلف ہوتا تھا، اور ان کے اوپر قابو پانابڑا مشکل کام تھا۔

ایک مرتبہ جیسے ہم شاکی لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں، وہاں ڈیرے پر بیٹھ کر یہ شکایت کر رہے تھے کہ دیکھیں اللہ کا نظام کس قدر تکلیف دہ ہے کہ ایک آدمی بڑے اعلیٰ درجے کی کار پر چڑھا پھرتا ہے، اور دوسرے کو پیدل چلنا بھی میر نہیں۔ ایک لڑکی وہاں آئی تھی۔ ایک سال ہوا اس کی شادی ہوئی تھی لیکن پھر اس کو طلاق ہو گئی۔ اس کا خاوند چھوڑ گیا۔ ایک، اور بی بی تھی اس پر آبلے پڑے ہوئے تھے، چھالے جس کو ہم ”چھلوئے“ کہتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے چھلوئے، اور میں عرض کرتا تھا ان سے کہ اس کا کچھ علاج کریں تو وہ کہتے، ”خہریں ابھی دیکھتے ہیں۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گے۔ تکلیف ہوتی تھی کہ اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ اور بہت سی ایسی چیزیں، جن میں ہم ہر وقت اپنی زندگی کے ایام میں، مہینوں میں، ہفتوں میں شکایت کرتے رہتے ہیں، وہ وہاں بھی چلتا تھا۔ یہ ایسا کیوں ہوتا

ہے۔ اللہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس کا خاطر خواہ جو جواب ملتا تھا، وہ ان کی مسکراہت سے ملتا تھا۔ لیکن ہم چاہتے تھے کہ ہم کو خصوصی طور پر Specifically یہ بتایا جائے کہ اللہ ہم پر کیسے مہربان ہوتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ دیکھو زندگی بسر کرنے کے لیے زندگی گزارنے کے لیے جس شے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر زندگی کی گاڑی آگئے نہیں چل سکتی، اور اس کا تانا بانا نہیں بن سکتا، وہ اللہ نے دی Free of cost ہے اور سب لوگوں کو دی ہے۔ کالے، پیلے، نیلے، گورے، موٹے، دبليے۔ سب سے ضروری چیز ہے آسیجن۔ اگر آسیجن کسی وجہ سے جا کے کسی صاحب کو لانی پڑے ڈاکٹر کی دکان سے، اور ہر صاحب صحیح اٹھ کر اپنے اپنے کنستراٹھا کے گئے ہوں تین بچوں کے لیے بھی لانے ہیں، دو اپنے لیے کنستراٹوبابا جی جو گھر ہے وہ روتارہ جائے کہ مجھ بڑھے کو پوچھا نہیں۔ میرا کنستراٹھر ہی بھول گئے تھے۔ تو جائیں اور صحیح کنستراٹھروں کے لا میں، اور پھر لوگوں کو دیں یا ہمارے بیہاں پر ایسے پہپہ لے گئے ہوں، پڑوں پہپہ جیسے، وہاں جا کے اپنی آسیجن حاصل کریں تو زندگی عذاب بن جاتی۔ لیکن اللہ نے کچھ اس کا ایسا انتظام کیا ہے کہ ہر شخص کو وہ نہ بھی چاہتا ہو تو اس کو آسیجن ملتی رہتی ہے۔ آپ سر کے اوپر رضاۓ رلیں، اور بالکل اس کے اندر سرگھسیز کے، یہ کوششیں کریں تو ایک دم آپ کا Re action ہو گا کہ آپ اس کو اٹھا کے، اور چھپا کے اس دائرے میں آ جائیں گے، جہاں آپ کو آسیجن مل سکتی ہے تو یہ تو قیمتی Free of Cost چیز ہے۔ اور قیمتی ترین چیز ہے۔ اس سے زیادہ تو قیمتی چیز کوئی ہے ہی نہیں۔

پھر دوسری قیمتی ترین چیز جو ہے، وہ پانی ہے۔ پانی کا بھی اللہ نے ایسا انتظام کیا کہ 3/4 حصہ کرہ ارض کا پانی کار کھا۔ بادل آتے ہیں۔ بارش برستی ہے۔ ہر ایک کو یہ نعمت جو ہے آسانی سے بغیر کسی Cost کے بغیر کسی پیسا خرچ کرنے کے ملتی ہے، ہر آدمی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور کوئی شخص میرے خیال میں اس کرہ ارض پر ایسا نہیں ہے جس نے یہ بھی کہا ہو کہ میں پانی کے ذائقے سے نا آشنا ہوں، کیونکہ یہ بہت مہنگی چیز ہے، اور صرف امیر آدمی پانی پی سکتا ہے، ہم تو نہیں پی سکتے۔ دور سے لانا پڑے، نزویک سے لانا پڑے، مشکل سے لانا پڑے، لیکن پانی جو ہے وہ ہماری زندگی میں داخل ہے۔ اس طرح سے خواتین و حضرات کھانے کا سلسلہ ہے۔ روٹی جو ہے وہ بھی کوئی اتنی مہنگی نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عام آدمی کو بڑی آسانی کے ساتھ مل جاتی ہے، اور واقعی یہ کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آج تک روٹی کا ذائقہ نہیں چکھا ہے کہ اس کی خوبیوں کیسی ہوتی ہے۔ جو سارے ظلم ہیں، یہ انسان نے انسان کی ذات پر زیادہ کیے ہیں، دوسرے جانوروں کے خلاف۔ دوسرے جانور اپنی Species کو کچھ نہیں کہتے، لیکن انسان ایک ایسا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس آدمی کو جو میرا بھائی ہے، پڑوی ہے یا رشتہ دار ہے، فائدہ پہنچے، اور یہ بھی اس آسائش میں داخل ہو جائے جس آسائش میں میں داخل ہوں۔ تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس بات پر غور کیا جائے، اور اس کو قریب سے دیکھا جائے، اور جو ہم شکایت کیا کرتے

ہیں، اکثر شاکی ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ نکلے گا گھوم پھر کے بالا خر انسان، تھی جس نے ہمارے ساتھ ایسا روایہ اختیار کیا ہے۔

باقی رہ گئی یہاڑی کی بات۔ مثلاً وہ جو بی بی آئی تھی، وہ عجیب و غریب سی یہاڑی میں بتلتا تھی؛ اور میں ذرا شکایت میں بابا جی سے کہتا تھا کہ اس کو تین دن ہو گئے ہیں تو ہمیں پتا نہیں چلا کہ آپ نے اس کا علاج کب شروع کرنا ہے، تو وہ کہتے تھے کہ پھر وہ بینا، ذرا جب میں اس کا صاحب حال ہوں گا، مجھے سمجھنہ نہیں آتی کہ یہ کیا یہاڑی ہے تبھی اس کا علاج کر سکوں گا۔ تو میری سمجھے میں نہیں آتا تھا کہ کسی یہاڑی کا صاحب حال کس طرح سے ہوا جاتا ہے۔ چاروں کے بعد خود ان کے بازو پر ویسے ہی چھالے پڑنے شروع ہو گئے، اور تقریباً ان کا بازو بھر گیا تو پھر انہوں نے کہا کہ اچھا نکالو فلاں مرہم لگا کے دیکھتے ہیں۔ اب ان کو پتا چلا کہ تکلیف کیسی ہے۔ یہ درد کس نوعیت کا ہے، اور میں اس میں سے گزر رہا ہوں، تو پھر میں اس کو Apply کروں گا اپنی دوائی، تو پھر مجھے پتا چلے گا کہ اس کے اوپر کیا گز رہی ہے، کیا تکلیف اس کے اوپر طاری ہے۔ چنانچہ خیر اس کا علاج شروع ہوا، اور ہم خوش ہوئے کہ اس کی کیفیت جو تھی، وہ ٹھیک ہونا شروع ہو گئی، لیکن اس سے ہماری شکایت جو تھی۔ اس کے جذبے میں تو کمی ہو گئی لیکن شکایت کی نوعیت، اور اس کی Volume کم نہیں ہوئی اور ایسی ایسی باتیں کہیں کیونکہ ہم پڑے لکھے لوگ تھے، اور اس زمانے میں نیشے کا فقرہ زبان زد عام تھا کہ God is jet۔ نیشے نے کہا ہے تو ہم بھی ایسی باتیں کرتے تھے کہ Religion is the opium of people، ہم اس کا ترجمہ کر کے انہیں بتاتے تھے۔ انہوں نے کہی اس بات کا براؤ نہیں مانا۔ لیکن ایک تکلیف دہ بات ضروری کی، جس سے ہم ناراض ہوئے ان سے۔ اور وہ رشتہ کثا، اور مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ اتنا دس ماہ کا گیپ کیوں آیا ہے۔ کئی دفعہ آیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ جو لوگ غربت کی، اور عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور آپ کے گروہ انسانی کے درمیان رہتے ہیں، اور آپ تو جانتے ہیں ان کی بہت ساری ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ مجھ سے پوچھا کر آپ کے کوئی غریب رشتے دار ہیں۔ میں نے کہا، ہاں جی ہیں۔ کہنے لگے، کہاں ہیں۔ میں نے کہا جی وہ لا ہو رہیں ایک علاقہ ہے، اس کو ہم مصری شاہ کہتے ہیں، اور وہ دو موریہ پل عبور کر کے وہاں جایا جاتا ہے، ہم چونکہ صاحبِ حیثیت لوگ ہیں۔ ہم تو کہیں ان سے ملنے ہی نہیں۔ وہ چونکہ ہمارے غریب رشتے دار ہیں۔ اس لیے وہ بہادر مجبوری ہمارے پاس آتے رہتے ہیں۔ عید کو سلام کرنے آتے ہیں۔ بہت قریبی یعنی میری پھوپھی کے بیٹے، اور میری ایک دور کی خالہ کا سارا اکنہ۔ تو ہم ان سے ملنے اس لیے نہیں جاتے کہ ہم ان کو برا کھھتے ہیں۔ ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہوتا، اور ہماری مصروفیت اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ ہم ان کے ساتھ اتنا سارا وقت نہیں گزار سکتے۔ تو کہنے لگے کہ دیکھیں بات یہ ہے کہ آپ کو جتنی تباہ ملتی ہے، وہ ساری کی ساری آپ کی نہیں، چونکہ آپ کے

غیر برشتے دار یا آپ کے غریب ساتھی یا آپ کے مفلوک الحال ساتھی ہم ایسے اتنے لاکن نہیں ہیں جتنے آپ ہیں اس لیے آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ ذہین آدمی ہیں، آپ دانشور ہیں، آپ نامی گرامی آدمی ہیں، آپ اشتقاق صاحب ہیں، اور اللہ کو بھی یہ پتا ہے کہ آپ ان کے مقابلے میں زیادہ لاکن، اور سمجھدار ہیں، اس لیے ان کو کم عقل سمجھتے ہوئے ان کے حصے کے پیسے آپ کو پہنچا دیجے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ بے چارے نہیں جانتے تاکہ کس طرح کیا کرنا ہے۔ تو آپ کی کتنی تشوہ ہے؟ میری اس وقت تشوہ نو ہزار روپے تھی، تو انہوں نے کہا، بالکل صحیح ہے۔ سات ہزار تو آپ کے، تو دو ہزار اللہ میاں ہر میٹنے آپ کو مزید دے دیتا ہے کہ آپ عقل مند آدمی ہیں، لاکن ہیں، ایماندار ہیں، ہزار ہیں، اور سمجھدار ہیں، اور آپ کے وہ عزیز واقارب جود و موریہ پل کے اس طرف رہتے ہیں Honest ہیں۔ تو ان کے پیسے یہ دو ہزار آپ کو دے دیے گئے تو مہربانی فرمائی آپ ان کو دے آیا کریں۔ تو یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی۔ میں نے انہی دنوں اپنی سنشل گورنمنٹ کو اپنی مشری آف اینجیکشن کو لکھا ہوا تھا کہ یہ میری تشوہ کم Calculate ہوئی ہے۔ اس میں دو ہزار کا اضافہ ہونا چاہیے، اور میرے مشر نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ یہ آپ کا دعویٰ صحیح ہے، اور ہم نے بھیج دیا ہے، مشری آف فناں میں پختہ ہوا ہے، وہاں ایسے وہ Objection لگا دیتے ہیں، لیکن ملے گا۔ جہاں میں دو ہزار کا اور متنہی تھا، اور سمجھتا تھا کہ میں لوٹا گیا، میں مارا گیا، میں دو ہزار کا اضافہ ہونا چاہیے، میرا بابا مجھ سے یہ کہہ رہا تھا۔ جس کو میں اتنا پر اپیکیٹ کر رہا تھا، اور اتنی عزت افزائی کرتا تھا کہ جو نو ہزار روپیہ مل رہا ہے، اس میں سات ہزار تو آپ کے ہیں، اور دو ہزار ان بے وقوف لوگوں کے ہیں جو پیسے کو سنبھال کر رکھ سکتے۔ آپ چونکہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کو دے آئیں۔ اب بتائیے صاحب! یہ کوئی عقل کی بات ہے، تکلیف دہ بات ہے، اور تھی۔ میں نے کہا، صاحب السلام علیکم، میں اس جگہ آنے کے لیے تیار نہیں، آپ تو بدراہ کرتے ہیں۔ واقعی لوگ صحیح کہتے ہیں کہ آپ رہبانیت کی طرف مائل کرتے ہیں لوگوں کو۔ اکثر یہ کہتے ہیں ناجی کہ یہ رہبانیت ہوتی ہے، اور یہاں بھنگ وغیرہ پیتے ہیں لوگ۔ تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ رہبانیت کی جانب مائل نہ کریں۔ یہ کیا الٹا سلسلہ آپ نے شروع کر دیا ہے، تو وہ گیپ آیا میری زندگی میں۔ آج میں اس کا ذکر کرنا چاہتا تھا، آپ کی خدمت میں۔ وہ کافی تکلیف دہ تھا، اور اس گیپ کے اندر اس خلا کے اندر اس ویکیووم کے اندر جو بہت کچھ چیزیں حاصل کی جاسکتی تھیں، وہ میں حاصل نہیں کر سکا۔ اس لیے ان لوگوں کی باتیں جو کتابوں میں یا ابلاغ کے دوسرے ذرائع میں ملتی ہیں۔ اب آگیا شکر گزار ہونے کا موقع، اس میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو وہاں آتے تھے، اور جن کو شکر گزار ہونے کا فن آتا تھا۔ اب شکر گزار ہونے کا فن بھی بڑا مشکل فن ہے۔ ہماری پوتیاں، نواسیاں، لڑکیاں خاص طور پر ایک بڑی لڑائی ہوتی ہے۔

- یہ لڑکیوں نے Why me? کا بڑا محاورہ نکالا ہے کہ یہ میرے ساتھ ایسا کیوں گزر رہا ہے۔ میں جو اتنی بڑی شاہزادی کی ہوں، اور اتنی پڑھی لکھی ہوں۔ میں نے M.A انگلش کیا ہے، اور میں نے فرست ڈویژن لی ہے۔ میں نے 2nd Div. میں کیا ہے۔ تو مجھے یہ بتایا جائے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کیا کیا ہو گا، کہنے لگی، میرے ناک پر پکپل نکلا ہے تو Why۔ میں نے کہا، یہ سب کے نکل آتا ہے۔ تو کہنے لگی، نہیں آپ دیکھیں کہ میری اتنی خوب صورت ناک ہے۔ چہرہ اچھا ہے۔ میں نے کہا اگر آیا ہے تو چلا بھی جائے گا، اس میں گھبرا نے کی کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا Why me، لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ تو یہ ناشکر گزاری کا جو سبق ہم کو پڑھایا جاتا ہے یا ہم پڑھتے ہیں یا ہماری زندگیوں میں داخل ہے۔ جان بوجھ کرنے نہیں، ہمارے ماحول کی وجہ سے ہمارے گرد و پیش کی وجہ سے ہماری تربیت کی وجہ سے، یہ ہماری زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کو میں نے ایسے دیکھا ہے، اپنی زندگی میں ظاہری طور پر جسمانی طور پر آسودہ نہیں ہوں گے، لیکن ان کے چہروں پر ایک طہانتی کارنگ ہوتا ہے، اور سکون ہوتا ہے، وہ یہ کیے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ایک بڑا مشکل کام ہے جو میں اپنی زندگی میں کسی طرح بھی اپنی گرفت میں نہیں لاسکا۔

ہم نے ایک دفعہ آج سے پہلے، کئی برس کی بات ہے جب گلگت میں ریڈ یوٹیشن کھولا، تو میں چونکہ پرانے لوگوں میں سے تھا، گیا تو وہاں جا کر ایک جگہ سلیکٹ کی منتخب کی۔ وہ اچھا ایک کھلاباغ ہے۔ آپ بھی جائیں گے، تو دیکھیں گے وہاں ہم کو دو کمرے مل گئے۔ وہاں چھوٹا شیش چلانے کے لیے کچھ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تو وہاں پر ایک عارضی ملازمت کے لیے آدمی مل گیا۔ بنارس خان پڑھان تھا۔ اس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ مجھے میں ایک خرابی ہے کہ میں کچھ، اور طرح کے آدمی سے بہت جلد متاثر ہوتا ہوں۔ بہت پڑھا لکھا آدمی مجھے اتنا متاثر نہیں کرتا، لیکن اگر وہ مجھے سے اعلیٰ وارفع ہو سینہر، تو میں اس سے دبک جاتا ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے میں یہ تحسیس بھی ہوتا ہے کہ میں اس کے قریب جا کر اس سے یہ معلوم کروں۔ میری تو قسمت میں شاید نہیں ہوتا کہ میں ویسا بن سکوں۔ بنارس خان میں ایک یہ خوبی تھی کہ جو کام اس کو سونپ دیا جاتا، ایک تو وہ خوش اسلوبی سے کرتا تھا، اور پھر اس کی طبیعت کے اوپر بوجھ نہیں پڑتا تھا، اور جو کام دے دیا گیا، وہ کر رہا ہے۔ یہ وہ نہیں کہ مارے گئے صح سے آئے ہوئے ہیں، چھبجے تک روئی نہیں ملی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بنارس خان تم شاکی آدمی نہیں ہو، شکوہ نہیں کرتے۔ کہنے لگا، صاحب، ہم بہت شکوہ کرتا تھا، یہ تو ہماری زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کے ہم تو ادھر آ گیا۔ شکوہ کرتا کہ ادھر تو کوارٹر میں کچھ نہیں ہے۔ ہم نے ادھر آ کے کام کیا۔ تو میں نے کہا، اب تم نہیں کرتے ہو؟ کہنے لگا، جی میں ادھر آیا تھا۔ سکون کی تلاش میں۔ بڑا پر باش رہنا چاہتا

تھا۔ بڑی کوششیں کی، بڑے لوگوں سے ملا۔ بڑے پیروں فقیروں کے پاس گیا کہ جناب ہم کو سکون کی تلاش ہے تو نہیں ملا۔ ایک دن شام کو کھانا کھاتے کھاتے میں نے فیصلہ کیا۔ میرے ہاتھ میں لقمہ تھا، رکھ دیا۔ میں نے کہا، یارا دفع کر و سکون کو۔ ہم نے اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔ ہم سکون کے بغیر ہی زندگی بسر کرے گا۔ کوئی بات نہیں ایسے ہی چلتے رہتے ہیں تلاش میں۔ اس دن سے مجھے سکون ملنا شروع ہو گیا۔ تو میں نے کہا، تم نے یہ کمال کی بات کی ہے۔ کیسے سوچا؟ کہنے لگا بس یہ اللہ کی طرف سے میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا، وہ ٹھیک ہے کہ آپ نے سکون کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا، اور اپنے آپ کے ساتھ ایک مصالحت کر لیکن یہ خوش دلی آپ میں کیسے آئی ہے، میں یہ جانتا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا جی یہ بھی بڑا مشکل کام تھا۔ کہنے لگا، جی یہ بھی ہمارے اوپر ایک مشکل آئی تو ہماری اس جھگی میں، جس چارپائی پر سوتا تھا، تو ہر شخص جو دنیا کا آدمی جو سوتا ہے، اور صبح امتحا ہے، تو میں بھی صبح، اور لوگوں کی طرح امتحا تھا تو اپنا پیرو چارپائی سے نیچے اتارنے سے پہلے، میں نے کہا کہ یارا بنارس خان قدم تو نیچے اتارنا ہی ہے تو کلفت میں کیوں اتاریں۔ خوشی میں کیوں نہ دن گزاریں، تو سارے دن میں جب بھی جس مقام پر بھی میں جاتا، تصور پر روتی کھانے، دوستوں سے ملنے یا کہیں مصیبت "اڑچن" میں گزرے تو مجھ کو یہ بات یاد آ جاتی کہ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ "کلفت" میں یہ دن نہیں گزارنا، آرام کرنا ہے۔ اس کے بعد صاحب عادت پڑ گئی۔ اگر انسان یہ فیصلہ کر لے، اور اس کا تہیہ کر لے، اور اس پر قائم ہو جائے تو یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں۔ میں نے کہا، یار ہم سے تو اس پر قائم نہیں رہا گیا تھا۔ کہنے لگا، آپ نے یہ فیصلہ کیا ہی نہیں۔ وہ تہیہ کرنے کی بات کر رہا تھا۔ بڑے سالوں کے بعد، پندرہ سولہ برس کے بعد پھر مجھے ہاں جانے کا اتفاق ہوا گلگت میں۔ تو میں نے پوچھا بنارس خان۔ تو پتہ چلا وہ ادھر نہیں ہوتا۔ میں نے کہا، وہ ہے یہیں پر۔ ہمارا وہ تو بہت بڑا استاد ہے، گرو ہے، ہمارا پیرو ہے، میں اس سے ضرور ملوں گا۔ کہنے لگے ہے تو ادھر ہی، لیکن اب وہ کام نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، ہم کو اس کے ذریعے پر لے جاؤ۔ ہم جائیں گے۔ تو میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ جھگی میں تھا، لیکن بڑا معدود تھا، اور تکلیف میں تھا۔ اس کو گاؤٹ ہو گیا تھا، گنشیا۔ اور وہ جزا ہوا تھا، اور چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا، بنارس خان کیسی طبیعت ہے۔ کہنے لگا، اللہ کا بڑا شکر ہے۔ میں نے کہا، سناء ہے یہاں ہو گیا۔ کہنے لگا، ہاں صاحب مجھے گنشیا ہو گیا ہے، اور میں چل پھر نہیں سکتا آسانی کے ساتھ۔ تو میں نے کہا، تم شکر یہ ادا کرتے ہو۔ کہنے لگا، ہاں بڑا شکر کرتا ہوں۔ میں نے کہا، کیوں شکر ادا کرتے ہو۔ کہنے لگا، صاحب اس لیے کہ میرے گھٹنے تو قائم ہیں۔ گوڑے میرے ہیں نا۔ اگر میرے گوڑے نہ ہوتے تو گنشیا کہاں ہوتا۔ پھر تو یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ میرے پاس گھٹنا ہے۔ صاحب اگر نہ ہوتا، کہیں کٹ کٹا جاتا تو پھر مجھے گنشیا کہاں سے ہوتا تو میں اللہ کا بڑا شکر گزار ہوں۔ اس نے مہربانی فرمائی ہے۔ یہ ساری

باتیں سننے کے باوجود، سمجھنے کے باوصف یہ ہمارے حال کا ایک حصہ نہیں بنتیں۔

ہمارے بابا کہا کرتے تھے کہ وہ مومن جو ماضی کی یاد میں بتانا نہ ہو، اور مستقبل سے خوف زدہ نہ ہو، اس کو صاحب حال کہتے ہیں۔ کہ جو حال اس کو عطا کیا گیا ہے، اس کے مطابق زندگی بس کرے، اور خوش و خرم بڑی چاہت کے ساتھ بس کرے، اور جب تک اس کو اس کا تحفہ دیا گیا ہے اس کو ساتھ لے کر چلے۔ لیکن بدمتی سے ہمارے پاس اس قسم کا زمانہ آ گیا ہے جو خود تو ناساز گا رہیں ہے، اس نے ہماری سوچ کو ہمارے روئے کو بہت ساری ناسازگاری میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں زندگی کے اس حصے میں پہنچ کر کہ جب تک اللہ کا ساتھ نہ ہو، اور اللہ کو اس طرح سے نہ مانا جائے جس طرح سے ماننے کا حق ہے۔ صرف کتابی طور پر نہیں۔ مثلاً میری خرابی یہ ہے میں بڑا اس کا ایمانداری سے اعتراض کرتا ہوں، اور بڑا مجھے دکھ بھی ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں لیکن کتابی طور پر۔ میری ماں کہتی تھی کہ نماز پڑھو لیکن میں نے کبھی یہ ارادہ یا تہمیں کیا کہ میں اس کے ساتھ ایک ربط باہمی قائم کروں گا۔ ہمارے بابا کہتے ہیں۔ لفظ خدا، خدا نہیں ہے۔ خدا تو، اور ہے نا، جو لکھا ہوا ہوتا ہے یا جو ہم گانے گاتے ہیں۔ میں وی پر خدا کا نام لیتے ہیں۔ وہ ایک اور چیز ہوتی ہے اور اس کا تجربہ ہونا اس کو زندگی کے اندر سے گزارنے کا لطف کچھ اور ہی ہے۔ اور میں یہ بات آپ کو اس لیے گارتی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ لوگوں سے بہت Privileged ہوں۔ میں ایک اونچے مقام پر ہوں کہ میں ایسے بندے سے ملا ہوں، اور میں ان کا تجربہ، اور مشاہدہ اور مطالعہ رہا ہوں اور وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی جھلکی میں بادشاہ جوتے اتار کر جانے کو سعادت تصور کرتے ہیں، یعنی کیا کمال ہوتا ہے۔ کچھ یہ تو نہیں ہوتا کہ ان کے پاس پیسے ہوتے ہیں یا دولت ہوتی ہے یا توب خانہ ہوتا ہے۔ کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کچھ اور ہی چیز ہوتی ہیں۔

مشورہ واقعہ ہے کہ دیوان انس کلبی سے سکندر اعظم ملا۔ اور میں شاید پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ساحل کے اوپر گرم گرم لکلنی ریت میں قلابازیاں لگا رہا تھا۔ تو سکندر نے جا کر کہا، اے آقا میں تیری کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا، تم میری خدمت کیا کرو گے۔ دھوپ چھوڑ کے کھڑے ہو جاؤ۔ دھوپ آرہی تھی۔ وہ ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا سائیں تو وقت کا بڑا فلسفی ہے، اور بہت عظیم انسان ہے۔ یہ جس طرح سے تو مزے کر رہا ہے، قلابازیاں لگا رہا ہے، میں بھی لگانی چاہتا ہوں۔ تو اس نے کہا، تو بڑا نالائق آدمی ہے۔ کپڑے اتار اور قلابازیاں لگانی شروع کر دے۔ اتنا بڑا ساحل پڑا ہے۔ یہ تو مجھے سے کیا ڈسکس کر رہا ہے۔ تو سکندر نے کہا، میں معافی چاہتا ہوں۔ میں سکندر اعظم ہوں، مقدوں یہ کا شہنشاہ۔ اس وقت میں نے آدمی دنیا فتح کر لی ہے، اور باقی کی مجھے ابھی فتح کرنی ہے، اور مجھے یقین ہے، اور میرے دیوتاؤں نے کہا ہے کہ تم وہ آدمی دنیا بھی فتح کر لو گے، تو

اے آقاب میں وہ آدھی دنیا فتح کر لوں گا، تو پھر انشاء اللہ آپ کے ساتھ قلابازیاں لگاؤں گا۔ تو اس نے کہا، تم کیے بد نصیب ہو۔ میں آدھی دنیا فتح کیے بغیر قلابازیاں لگارہا ہوں۔ تو جائے گا آدھی دنیا فتح کر کے آئے گا، پھر ایسا کرے گا۔ تو خواتین و حضرات یہ اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا کہ نظر آتا ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آر وائے خان

چھپلی مرتبہ ایک بات چل رہی تھی جو پیچ میں ہی رہ گئی۔ گوہد اپنے انداز میں تکمیل تک بھی پہنچی۔ وہ یہ کہ لفظ خدا خدا نہیں ہے، اللہ کا تصور اور چیز ہے، اور اللہ کی ذات کا اور اک جو ہے وہ اس سے مختلف چیز ہے۔ انسان کی اچھی عادتوں میں سے اور اس کے مباح کاموں میں سے سب سے اچھی بات جو ہے، وہ عبادت ہے۔ اچھی عادت ہے عبادت کرنا، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکیں، جہاں تک آپ کو پہنچنے کی آرزو ہے، جس کے لیے روح آپ کی ترقی رہتی ہے۔ ہم جو بڑے تھکے ہارے ولایت سے آئے تھے، نوکریاں کر کے، دھکے کھا کے تو ہماری یہ آرزو تھی کہ اپنے وطن واپس جائیں گے، اور ہمارے وطن میں جوڑیے ہوتے ہیں، بابے لوگ ہوتے ہیں، اور وہاں رہبانیت ہوتی ہے، جیسے وہاں بھنگ وغیرہ پیسیں گے، چرس کے سوٹے لگائیں گے۔ کام و ام تو وہاں ہوتا نہیں۔ یہی عام طور پر کیا جاتا ہے۔ عین عشرت کی زندگی ہوگی، تو ہم نے اس لیے اس پر بھی توجہ دی کہ کم سے کم اتنی ساری مشکل کی پیچیدہ زندگی گزارنے کے بعد ایسا ما جوں بھی میر آئے کہ آدمی آرام سے رہ سکے۔ لیکن خواتین و حضرات! وہاں پہنچ کے پتا چلا کہ اس سے زیادہ مشقت سے بھری زندگی، اور جدوجہد، اور کوششیں، اور کسی جگہ پر ہے ہی نہیں، کیونکہ عبادت کر لینا اور دین کے بارے میں کچھ گفتگو کر لینا، یہ تو بڑا آسان کام ہے، لیکن اس کے اندر اتر کر اسے عملی طور پر اختیار کرنا یہ برا مشکل کام ہے۔ یعنی تصور شریعت سے جدا نہیں ہے۔ یہ وہی نماز روزہ ہے۔ صرف علم کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی زور دیا جاتا ہے، اور عمل کے تو ہم ایسے عادی نہیں تھے کہ یہ کیسے کیا جائے۔ اور جس بابے کے متعلق ہم بات کر رہے تھے، بابا نور والے، ان کا انداز اپنی طرز کا تھا، اور جو بات وہ کرتے تھے، وہ مختلف ہوتی تھی، جو ہمیں کتابوں میں کتابی پلنڈوں میں نہیں ملتیں۔ اور ان کے قریب کے لوگ بڑے شاکی ہوتے تھے۔ یہ بات اندر کی ہے، لیکن آج میں اس کا اظہار کروں گا، کیونکہ ان کے صاحبزادے نے خود مجھ سے شکایت کی کہ دیکھیں بابا جی لوگوں پر اتنی مہربانی کرتے ہیں، لوگوں کے

ساتھ اتنے Kind ہیں، ان کو چیزیں بھی دیتے ہیں، رضا یاں بنانے کے دیتے ہیں، کھانے کا سامان سب فراہم کرتے ہیں، لیکن میرے اوپر بالکل مہربان نہیں ہیں۔ میں ان سے کوئی چیز مانگتا ہوں تو یہ کنشروں کر کے اس کے اوپر شرط عائد کر کے، اور جتنا حصہ یا جتنا کچھ مجھے درکار ہوتا ہے، وہ مجھے نہیں دیتے۔ تو ان کی اس بات کا میرے دل پر بھی بڑا اثر ہوا۔ میں نے کہا، یہ ایسے ہونا نہیں چاہیے۔ واقعی یہ جو کہتے ہیں، صحیک کہتے ہیں۔ یہ ذرا سی تعلقی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اور ان کی شاید ترینگ ہے یہ شاید تربیت جو ہورہی ہے۔ قدرے سختی کی بات ہے۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ میں تھوڑا سامنہ چڑھا ہوا تھا۔ میں ان سے بات کر سکتا تھا۔ میں نے کہا، دیکھیے باباجی یہ صاحبزادے جو ہیں، یہ شکوہ کناؤں ہیں اور آپ ان کو وہ کچھ مراعات نہیں دیتے جو کہ مل جانی چاہئیں۔ کہنے لگے، میں جان بوجھ کر ایسا نہیں اور آپ ان کو وہ کچھ مراعات نہیں دیتے جو کہ مل جانی چاہئیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس پر سختی کا عمل بھی کیا جائے۔

خیروہ بات ان تک پہنچاوی لیکن وہ اس سے کچھ راضی نہ ہوئے، لیکن کچھ ایسے بھی آتے تھے جن کو اللہ کا بلا واسط طور پر علم تھا، اور وہ یوں سمجھتے تھے کہ اللہ ہے، اور وہ ان کے کاموں میں پورے کا پورا دخل دے رہا ہے، اور حاوی ہے، اور جس سے وہ فرماتا ہے، اور جس طرح سے وہ چاہتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مژ کے گھوم کے چلا جاتا ہے۔ بڑے خوش نصیب لوگ تھے۔ مجھے یاد ہے وہاں ایک اشرف لاری آیا کرتا تھا، اشرف کو پنگ اڑانے کا بڑا شوق تھا۔ نوجوان خوب صورت چادر باندھتا تھا ریشمی، اور کندھے پر پر نارکھتا تھا اور جب بست قریب آتی جاتی تھی اس کی مانگ بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم پنگ سے اتنی محبت کیوں کرتے ہو۔ کہنے لگا، اگر آپ کبھی پنگ اڑا کے دیکھیں، اور آپ کو اس کا پکا پڑے تو آپ اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کے اندر ایک ایسی ٹیلی کیوں کیش ہوتی ہے۔ تار ہوتی ہے۔ اور ہر سے ضرور کوئی Message آتا ہے۔ جو بڑا پنگ باز ہوتا ہے، ان کو پیغام آتے ہیں۔ تو میں نے کہا، تم یہاں بھی آتے ہو، ذیرے پر بھی بیٹھتے ہو۔ باباجی کی باتیں بھی سنتے ہو، اور خدمت بھی کرتے ہو لوگوں کی۔ اللہ رسول کو بھی مانتے ہو، اور ہم سے بہتر مانتے ہو، یہ کیسے؟ تو اس نے کہا، یہ سب کچھ جو مجھے ملتا ہے نا، یہ میری گذی اڑانے سے ملتا ہے۔ میں نے کہا، یہ کیا راز ہے؟ کہنے لگا جب پنگ بہت دور چلا جاتا ہے، اور ”نکنی“، ”ہو جاتا ہے، وہ لفظ ”نکنی“ استعمال کرتا تھا۔ یہ کہنک جاتا ہے۔ ایک جگہ پر، اور نظرؤں سے اوچھل ہو جاتا ہے۔ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہ صرف مجھے دکھائی نہیں دیتا ہے بلکہ کسی کو بھی دکھائی نہیں دیتا، اور میرے ہاتھ میں صرف اس کی ڈور ہوتی ہے۔ تو اس نہ

نظر آنے والے کی جو کھینچ ہوتی ہے میرے ہاتھ میں، اس نے مجھے اللہ کے قریب کر دیا ہے، کیونکہ میرے دل پر اللہ کی بھی کھینچ ویسی پڑتی ہے جیسے اس پنگ کی ڈود میرے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ اب دیکھئے کیا ہم جو بڑے کتابیں پڑھ کے بڑے علم سیکھ کے بڑے بڑے کیست سن کے، اور ولایت میں جھگڑے، بحث و مباحثے کر کے آئے، ان کے پاس کچھ نہیں تھا، اور وہ جو ہمارا پنگ باز بجان تھا، وہ اسی کے زور پر ٹکی ہوئے پنگ کو اس کے دباؤ کو محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اشراق صاحب آپ کو بھی کھینچ نہیں پڑتی اللہ کی طرف سے۔ میں نے کہا، نہیں۔ ویسی تو نہیں جیسی تم کہہ رہے ہو۔ کہنے لگا، وہ انسان کے دل کو ایسے کرتا ہے۔ میں نے کہا، نہیں اشرف یہ تو ہمارے مقدمہ میں نہیں ہے۔

ہمارے وہاں ایک صاحب تھے، ڈیرے پر، حاجی صاحب Blue Eye۔ مجھے ان کا نام بھولتا ہے۔ بہت خوب صورت ان کی آنکھیں تھیں۔ وہ وہاں رہے، اور کچھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ پھر ایک دن کہنے لگے، میں واپس چلا جانا چاہتا ہوں اپنے رحیم یار خان۔ وہاں جا کر میں کچھ لوگوں کو تبلیغ کروں گا، اور جو جو کچھ میں نے یہاں سیکھا ہے، وہاں جا کر ان کو بتاؤں گا۔ مجھے اجازت دیں۔ آپ نے کہا، بالکل صحیح ہے۔ آپ جائیں، لیکن میری آرزو یہ تھی کہ آپ کچھ اور یہاں شہرتے اور ہمیں خوشی ہوتی۔ آپ ہمارے جانی جان ہیں۔ ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حاجی صاحب کچھ دیرتے، لیکن وہ مصر تھے، اس بات پر میں جاؤں گا اور بابا جی کا اس پر اصرار ہوتا تھا کہ جب تک تمہارا رابطہ اللہ سے پورے کا پورا سالم کا سالم نہیں ہو گا تب تک آپ دیوار سے ڈھونگا کر اس کے ساتھ کیوں کیت، اس کے ساتھ گرین لائن پر کچھ بات نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت تک آپ کی عبادت یا آپ کا یقین کا تجربہ ایسا ہی ہو گا شنیدہ سننا ہوا۔ تو حاجی صاحب نے کہا، جی میں وہاں جا کر انشاء اللہ یہ جو آپ سب کچھ فرماتے ہیں، بیان کروں گا۔ اور انہوں نے کہا، صحیح ہے۔ جب وہ جانے لگے تو تھوڑے سے افرادہ تھے کہ حاجی صاحب جا رہے ہیں، انہوں نے بلا یا۔ بابا جی کہنے لگے، تم جاؤ گے اپنے رحیم یار خان تو تمہارا گاؤں لکتی دو رہے۔ اس نے کہا، میرا چک وہاں سے کوئی پانچ چھوٹیں کے فاصلے پر ہے۔ کہنے لگا، وہاں لوگ بھیز کریاں بہت رکھتے ہیں۔ کہنے لگے، ہاں وہاں تو بھیزوں کے گلے ہوں گے۔ کہا تو جب تم اپنے گاؤں میں داخل ہو گے تو تم بھیزوں کے رویوں کو کر اس کر دے گے۔ کہیں نہ کہیں چڑچک رہے ہوں گے۔ اس نے کہا، ہاں جی ضرور ہوں گے۔ کہنے لگے، جب تم بھیزوں کے رویوں کے پاس پہنچو گے تو اس رویوں میں کتے بھی ہوتے ہیں پاسبانی کے لیے، حفاظت کے لیے رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا، ہاں جی ہوں گے۔ انہوں نے کہا، تم یہاں رہے ہو اتنی دیر تک، اب تک تو واقع نہیں ہو گے۔ آپ ان کتوں کو اس طرح سے عبور کریں گے، کیسے کر اس کریں گے۔ اس نے کہا جی کہ اگر کسی کتے نے میرے اوپر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں پتھرا ٹھالوں گا۔ تو بابا جی نے کہا، وہ تو چار کتے ہوں گے، اور آپ ایک

کو پھر مار لیں گے۔ تھیک وہ زخمی ہو سکتا ہے، تین آپ کو پھر لیں گے۔ حاجی صاحب کچھ پریشان ہو گئے۔ کہنے لگے، میں جی کچھ ایسے کروں گا کہ وہاں سے ایک لکڑی توڑ لوں گا۔ وہاں سے چاروں میرے چیچے پڑیں تو زور سے گھما تا ہوا چلوں گا اور پھر میں اپنا آپ بچا کر کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔ انہوں نے کہا، میں تو تم سے یہ کھدرہا ہوں کہ وہ تو ایک کتے کو لگ جائے گی، دو کو لگ جائے گی تو تم گزرو گے کیسے۔ یہ تو مشکل پڑ جائے گی تمہارے لیے۔ چاہے لکڑی گھماتے ہوئے گزو۔ حاجی صاحب تو سوچ میں پڑ گئے۔ ہم بھی سوچ میں پڑ گئے کہ بھی ان کو کراس کرنا بڑا مشکل کام ہے تو حاجی صاحب ہم سے زیادہ سمجھدار تھے، عمر میں بھی بڑے تھے۔ تو کہنے لگے، حضور آپ فرمائیں کہ ایسی حالت میں ایسے موقع پر کیا ہونا چاہیے۔ تو بابا جی نے کہا کہ صاحب طریقہ یہ ہے کہ ان کو پریشان کیے بغیر، اور ان کو اپنا آپ دکھائے بغیر سب سے پہلے آپ گذریے کوآواز دیں۔ وہ آپ کی آوازن کر جگی سے نکلے گا۔ آپ اس سے کہیں گے، میں یہاں سے گزرنا چاہتا ہوں۔ وہ کتوں کوآواز دے گا، اولکا لوڈ باؤ بیٹھ جاؤ وہ بیٹھ جائیں گے۔ تو آپ گزر جائیں گے۔ جب بھی مشکل وقت ہو گذریے کوآواز دیں۔ آپ کا پالن کرنے والے۔ اپنی Efforts کر کے راہ تجویز کر کے بھی زندگی کے مشکل مقام سے گزرنے کی کوششیں نہ کرو۔ اس وقت اپنے چروں والے کو پکارو۔ تو حاجی صاحب کی سمجھیں بات آگئی۔ انہوں نے کہا، ابھی میں چروں والے کو پورا آواز دینے کے قابل نہیں ہوا۔ میں ابھی رہوں گا آپ کے پاس، اور میں یہ سکھوں گا کہ اس کوآواز کس طرح دی جاتی ہے۔

تو وہاں خواتین و حضرات کچھ کچھ لوگ ایسے آتے تھے جن کو آپ صاحب حال کہ کر پکارتے ہیں۔ جن کو ایک ذاتی تجربہ، اور ذاتی مشاہدہ ہوتا ہے، اور وہ اتنے خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں، اتنی آسانیوں میں سے گزرنے والے ہوتے ہیں کہ وہ ہر کام کو اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کو Endorse کر دیتے ہیں۔ اس کے نام کر دیتے ہیں۔ ہم پڑھے لکھے لوگ جو تھے یا ہوتے ہیں۔ ہم اپنی تجویز ساتھے لے کر چلتے ہیں، اور جب بہت بھی مشکل آئے تو بہت ساری تجویزیں ساتھے لے کر چلتے ہیں۔ اپنی دنیا بھر کی سلطنتوں، اور حکومتوں کو دیکھیں کوششیں کرتی رہتی ہیں، اور ان کے سارے رخ نیز ہے، اور پھر ہوتے رہتے ہیں، اور بھی نوع انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے، ان میں کمی نہیں آتی۔ چند روز ہوئے میں اپنی بنیان استری کر رہا تھا۔ میری بنیان کھدر کی ہوتی ہے۔ سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ ہاتھ کی سلی ہوئی۔ بنی بنیان مجھے ملتی ہی نہیں، سلوٹی ہوتی ہے۔ تو میں چاہ رہا تھا کہ اس کو استری کر کے پھر پہنبوں تو خوش دلی کے ساتھ اس کو استری کر رہا تھا۔ ابھی شروع ہی کیا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مجھے ٹیلی فون سننا پڑ گیا۔ اس پر کچھ دیر بات ہوتی رہی۔ میں استری ویسے ہی چھوڑ آیا، لوٹ کے گیا۔

بات کرنے کے بعد تو پھر میں نے اتحادی استری۔ اب میں پھر استری کرنے لگا، لیکن اس پر استری کا

کوئی اثر نہیں ہوا میری بنیان پر۔ تو پریشانی کے عالم میں میں نے دیکھا کہ یہ کیا ہوا۔ دیکھاتو میں نے اس کا پلگ تو آن ہی نہیں کیا تھا۔ جب تک پلگ کا کنٹیکٹ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میری استری پوری تھی، ولایت کی بھی ہوئی اور تھی بھی بالکل تھی۔

بس اس میں ایک خرابی تھی کہ وہ کنکشن نہیں لگا، پلگ نہیں لگا تھا۔ اس لیے وہ سلوٹیں تو ویسی کی دیکھ رہ گئیں۔ اپنی زندگی میں بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا، جب کنکشن نہ لگے، تو زندگی کی سلوٹیں نکلتی نہیں ہیں، اور لگانے کے لیے بات اس کی ہوتی ہے کہ پلگ کسی نہ کسی طرح سے ڈاڑھی کیٹ لگ جائے۔ دیکھ لگا میں جیسے تاروں کو کندے لگادیتے ہیں۔ وہ بھی بڑی شیرینی بات ہے، لیکن صحیح طور پر اگر پلگ لگے تو اس کا لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

فرانس کے ملاج میں نے دیکھا ہے وہاں South کے، خاص طور پر۔ وہ سمندر میں اترنے سے پہلے ایک دعا مانگا کرتے ہیں۔ بڑی مختصری، اور وہ دعا یہ ہوتی ہے کہ اللہ تیرا سمندر بہت بڑا ہے، اور میری کشتی بہت چھوٹی ہے۔ بظاہر یہ معمولی سی دعا ہے، لیکن اس میں اتنا اعتراف ہوتا ہے، اور اتنی قربت ہوتی ہے خدا کے ساتھ ان کی، اور اتنا ارابطہ ہوتا ہے کہ جب اترنے لگتے ہیں وہ South France کے لوگ کہ اس یقین کے ساتھ اترتے ہیں کہ یہ واقعی اس اللہ کا سمندر ہے، اور وہ اس کا مالک ہے۔ میری کشتی جو ہے، وہ واقعی چھوٹی ہے، اور اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی جتنا کہ اسے کرنا چاہیے۔

ہمارے پاس جانکار لوگ بات کو سمجھنے والے بھی، اور احساس رکھنے والے بہت سے تھے، اور ہیں اب بھی۔ مجھے ایک واقعہ اور یاد آتا ہے، جانکار لوگوں میں سے ایک کا۔ میرے ایک دوست تھے۔ سلطان راہی ان کا نام تھا۔ آپ نے ان کی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ باوجود اس کے کہ میرا تعلق ریڈ یو شیلویژن سے تھا لیکن ہمارا رشتہ فلم سے وہ نہیں تھا۔ ایک، اور جو والے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے، اور ہمارا رابطہ اپنے طور پر خفیہ انداز کا رہتا تھا۔ اسے اجاگر کرنے کی چند اس ضرورت نہیں تھی۔ ایک روز میرے پاس T.V. میں ان کا پیغام ملا کہ آپ آئیں، ایک چھوٹی سی محفل ہے۔ اس میں آپ کی شمولیت بڑی ضروری ہے، اور آپ اسے پسند کریں گے۔ میں نے کہا، بسم اللہ۔ ہمارے یہاں لا ہو رہیں ایک علاقہ ہے نسبت روڈ جہاں پر دیال سنگھ کا الج ہے۔ اس کے عقب میں چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں جہاں اچھے اچھے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں پر انہوں نے انتظام کیا تھا بڑی اچھی ایک بیٹھک تھی اور جالی والا دروازہ۔ اس کو صاف کر کے اگر بیال جلا کے سلطان راہی نے بندوبست کیا تھا۔ سلطان راہی کو شاید آپ جانتے ہیں یا نہیں اسے قرأت کا بڑا شوق تھا، اور اس کا ایک اپنا انداز تھا۔ اس کا اپنا ایک الج ہے۔ کبھی کوئی فناش شروع ہوتا تھا تو لوگ ان سے کہتے تھے کہ آپ قرأت کریں وہ کردیتا تھا۔ لیکن اس کا ایک، اور پہلو جو تھا قرأت کے ساتھ واپسی کا، اسے کم لوگ ہی جانتے تھے۔ تو وہاں ہم بیٹھے تھے تو اس

کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، گاؤں کا پینڈ و آدمی۔ اس نے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ کندھے کے اوپر اس کے کھیس تھا۔ سادہ سا آدمی کچھ اتنا زیاد و می (Imperessive) مترشکن) بھی نہیں تھا جتنا اس کو ہونا چاہیے تھا۔ تو انہوں نے کہا، ان سے ملیں، یہ بھار فیق ہے۔ بھار فیق بھی اس محفل میں شامل تھا۔ ہم دس گیارہ پندرہ لوگ دیوار کے ساتھ ڈھوکا کے بیٹھ گئے۔ سلطان راہی نے کہا، آپ کو اپنی کچھ قرأت سنانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا۔ بسم اللہ۔ انہوں نے کہا، میں سورہ مزمل پڑھوں گا۔ تو کہا، بجان اللہ اور کیا چاہیے تھا۔ تو سلطان راہی نے اپنے انداز میں اپنے لبھے میں، اور اپنی آواز میں سورہ مزمل کی تلاوت شروع کی۔ بہت ہی اعلیٰ درجے کی، اور لوگوں نے اسے بہت ہی پسند کیا۔ وہ پڑھتے رہے۔ ہم دیوار کے ساتھ نیک لگا کر سنتے رہے، اور جب ختم ہو گئی تو سب کے دل میں تھی آرزو کہ کاش ایک مرتبہ پھر اسے پڑھ سکے، لیکن انہوں نے بند کر دیا۔ پھر انہوں نے بھار فیق کی طرف دیکھا، اور ان سے کہا، جی آپ بھی فرمائیں ہمارا انداز نہیں تھا کہ ایسا سیدھا سا آدمی بولے گا۔ تو بھار فیق نے کہا، جی میری آرزو بھی سورہ مزمل سنانے کی تھی لیکن چونکہ انہوں نے سنادی۔ ہم نے کہا، نہیں نہیں آپ بھی ہم کو یہی سنائیں۔ اس میں کیا حرج ہے تو آپ اپنا شوق پورا کریں۔ ہم تو یہ آرزو کر رہے تھے کہ دوبارہ شروع ہوتی۔ اور کہنے لگا۔ بسم اللہ۔ انہوں نے بیٹھ کر خواتین و حضرات اپنے اس انداز میں کھیس کندھے سے اتار کر گود میں رکھ لیا۔ اس کے اوپر کہنیاں رکھ کے بیٹھ گئے، اور سورہ مزمل سنانی شروع کی۔

آپ نے بے شمار کیست سئے ہوں گے۔ بے شمار قاریوں کو سنانا ہوگا۔ انہوں نے جو سنایا، اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ جوں جوں وہ سناتے چلے جا رہے تھے۔ ہم سارے آدمیوں نے جو بیٹھے تھے، یہ محسوس کیا کہ اس بیٹھک میں تاریخ کا کوئی اور وقت آ گیا ہے۔ یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں ہم زندگی برکر رہے ہیں، اور ہم لوگوں کو ایسا لگا کہ ہم قرون اولی کے مدینہ شریف کی زندگی میں ہیں، اور یہ وہی عہد ہے، اور یہ وہی زمانہ ہے، اور ہم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں کہ جو اس عہد کی آواز کو دیے ہی کسی آدمی کے منہ سے سن رہے ہیں۔ یہ سب کا تجربہ تھا۔ عجیب و غریب تجربہ تھا۔ ہم نے یوں محسوس کیا جیسے اس کرے میں بیٹھک میں عجیب طرح کی روشنی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ہمارا خیال ہو، لیکن اس کی کیفیت ایسی تھی کہ اس نے سب کے اوپر ایک سحر کر دیا تھا۔ پھر وہ ختم ہو گئی۔ ہم نے زبان سے شکر یہ نہیں ادا کیا، کیونکہ ہم سارے اتنے جذب ہو گئے تھے کہ بولا نہیں جا رہا تھا۔ البتہ ہماری نگاہوں میں جھکے ہوئے سروں میں، اور ہماری کیفیت سے یہ صاف طور پر واضح ہوتا تھا کہ یہ جو کیفیت تھی، جو گزری تھی، یہ کچھ اور ہے۔ تو کوشش کر کے ہمت کر کے میں نے کہا، راہی صاحب ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ پہلے آپ نے سورہ مزمل سنا کر پھر آپ نے اپنے دوست کو لا کر تعارف کروایا اور قرآن سنوایا۔ یہ کیفیت ہمارے اوپر کبھی پہلے طاری نہیں ہوئی تھی۔ ہم کبھی نہیں سکے تھے۔ تو سلطان راہی نے کہا، بھاجی

بات یہ ہے کہ میں سورہ مزمل جانتا ہوں، اور بہت اچھی جانتا ہوں، لیکن یہ شخص مزمل والے کو جانتا ہے تو اس لیے بڑا فرق پڑا۔ تو جب آپ والی کو جانتے ہیں، اور جانے لگتے ہیں، زندگی میں خوش قسمتی سے یا اللہ سے ایسا رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جیسا اس کا تھا، تو پھر وہ کیفیت، اور طرح کی ہوتی ہے، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ جو کیفیت ہوتی ہے یہ مختلف ہوتی ہے، اور زندگی میں ساری عمر ساتھ چلنے والی ہوتی ہے میں نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار جب بھی کیا تھا، اب بھی کرتا ہوں کہ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کی گذی جو تھی، وہ نکی ہو جاتی تھی، جو بظاہر تو گذی کی بات کرتا ہے لیکن اس کے اندر پیغام کچھ اور ہوتا ہے، میں آپ کا بڑا شکر گزار ہوں۔

اینڈریو

میری ولی آزو کے مطابق ہمارے شہزاد احمد یہاں اس محفل میں تشریف لائے تو انہوں نے آتے ہی اس عہد کی یاد دلادی جس کا تعلق 60-61-62 کی دہائی کا ہے۔ مجھے صحیح طرح سے سن یاد نہیں رہا۔ اور اس بات کا تعلق، ایک حد تک اس درس روحانیت سے ملتا ہے جس کے بارے میں میں علم حاصل کرنے کے لیے، اور تعلیم پانے کے لیے بڑی بڑی جگہوں پر گھومتا رہا، لیکن یہ میرا ابتدائی دور تھا۔ اور میرا اس روحانیت کے بکھیرے میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ شام کے وقت بچوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی تو میں گیا، جا کے دروازہ کھولا تو وہاں ایک بڑا بلاسانو جوان، ڈاڑھی، سنہرے بال، انگریزی مزاج، گھسی ہوئی جیز پہنے ہوئے، اور آدمی آستین کی قمیض پہنے دیوار سے لگا کھڑا تھا چوکٹ سے۔ تو اس نے مجھے سے کہا، Are you Ashfaq Ahmed? میں نے کہا، میں ہوں تو وہ کچھ دیر چپ رہا، پھر میرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا، مجھے آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں کہ آپ Spiritualism (روحانیت) کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس علم کا ایک صحافی ہوں زیادہ سے زیادہ، لیکن میں اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ مجھے اس کا پتا کچھ نہیں۔ اس نے کہا، مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ مجھے تو کسی نے کوئی میں بتایا تھا جہاں سے میں اپنا تریوں چیک کیش کرو رہا تھا۔ اشراق صاحب سے مل لینا، وہ آپ کو بہت ساری معلومات بتائیں گے۔ میں نے کہا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن تم کہاں ٹھہرے ہو۔ اس نے کہا، میں ریلوے شیشن لا ہو رہا، وہیں رہتا ہوں۔ مجھے آئے ہوئے تین دن ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے میں ہندوستان میں رہا۔ بنارس میں ایک سال میں رہا، اور وہاں سے پھر میں کھمنڈو چلا گیا۔ کھمنڈو میں میں نے تاترک دیا کا علم حاصل کیا۔ وہاں وس گیارہ مہینے رہا۔ تاترکا کا علم حاصل کرنے کے بعد میری کوئی تشقی نہیں ہوئی، تو پھر یہاں آگیا لا ہو رہا میں۔ کسی نے بتایا کہ لا ہو رہ بھی

روحانیت کا گڑھ ہے۔ میں نے کہا، یہ مدینۃ الاولیا ہے تو کسی، لیکن میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہیں ہوں۔

چیزیں کہ میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ وہ ما یوس ہوا، چہرہ شہزاد، اس کا، بالکل، آپ کو آسانی ہو گی جانے میں، ذمی ایچ لارنس سے ملتا جلتا تھا۔ اتنا ہی دبلا، ویسی ہی شکل؛ وہی آنکھیں، ویسی ناک، دیسے اس کا انداز کھڑے ہونے کا، گردن بھی۔ میں واپس اندر آیا تو میری بیوی نے پوچھا کون تھا؟ میں نے کہا، کوئی باہر کا آدمی تھا۔ غیر ملکی، یہ پوچھتا تھا۔ اس نے کہا، ہمارے پاس کیوں آ گیا۔ میں نے کہا، مجھے بڑا تجسس ہے کہ ہمارے پاس کیوں آ گیا۔ تو خیر شام کو جب میں لینا تو مجھے خیال آیا کہ پتا نہیں وہ کہاں رہتا ہوگا، اور اس کو وقت ہوتی ہو گی، شریف سا آدمی تھا، اور وہ کچھ جانتا چاہتا تھا۔ اور وقت میں میں بھی تھا، پسکی اس زمانے میں بہت آیا کرتے تھے، اور اس کا انداز بھی پیانا تھا تو یوں میرے ذہن پر یہ ساری چرخی چلتی رہی۔ اگلے دن میں دس گیارہ بجے ریلوے سٹیشن پر گیا تو وہ تھرڈ کا اس کے نلکے کے پاس اپنی کتاب کھولے دیوار سے ڈھونگائے کچھ پڑھ رہا تھا میں اس سے ملا۔ میں نے کہا، میرا نام میں معافی چاہتا ہوں۔ لکن آپ کے ساتھ تھیک بات نہ ہو سکی۔ آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے کہا، میرا نام اینڈر یو ہے۔ میں نے کہا، تم یہاں کہاں رہتے ہو۔ کہنے لگا، میں یہیں رہتا ہوں۔ میں نے کہا، تمہیں یہاں وقت ہو گی۔ اس نے کہا، نہیں وقت کوئی نہیں، ہم عام آدمی ہیں۔ ایسی کوئی مشکل نہیں۔ یہ بہت اچھا ہے، پانی مجھ مل جاتا ہے پینے کو۔ کھانے کو ایک آدھ سو سکھا لیتا ہوں۔ میں نے کہا، تم ایسے کرو۔ میرے ساتھ چلو گھر، اور وہاں تمہیں تھوڑی سی آسانی ہو گی۔ میری طبیعت پر بڑا بوجھ ہے۔ اس نے کہا، تھیک ہے۔ میں حاضر ہوں چلو۔ جب چلنے لگا تو اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ میں نے کہا، اپنا تھیلا اٹھالو۔ کہنے لگا، کون ساتھیلا۔ میرے پاس تو کچھ نہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ تو میری بیوی کہنے لگی، یہ کیا چیز پکڑ لائے ہو، کیونکہ جب وہ گھر آیا تو ایک تو اس کے بدن کی بڑی بدبو تھی۔ پیوں سے خاص قسم کی بدبو آیا کرتی ہے۔ دوسرے جب وہ بیٹھ گیا۔ تو اس نے مجھ سے کہا، کیا میں سگریٹ لے سکتا ہوں۔ تو میں نے کہا، پی لو۔ جب اس نے سگریٹ پیا۔ تو میری بیوی نے کہا، یہ کیا سگریٹ ہے۔ اس میں تو اور قسم کی بدبو ہے۔ تو میں نے کہا، یہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ اجازت دے دیں۔ کوئی بات نہیں۔ اسے اجازت دے دیں۔ تو کہنے لگی، آپ اسے کیا کریں گے۔ میں نے کہا، ہمارا یہاں ایک کمرا ہے۔ بڑا اچھا سا، خالی پڑا ہے تو اس میں رہ لے گا۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ تو اس نے بہت بادل خواتر کہا، اچھارہ لے۔ کتنے دن کے لیے۔ میں نے کہا، مجھے پہنچیں۔ کتنے دن کے لیے۔ وہ صحیح احتہا تو اس نے کہا اشFAQ صاحب! I am not a real poet, I am sort of a poet. میں شاعر تو نہیں ہوں لیکن میں نے ایک نظم لکھی ہے رات کو۔ تو وہ مجھے سنانے لگا۔ میں شاعری سے بڑی رغبت رکھتا ہوں

لیکن اتنی گھرائی میں جانے کے لیے جب کہ مشکل نظم ہوتے میں پھر رک جاتا ہوں کہ مجھے لکھی ہوئی ملے، دھیان سے دیکھ کر کچھ سمجھوں لیکن وہ سنانے لگا انگریزی میں تو میری بیوی آگے ہو کے بیٹھ گئی وہ چونکہ کاؤنٹ کی پڑھی ہوئی تھی، اس کو ذرا آسانی ہے، تو اس نے کہا Andrew please say it again اس نے پھر پڑھا تو وہ توجہ تاب بالکل اس کی محبت میں جلتا ہو گئی، اور میں نے شکر کیا کہ میرے اوپر بوجھ نہیں رہا۔ تو اس نے کہا، Do you write'---have you written something else too.

کہا، ہاں میری ایک کاپی ہے۔ جو جیب میں تھی تو اس نے دو تین نظمیں اس میں سے نہیں تو میری بیوی کہنے لگی یہ تو بڑا کمال Poet ہے۔ غصب کا ہے یہ تو، اور وہ یہ ساری لمبی لمبی باتیں Detail سے بیان کرنے لگی۔ اس کو اچھی خوارک ملنے لگی۔ ہمارے گھر سے، کیونکہ وہ بہت اچھا شاعر تھا۔ اینڈریو بیان وہاں رہنے لگے۔ ہمارے گھر میں ایک کوتا تھا جہاں کوئی نہیں بیٹھتا تھا، کارز میں تو وہ اس نے اپنی جگہ بنالی۔ وہاں ایک ٹوٹا ہوا مصلی بچھا لیا۔ دن بھر وہ اسی کونے میں بیٹھا رہا۔ کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ کبھی ہم کو ڈسرب نہیں کیا۔ کبھی ہم سے کچھ پوچھنا نہیں۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ بس وہیں بیٹھا رہتا تھا، اور لکھتا رہتا تھا۔ شام کو میری بیوی پوچھتی Have you something new? تو وہ کہتا تھا کہ ایک بند Stanza ہوا ہے یا دو یا پوری نظم تو وہ سناتا تھا۔ ایک ہی اس کی سامن تھی، اور ایک ہی تھا Poet اور وہ اپنا مشاعرہ کر کے شام کو پھر اوپر چلا جاتا۔ ایک دن میری بیوی بڑی پریشان تھی اور وہ بھاگی پھرتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ دوسرے سے تیسرے کمرے میں، اور ملازم بھی پریشان۔ وہ بار بار جاتی تھی برآمدے میں، اور بار بار باہر آتی تھی تو اینڈریو جس نے کبھی دخل نہیں دیا کام میں، اور انگریز آدمی کبھی دخل دیتا بھی نہیں، پوچھتا بھی نہیں۔ اس نے جب آپا جی کی پریشانی کو ایسا دیکھا تو اٹھ کے اپنی جگہ سے آیا۔ کہنے لگا:

If you do not mind Apa Ji, You seem to be discomfort and you are uncomfortable. what is wrong?

مجھے آپ سے پوچھنا تو نہیں چاہیے، کیونکہ یہ Manners کے خلاف ہے، اور مجھے دخل نہیں دینا چاہیے تھا، لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، آپ بہت گھبرائی پھرتی ہیں۔ تو اس نے کہا، Andrew do not talk to me You do not distract me اس کی پریشانی، اور بڑھی، ایک آدمی آگیا۔ ایک ہتھوڑی، اور پلاس اٹھائے ہوئے۔ وہ اندر کچھ کھٹا کھٹ کرتا رہا۔ پھر چلا گیا واپس، تو اینڈریو نے کہا، آپ مجھے جو مرضی کہیں آپا جی، میں تو ضرور پوچھوں گا کہ کیا مسئلہ ہے۔ اس نے کہا، بات یہ ہے کہ میری جو کوٹھڑی ہے، جہاں کھانے پینے کا سامان

رکھا ہوا ہے، اس کو لاک رکھا ہوا ہے آٹو میک بند ہونے والا تو میں اپنی چابیاں اندر بھول گئی ہوں۔ غلطی سے ہاتھ لگ گیا دروازے کو تو وہ بند ہو گیا، اب وہ کھلتا نہیں، اب میں نے پڑوں پہپ سے آدمی کو بلوا کے بھیجا۔ اس نے کہا 60 روپے لوں گا۔ اس نے بہت Try کیا۔ اس نے کہا ہے کہ تالا ایسا ہے جو دنیا کا کوئی بندہ کھول نہیں سکتا۔ ترکھان کو بلوائیں، وہ آری لے کر اتنا حصہ کاٹے گا۔ پھر لاک نکلے گا اس نے کہا کہ کیا میں آپ کا وہ تالا دیکھ سکتا ہوں۔ اس نے کہا تو دیکھ کے کیا کرے گا Poet۔ اس نے کہا، نہیں جی، میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو وہ کہنے لگی، آجا۔ آجاد دیکھ لے۔ اس نے تالا جا کے دیکھا تو اس نے کہا، آپا جی کوئی تار ہو گی تو اس نے کہا، تار کوئی نہیں ہے تو اس نے خود گھوم پھر کے ایک ٹوٹی ہوئی چھتری پڑی تھی ہمارے گھر میں جو پرانی تھی اس نے اس کی تار نکالی، اور اس کو مروردیا، اور اس کے اندر یوں ہلاک کر کرک سے دروازہ کھول دیا تو میری بیوی بڑی حیران ہوئی۔ تو اس نے کہا، یتم نے کیسے کھول دیا۔ کہنے لگا، بس یہ کھل جاتا ہے۔ کہنے لگا، Yes it was a Very Complicated Lock.

نے کہا، کہ اینڈر یو مجھے بتاؤ کہ تم نے کھولا کیے؟

اس نے کہا، آپا جی میں لندن کا ایک نامی گرامی چور ہوں، اور میں نے دوسال قید بھگتی ہے چوری کرنے پر۔ میرا کریکٹر اچھا تھا۔ مجھے چار مہینے کی معافی مل گئی تو ایک سال آٹھ مہینے کی سزا کائے کے بعد پھر میں جیل سے نکلا ہوں تو میرے سامنے کوئی دروازہ کوئی لاک جو ہے، وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ اب وہ ڈر گئی۔ میں شام کو گھر آیا تو کہنے لگی یہ اینڈر یو جو ہے، یہ چور ہے اور اس کو ہم نے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا، اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس نے کہا کہ اس نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ جب میں نے پوچھا اس سے۔ تو کہنے لگا، یہ سر میں تو بہت مشہور چور ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو وہ اخبار کی نیوز لنسنگ دکھا سکتا ہوں جس میں میری فوٹو ہے۔

مجھے چار مہینے کی معافی مل گئی، کیونکہ میرا کریکٹر بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد کہنے لگا، میں نے پر انگریزی سکول میں نوکری کر لی بطور پروفیسر آف فلا لو جی He did M.A in English۔ لڑپر کا آدمی تھا۔ لسانیات کا آدمی تھا۔ لغت کا بالکل لسانیات کا پروفیسر ہو گیا، تو پڑھتا پڑھاتا تارہا۔ تو کہنے لگا لسانیات بڑا سخت Subject ہے آپا جی! میں کبھی آپ کو بھی بتاؤں گا، کیونکہ آپ کو یہ ضرور آنا چاہیے، اس کی بنیادی باتیں۔ تو پھر مجھے روحا نیت کا شوق ہوا تو پھر میں اندھیا چلا گیا۔

اب ہم گھر میں دونوں میاں بیوی بڑے خوف زدہ ہوئے کہ چور کو گھر میں رکھا ہوا ہے، یہ سزا یافتہ بھی ہے، اور ساتھ ساتھ شاعر بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی کا پروفیسر بھی ہے، اور پروفیسر بھی لسانیات جیسے مضمون کا، فلا لو جی وغیرہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ اب میں اس سے تھوڑا تھوڑا ذر نے لگا، اور اس نے بھی بھانپ لیا، اور وہ صبح اٹھ جاتا تھا۔ اور ایک لمبار است طے کر کے دن بھر غائب

رہتا تھا۔ شام کے پانچ چھ بجے واپس آ جاتا تھا، پھر ہم کھانا وغیرہ کھاتے۔ دن کا کھانا وہ ہمارے پاس نہیں کھاتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا، تم دن بھر کہاں جاتے ہو۔ اس نے کہا کہ آپ تو میری مد نہیں کر سکے، لاہور میں بڑھے راوی کے پاس، ایک بابا چھتری والا ہے۔ اس کے پاس جاتا ہوں تو آپ کو بھی چلتا چاہیے۔ وہ بہت عجیب و غریب ہے، اس کے پاس علم ہے، اور وہ بہت ساری آپ کو ایسی چیزیں بتائے گا۔ تو میں نے کہا، میں ایسی چیزوں پر اعتماد نہیں رکھتا۔ میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس نے کہا، نہیں آپ میرے ساتھ ضرور چلیں تو میں شوق، اور تجسس کے مارے اس کے ساتھ گیا۔ وہاں گئے تو وہ بابا چھتری والے جو تھے، وہ کشمیری زبان بولتے تھے۔ ان کو کوئی اور زبان نہیں آتی تھی۔ اینڈر یو صرف انگریزی بولتا تھا۔ اس کو کوئی اور زبان نہیں آتی تھی، لیکن یہ دونوں صبح بیٹھے جاتے تھے گفتگو کرنے، اور شام تک ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے تھے۔ اب یہ کیا کرتے ہوں گے، یہ وہی جان سکتے ہیں۔ میرے لیے تو یہ بہت بڑا مسئلہ تھا۔ یہ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ بابا جو بات کرتا ہے، ایسی ہوتی ہے جو میں نے اس سے پہلے نہ کھمنڈو میں سنی تھی، بنا رکھنے اور بابا سے میں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ سر جو آپ سے پوچھتا ہے، کیسا آدمی ہے، لیکن اینڈر یو کو ان ساری باتوں کا پتا چلتا ہے۔ اب دیکھیے انسان تلاش کے لیے کسی طرف کو نکلتا ہے، رخ اس کا کسی، اور طرف ہوتا ہے۔ چلا کہیں سے آ گیا ہمارے گھر۔ ہم جو بے یقینے لوگ تھے جن چیزوں پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اس کو وہاں رہتا پڑا۔

اب اس نے ایک دن بتایا کہ میری ایک مُنگیتہ بھی ہے اس کا نام جوئی ہے، جوئی آنا چاہتی تھی۔ اس کو خط لکھتی تھی کہ I want to join you । تم کہاں ہو، اس وقت اینڈر یو کا والد جو تھا، وہ برلن ریلوے کار پیٹریزڈ آفیسر تھا۔ جوئی کا باپ کاؤنٹی میں ایک ڈرافٹر تھا۔ جی پی ڈرافٹر تو اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا میری بیوی کا شوق ہوا۔ اس نے کہا، جوئی کو ضرور آنا چاہیے۔ یہ الگ الگ کیوں رہتے ہیں۔ تو ہم نے کہا، ٹھیک ہے۔ اسے بلا لیتے ہیں، تو اسے خط لکھا گیا۔ اب جوئی جب آئی ہمارے گھر میں۔ بڑی خوب صورت تھی۔ بڑی گوری اوچے قد کی، لیکن طبیعت ذرا جسے کہتے ہیں، نا جلدی گھبرا جاتی تھی، وہ تحمل، اور بردباری جو اینڈر یو میں تھی، اس میں نہیں تھی، اور وہ بہت سی باتوں پر اینڈر یو پر چڑھتی تھی۔ تو جب میری لڑکیوں نے دیکھا، میری بھائیوں، میری بھتیجیوں، میرے گھر والوں نے تو انہوں نے کہا، جوئی کی، اور اینڈر یو کی شادی کی جانی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ پہلے ہم اس کی ڈھونکی رکھیں گے۔

پھر اس کی گھوڑیاں ہوں گی۔ آدمی لڑکیاں ادھر ہو گئیں۔ اس کی طرف، اور آدمی جوئی کی طرف۔ ہمارے برآمدے میں صاحب اتنی بڑی شادی پہلے کبھی ہوئی نہیں۔ بچیاں روز بیٹھے جاتی تھیں

ڈھولکی لے کر، انہوں نے بجانا شروع کر دی۔ جوئی بہت خوش۔ اتنی تو عزت نہیں ہوتی ولایت میں۔ وہ تو جاتی ہیں ایک سینڈ کے لیے۔ چرچ میں گئے اور ختم۔ ہو گئی شادی، جب شادی قریب آتی گئی۔ تو مجھے اینڈر یون نے کہا، شادی تو میری ہو چکی ہے، لیکن میں اسے بلا ناچاہتا ہوں، ملاں جی جو ہوتا ہے نا وہ بھی ہو۔ میں نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم کو ہم کیا درج کرائیں گے اس میں۔ اس نے کہا، نہیں دیے ہی آجائے، تو میں نے محلے کے مولوی سے کہا، آج ہمارے شادی ہے۔ گورا گوری کی تو آپ آ جائیں۔ تو کہنے لگا، ٹھیک ہے۔ میں نے کہا، نکاح پڑھادیں، کچھ پڑھ دیں آپ۔ اس نے کہا، کوئی بات نہیں نصیری ہیں۔ میں نے کہا، ہاں نصاری ہیں۔ اب جس دن اس کا شادی کا ون تھا، تو وہ صحیح چلا گیا، اپنے بابا سے ملنے بابا چھتری والے سے، اور اس سے دعا وغیرہ لینے۔ دن گزر گیا ہے۔ لڑکیاں ڈھولکی بجا بجا کے تھک گئی تھیں۔ شام پڑ گئی۔ مولوی صاحب آگئے۔ اینڈر یو صاحب کا کوئی پناہ نہیں، اور ہم سارے پریشان ہیٹھے ہیں گھر میں، اور جوئی جو ہے pins and needles لیے بھاگتی پھرتی ہے۔ رات پڑ گئی۔ رات کے آٹھ نوچ گئے۔ آدمی رات کو اینڈر یو صاحب چلے آرہے ہیں۔ ایک سخن پہنچی ہوئی گھنون سے اوپنجی، اور سر کے اوپر ایک ایسا صافہ اور قیص تو میں نے ذرا شاؤٹ کیا اس کو۔ میں نے اس سے کہا۔ I am very sorry I am lazy Where have you been andrew۔ تو اس نے کہا Sorry sir! forgive me یہ بار بار کہے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے کہ لیکن یہ ساری لڑکیاں ہیں۔ تمہاری شادی کا سارا اہتمام ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو کہنے لگا کہ مجھے بڑا ضروری کام تھا۔ وقت مجھے مل نہیں رہا تھا۔ مجھے سر شیفیکیت لینا تھا تو وہ مل نہیں رہا تھا، دیر ہو گئی۔ تو میں نے کہا، کون سا سر شیفیکیت۔ کہنے لگا جی میں آج مسلمان ہو گیا ہوں اور مجھے اس کا سر شیفیکیت لینا تھا۔ میں نے کہا کہاں سے لیا سر شیفیکیت۔ اس نے کہا، شاہی مسجد میں مولوی صاحب نے مجھے دیا۔ میں یہ لے آیا ہوں تو میں نے اپنا نام سلیمان رکھا ہے۔ میں نے کہا یا رجھے مسلمان ہونا ہی تھا تو مجھے سے کوئی اچھا سانام پوچھتا۔ ہم نے ذرا موسی میں اتنے اعلیٰ نام رکھے ہیں۔ سلیمان کہنے لگا، یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ بس ہاں حضرت سلیمان کی نقل۔ (اس پر ایک کیفیت طاری تھی، عجیب و غریب آدمی تھا)۔ اس نے کہا میں یہ نام رکھا ہے۔ اوہ لڑکیاں ڈھولک بجارتی تھیں۔ انہوں نے شور چاڑیا کہ سلیمان بھائی زندہ ہا د۔ جوئی کہنے لگی؟ What has happened اب میں تو چپ، میری بیوی بھی چپ۔ ایک لڑکی میری بھائی ہے نیلو کہنے لگی۔ He has embraced Islam, Now he is a muslim, His name is Sulaiman اپنے خوب صورت کپڑے جو پہنے ہوئے تھے، پھاڑ دیئے، سر کے بال نوچے، چھینیں ماریں۔ زمین پر لیٹنے لگی۔ تھوکنے لگی، اور اتنی پریشان ہوئی کہ ہمیں مشکل پڑ گئی، کہ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ اس نے کہا I will kill him, take it away from my side

کوشش کرے۔ اس نے کہا Do not talk to me تم اتنے ظالم ہوتے ہو، دہشت گرد ہوتے ہو۔ تم کچھ بھی ہو جاتے، مسلمان نہ ہوتے۔ تمہیں پتا نہیں یہ دنیا کی خوفناک ظالم، خونخوار قوم ہے۔ اس نے کہا Look I know we are not such people۔ اچھا اس کو بتارہا ہے کہ ہمارے دین میں یہ آکیلا دین ہے، جس میں ”لَا أَكُرَا هُنَّ دِيْنُ“ ہے دین پر کوئی جبر نہیں ہے۔ میں تم کو کبھی نہیں کہوں گا کہ تم اپنا دین تبدیل کرو۔ مجھے اس بات کا حکم ہے۔ وہ اس طرح سے کہد رہا ہے جس طرح سے اب وہ ایک، اور چیز ہو گیا۔ جوئی کو ہم نے سمجھایا، ملاں جی بیٹھے ہوئے ہیں اور ہر آکے، لڑکیوں کی ڈھونک بند ہو گئی۔ بڑا رونا پینا پڑ گیا۔ اس نے کہا quit I میں یہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ ہم نے کہا، اس کی اگر مرضی نہ ہو۔ تو وہ کہنے لگی، آپا جی نونونو نو ایک ہی بات کرے، مسٹر سلیمان جو کہ پہلے اینڈر یو تھا، ایک ہی بات کہے لکم دینکم ولی دین۔ یہ پتا نہیں کیا کچھ پڑھا ہوا تھا کہ شادی زبردستی نہیں کرنا۔

میں نے بتایا تو ہے کہ پاجامہ سا پہنا ہوا تھا۔ بو بھی ویسی آرہی تھی۔ خیر وہ اسے چھوڑ کر واپس چل گئی یہ رہ گیا۔ اس نے کہا، کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ ہم زبردستی کرنے والے بندے نہیں ہیں، لیکن میں اس کو مناؤں گا ضرور۔ چاہے کوئی شامل ہو یا نہ ہو تو آپ میری ایک مددگر ہیں۔ میں نے کہا، کیا۔ میں نے کبھی کوئی آپ سے چیز نہیں مانگی تو وہ میں نے دیکھی ہے۔ میں نے ایک دن سورکھوں کا آپا جی کے ساتھ چاول نکالنے کے لیے۔ وہاں سور میں ایک ڈبہ تھا میں کا۔ سر اس میں ایک بہت قیمتی چیز پڑی ہے۔ کیا آپ وہ مجھے دے سکتے ہیں۔ میں ڈر گیا، پتا نہیں کیا مانگ رہا ہے۔ میں نے کہا، کیا تو میں نے پوچھا، تم اس کا کیا کرو گے؟ اس نے کہا You don't know sir اس میں کیا شیم ہوتا ہے، اس میں آڑن ہوتا ہے، اس میں فاسفیٹ ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ یہ بڑی نعمت ہے۔ مجھے دیں میں اس کا کیک بناؤں گا۔ میں نے کہا، جوئی چلی گئی۔ شادی تھماری ہوئی نہیں، کیک بنانا کے کیا کرو گے؟ اس نے کہا، نہیں۔ چنانچہ وہ گندہ گڑ واہیات اس نے گھوول کے آٹاؤال کے اتنا اعلیٰ درجے کا کیک بنایا، ہم تو کھانہ سکے، لیکن وہ کاٹ کاٹ کر چھری سے کھارہا تھا۔ ہمارے گھروالوں کو ایک ایک فکردا دیا۔ تو میری بیوی نے کہا، اس کی شادی کا ہے۔ ہم کو لینا چاہیے تو ہم نے بھی لے کر جلدی جلدی تھوڑا تھوڑا کھایا۔ تو اس نے کہا میں اپنی ماں کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں نے کہا، ضرور کرو۔ اس نے U.K برطانیہ ماں کو فون کیا کہ یہاں پر مقامی لوگوں نے میری شادی میں بیٹ کی ماما۔ ماں اس کے بجائے اس سے یہ پوچھتی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہہ چیزیں؟ کہنے لگی؟ How was the cake? بس ایک

ہی بات کہ ماما فائیو پاؤ نڈ رادر ٹین پاؤ نڈ، اور اس میں یہ تھا۔ اور اس نے اس کو گڑ کی کیفیت بتائی۔ اس میں کیا شیم، فلا نا آرِن، فلا نا فلا نا کوئی اٹھارہ قسم کی خوبیاں گنوادیں۔ پھر اس نے کہا، میں تمہیں کل ایک لشکر لے کر پارسل کر کے کیک کی بھیجوں گا۔ کیک شادی کا بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ پھر اچانک ایک دن وہ ہم کو چھوڑ کر چلا گیا۔

مجھے کوئی ایک ممینے بعد اس کا خط آیا کہ میں بدین میں رہتا ہوں۔ سو اس میں ایک جگہ ہے، اور یہاں دریا بہہ رہا ہے، اور اللہ میاں نے اگر کوئی جنت زمین پر اتنا تاری ہے تو وہ سو اس ہے، اور میں یہاں بہت ہی خوش ہوں۔ یہاں پر ہوں، اور مجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے، میں نے جگہ خریدی ہے۔ میرے پاس تیرہ کنال زمین ہے۔ میں نے کہا، وہ تم نے کیے لی؟ اس نے کہا یہاں جن لوگوں کی یہ زمین تھی، ایک باپ، تین بیٹے ہیں۔ اس میں بزری آگئی ہے کہ دنیا دیکھے اور میں حسرت بھری نگاہوں سے اس ٹوٹے کو دیکھتا تھا پہاڑ میں۔ تو وہ مجھ سے پوچھتے تم کیا دیکھتا ہے گوا۔ میں نے کہا، یہ کتنی خوب صورت زمین ہے۔ انہوں نے کہا، لعنت ہو، یہ کوئی زمین ہے۔ یہ کوئی جگہ ہے۔ یہ کوئی ملک ہے۔ دفع دور۔ تو میراں کا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے کہا، تم زمین مجھے دے دو، انہوں نے کہا، تم زمین ہم سے لے لو۔ چارویز اہم کولندن کا منگوادو۔ میں نے کہا، منظور۔ میں نے اپنے باپ کو خط لکھا، اس نے مجھ کو چار دیزا بھیج دیا۔ انہوں نے کچھری جا کر زمین میرے نام کر دی۔ میں نے کہا، اگر جنت ہے تو سو اس ہے۔ تو وہ کہتے تھے اگر جنت ہے تو انگلستان ہے۔ ہمیں کیا اچھی چیز مل گئی۔ میں کہتا تھا، اگر جنت ہے تو یہ سو اس ہے۔ پاکستان ہے۔ کیا اچھی چیز مل گئی۔ کہنے لگا، اشفاق صاحب میں سمجھنیں سکا۔ یہ کیا ہے۔ وہ لوگ جنت کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ جو پڑھاں تھے، وہ کہتے تھے یہ بے وقوف کا پچ انگلستان کی جنت چھوڑ کر ادھر کیوں آ گیا ہے۔ تو یہ اینڈریو کی کہانی تھی، جو وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے یوں بند کرنی پڑی ہے۔ پھر کسی محفل میں آیا تو پھر بیان کروں گا کہ یہ فیصلہ انسان کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی جنت ارضی کہاں پر ہے۔

خواتین و حضرات! آپ کا بہت بہت شکر یہ، اور بڑی مہربانی، اور اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

گومان ہالینڈ

یہ جواب بات میں کرنے لگا ہوں، اس کا ہماری محفل "زاویہ" سے بلا واسطہ تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ایک چھوٹا سا تعلق ضرور ہے کہ محنت کرنے سے، اور لگن کے ساتھ پوری دھن کے ساتھ، جس طرح لوگ خدا کو تلاش کر لیتے ہیں جس طرح دنیا کی تلاش میں ہم لگے رہتے ہیں۔ مجھ سے اکثر اوقات لوگ سڑک پر چلتے ہوئے جب سامنے سرخ بیتی ہوتی ہے تو گاڑی روک کر شیشہ اتار کر کہتے ہیں کہ "اشفاق صاحب! بابا ہے کہیں؟"۔ میں کہتا ہوں ابھی تو نہیں اس وقت موڑ میں۔ میں پھر کبھی ملوں گا تو آپ سے ملاقات ہوگی۔ کہنے لگے، بس ٹھیک ہے جی، بڑی مہربانی۔ ایسے بھی کہہ کر گزر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اکثر پوچھتے ہیں کہ کوئی بابا نہیں ملتا۔ میں نے کہا، سروہ اب آپ کی آرزونہ نہیں ہے۔ کی کوئی کہا، اس محفل میں بھی یہ بات کی کہ چودہ برس بی اے کرنے میں لگائے، چودہ مہینے اس کی کوشش کرو روحانی دنیا میں جانے کی۔ کہنے لگا، نہیں چودہ مہینے تو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے کہا، چودہ چھتے، کہنے لگنہیں یہ بھی زیادہ ہے۔ اتنا نام نہیں ہے ہمارے پاس۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی ہے "بابا" تو میں آپ کی خدمت میں پیش نہیں کروں گا۔ اس لیے اسے زوج کرنے کے لیے ذلیل و خوار کرنے کے لیے اس کا ایڈریس پوچھ رہے ہیں کیونکہ آخر میں آپ نے یہ کہنا ہے کہ ملے تھے وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے تو کوئی کبوتر نکال کر دکھایا ہی نہیں۔ اکثر یہی آرزو ہوتی ہے نا آدمی کی۔ ہم نے پاس کرنے کے لیے کہا تھا، وہ تو کیا نہیں ڈبا پیر جو تھا۔ اکثر جو جعلی قسم کے پیر ہوتے ہیں وہ اسی طرح بنتے ہیں کہ اپنی زندگی تو بے چارے شروع کرتے ہیں اللہ کی تلاش میں، لیکن ہم لوگ جوان کی خدمت میں حاضر ہونے والے ہوتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو جا کر مجبور کرتے ہیں آہستہ آہستہ کہ وہ ڈبا پیر بھیں، اور ہماری خواہشات کو پورا کریں۔ ابھی تک کوئی بندہ ایسا نہیں گیا ان کے پاس جو کہے کہ مجھے کچھ روح کی تلاش ہے۔ اللہ کی آرزو ہے۔ میں دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا چاہتا۔ اس لیے میری آپ مدد کریں۔ چونکہ ایسا سوال نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بے چارے اپناروپ بھی، اور طرح کا اختیار کر

لیتے ہیں۔ تو میں تمہیداً عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو بات میں کرنے والا ہوں، اس کا تعلق Struggle سے ضرور ہے۔ کوشش سے، اور جدوجہد سے، لیکن اس کا بلا واسط طور پر اس سے تعلق نہیں ہے، لیکن آپ سنیں گے تو چونکہ آپ ہمارے ذہین ناظرین ہیں، خود و خود اس کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں گے۔

کن 49ء کی بات ہے، میں یہاں تھا تو ہمارے دوستوں کا ایک گروہ تھا جس میں سے سب سے نمایاں ہمارا دوست نصرت درانی تھا، جو ایک سپالیٰ کمپنی کا مالک تھا ملٹری کو سامان لے کر دیتا تھا۔ امیر آدمی تھا اس زمانے میں۔ اس کی بیوی بہت ماڈرن تھی۔ ہم اس کو پیار سے نیتی کہتے تھے۔ نیتی استانی قسم کی خاتون تھی، اور ہر بات میں ہم کو گایہزد کرتی تھی۔ آرٹسٹ، بہت اچھی تھی، اور وہ یہ جولینڈ سیکپ پیننگ ہوتی ہے، واٹکلر کی بہت ماہر تھی، اور وہ اکیلی لڑکی تھی سارے لاہور میں جو دوپٹے نہیں لیتی تھی۔ سارے اس کو جیرانی سے دیکھتے تھے کہ کمال کی بات ہے۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے جو اس زمانے میں نہیں ہوتے تھے، ہم جب اس کے ساتھ دوستوں میں باہر نکلتے تھے تو سب اس نیتی کو دیکھتے تھے۔ اس کا ایک بچہ تھا، بڑا شریر، بڑا ضدی، بڑا ظالم، بوٹ سے ٹھوکریں مارنے والا، بالکل نہ مانے والا۔ تو ان کے ساتھ، اس خاندان کے ساتھ ہمارے بڑے تعلقات رہے۔

ہمارا ایک دوست تھا۔ بہت اچھا آرٹسٹ، اب بھی ہے تو ان کے سٹوڈیو میں ہم اکٹھے ہوتے تھے۔ کئی دفعہ ہم اپنی دھماچوکڑی لارنس گارڈن جس کو اب باغِ جناح کہتے ہیں، میں چاٹتے تھے، ہم چلتے رہے۔ بہت اچھی طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ بانہوں میں بانیں ڈال کر، بڑے اچھے ایام ہمارے گزر رہے تھے کہ اچانک درانی اور نیتی کا جھگڑا ہو گیا۔ میاں بیوی کا جھگڑا ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اتنی شدت اختیار کر گیا کہ انہوں نے علیحدگی کی بات کر لی کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ بچے کا معاملہ تھا، ہم سب روئے پیئے۔ درانی سخت آدمی تھا۔ اس نے کہا، نہیں میں نے نہیں رہنا۔ میں نے کہا، بچے کا کیا کرو گے۔ اس نے کہا، بچے کی مرضی ہے، ماں کے پاس رہنا چاہے، ماں کے پاس رہے۔ میرے پاس رہنا چاہے تو میرے پاس رہے۔ تو نیتی کو بھی ہم نے سمجھایا۔ وہ کہتی تھی کہ نہیں اگر یہ اتنا زیادہ سخت ہے تو میں اس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ میں اپنے فن میں طاق ہوں۔ لو جی دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں کے سامنے ہماری موجودگی میں کاغذ (طلاق) لکھے گئے، اور وہ تو کم روئے، اور ہم زیادہ روئے، اور بڑا دکھ ہوا۔ طلاق ہو گئی۔ بچے ماں کے ساتھ چلا گیا۔ ویسا ہی ضدی ویسا روتا، سورتا، تھڈے مارتا ہوا۔ تو درانی سے میں ملا، وہ منتقل ہو گیا تھا GHQ راولپنڈی، وہیں اس کا دفتر تھا۔ اچھا خاصاً بڑا دفتر۔ میں نے اس سے کہا کہ اب تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ کہنے لگا، نہیں دفع کرو۔ یہ تو پیشہ ہی ایسا نہیں ہے کہ شادی کرو۔ میں شادی کروں ہی گا نہیں ساری عمر۔ میں نے کہا نہیں نہیں تمہیں کرنی چاہیے، تو نہیں مانا۔ سارے دوستوں نے بھی زور دیا مگر نہیں مانا۔ وہ کہتا تھا میں

اکیا بڑا خوش ہوں۔ یہ میری کوئی ہے، اور اتنی بڑی کوئی بارہ چودہ کنال کی، اور چھاؤنی کا علاقہ ہے، خوش و خرم ہم رہتے ہیں۔ مالی آتی ہے، اماں زین کپڑے دھونے کے لیے۔ اس کی ساتھ دو بیٹیاں تھیں۔ ایک داروغہ تھی۔ ایک کام نام تھا۔ وہ کپڑے بھی دھو جاتیں، کھانا بھی پکا جاتیں، جھاڑو والوں بھی کر جاتیں۔ پھر اس کا خانہ مال تھا۔ پھر اس کا گھوڑا تھا۔ گولف کھیلتا تھا۔ امیر آدمی تھا۔ اچانک میں تھوڑا سا اس سے دور ہو گیا کہ میں لا ہو رہی میں مصروف ہو گیا۔ کچھ میری مصروفیات آزاد کشمیر یہ یوں تھیں۔ جیسا کہ آپ کو پتا ہے وہاں سے تراز کھل چلے گئے، تو لوٹ کے آیا تو اس نے کہا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے شادی کرنے کا۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے۔ کہنے لگا اب کی بار میں شادی کروں گا تو کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جو بالکل دیہاتی ہو، الہر نیا رہو جس کو کچھ زمانے کا پتا نہ ہو۔ نینی جیسی نہ ہو، نہ پینٹنگ جانتی ہو، نہ ڈنس جانتی ہو۔ نہ اس کو کچھ زندگی کا آگے کا پتا ہوئہ چیچھے کا پتا ہو۔ ایک سادہ، پاکیزہ سی لڑکی۔ میں نے کہا، بھی دیکھ لو تم بہت پڑھے لکھے ہو، اور تمہارا انداز زیست مختلف قسم کا ہے، تو تم اس کے ساتھ بناہ کرلو گے؟ اس نے کہا، میں کرلوں گا۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے۔

تو جناب یہ فیصلہ اس نے دل میں کر لیا ہوا تھا۔ میں نے دوستوں کو اطلاع بھی دی۔ بتا بھی دیا تو انہوں نے کہا، یہ بکواس کرتا ہے۔ یہ ہونیں سکتا، یہ کس طرح سے کرے گا؟ یہ تو بہت ماڈرن قسم کا آدمی ہے۔ میں لوٹ کے آیا کراچی سے، ہمارا وہاں ایک سیمنار تھا، کوئی ایک میئنے کا۔ مجھے اس نے ڈھونڈا۔ گاڑی اس کے پاس لینڈ روور تھی بغیر چھٹت کے بٹن دباتے تو چھٹت کھل جاتی تھی، وہ آیا اور کہنے لگا Meet your Bhabhi تو وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی بے چارمی لڑکی۔ نہ اس کا سرمنہ نظر آئے۔ میں نے کہا، کون ہے یہ لڑکی؟ تو میں نے آگے ہو کے کہا، السلام علیکم۔ کہنے لگی و علیکم السلام بھائی جان۔ تو دیہاتی سی لڑکی تھی تو میں نے آگے ہو کے دیکھا، وہ گوماتھی، جوان کے کپڑے دھونے آتی تھی۔ اماں جان (کام کرنے والی) کی بیٹی، اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی، گوما کے ساتھ۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے کہا، یہ گوما بیچاری جھاڑو دیتی ہے کچھ نہیں پتا اس کو۔ اس نے کہا، میں بڑا خوش ہوں اس کے ساتھ، اور بہت اچھی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مجھے وہ نظرے والی نہیں چاہیے۔ اچھا بھی اب کیا کر سکتے تھے۔

خواتین و حضرات پورے ایک سال کے بعد 31 دسمبر کی رات تھی۔ اگلے دن صبح نیو ایئر (New year) تھا۔ چھاؤنی میں وہ تھا، چکلالہ میں۔ بہت لمبا چوڑا انتظام جیسے ہوتا ہے تو اس نے کہا، شام کو باغ میں چلیں گے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے چلیں گے۔ کھانے کا مجھے جب سے شوق تھا یہ جسم سے بھی ظاہر ہے۔ بڑی اچھی میں تھی، وہاں گئے۔ وہاں غیر ملکی لوگ بھی موجود تھے، اور سفارت خانے کے لوگ، مشری کے ایک پہر جو باہر سے آئے تھے، وہ بھی تھے تو جب وہاں گئے تو مجھے اس نے

کہا، تم آ جانا میری سیشیں بک ہیں۔ میں وہاں بینچ گیا تو یہ تھا نہیں۔ دور سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ بڑی خوبصورت لڑکی، اور چھوٹی سی اس کی کمر پیلے رنگ کا اس نے سویٹر پہنا ہوا۔ اوپری ایڑی کی گرگابی اس کے بال کے ہوئے تھے۔ وہ چلی آ رہی تھی اس کے ساتھ۔ میں نے کہا، دیکھو میں نے اس کو منع کیا تھا، اب دیکھو کوئی اور لے آیا ہے وہ قریب آئی تو گوماتھی۔ کہنے لگی، بھاجی۔ میں نے اسے دیکھا، اور انھوں کے کھڑا ہو گیا۔ تو کہنے لگی، آپ کیسے ہیں؟ آپ تو آئے ہی نہیں۔ یہ آپ کا بڑا ذکر کرتے ہیں جی۔ اب میں اس کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ میں اس کو دیکھ رہا ہوں، جیز اس نے پہنی ہوئی تھی نیلے رنگ کی اور پیلا سویٹر۔ چانے کافی مجھے پینے کا شوق تھا۔ انہوں نے کہا بھی پیو گے۔ میں نے کہا، بھی بھی پیوں گا، اور کھانے کے بعد بھی پیوں گا۔ کافی پی، لیکن میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گوما کی طرف۔ میں نے پوچھا، داراں کہاں ہے، تو اس نے کہا کہ انہوں نے اس کو مکان لے کر دیا ہے۔ وہ وہاں گاؤں میں ہیں۔ اماں بھی وہیں ہیں۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے جاتی ہوں، لیکن اس کے انداز میں اس کی گفتگو میں ایک بڑی تبدیلی آگئی تھی، جو کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسی تبدیلی آ سکتی ہے، اور اتنی جلدی۔ لوگ ہلا گلا کرنے لگے، میوزک بختے لگا۔ اتنے میں میں کرتل آیا بوڑھا سا آگے بڑھا، اور سلام کیا۔ اس نے گوما کی طرف انگلی اٹھائی وہ پکڑ کر چلی گئی۔ خواتین و حضرات وہ ناچی ہے کوئی۔ یعنی بینڈ کی دھن کے اوپر گوما۔ اپنی ایڑیاں زمین سے اٹھا کر بڑا مشکل ہے دھم دھما دھم، اور وہ کیسے ہمیزی کی طرح گھوم رہی تھی، اور کرتل بیچارہ اچھا بھلا تھا، وہ ہف گیا بوڑھا۔ اس سے چلانے جائے۔ تو وہ ایک دوتالیاں بھیں۔ آ کے بینچ گیا۔ تو میری سمجھ میں نہ آئے کہ اس کو داد دوں یا بے داد، سمجھ میں نہ آئے۔ پھر ایک بندہ آ گیا تو اس سے آ کر کہنے لگا کہ ایک سکو زمی۔ گوما کہہ رہی ہے کیسے انگریزی I am realy tired' after five minute I will be refresh میں نے جب انگریزی سنی اس کی، تو میں نے کہا، یہ تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کہنے لگی گفتگو میں آ جاتی ہے۔ تو میں نے کہا، تم نے پڑھائی شروع کی۔ کہنے لگی، نہ بھاجی مجھے پڑھائی اچھی نہیں لگتی میں پڑھی لکھی تو نہیں۔ میں نے پڑھنا لکھنا بالکل نہیں سیکھا۔ تو میں نے کہا، یہ جو تم بولی ہو۔ کہنے لگی، نہیں بول میں ساری ٹھیک ٹھاک لیتی ہوں۔ سمجھ بھی لیتی ہوں۔ میں نے کہا یہ راز کیا ہے؟ کہنے لگی جی زبان کے جانے کا راز اس کے بولنے میں ہے۔ اچھا لکھنے والا جو ہے نا، اس کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ جتنا اچھا بولنے والے کی ہوتی ہے، کیونکہ کاونٹ کے پڑھے بچے بچیاں ہیں جو ان کو انگریزی سکھائی جاتی ہے بولنے والی ہے۔ فیض صاحب جو تپڑ سکول کے پڑھے لکھے تھے، ایڈیٹوریل وہی لکھ سکتے تھے۔ وہ یہ راز پا گئی تھی۔ اس نے کہا، بولنے کا کمال ہونا چاہیے، آپ نے دیکھا ہو گا کہ سیاستدان اکثر کہتے ہیں، یہ تو بولنا نہیں ہے، فلاں آدمی کمال کا بولتا ہے جی، اس کے کیا کہنے ہیں جی، تعریف ہوتی ہے اس کی۔ تو وہ چونکہ یہ راز

پاگئی تھی، اس نے بولنے پر توجہ دی، اور کھٹا کھٹ بولنے لگی۔ تو اس کے ساتھ کہنے لگی، ہمارا اس کا جائزت اکاؤنٹ بھی ہے۔ درانی کا، اور میرا، اور میرا سنگل بھی ہے۔ تو میں نے کہا، تم اسے آپریٹ کیسے کرتی ہو۔ کہنے لگی، میں Goma (گوما) لکھتی ہوں۔ گوما لکھنا سیکھ لیا ہے۔ وستخٹ تو کر لیتی ہوں، اور میں نے ہند سے بھی سیکھ لیے ہیں۔ ایک سے سوتک۔ بڑے اچھے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ کوڑا صاف کرنے سے بہت آسان بات ہے۔ میں تھک جاتی تھی اور وہ کپڑے دھونے سے یہ پڑھنا لکھنا تو بڑی کمال کی چیز ہے۔ اس میں بندے کو بغیر کچھ کیے عزت مل جاتی ہے۔ عجیب فلسفہ تھا اس کا، میں بہوت رہ گیا۔

اتنے میں ایک اور آدمی آیا، اور اس کے ساتھ جا کر ناپنے لگا اور وہ ساری اس محفل کی جان تھی جو بھی لوگ آتے تھے، خاص طور پر فارنز وہ اس کے ساتھ ناچتا پسند کرتے تھے، اور اللہ نے اس کو ایسا شعور دیا تھا کہ وہ تو پتا نہیں میں کس کی مثال دوں۔ آپ نے کبھی ایسا ناج نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر ہم نے کھانا کھایا، اور ہم آگئے۔ درانی مجھے کہنے لگا، شام کو تم جاؤ گے نہیں کہیں۔ میں وہیں رہا، تو صبح جو اس نے ناشائستہ ہم کو دیا وہ تو تھا ہی کمال کا لیکن جس طرح سے اس نے ملازمہ کو کنڈ کٹ کیا، یعنی اس کو حکم دیا کہ یہ چیز لے کر آؤ، بھائی جان کے لیے، یہ چیز واپس لے جاؤ، اور وہ جو میں نے فلاں فریج میں رکھی ہے، اس کو نکال کے لاو، وہ دیکھنے والا انداز تھا۔ اس نے کہا، دیکھو اس کو غلام محمد دیکھو، سائیں ہے؟ اس نے کہا، جی بیگم صاحب۔ بلا وہ اس کو۔ تو وہ سائیں آ گیا۔ کچھ، اور قسم کا آدمی۔ تو اس نے کہا دیکھو ایک گھوڑا تو میرا ہے ایک صاحب کا ہے۔ ایک بھائی جان کے لیے پیدا کرو۔ تو اس نے کہا، بہت اچھا۔ میں نے کہا، مجھے کیا کرنا ہے گھوڑا۔ انہوں نے کہا، آپ کو بھانا ہے اس کے اوپر۔ آپ چلیں گے۔ میں نے کہا، خدا کے لیے میں گھوڑے پر کبھی نہیں بیٹھ سکتا۔ انہوں نے کہا، پچھو نہیں ہوتا، آپ چلیں ہمارے ساتھ۔ تو جی شام کو اس نے گھوڑے پر چکر لگوایا اور انہوں نے کہا، اگر آپ چاہیں تو ہم انہی گھوڑوں پر مری چلتے ہیں۔ میں نے کہا، اللہ کے واسطے اتنا ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہیں تک کافی ہے۔ اس کے بعد بڑی بھی کہانی ہے، میں جلدی جلدی سے وانتہا اپ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر جناب مجھے ولایت آتا پڑ گیا۔ اور کچھ عرصہ مجھے ان کی کوئی خبر معلوم نہ ہو سکی۔ دو سال کے بعد جب میں واپس گیا، بڑی آرزو تھی درانی سے ملنے کی، گوما سے ملنے کی۔ تو میں ملا درانی سے، اپنے دفتر میں تھا۔ بڑا اچھا خوشحال۔ تو میں نے کہا، سناو بھائی کا کیا حال ہے۔ کہنے لگا، دفع کرو، لعنت بھی جو اس پر۔ میں وہ گالی نہیں دے سکتا جو اس نے دی تھی۔ ساری کائنات کو، انسانوں کی انسانیت کو، جس کو بھی جس طرح سے گنا جا سکتا ہے، اور ساتھ گوما کو بھی۔ میں نے کہا، وہ ہے کہاں۔ تم اس طرح کیوں کہہ رہے ہو۔ کہنے لگا، بس یار لعنت بھیجو۔ میں نے کہا، ہوا کیا۔ کہنے لگا، وہ اس کا ایک بڑا محبوب دوست تھا ہالینڈ کا تھرڈ سیکرٹری ایمسی میں۔ اس نے مجھ

سے طلاق لے کر اس سے شادی کر لی اور وہ ہالینڈ چلی گئی، وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے کہا، گوما ہالینڈ میں۔ کہنے لگا، ہاں۔ تو میں نے کہا، وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ کہنے لگا، وہ ہم سے تم سے زیادہ سمجھدار ہے۔ اس کو زندگی گزارنے کا طریقہ بہت اچھی طرح سے آتا ہے، اور وہ اونچ پنج کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہے، اور وہ اپنا آپ اپلا فی کرتی ہے۔ اگر کہیں اس نے اپنا آپ روحاںیت کی طرف اپلا فی کیا ہوتا تو اس وقت پاکستان کی کیا، پورے بر صغیر کی ایک بزرگ ترین تھی ہوتی، لیکن اس کا رخ دوسری طرف ہے وہ کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے تو میں نے کہا، مجھے جانا ہے ولایت، تو پھر میں اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ اس نے کہا، جاؤ دفعہ ہو جاؤ تم بھی اس کے ساتھ۔ خیر مجھے وہاں ہالینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ پتا کیا اس کو ڈھونڈ نکالا۔ بڑی خوش و خرم تھی اور اس کا والائی خاوندوہ چھوڑ چکا تھا نوکری۔ اس نے کوئی خوشبویات کی Activity چلائی تھی، اس میں وہ ساتھ اس کے کام کرتی تھی۔ میں نے کہا، تم نے ابھی تک لکھنا نہیں سیکھا۔ کہنے لگی، نہیں، لکھنا نہیں سیکھا، میں بولنے انگریزی ہوں۔ اب میں ڈچ زبان بھی بول لیتی ہوں، کیونکہ مجھے اس کا محاورہ ہے۔ اس نے کہا، ایک فرق میری زندگی میں پڑا ہے کہ میں نے اپنے نام کے سپیلگ بدل لیے ہیں۔ میں اس کو Gomant کرتی ہوں فرچ میں T نہیں بولتے بھائی جان۔ تو گوالمکھتی تھی، یہ بہت اچھا لگتا ہے، جب میں دستخط کرتی ہوں پیسے چیک وغیرہ نکالنے ہوتے ہیں۔ تو میں بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگی، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ یہ علاقہ جو ڈھنک کا ہالینڈ ہے۔ میں اسے چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا، تم کہیں اور کام کرو۔ کہنے لگی نہیں، میں اس پر غور کر رہی ہوں۔ کہنے لگی، اماں کا بہن کا بھی کوئی خط آتا ہے، ان کو پیسے وغیرہ پہنچ دیتی ہوں۔ وہ بہت خوش ہیں۔ میں نے کہا، تمہیں آرزو پیدا نہیں ہوئی، بھی ان سے ملنے کی۔ کہنے لگی، ہوتی ہے، لیکن یہاں کام و امانتنے ہیں، مصروفیات ایسی ہیں کہ میں اس میں لگی رہتی ہوں، اور میں ان کی طرف توجہ نہیں دے سکتی، لیکن میں ان کی نگہداشت بہت اچھی طرح سے کر لیتی ہوں۔ مالی طور پر وہ بہت خوش ہیں۔ میں نے کہا، اچھا جی ٹھیک ہو گیا۔ اس سے مل کے، اس کے ہاں کھانا کھا کے پھر اپنے کام کر کے جو میرے ذمے تھے، ہماری یونیورسٹی کی طرف سے میں واپس آیا اور درانی سے ملا۔ بہت خوش و خرم، اور بہت اچھے موڑ میں۔ ہاں جسے کہتے ہیں ناچا گیاں مارتا ہوا۔ بالکل خوش ہوتے ہوئے کہنے لگا، لو دیکھو ہماری بھی مدد ہو گئی۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ کہنے لگا۔ وہ اس بد بخت کے پاس بھی نہیں رہی، ڈچ کے پاس۔ اس نے اس سے طلاق لے لی ہے۔ برسلز کے ایک بوڈھے کے ساتھ شادی کر لی ہے جو کہ وہاں کی ایلومنیم کی فیکٹری کا مالک ہے۔ اب وہ اس کی فیکٹری Run کرتی ہے کیونکہ باپ سے اتنا نہیں ہوتا کام اب، اس کے ہاں ڈیڑھ ہزار مالازم ہے، گھوگھو بجتا ہے، اور وہ پنج میں پتلون پہن کے گھومتی ہے۔ ہنڑ پکڑ کر جیسے سرکس نہیں ہوتی، رنگ ماسٹر، وہ سارا کنشروں کرتی ہے، اور اتنا اچھا اس نے کنشروں کیا ہے کہ اب وہ

یورپ ایسوی ایشن آف ایلومنیم فیکٹری کی اسٹنٹ صدر ہو گئی ہے۔ یہ یاد رکھیے پنڈی کے پاس گاؤں ہے۔ دو بتا لے اس کے پاس کی رہنے والی تھی، تو یہ اس کا ارادہ تھا، اور یہ اس کا تمہیرہ تھا۔ اس وقت میں اسے نہیں جانتا، دس سال ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے اب بھی وہ انٹرنیشنل ایلومنیم ایسوی ایشن کی صدر ہو گئی کیونکہ اللہ نے اسے بڑی صلاحیت دی تھی، اور اس نے اپنی ساری صلاحیت ایک رخ کے اوپر چلا دی تھی۔ توجہ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب ہمیں کوئی بتائیں کہ بابا کدھر ہوتا ہے، تو مجھے ہمیشہ وہ یاد آ جاتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہوتا ہے۔ یہ فلاں چیز کہاں ہوتی ہے۔ وہ اپنی دھن کی پکی، اور راست روختاون تھی، اور جوبات تھی دل میں رکھتی تھی، وہ بہت کم گوئی، دھارنا و دھاری تھی، اس کو پورا کر کے چھوڑا۔ خواتین و حضرات! اگر آپ تمہیرے کرنا چاہتے ہیں تو مجھ سے نہ پوچھیں۔ اپنے آپ سے پوچھیں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ جب تک آپ کی کنویشن نہیں ہو گی۔ باہر کی لائی ہوئی تبدیلی کسی طرح سے بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ اب ہم سارے مل کے اپنی گوما کو ڈھونڈیں گے۔ یعنی ہماری اپنی روح جو ہے، وہ ہمارے لیے گوما کا درجہ رکھتی ہے تا، ہم چونکہ روح کے انسان ہیں۔ اللہ میاں نے انسان کو ایک کیفیت دی جو دوسروں کو، کسی جاندار کو نہیں دی۔ انسان کا ایک وجود ہو ہے، وہ جسم ہی جسم نہیں ہے۔ اس کے اوپر ایک اور چوبارہ بھی ہے، جو Intellect کا چوبارہ ہے۔ اسی وجود کے اوپر۔ وہ اخلاقیت کا چوبارہ جو آپ کو مجبور کرتا ہے کہ آپ سردیوں کی تجربتی رات کوٹھی ہوئی بائیکل چلاتے ہوئے نصرت فتح علی خان کا گانا سننے جائیں، وہ تقاضا ہے نا۔ بھیس بھی بھی مشاعرہ سننے نہیں جاتی۔ اس کو صرف اپنا جسم چاہیے، روٹی، کپڑا، مکان، کوئی جانور ایسا نہیں کرتا۔ شیر نے آج تک کسی قوالی میں شرکت نہیں کی، بندہ کرتا ہے۔ اس کی آرزو ہے جو مرضی کریں۔ یہ جو اخلاقیت ہے، ذہن کا چوبارہ، اس کے اوپر ایک، اور ہے، اور وہ روح کا چوبارہ ہے، وہ ہمارا بند پڑا ہے۔ گندی ٹوٹی پھوٹی پھوس اس میں پڑی ہے۔ پرانا ٹوٹا ہوا چرخ ہے۔ پرانی محبیاں (چار پائیاں) بستر چھینکے ہوئے ہیں۔ شنیشے اس کرے کے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ گندی اس کی آدمی Permanent بند ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی اوپر چڑھتا ہے، اور وہ آواز دے کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کا ہے چوبارہ۔ تو یونچ سے آواز دیتی ہے کہ اپنا ہے۔ تو کہتا ہے۔ اس کو کھولیں۔ وہ کہتی ہے، نہ پت دفعہ کہ اس میں گند پھوس بھرا ہوا ہے۔ اس کو کھولنے کی کوئی چند اس ضرورت نہیں۔ تو یہ ارادہ شیر حیاں طے کر کے اوپر چڑھنے والے انسان کا ہوتا ہے کہ آیا میں اس کو ٹھڑی کوکھلوں یا نہ کھلوں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

احکام الٰہی

جو ان کا زمانہ طاقت ور، منہ زور اور کڑا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم جوان تھے، اس وقت اس میں ضد بھی شامل تھی، اور سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ ہم کو دنیا بھر کے سوالوں کے جواب آتے تھے۔ کوئی مشکل سے مشکل بات ہو، ہم اس کو سمجھتے ہیں، یہ اس عمر میں ایک خاص طرہ امتیاز ہوتا ہے تو ہم نے ایک دن بابا سے یہ سوال کیا کہ سرآپ یہ بتائیں اور تو ساری باتیں سمجھیں میں آگئی ہیں زندگی کی، یہ بتائیں یہ جو بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں ناکارہ لوگ ہوتے ہیں جن کا سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جنہوں نے بہت سے ایسے مظالم ڈھانے ہوتے ہیں لوگوں پر کہ ان کو کوئی معافی نہیں ملنی چاہیے۔ وہ زندگی میں % کامیاب ہوتے ہیں، اور بہت اونچے درجوں کے ہوتے ہیں، اور بہت اعلیٰ رتبے حاصل کرتے ہیں، اور جو لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، بڑے نیک ہوتے ہیں، بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں، وہ دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو قدرتی طور پر ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ مسکراتے رہے۔ اس بات کا کوئی جواب نہ دیا، اور ہم بڑے مالیوں ہوئے، اور واپس اپنی کوٹھڑی میں آ کر بیٹھ گئے، اور اپنے طور پر غور کرنے لگے کہ یہ عجیب ہے، یہاں بھی دونبر کام کرنے والے لوگ ہیں، ان کی بڑی عزت افرادی ہے، اور جو اچھے والے ہیں، وہ بے چارے مارے پھرتے ہیں۔ کچھ معمولی لوگ ہوتے ہیں، ان کو کیوں سزا ملتی ہے زندگی میں۔ ایک تین سال کا بچہ ہے، اور وہ باہر نکلا سڑک پر اپنی گیند کو پکڑنے کے لیے، اور تیزی سے ایک کار آتی ہے، اس کو کچل جاتی، اب اس کا کیا قصور تھا۔ اس طرح کے بے شمار سوالات جو ذہن میں آتے تھے، جب بھی آتے تھے اب بھی آتے ہیں، اور ان کا جوانی، اور بڑھاپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ بتدریج آتے چلے جاتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں جب تک انسان زندہ ہے۔ وہ ضرور ان سوالوں کو Face کرتا ہے، اور ان کا جواب نہیں دے پاتا۔

ایک روز ایں اور میرا ساتھی بہت بے چین ہوئے۔ اور ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ گزرا تھا، جو ہمارے ساتھ نہیں گز رنا چاہیے تھا، کیونکہ ہم اپنے ”بھانویں“ بڑے اچھے آدمی تھے۔ لیکن ہم نے

بایا جی سے پوچھا کہ سری راز کھول کر ہمیں بتائیں، ایسا کیوں ہوتا ہے، تو انہوں نے کہا، دیکھو آپ لوگ جو ہیں، اللہ کے حکم کے پابند ہیں، احکام الہی کے پابند ہیں۔ آپ لوگوں نے ایک عجیب صورت حال اختیار کر لی ہے کہ آپ فعل اللہ کے اوپر تنقید کرنے لگ گئے ہیں۔ فعل اللہ کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ اللہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے جو چاہے اس کی مرضی کرے۔ لیکن آپ صرف اس کے احکام تک رہیں، اور فعل اللہ کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے کہا، سری تو پھر کمال کی بات ہے۔ ہم تو پڑھے کہے لوگ ہیں، اور ہم کو کالجوں، یونیورسٹیوں میں یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ تنقید کریں۔ با قاعدہ Discuss کریں، ڈائیلاگ کریں۔ انہوں نے کہا، نہیں آپ کا، اور ان کا یہ رشتہ ہرگز ایسا نہیں ہے، تو آپ سے ہمیشہ یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ آپ احکام الہی کو چھوڑ کر فعل الہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک نئی بات تھی جو بڑی قابل غور اور قابلِ توجہ تھی۔

پھر جب تھوڑا سا وقت اور گزرا، اور ہم نے اپنے ارد گرد دیکھنا شروع کیا تو یہ محسوس کیا کہ واقعی ہماری توجہ فعل اللہ پر زیادہ رہتی ہے، اور ہم خواخواہ اس میں داخل دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم ایک دفعہ کافشن گئے۔ ارادہ تھا کہ ساحل پر پینک منائیں گے، بالکل پانی کے قریب جا کے ریت میں۔ وہاں جا کر کے دری بچھائی سامان رکھو دیا اس کے اوپر تو میں نے کہا تھا، کوئی لہر ایسی بھی آئے گی جو ہمارے اوپر چڑھ جائے گی۔ تو ہم نے کہا کوئی بات نہیں، پھر ہم بھاگ چلیں گے، دری کھیچ لیں گے۔ بڑا مزہ رہے گا۔ جب میری بیوی سارا سامان لگا رہی تھی، چائے والے کا تو میں نے دیکھا کہ اس دری کے اوپر ایک چھوٹی سی چیونٹی جو ہے، وہ چلی جا رہی ہے۔ بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ سمندر کے پاس گھونگھا پس، سنکو ہو سکتے ہیں۔ یہ چیونٹی کا یہاں کیا کام، یہ کدھر سے آگئی۔ پھر میں غور کر کے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سوچتا رہا کہ یہ لا لوکھیت سے چلتی چلتی تیرہ دن کی مدت میں سفر طے کر کے آج ساحل پر پہنچی ہے۔ لیکن پھر میں سوچنے لگا، اس نے کیوں اتنی مصیبت اختیار کی۔ پھر میرے اندر سے آواز آئی کہ یہ بے چاری بہت بے چین تھی۔ گھر میں بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ میں جو یہاں پر رہتی ہوں تو میں جا کر سمندر کی حقیقت معلوم کروں گی۔ تو یہ سمندر کی گہرائی اور اس کی وسعت دیکھنے کے لیے یہاں تشریف لائی ہے، اور کہتی ہے کہ میں سمندر کو اچھی طرح سے سمجھنا چاہتی ہوں۔ تو یہی کیفیت انسان کی ہے کہ وہ اللہ کو اس کی ساری گہرائی، اور گہرائی کو ایک چیونٹی سے بھی کم تر ہونے کے باصف جانے کی آرزو رکھتا ہے۔ جانے کا تجسس، اور شوق ہوتا ہے۔ تو ہم بیٹھے رہے۔ خیر ایک لہر آئی ہے، اور اس چیونٹی کو ہماری جائے نماز کو، اور ہماری سب چیزوں کو بھلکو کر گز رگئی، تو پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی اللہ جو چاہے کرے جس طرح سے مناسب سمجھے لیکن اس کے باصف دل کے اوپر ایک بوجھ ضرور رہتا ہے، اور آپ بھی اپنی روزمرہ زندگی میں یہ سوال کرتے رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں سے اپنے گھر والوں سے

اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ تو ہمارے بارے یہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تم پچھے ہو، اور تم جاننا چاہتے ہو اور اس راز کو معلوم کرنے کے خواہش مند ہو، صرف یہ نہیں سری پائے کھاتے ہوئے یا انہاری کھاتے ہوئے یا بروست کھاتے ہوئے۔ اگر آپ سچ مجھے جاننا چاہیں تو پھر اس کا ایک نسخہ ہے بڑا سیدھا اور پائیدار نسخہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ احکامِ الہی کے اندر پورے کے پورے داخل ہوں جوں جوں آپ احکامِ الہی کے اندر داخل ہوتے جائیں گے، اور اس محیط کے اندر اپنے آپ کو سمیٹنے جائیں گے آپ پراسرارِ الہی ضرور واضح ہوں گے۔ جس طرح سے آپ ایتم کا راز معلوم کرتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا ایتم جو آنکھ کو بھی نظر نہیں آتا، خور دین سے بھی نظر نہیں آتا، وہ کس طرح اتنا بڑا، اور طاقتور ہو سکتا ہے کہ سارے علاقے کو ملک کو جگہوں کو شہروں کو پھاڑ کر رکھ دے، اور ملیا میث کر دے۔ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ سب سے پہلے آپ نیوکلیئر فزکس پڑھیں۔ پھر آپ لیبارٹری میں آئیں، اور لیبارٹری میں آکر اس پر تجربہ کریں۔ پھر اس کے بعد آپ کہوں جائیں گے۔ پھر کہوں میں جا کر ان کے ساتھ کام کریں۔ آپ پرشیش کی طرح یہ واضح ہونے لگ جائے گا کہ یہ کیسے عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے افعال کو جاننے کے لیے اللہ کے احکامات کو ماننا ضروری ہے۔ یہ راست ہے۔ جب آپ احکامات کی لیبارٹری میں آجائیں گے۔ پھر یہ ساری باتیں آپ پر آسانی کے ساتھ واضح ہوتی جائیں گی اور واضح یوں ہوتی ہیں کہ انسان جو ہے وہ کتنی بھی کوششیں کیوں نہ کرے، ایک سنگل بینڈ کار یڈ یو سیٹ ہے۔ اس پر ایک ہی شیش بجا ہے، اور اس جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، بے شمار اور لمبیں بھی ہیں، اور ملک بھی بول رہے ہیں، لیکن میں تو ہوں ہی سنگل بینڈ کار یڈ یو تو مجھ پر وہی ایک بجے گا۔ تو جوں جوں آپ احکامِ الہی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کے بینڈ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور وہ سکنٹز جو آپ کو وہ یہے نہیں دیتے، ویسے محسوس نہیں ہوتے؛ ویسے ان کا احساس نہیں ہوتا وہ ارتعاش آپ کے اندر داخل ہونے لگے گا۔ وہ اسرار فنا فاث آپ کے اوپر کھلتے چلے جائیں گے۔ لیکن اس وقت رک جائیں گے؛ جس وقت آپ احکامِ الہی سے ذرا سا بھی منہ پھیر کے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم جیسے آدمی، چھوٹے سے آدمی، بالکل بے حیثیت۔ ہم نے تو ایسے رازوں کو نہ جانے کی کوشش کی نہ یہ ہماری حیثیت ہے۔ نہ ہماری برات ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے میں نے دیکھے، اور بہت قریب سے دیکھے ہیں، جنہوں نے اس بات کو دل میں تھیہ کر کے اپنایا۔

چھپلے دنوں میرے پچھے مجھ سے لیڈی ڈیانا کی بات کر رہے تھے، آپ جانتے ہیں وہ مرگی بے چاری فوت ہو گئی۔ ایک سینٹ کا شکار ہو گئی۔ اب جناب اس کا جو جنائزہ چلا ہے تو کل دنیا نے دیکھا، ہر T.V. شیشن سے۔ اس وقت اگر آپ کے پاس ایسی صلاحیت ہوتی کہ جلدی جلدی دنیا کے شیش بدل کے دیکھ سکتے، جیسا کہ ہم نے یہاں اپنے پیٹی وی پر لا ہو رہیں دیکھے۔ ہم نے دیکھا سب جگہ پر

ایک اسی کا جنازہ چل رہا تھا۔ ساری دنیا میں یعنی راؤنڈ دا گلوب، سارے کرہ ارض پر۔ ہم سب گھر میں بیٹھے جیران ہو رہے تھے، اور اس سے مرعوب بھی تھے۔ وہ بار بار ایک ہی بات دھرا رہے تھے کہ دیکھیں، چونکہ اس کا رو یہ مخلوقِ خدا کے ساتھ بہت اچھا تھا، اور اس نے مریض بچوں کو اپنی گود میں بخایا تھا، جب یہاں آئی تھی، اور دنیا میں بڑے اس نے کام کیے تھے جو مائزر (بارودی سرنگیں) تھیں ان کو دور کرنے میں بھی مدد دی تھی۔ اسے جسے اللہ نے رتبہ دیا ہے کہ اس کا جنازہ اتنا بڑا ہے، اور راملٹی، جو شہنشاہیت ہے، جو اپنی بھی سے پیدل اتر کر چل رہی ہے۔ غالباً زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ راملٹی ان کے پیچھے پیدل چلے آرہے تھے، تو سب جب اتنی تعریف کر رہے تھے تو میں بھی مرعوب تھا اس سے اور تھوڑا سا متاثر بھی تھا کہ شاید ابھی اسے نہیں مرتاحا پہنچا پے تھا، اور میں اس بات کا یعنی شاہد بھی تھا کہ اس کی طبیعت اور اس کا مزاج بہت اچھا تھا۔ ایک شام یہ لیڈی ڈیانا ہمارے گھر آئی تھی، تو ہم معمولی سے لوگ ہیں، وہاں ایک معمولی سے ڈرائیور میں جب وہ آئی ہے تو بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہمارے ہاں لوڈ شیڈنگ تو ہوتی ہے، تو ہم سب بڑے پریشان تھے، میری بڑی آپا جو تھیں کہنے لگیں کہ ہائے ہائے شہزادی آئی ہے، اس پر بڑا ظلم ہو گیا، بتیاں بجھ گئیں۔ شرمندگی بھی ہوتی ہے، تو وہ کہنے لگی Never

mind Apa, no, it is nothing, candle will do.

کوئی بات نہیں موم بتی جالیں۔ کوئی بات نہیں۔ تو ہم نے کہا، بھاگ کے جا، جلدی سے کینڈل لے کر آ صابری کی دکان سے تو ملازم بے چارہ بھاگا گیا تو آ کر کہنے لگا۔ صابری کہتا ہے بتیاں پتا نہیں کہاں پڑی ہیں، اندھرا بہت چھایا ہوا ہے۔ پتا نہیں موم بتیاں کہاں رکھی ہوئی ہیں۔ تو وہ بے چارہ واپس آ گیا۔ تو پھر اس نے کہا، کوئی نہیں، اندھرے میں ہم نے با تین ہی کرنی ہیں نا، با تین کرتے ہیں۔ تو ہم سب بہت متاثر ہوئے، کہ اتنی بڑی شخصیت ہے۔ ایسے ہی بات کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک ذاتی مشاہدہ بھی تھا، لیکن یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، میں اپنے ساتھی دیکھنے والوں سے اپنے بچوں سے، اپنے بیٹے، پوتوں سے ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ دیکھو یہ اللہ کی شان ہے، اور اللہ کی مرضی ہے، اور وہ جیسے چاہتا ہے ویسے کرتا ہے۔ اس میں یہ خوبیاں جو آپ گنوار ہے ہیں ان کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ وہ جیسے چاہے کر سکتا ہے۔ اس کو یہ پسند ہے۔ اس نے تم کو دکھایا ہے کہ دیکھو، ہم ایسے بھی کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ڈیانا کی دوسری زندگی سے ہم سب لوگ واقف ہیں۔ بہت اچھی طرح سے جانتے تھے، لیکن یہ تو اللہ کا ایک فعل ہے، اور وہ کر رہا ہے۔ لیکن میرے لیے اللہ کا حکم اور ہے یہ میری رول ماؤنٹ نہیں ہے۔ میری رول ماؤنٹ حضرت بی بی فاطمہ ہے۔ یہ نہیں ہو سکتی۔ میں دیکھوں گا۔ اس کا جنازہ چلا جا رہا ہے۔ بڑی شان ہے اس کی، لیکن رول ماؤنٹ نہیں ہے۔ میرے بچوں کے چہروں پر بڑی ادا سی ہوئی کہ کتنی بڑی بات ہے۔ یہ کام کرنا کوئی اتنی بڑی بات

نہیں۔ اللہ کا پسندیدہ ہونا ایک مختلف بات ہے۔ اچھا پھر میں تھوڑا سا پریشان ہوا، اور غم زدہ یوں ہوا کہ سارے بچوں نے میری بہت ٹھکائی کی کہ آپ بابا کمال کی بات کرتے ہیں۔ بہت سخت دل آدمی ہیں۔ تو میں نے کہا، یا اللہ تو کچھ ایسے کر کہ میری عزت رہ جائے، تو اللہ نے میری بات مان لی۔ کچھ چھٹے ساتویں دن مدرثیسا فوت ہو گئی۔ اب مدرثیسا نے تو 80 برس کی عمر تک، شروع سے لے کر لوگوں کی بے شمار خدمت کی تھی، اور ان کو ہر طرح سے مدد اور آسانی دی تھی اور مریض کو زخمی اپنے ہاتھوں سے اخفا کر لائی تھی، مکلتہ کی سڑکوں پر مرتبے ہوئے تڑپتے ہوئے جب وہ فوت ہوئی ہے مدرثیسا تو میں اس کا جنازہ دیکھنے کے لیے بھی رکا، اور میں نے اُنہی آن کیا۔ بی بی سی لگایا، اور دو تین سویں مدرثیسا کا جنازہ، خواتین و حضرات! ایسا معمولی، ایسا چھوٹا تھا کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ یا اللہ اس کا جنازہ تو ایسا غیر معمولی ہونا چاہیے تھا۔ نومل پر اائز ملا ہے مدرثیسا کو امن کا، اور اس نے سب کچھ قربان کر دیا انسانیت پر، لیکن یہ تیری شان ہے تو جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

احکامِ الہی میں داخل ہونے سے وہ فریکنی ضروری ہے۔ پھر میں اس نتیجے پر پہنچا جس کے زور پر آدمی اپنے دل اور ذہن پر اٹھے ہوئے سوالوں کو جانچ سکتا ہے، آنکھ سکتا ہے۔ پر کھلکھلتا ہے، اور اس کو اس کا جواب ملتا رہتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بات بڑی عجیب سی رہ جاتی ہے کہ کئی دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا شخص اور ایک بڑے مقام پر پہنچا ہوا آدمی احکامِ الہی میں پورے کا پورا اتر اہوا انسان، کئی دفعہ کسی کوتاہی کی وجہ سے اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے، اپنی مرضی سے، اور اپنی مرضی کے خلاف بھی پھسل جاتا ہے، تو اس کے ساتھ جو ہوتی ہے وہ بھی اپنی طرز کی ایک نئی چیز ہے۔

ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ وہ اپنے بچوں کی، اور اپنے متعلقین کی، اور اپنے مریدین کی ٹریننگ کے لیے ڈیرے سے نکل کر باہر جنگل میں چلے گئے۔ ایک ایسے جنگل میں جس کے قریب سمندر تھا۔ لے جا کر ان کو جنگل کے مناظر بھی دکھانا چاہتے تھے، اور اللہ، اور جنگل کا، اور سمندر کا رشتہ بھی کچھ اپنے انداز میں سمجھانا چاہتے تھے۔ ان کو لے جانا اس لیبارٹری میں بہت ضروری تھا۔ مریدین کی ایک لمبی جماعت تھی۔ وہ بابا جی جو تھے، وہ ایک درخت کے نڈو پر بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اچانک ایک شام ایسا ہوا کہ ایک اور بزرگ وہاں آگئے اور انہوں نے آ کر اس صوفی کو السلام علیکم کہا۔ یہ صوفی صاحب جو مریدین کی فوج لے کر گئے تھے، انھوں کو کھڑے ہو گئے اور دست بدست ان کے سامنے بھکھ کر ان کے گھننوں کو ہاتھ لگایا۔ تو یہ جوان کے مرید تھے، وہ تو بے چارے پریشان ہوئے کہ یہ کون صاحب ہیں جن کے آگے ہمارا پیر جو ہے، ہمارا گرو جو ہے، ہمارا monitor جو ہے، اس طرح سے جھکتا ہے تو وہ ان کے ساتھ محبت، اور ادب سے باتیں کرتے ہیں۔ ایک مرید جو تھامیرے جیسا،

اس کے دل میں کھد بد ہو رہی ہے، اور بستور ہو رہی ہے۔ اس نے کہا، اس کی کچھ خدمت ہونی چاہیے۔ یہ وقت کے بہت بڑے ولی قطب ہوں گے۔ مرید اپنے پیر صاحب کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا، حضور یہ کون صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا یہ دلیوں کے ولی ہیں، اور ہم خوش ہیں کہ ان سے ہماری ملاقات ہو گئی، اور یہ امیر الامر ہیں۔ یہ سمندوں کے قطب ہیں، سمندوں کی ڈیوٹی ان کو سونپی گئی ہے۔ ہم اتفاق سے سمندر کے کنارے آ کر جیشے ہیں تو یہ ہم سے ملنے کے لیے آ گئے ہیں۔ اس نے کہا، جی یہ تو ہر ڈی اچھی بات ہے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ اس سے تو ہماری ترقی ہو گی، اور ان سے کچھ پوچھیں گے۔ وہ بولے ایک بات ہے بخوردار کہ تمہاری ترقی نہیں یہ کر سکتے کیونکہ بڑے دکھ کی بات ہے، اور میرا دل اندر سے خون کے آنسو روتا ہے کہ ان کے پپ جو ہیں، کندھوں پر جو شار لگے ہوتے ہیں، وہ اتر چکے ہیں، اور ان کو اس کا علم نہیں، اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو امیر الامر سمجھتے ہیں۔ جب یہ بات سنی اس مرید نے تو رو نے لگا کہ اتنا بڑا درجہ میرا پیر آن کو دے رہا ہے، اور ان بے چاروں کو پہنچیں۔ وہ اتنی زور سے روایا کہ انہوں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ تو خاموش رہ، ورنہ ان کو علم ہو گیا تو بڑی تکلیف ہو گی۔ خیر وہ ملے جیشے، ان کے ساتھ با تین کیس۔ پھر انہوں نے کہا، ہم کو اجازت دیجیے۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے سمندوں میں۔ تو مرید نے کہا کہ میں ان کو چھوڑ آؤں۔ انہوں نے کہا، ضرور یہ تو ہمارا فرض ہے۔

وہ پیچھے پیچھے ان کے دست بست چلا۔ اور جو امیر الامر تھے وہ آگے چلے تو جنگل میں جاتے جاتے جب گھنا جنگل آیا۔ تو اس نے کہا، آگے آ جاؤ میاں ہمارے ساتھ۔ تو اس نے کہا، نہیں حضور ایسے ہی تھیک ہے۔ جب بات کی تو اس نے زور سے تیخ ماری، اور رو نے لگ گیا۔ انہوں نے کہا، کیا بات ہے۔ تم رو نے کیوں لگ گئے ہو۔ اس نے کہا، حضور میرا دل بھرا یا ہے، اور میرے اوپر ایسی افتاد پڑی ہے کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا، بے فکر ہو۔ ہم سے بات کرو، ہم تمہارے پیرسے بات کریں گے۔ کوئی الجھن ہے؟ اس نے کہا، ہاں حضور الجھن ہے۔ انہوں نے کہا، کیا الجھن ہے؟ اس نے کہا، حضور الجھن یہ ہے کہ آپ امیر الامر ہیں، اور آپ کا تصرف ہے سمندوں پر، یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ انہوں نے کہا بال یہ اللہ کا فضل ہے، ہم پر، لیکن حضور آپ کے پپ اتر چکے ہیں۔ آپ کے شارذ کوئی نہیں ہے۔ اب آپ اس ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ تھوڑے دنوں میں آپ کو پتا چل جائے گا۔ انہوں نے کہا، تم کیا بکتے ہو۔ اس نے کہا، مجھے یہ فرمایا گیا ہے جو عرض کیا۔ اور میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ انہوں نے بھی جب اوہرا وہر دیکھا، دونوں کندھوں پر تو واقعی ان کے شارذ نہیں تھے وہاں۔ انہوں نے خاک زمین سے اٹھا کر سر میں ڈالنا شروع کی، اور وہ واویلا کیا کہ جنگل میں پرند چرند سب پریشان ہو کر شاخوں سے اڑ گئے۔ انہوں نے کہا، اے پیارے، اے نوجوان! تم نے مجھ پر اتنی بڑی

مہربانی کی ہے۔ اب میرے پر ایک مہربانی اور کروکہ میرے پاؤں میں رہی باندھو، اور مجھ کو گھیٹوڑ میں پر، اس جنگل میں، اس کڑی سر زمین پر، جہاں کیکر کے کانے اور کیا کچھ نہیں ہے۔ آمیں بھی واویلا کرتا ہوں تو بھی کر کہ اللہ کے احکام نہ مانتے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے، جو مجھ سے بے خیالی میں ہو گیا۔ اس نے کہا، حضور میں تو یہ بے ادبی کرنہیں کر سکتا۔ آپ مجھے قتل کر دیں یہ میں نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا، میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ میں بھی تجھے اس کا بدلہ دوں گا، تو بے چارہ مجبور ہو گیا۔ اس نے کوئی سخت بیل تو زمی، اس کو بل دیا، حکم کے مطابق ان کے ٹخنوں پر باندھا کندھے پر بیل کو رکھا اور چینیں مارتا ہوا خود بھی اس کو بت کی طرح گھینٹتا ہوا چل پڑا جنگل میں، اور وہ روتے جاتے تھے، اور آہ و بکا کرتے جاتے تھے، اور فریاد کرتے جاتے تھے کہ ہماری کوتا ہی، جو گناہ ہے، معاف کیا جائے۔ جب وہ چلتے ہوئے آرہے تھے، تو بتانے والے بتاتے ہیں جتنے پرندے درختوں میں بیٹھے تھے، انہوں نے بھی چیخ و پکار شروع کر دی، اور رونا شروع کر دیا، اور جنگل کی ہر نیاں اور ہر نیا شیر اور چند پرند کھڑے ہو گئے اور منہ اور اٹھا کے کہنے لگے، یا باری تعالیٰ ان کو معافی عطا فرم۔ ہم تیری مخلوق ہیں۔ بیکاری مخلوق ہیں۔ ہم تو جانور ہیں لیکن تیرے حضور یہ تو درخواست کر سکتے ہیں کہ اس کو معافی عطا کی جائے۔ ان کا رونا، اور چینا، اور پرندوں اور جانوروں کا اللہ کو پسند آیا، تو پھر انہوں نے کہا، جا اس کو معاف کیا۔ چنانچہ اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ تو وہ آگے اپنے عہدے پر واپس۔ تو اس مرید نے کہا، حضور میں تو خوشی سے بے چین ہوا جا رہا ہوں۔ الحمد للہ۔ جب وہ جانے لگے سمندر کا کنارہ نزدیک آگیا۔ کیونکہ اب انہوں نے اپنی ڈیوٹی پر حاضری دی تھی۔ مرید نے کہا، حضور میری حیثیت تو نہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آپ سے کیا کوتا ہی ہوئی ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے۔ کہنے لگے چند روز کی بات ہے کہ میں سمندوں میں اپنی ڈیوٹی دینے جا رہا تھا، کشتی میں بیٹھا تھا، اور حکم خداوندی سے چل پھر رہا تھا۔ بڑی تیز بارش ہونے لگی سمندر میں۔ تو میں نے کہا، یا باری تعالیٰ اس بارش کو یہاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ بھرے سمندر پر یہ بارش۔ اگر سو کھے میدانوں میں ہو تو کچھ فائدہ ہو۔ لوگوں کو اناج ملے، فصلیں اگیں۔ بس اتنی بات، میں نے رائے دی تھی۔ فعل اللہ کے اوپر میں نے تقید کی تھی، تو خواتین و حضرات پھر یہ بات ہو گی۔ فعل اللہ اور ہیں، احکامِ اللہ اور ہیں، اور ہم سب احکامِ الہی کے پابند ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ایک معصوم بیٹی کی کہانی

اتنی ساری بیٹیوں کی موجودگی میں آدمی کا دل بہت خوش ہوتا ہے اور اس کو ہمیشہ بڑی تقویت ملتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ بینا مطلوب ہوتا ہے، اور بیٹی لاڈی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ وہ نہیں لے سکتی اور اس کی جگہ وہ نہیں لے سکتا، لیکن اگر حساب لگا کر دیکھو اعداد و شمار کے مطابق تو بیٹی کا نمبر ہمیشہ اوپر ہی رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ طے شدہ بات ہے کہ عورت کا احترام بہت ہے۔ جب آپ باہر نکل کر دیکھیں تو ہر ایک شے کے اوپر آپ کو ماں کی دعا لکھا ہوا ملے گا۔ پیو کی دعا کہیں بھی نہیں۔ ایک بھی رکشہ پر نہیں لکھا ہوتا۔ عورت ماں کے روپ میں ہو، بیٹی کے روپ میں، بہن کے روپ میں ہو، عورت کی بڑی عزت دلوں میں ہوتی ہے۔ جھگڑے و گزبے ہو جاتے ہیں، لیکن بابا کو اپنی بیٹی اور بیٹیاں ہمیشہ بہت پیاری، اور بہت لاڈی ہوتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ یورپ کے کچھ ملک یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے یہاں پر عورت کی عزت نہیں ہے اور اس کے ساتھ رُرا بر تاؤ کیا جاتا ہے، اور کچھ ادارے انہوں نے اس طرح کے بنادیے ہیں کہ چیک کرنے کے لیے کہ کیا واقعی رُرا بر تاؤ ہوتا ہے۔

کافی دریکی بات ہے کہ میرے دفتر میں آیا ایسے ہی ایک ادارے کا ایک آدمی، وہ بڑا بھلاسا نیک سانو جوان تھا، جرمنی کا۔ اور جرمنی کے لوگ تحقیق کے معاملے میں اتنے ضدی، اتنے کڑوے، اور اتنے کیلے نہیں ہوتے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ کے اس کو تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن وہ بے چارہ آیا تھا بہت سارے تصورات لے کر اپنے ذہن میں کہ میں کہ میں پاکستان جا رہا ہوں اور اس کے بارے میں یہ کہانیاں موجود ہیں۔ تو اس نے میرے دفتر میں مجھ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ سر i You don't mind if i ask you direct question میں نے کہا، شام کے وقت۔ میں دفتر سے تھکا ہارا جاتا ہوں تو ٹھیک طرح سے مار نہیں سکتا اس لیے میں صح جب میں فرائش ہوتا ہوں تو بانو قدسیہ کو "کھڑکا" جاتا ہوں۔

بے چارے کو بڑی کوفت ہوئی۔ کہنے لگا، آپ تو بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو

کوئی بات نہیں۔ ویسے ہماری جو محبت آپس کی ہے، وہ چلی آ رہی ہے۔ چاہے آپ کتنا بھی ہمارے خلاف پروپیگنڈا کریں، اس کا اثر مجھ پر یا میری بچیوں پر یا میرے بچوں پر نہیں ہوگا۔ ایسے ہی بارہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ یہ بچے بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں، اور بڑے ازیل ہوتے ہیں، بڑے ضدی ہوتے ہیں، اور بہت زمین پر پاؤں مار کر اپنی بات منوانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ میں چونکہ اس عمر میں ہوں، اور میں نے بہت سے زمین پر پاؤں بجھتے ہوئے سنتے ہیں، اور میں نے اس کے آگے سر جھکایا ہے، تو میرے دفتر میں پانچ چار نوجوان طالب علم آ گئے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں، دو لاڑکے تھے، اور وہ پیشکل سائنس کے 6th year میں تھے۔ اسے آپ کیا کہتے ہیں، ایک part کے سٹوڈنٹ تھے۔ ان میں ایک لڑکی تھی، اس کا نام کلثوم تھا۔ ایک کا یاد نہیں، ایک کا مجھے یاد نہیں، اسے بُلی بُلی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ کچھ زیادہ بولی نہیں، اور دو لاڑکے تھے، نوجوان بڑے اچھے تھے پیارے خوش شکل۔

کلثوم ان کی لید رتھی، اور اس کے چہرے کے اوپر کچھ نشان تھے۔ لڑائی جھگڑے کے دھبے۔ جب یہ لوگ میرے دفتر آئے تو کلثوم آتے ہی دھم سے صوفے پر بینچنگی، اور کہنے لگی، انکل ہم نے دیکھا ہے، آپ کا معاشرہ، اور ہم نے دیکھا ہے آپ کا مذہب، اور سب لوگ جو ہیں بڑے چالاک اور بے ایمان، اور سخت ہوتے ہیں۔ ہم لڑائی کر کے آئے ہیں۔ میں نے کہا، کیا ہو گیا۔ اس نے کہا، میرا نام یہ ہے، اور یہ میرے ساتھ میری کلاس فیلو، ان کا نام یہ ہے، اور ان کا نام یہ ہے۔ تو تعارف کرانے کے بعد اس نے کہا، آپ بڑے ماے بنتے ہیں اخلاقیات کے اور دین کے۔ میں نے کہا، ہو کیا گیا؟ کہنے لگی، ہم پہنچوں (خواتین پولیس الپکار) سے لڑکے آئے ہیں۔ انہوں نے جلوس وغیرہ نکالا ہوگا۔ آگے پہنچنیں ہوتی ہیں۔ بے چاری اچھی ہوتی ہیں۔ ان کو حکم جو ہوتا ہے، ان کو روکو تو ان کی مذہبیز ہو گئی۔ ہمارے لاہور میں ایک جگہ ہے جہاں یہ T.A وغیرہ بہت بکتے ہیں، ہال روڈ۔ اس کے اوپر جھگڑا تھا۔ میں نے کہا، جھگڑا کس بات پر ہو گیا؟ تو اس نے کہا، جی یہ کیا قانون بنایا ہے آپ نے، لوگوں سے خواخواہ کہا کہ ہمارے حقوق آدھے ہیں، مردوں کے پورے۔ کہنے لگی یہ کیا بات ہوئی کہ عورت قتل ہو جائے تو آدمی دیت اور مر قتل ہو جائے تو زیادہ۔ میں نے کہا، تم نے اس پر جلوس کیوں نکالا، یہ تو مجھے جلوس نکالنا چاہیے تھا۔ میں نکالوں گا کل سے جلوس، یہ تو کمال کی بات ہے۔ وہ غصے میں تھی، کہنے لگی۔ آپ کیوں جلوس نکالیں گے۔ میں نے کہا، میں اس لیے جلوس نکالوں گا کہ یہ بڑی زیادتی کی بات ہے کہ میں مر جاؤں گا تو بانو قدیمہ کو ایک لاکھ روپیہ مل جائے، وہ مرے تو مجھے بیچاں ہزار میں گے۔ یہ تو الٹا ہو گیا کام۔ کہنے لگی، ہاں ہم تو پھر جلوس نکال کے آئے ہیں۔ میں نے تو یہ اٹا جلوس نکال دیا تھا را۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ اگر میری بیوی خداخواستہ قتل ہو جائے تو مجھے چار پانچ لاکھ میں، میں مارا جاؤں تو

میری بیوی کو 25-26 روپے مل جائیں، تاکہ اس کو کوئی سزا ملے۔ اس کی ساتھی کہنے لگی، وہ یکھویا سمیں میں نے تم سے کہا تھا ناکر انکل کے پاس نہیں جانا۔ یہ ہمیشہ ایسی الٹ بات کرتے ہیں۔ میں تو اس کا غصہ مختدرا کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ تو کہنے لگی، یہ ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ آپ کا یہ سب فلسفہ، میں آپ کی پروانیں کرتی۔ میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ ہم سارے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پرانے دقیانوی دھات، پھر کے زمانے کی چیزیں، اس زمانے کی آپ نے اخلاقیات میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب میں نے کنڈم کروی ہیں۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ کنڈم کرتی ہیں تو کریں، تمہیں پورا حق پہنچتا ہے۔ وہ کہنے لگی، میں آپ کو بتا دوں ایک بات، اور آپ کا انکھوں کے سن لیں کہ میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ میں نے بالکل نہیں جانا، بہشت وغیرہ میں، مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ غصے میں تھیں بے چاری۔ بڑی پیاری سی تھی، اور اچھی طاقت تھی اس میں، بہت خوب صورت بازو چڑھائے ہوئے تھے۔ اس کے ارادے مضبوط تھے۔ ہنسنے والی لڑکی تھی۔ میں نے تو دوزخ میں جانا ہے۔ مجھے کوئی پروانیں آپ کی..... میں نے کہا، نہیں نہیں، تو نے دوزخ میں جا کر کیا کرنا ہے۔ دفع کرو۔ کہنے لگی نہیں میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے میں نے دوزخ میں جانا ہے۔ میں نے کوئی قانون نہیں مانتے۔ میں نے نہ دین کے، نہ اسلام کے۔ میں نے اپنی مرضی سے رہنا ہے۔ میں نے کہا، میں دوزخ میں جانا بڑا مشکل کام ہے۔ تو کیسے جائے گی۔ دوزخ میں جانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس نے کہا، جی کیسی محنت کیا؟ وہ جی میرا، اور اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بڑا ذرودست۔ میں نے کہا، تو نہیں جا سکتی۔ کہنے لگی میں جا کے دکھاؤں گی۔ اتنا جھگڑا ہو گیا کہ میں نے کہا کہ تو دوزخ میں تو.....؟ ”تو کیسہ تیرا پیو نہیں جا سکدا“۔ میں نے کہا بڑا المبا کام ہوتا ہے۔ اس میں کئی مصیبتوں اٹھانا پڑتی ہیں۔ پھر جا کے کہیں بندہ ہوتا ہے دوزخی۔ پہلے جا کے تو شرک کر۔ پھر اللہ کی زمین پر فساد پھیلا، پھر جائے گی۔ کسی کی چیز چڑالے گی، پسل کا لج سے لے آئے گی، یا کسی کا دوپنہ کھر کا لے گی تو اس سے تو نہیں جائے گی دوزخ میں۔ کہنے لگی نہیں بس میں نے تہیہ کر لیا ہوا ہے۔ میں نے کہا، نہ نہ بچے، غصہ تھوک دے، کوئی بات نہیں۔ ہم ایسے کریں گے کہ تجھ پر بوجھ نہیں پڑنے دیں گے، تو تم کو آسانی آسانی سے چلنے دیں گے۔ مجھے یہ بتاؤ جس زمانے میں ہم ایم اے میں پڑھتے تھے، اس وقت پرچے میں پانچ سوال ہوتے تھے، میں بیس نمبر کے، اور وہ پانچ کرنے ہوتے تھے، کہا جاتا تھا کہ آؤٹ آف Eight کوئی پانچ سوال کریں۔ اب سسرا سسٹم چل گیا ہے، جس کی مجھے کچھ سمجھ نہیں ہے۔ کہنے لگی، نہیں۔ سسرا سسٹم چلا تھا، وہ پھر کینسل ہو گیا۔ اب پھر پیپر ہی ہوتا ہے، اور پانچ سوال ہی کرنے ہوتے ہیں، اور پانچوں سوال بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا، اور تیرا بھلا ہو جائے اسلام میں بھی پانچ ہی سوال ہوتے ہیں۔ وہ بھی میں بیس نمبر کے ہوتے ہیں۔ کہنے لگی ہیں، یہ کیا؟ میں نے کہا۔ وکیہ اب تو ایسے کریں گے۔ تو ہے غصے والی

بیٹی، تو تیرا انتظام ایک اور طرح سے کرنا چاہیے کہ ہم ایسے کریں گے کہ تم کو لڑکیوں کو بہت شوق ہوتا ہے ڈامنگ کرنے کا، اور اپنی Figure صحیح رکھنے کا، صحیح رکھنے ہے نا، ہم ایسے کریں گے تجھے سال میں ایک مہینہ ڈامنگ کرائیں گے صحیح ہے نا۔ صحیح کھلا دی روٹی سارا دن پانی بھی میں نے پیئے نہیں دینا، اور کھانا بھی نہیں کھانے دینا۔ کہنے لگی - Oh you are talking of Ramzan.

میں نے کہا، اب تم جو مرضی نام دے لواس کا۔ کہنے لگی، انکل وہ تو جو رمضان ہے نا وہ تو روزے میں رکھتی ہوں سارے۔ کہنے لگی، ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نہیں رکھتا لیکن میں رکھتی ہوں سحری کھا کے مالی بابا، اور اس کی فیملی جاگی ہوئی ہوتی ہے، میں ان کے کوارٹر میں چلنے جاتی ہوں۔ بڑے مزے کی روٹیاں پکائی ہوتی ہیں مایی نے۔ تو میں سحری کھا کے آ جاتی ہوں، تو میرا روزہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تیرے ہیں میں سے میں نمبر آ گئے، صحیح ہے نا۔ پھر میں نے کہا تم جیسی لڑکیوں کو بڑا شوق ہوتا ہے سیر و تفریخ کا، بہت سرتی ہیں، ایسے تصویریں دیکھتی ہیں۔ کیلندر دیکھتی ہیں۔ کہتی ہیں ہائے ہائے ملیشیا جائیں گے۔ یہ امریکا کا ساحل ہے۔ یہ دیکھو، یہ ڈیزنی لینڈ ہے، اس جگہ جانا چاہیے، شوق ہوتا ہے۔ میں ایسا بندوبست کروں گا۔ میں ہوں تو غریب آدمی لیکن میں تمہیں پاسپورٹ بخوا کے دوں گا اور میں تمہیں ملک سے باہر بھیجنوں گا، اور تمہیں بڑا شاندار نظارہ ملے گا، جو تمہیں دنیا میں کہیں اور نہیں نظر آئے گا۔ کہنے لگی، کیسی جگہ۔ میں نے کہا، ایک ایسی جگہ جہاں آدمیوں کا بڑا جھوم ہوگا۔ اتنا بڑا جھوم دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگی، آپ حج کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ کہنے لگی، انکل وہ تو مجھے شوق ہے دیکھنے کا، کیونکہ دنیا میں سب سے بڑا جھوم۔ وہ کہنے لگی، آپ مجھے نہ دیں پاسپورٹ، اور نہ دیں ٹکٹ۔ وہ تو میں انشاء اللہ خود جاؤں گی۔ وہ میرا پاکا تھیہ ہے وہ تو میں نے طے کیا ہوا ہے۔ لیکن میں آپ کے اسلام وغیرہ کو نہیں مانتی۔ غصے میں تھی نا۔ تو بار بار ایسے کہتی تھی۔ میں نے کہا چلو ہیں نمبر تیرے یہ ہو گئے، چالیس ہو گئے۔ تو میں نے کہا کہ تم نیو کیمپس میں کیسے آتی ہو۔ کہنے لگی نیو کیمپس میں ایک اکار میں چھوڑ جاتے ہیں۔ کئی دفعہ نہیں آتے تو میں خود کار لے کر آ جاتی ہوں۔ اگر دونوں میں سے کوئی صورت حال نہ ہو تو ڈیڈی مجھے دس روپے دیتے ہیں۔ میں 1984-83ء کی بات کر رہا ہوں۔ تو اس زمانے میں ڈیڑھ روپیہ آنے جانے میں لگتا تھا۔ ہماری بس ہوتی ہے۔ میں نے کہا، اگر میں تجھے کہوں یہ جو تجھے دس روپے ملتے ہیں، ان میں سے تھوڑے سے پیئے اٹھنی اس سے بھی کم یہ ایک طرف رکھ کے Put by کر کے ایک طرف رکھ دے تو دے دیا کر کسی غریب کو۔ تو کہنے لگی۔ آپ مجھے پھنسا رہے ہیں۔ میں نے کہا، میں آپ کو کہاں پھنسا رہا ہوں، تو پھسانے کی بات کرتی ہے۔ اتنی محبت کے ساتھ، تیرا بابا اتنی محبت سے تم سے بات کرتا ہے، تو پھسانے کی بات کرتی ہے۔ کہنے لگی، آپ مجھے زکوٰۃ میں پھسانا چاہ رہے ہیں، جسے انکل آپ ڈھائی فیصد کہتے ہو۔ یہ تو غلط ہے، یہ تو فلاں نے بنائی

ہے ذہائی فیصلہ۔ اللہ کا حکم اور ہے۔ میں نے کہا، بھی وہ کیا ہے۔ کہنے لگی اللہ تو کہتا ہے جو کچھ تمہارے خرچ سے باقی بچے وہ سارے کا سارا دے دو۔ یہ تو میں نے پہلی بار سنًا۔ میں نے کہا، اوہ تیرا بھلا ہو جائے تو نہ تو مجھے ڈرا دیا۔ ذہائی فیصلہ پر میں یقین نہیں رکھتی۔ یہ کیلکولیشن غلط ہے۔ کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا، یہ تو تیری اور کمال کی بات ہو گئی۔ تیرے تو ساتھ نمبر ہو گئے۔ ٹھیک ہے۔ کہیں۔ تو اسی طرح میں نے کہا، اب اگلا کام آتا ہے جہاد کا۔ وہ مرد بھی جاتے ہیں عورتیں بھی۔ ایں لیکن ذات کے خلاف لڑنا بھی ایک جہاد ہے۔ خرابی کے خلاف۔ تو وہ تو سامنے ہے۔ کہنے لگی، دیکھو میں کہاں کہاں ماری پھر رہی ہوں۔ تو میں نے کہا 80 نمبر ہو گئے۔ میں نے کہا، بے دوقوف لڑکی کلثوم بی بی تم نے آج تک اتنی نمبر لیے ہیں کسی پر چے میں۔ کہنے لگی، اسی تو انکل بہت ہوتے ہیں۔ میں تو یہی رو رہا تھا کہ تو دوزخ میں کیسے جائے گی تو تو مصیبت یہ ڈالئیتی ہے۔ تیرا ارادہ دوزخ میں جانے کا ہے۔ کہنے لگی، وہ میں غصے میں کہہ رہی تھی۔ اس کا جھکڑا دین کے ساتھ تو نہیں تھا بلے چاری کا۔ آدمی دکھی ہوتا ہے۔ اپنی ماما جی سے اپنی اماں سے اپنے ابو سے لڑتا ہے تو پھر اس کو غصہ آتا ہے۔ پھر جن باتوں کی وہ تلقین کرتے ہیں، جس کے اوپر قائم رہنے کے لیے....؟ اس کو وہ ہٹ کرتا ہے۔ میں نے کہا، کلثوم بچے اب ایسے کریں گے کہ پھر تمہیں ایک لفظ سکھائیں گے۔ وہ ہے تو مشکل عربی کا لیکن تو ذہین لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے تو یکھے جائے گی اگر مشق کرے تو۔ کہنے لگی وہ کیا ہے۔ میں نے کہا، وہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ کہنے لگی، لو کیا بات کی۔ یہ تو میں صبح منہ دھوتے وقت صبح سوریے جب پانی ڈالتی ہوں تو یہی پڑھتی ہوں۔ تو میں نے کہا، اب بتاؤ بچہ تم نے تو پھنسا دیا، ہم دوزخ کیسے جائیں گے۔ یہ تو تم نے میری بھی راہ بند کر دی، اب میں بھی کلثوم بی بی کا بابا دادا بن کے بیٹھ گیا۔ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ مجھے بھی فائدہ ہو جائے گا۔ باقی رو گئی نماز کی بات۔ تو میں نے کہا، عید کو لڑکیاں بڑے شوق سے گھر میں مصلی ڈالے سروں کے اوپر دو پیٹ کر کھڑی ہو جاتی ہیں نا تو تم نہیں نمبر تو اس میں بھی آ جائیں گے۔ 83-84 نمبر ہو جائیں گے۔ میں تیرے لگنے کے ہوئے پڑے ہیں۔ کہنے لگی نہیں نہیں خیر نمازیں میں رمضان شریف میں تو ساری پڑھتی ہوں پوری، اور اس کے علاوہ بھی جب بھی موقع لگ جائے، لیکن ریگورنیسیں ہوں۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں، تیرے نمبر تو 94-95 سے زیادہ بن رہے ہیں، تو اب تیرا کیا کریں۔ تو اس کی سہیلی یا سکین کہنے لگی، تم انھوں میں نے تم سے کہا تھا کہ انکل اشفاق کے پاس نہیں جاتا یہ بہت چالاک ہیں۔ یہ ہمیں دھوکے سے پھنسا رہے ہیں۔ تو ان کے جو ساتھی لڑکے تھے وہ بڑے غور سے یہ باتیں سنتے رہے اور جیران ہوتے رہے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ تھوڑی سی باتیں کیں کہ سر ہم بھی کچھ تھوڑے سے ایسے ہی تھے۔ گستاخ کچھ ائے سیدھے الفاظ ہمارے منہ میں بھی، اور ذہن میں بھی آ جاتے ہیں۔ میں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ ذہن میں آ جاتے

ہیں تو بے اختیاری کی بات ہے۔ ذہن کے اوپر نہ رول نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں چلتے رہیں، لیکن کہنے لگے، رخ ہمارا البتہ ادھر کا ہو گیا ہے جس طرف کی بات آپ کر رہے ہیں۔ تو کلشوم بی بی اپنی آسمیں چڑھائے ہوئے غصے میں لیں کھلی ہوئی، لیکن وہ ذرا تھوڑی سی شہنشہی ہوئی، لیکن اس کا غصہ پورے کا پورا کم نہیں ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا، پولیس نے انہیں تنگ کیا تھا۔ بات بھی اس کی سن لیں۔ جب آپ بات کسی کی نہیں۔ سننے کے لیے کوئی بھی ہو۔ آپ کے گھر میں جھاڑو دینے والی ہے۔ ماسی کھانا پکانے والی ہے۔ اس کی بات ہے۔ کہنے سننے کے لیے آپ کے پاس بھی وقت ہونا چاہیے۔ کلشوم کی اور یا سمیں کی بات، اور ان کے ساتھیوں کی بات نہیں سننی گئی تھی؟ اس لیے ان کو غصہ تھا، اور غصہ سارا وہ ڈائریکٹ گیا تھا اس دین کی طرف اور اتحاری کی طرف، اور بڑوں کی طرف۔ اب اس میں ساری جہالت جو ہے وہ بڑوں کی ہوتی ہے۔ بڑوں کو سنبھالنا نہیں آتا۔ وہ اپنی اتحاری میں لگ جاتے ہیں، اور ہمارے ملک میں اتحاری کارروائج ذرا ضرورت سے زیادہ ہے۔ ہاں اکیلے بڑوں کی اتحاری نہیں۔ آپ بھی جب سوچیں گی، اور آپ جب گھر جائے غور کریں گی تو آپ دیکھیں گی، آپ اپنی اتحاری کو ان معصوموں پر، ان لوگوں پر ضرور استعمال کر جاتی ہیں، جو کہ آپ سے نیچے ہیں۔ لیکن الحمد للہ آپ نے اس بات کو تعلیم کیا۔ لڑ کے تو مانتے نہیں، لیکن ہم کیا کرتے ہیں ہمارے ہاں عام لوگ جو ہیں وہ بھی اپنی اتحاری کو بڑی شدت سے، اور بڑی بری طرح سے استعمال کرتے ہیں۔

میں شاید پچھے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس ایک بات کا بڑا غصہ تھا۔ یہاں ایک جگہ ہے اچھرہ، اس میں خواتین بہت جاتی ہیں۔ کچھ کپڑے و پڑے لینے کے لیے۔ میں بھی جاتا ہوں، بیگ پکڑ کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ انہوں نے کچھ لینا ہوتا ہے کچھ سلی سلامی چیزیں۔ تو ہاں پر ایک خاتون کسی سکول کی ٹیچر تھی۔ اچھی پیاری معزز، سیاہ برقع اس نے اوڑھا ہوا، ہاتھ میں تھیلا پکڑا ہوا۔ ہم جس دکان سے کچھ سودا لے رہے تھے تو اس نے کچھ پوچھا، سرخ رنگ کا کوئی کپڑا، پتا نہیں کیا کہا، لیکن دکاندار نے شاہی نہیں۔ پھر اس نے ذرا اوضاحت سے کہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، تیرے کام کی یہاں چیز نہیں ہے اس دکان پر آگے جا کے پتا کر۔ تو میں غصے میں بھی آیا اور مجھے رونا بھی آگیا۔ میں نے کہا یہ تو آپ کو حق نہیں پہنچتا۔ اس نے کہا، نہیں اشراق صاحب یہ ایسے ہی ہے کوئی کم پیسوں والی۔ تو یہ اتحاری دیکھیں نا، حالانکہ وہ کوئی افسر نہیں ہے۔ کسی بڑی جگہ پر نہیں ہے، لیکن وہ اپنی اتحاری بے جا طور پر استعمال کر رہا ہے، اور اگر آپ اپنے اردو گرد دیکھیں گی تو بڑا ظلم چل رہا ہے۔ بہت زیادہ تکبر شامل ہو گیا ہے ہر بندے کے ذہن میں۔ اور تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے وہ بہت ساری چیزیں اکٹھی کرتا رہتا ہے، تاکہ دوسروں کو ڈرانے کے لیے تکبر نمایاں کرے۔ یہ بات خوشی کا اظہار اس لیے کر رہا ہوں کہ تھوڑے دن ہوئے میں اپنے گھر کے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڑی خوب صورت سی پیاری لمبی

عورت ایک خوب صورت سا پچ نیلا ٹوپ اس نے پہننا ہوا، اون کے موزے جرائیں، وہ آگئی۔ آ کے وہ عورت میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بننے لگی اور کہنے لگی آپ نے مجھے پہچانا؟ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگی انکل میں کلثوم ہوں۔ میں نے کہا، اوہ تیرا بھلا ہو جائے بیٹھ۔ میں نے کہا، تو اتنی دیر کہاں رہی۔ کہنے لگی میں سیدھی شکا گو سے آ رہی ہوں، اور میں نے آپ کا پتا ڈھونڈ کے سب سے پہلے آپ کے ہاں حاضری دی، میرا خاوند و بابا ڈاکٹر ہے۔ اچھا آدمی ہے، میں آپ سے اپنی پرانی محبت، اپنی برخوداری، اپنی بیٹی ہونے کا ایک چھوٹا سا حق مانگنے آئی ہوں، سیدھی آپ کے پاس۔ میں ڈر گیا۔ میں نے کہا، فرمائیں۔ میں تجھ سے بڑا ذریت ہوں، اور اتنے سال میرے ڈر میں ہی گزرے ہیں۔ کہنے لگی، یہ میرا بیٹا ہے۔ بہت پیارا ہے، اور بہت صحت مند ہے، اور ہم اس کو صحت، اور حفظان صحت کے اصولوں پر پال رہے ہیں۔ یہ روتا بہت ہے۔ ہم نے بہت کوشش کی ہے کہ کسی طرح سے اس کاروනا کم ہو، کئی دوایاں رہے ہیں۔ میرے خاوند ڈاکٹر ہیں، لیکن اس کارونا کم نہیں ہوا تو میں اس کو آپ کے پاس لائی ہوں کہ دی ہیں۔ میرے ساتھ پاؤں پھول گئے۔ مجھے واقعی نہیں آتا دم کرنا کہ کیا پڑھتے ہیں۔ کیسے کرتے ہیں۔ کہنے لگی آپ میرے ساتھ ہمیشہ.....؟ اب پھر وہی غصہ پرانا اس کا کہ میں کتنی دور سے چل کر آئی ہوں، اور کتنی آرزو لے کر آئی ہوں۔ کہنے لگی۔ اب آپ پھر تکبر کے میز کے اوپر چڑھ گئے ہیں۔ آپ کریں اس کو دم۔ میں نے کہا، پیارے بچے! اگر مجھے کچھ آتا تو میں ضرور کرتا۔ اس نے کہا، آپ جھوٹے ہی کر دیں۔ ”شو شو“ کروں۔ اب میں نے کہا، جھوٹی پھوک کیسے ماروں گا۔ پھر میں نے کہا، چل ہمارے مولوی صاحب ہیں۔ مسجد میں بہت نیک آدمی ہیں۔ میں جمعہ پڑھنے جاتا ہوں وہاں۔ ان سے دم کرواتے ہیں۔ تو کہنے لگی، نہیں آپ سے کرواؤں گی۔ آپ ہی کریں۔ دیکھیں انسانی کوتا ہی کیا ہوتی ہے۔ میں بھلا اس کا دل رکھنے کو کر دیتا۔ ایسے ہی ”شو“ لیکن میں رکارہا۔ میں نے کہا، مجھے نہیں آتا۔ یہ اللہ نے میرے اندر صلاحیت نہیں رکھی ہے، میری صلاحیت ہے کہ میں کچھ لکھ لیتا ہوں ڈرامے، لیکن یہ کام نہیں جانتا تو اٹھ کے کھڑی ہو گئی، جس طرح سے میرے دفتر میں اپنا پاؤں مار کے گئی تھی زور سے اتنے ہی زور سے اس نے ویسے ہی پاؤں مارا۔ کہنے لگی نانا۔ (بچے کے حوالے سے مجھے نانا کہہ رہی تھی) ”نانا یو آ رہو لی مین“ یہ اس کا آخری فقر و تھا، اور غصے میں کار میں بیٹھ کے چل گئی۔ اب بتاؤ میں تم کو کس کھاتے میں ڈالوں۔ تم جو آگئی ہو ساریاں (ہال میں بیٹھی خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے) مجھے ڈر ہے کہ تم بھی اندر سے لڑائی کرو گی۔ کسی نہ کسی دن میرے ساتھ، اور پیاری تم بہت ہوتی ہو۔ یہ آپ اپنے ہڑوں سے اپنے بھائیوں سے اپنے ابو سے پوچھیں۔ باوجود اس کے کہ اختلاف ہوتے ہیں۔ اب

ہمارے درمیان، کوشش ہو رہی ہے کہ ہمارے درمیان ہماری محبت کے درمیان کچھ ایسی دیواریں کھڑی کر دی جائیں، تاکہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ تو پیارے بچو! میں اب تمہارے سامنے شکایت کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ووٹ دینا پڑے، آپ میرے حق میں دینا۔ کلثوم کے حق میں نہ دینا۔ وہ مجھے بہت جھٹکیاں دے کر گئی ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

موت کی حقیقت

جب آدمی کے وجود پر بہت سال کی بڑی دھول جم جاتی ہے تو پھر وہ اپنے اردوگرد اپنے ماحول میں سے ایسی چیزیں تلاش کرنے لگ جاتا ہے جو بڑی گروہ آلو ہو چکی ہوتی ہیں، اور اس کی آرز ویہ ہوتی ہے کہ یہ چیزیں صاف سترہی ہو کے پھر سے ترتیب سے رکھی جائیں، لیکن میرا وجود اتنا صاف سترہا ہو کے دلیلی ترتیب سے نہیں رہ سکتا۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ پرسوں ہوا۔ میں اپنی پرانی کتابوں کی الماری کو صاف کر رہا تھا، تو اس میں سے ایک کتاب بڑے پیارے محبوب دوست، اور اس سے بڑے شاعر کی نکل آئی، اور میں اسے دیکھنے لگا، اور ماضی کے کافی دور پہنچ کر ان حالات میں بھی پہنچا جو ماضی سے بعید تر تھے۔ اس میں ایک چھوٹی سی پرچی پر ایک چھوٹی سی نظم میں نے لکھ کر رکھی تھی۔ یہ نظم ہمیں اپنے زمانے میں بہت ہی پیاری، اور بہت ہی اچھی لگا کرتی تھی، اور ہم اس کو لہک لہک کر، اور چک چک کر پڑھا کرتے تھے، لیکن اب بالکل ہمارے ذہن سے یہ چیز نکل چکی تھی۔ اس پر وقت کی دھول جم چکی تھی۔

خواتین و حضرات! جب کوئی رخصت ہو جاتا ہے آپ کے درمیان میں سے، اور موت اس کے ساتھ رشتہ گانٹھ لیتی ہے تو پھر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ یہ موت کا جو وجود ہے، اس کا تعلق عدم کے ساتھ ہے یا موجود کے ساتھ۔ آدمی تو گزر گیا، چلا گیا، لیکن وہ اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں اتنا کچھ نہیں تھا، چلے جانے کے بعد جتنا کچھ ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ موت بھی زندگی کا، ایک روپے کا دوسرا رخ ہی تو ہے، لیکن یہ بڑی اہم بات ہے، اور بڑی دلچسپ ہے، اور اس کے ساتھ ایک گھر ارشتہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تو مجھے یاد آیا، کتابوں کی الماری صاف کر کچنے کے بعد اور اس دوست کا ذکر کتاب میں پڑھنے کے بعد اس کی شاعری دیکھنے کے بعد، جو کہ اب ہم میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں پڑھارے مشرق میں موت کے بارے میں بہت عجیب و غریب روایات، اور بہت عجیب و غریب قصے، اور بہت عجیب و غریب رویے ہیں۔ میرے چچا جہلم میں تھے ثُبر مرچنٹ۔

ان کے دوست کا ایک جواں سال بیٹا کسی وجہ سے فوت ہو گیا۔ اکیلا ہی اس کا بیٹا تھا، اور وہ بڑا صوفی آدمی تھا۔ میرے بچا کے دوست اپنے زمانے میں نائب تحریک دار رہے تھے، لیکن بے حد ایماندار، اور بہت Honest، اور راست گوانسان تھے۔ کسی وجہ سے میرے بچا نے یہ عرض کیا کہ ان کی طبیعت تھیک نہیں۔ انہوں نے اپنے نمائندے کے طور پر مجھے بھیجا کہ جا کے تم افسوس کر کے آؤ اور کہنا کہ میں جو نبی خلیک ہوا، میری صحت بحال ہوئی، میں خود حاضری دوں گا۔ جب میں وہاں گیا تو بہت سے لوگ جمع تھے، اور وہ چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے پہچانا۔ اور مجھے کہنے لگے، اشفاق میاں دیکھو ہم جیت گئے اور سب دنیا ہماری گئی، ہم کامیاب ہو گئے اور باقی کے سب لوگ بڑے بڑے ڈاکٹر، بڑے حکیم اور بڑے بڑے نامی گرامی طبیب ہار گئے۔ میں پریشان کھڑا تھا، ان کے سامنے کہ یہ کیا بات کہہ رہے ہیں۔ کہنے لگے، دیکھیے ہمارا یار جیت گیا، اور سارے ڈاکٹر فیل ہو گئے۔ ہم ایک طرف تھے، اور یہ لوگ سارے ایک طرف تھے۔ وہی ہوا جو ہمارے یار نے چاہا، اور جو اس نے چاہا تھا وہی ہم نے چاہا۔

میرے رو ٹکنے کھڑے ہو گئے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک انکوٹا اس کا بیٹا جواں سال، اور بار بار یہی بات کہہ رہا ہے۔ کچھ وقت ایسی کیفیت درد کی، اور کرب، اور الہم کی بھی بن سکتی ہے۔ لیکن یہ انداز بتاتا تھا کہ وہ یہ بات اندر سے کہہ رہے ہیں اور اس کے اوپر ان کا پورا ایمان ہے، اور وہ بال نہیں رہے ہیں اس مقام سے۔ اور کہتے تھے جو اللہ نے کیا ہے وہی درست۔ اور وہی تھیک ہو گا جو اللہ کرے گا۔ اور چونکہ ہم اللہ کی سائید کے ہیں اس لیے جب اللہ کامیاب ہوتا ہے اور وہ ہر بار کامیاب ہی ہوتا ہے، تو ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ میرے لیے ایک عجیب بات تھی۔ میں اس وقت ایسا کہر چکا تھا، لیکن نہ میرے پاس الفاظ تھے، نہ میں بڑے سلیقے سے ان کے ساتھ افسوس کر سکتا تھا جس کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا۔ افسوس کے لیے میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ انہوں نے چائے پلائی، کھانا وہاں کھلانے کا رواج تھا۔ اگلے دن واپس آئے۔ میں نے آ کر ساری بات پچھا سے کہی۔ انہوں نے کہا کہ وہ بہت مضبوط، اور اللہ کو ماننے والے شخص ہیں۔

اس کے پھر کچھ عرصے بعد جب میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور میں نے ابھی کوئی ملازمت نہیں کی تھی تو مجھے سالٹ ریخ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ جو ہے ناکوہستانِ نمک تو یہاں پر ایک مقام تھا پہاڑوں کے اندر۔ اب تو ماشاء اللہ راستہ بہت آسان ہو گیا ہے نا، موزوںے کی وجہ سے، اس وقت بہت مشکل سے یہاں پہنچتے تھے۔ جب ہم تلے گنگ پہنچ تو ایک بزرگ تھے ملک صاحب، ان کا بھی اسی طرح بیٹا فوت ہوا تھا، اور ان کے پاس لوگ افسوس کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ بیٹھے تھے آرام سے ایک مقام پر، اور لوگ گھوڑوں پر پیدل، ایک دو اونٹ پر بھی وہاں آرہے تھے۔ بہت ریکھ تھے اس

علاقے کے۔ جو آدمی بھی جہاں پر ملک صاحب بیٹھے تھے اس دائرے کے قریب پہنچتا تھا وہ اپنے گھوڑے کی باگ یا شتر کی مہار چھوڑ کر پیدل چلتا ہوا رکتا تھا، اور ہاتھ اوپنچ کر کے ایک آواز لگاتا تھا۔ ”ملک صاحب حق ہو یا“، یعنی جو کچھ بھی ہوا، یہ حق ہوا۔ اور وہ بہت اوپنچی آواز میں روتے ہوئے کہتے تھے کہ ہاں حق ہو یا۔ یہ حق ہے جو کچھ بھی ہوا، میں اس کے آگے بول نہیں سکا۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ یہ بھی پرساد یعنی کا ایک انداز تھا، لیکن وہ کہتے اوپنچی آواز میں۔ اب بھی یہ رسم ہے کہ جب کوئی فوٹیڈ گی ہوتی ہے تو وہ آنے والے پرساد یعنی والے لوگ بہت اوپنچی آواز میں کہتے ہیں کہ ملک صاحب حق ہو یا اور وہ جواب میں یہ کہتا ہے کہ بالکل ٹھیک ہے جو کچھ ہوا حق ہوا۔ یہ بڑی مشکل بات ہے۔ اس کو اندر سے نکال کر کہنا۔ وہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑا جمع غیر تھا، اور عورتوں کے دل نازک ہوتے ہیں، روتنی ہوئی آتی تھیں۔ لیکن وہ بھی ساری ہاتھ کی انگلیاں ہلا کر کہتی تھیں بی بی حق ہوا۔ حالانکہ ان کا دل ہی نہیں تھا، عورت کی طبیعت نرم ہوتی ہے۔ لیکن رسم کے مطابق یہی کہتے تھے کہ بی بی حق ہوا، اور وہ ماں جو تھی اس بیٹھی کی، وہ بھی کہتی تھی، ہاں ہوا، میں اس کو تسلیم کرتی ہوں۔ جو بھی کچھ ہوا حق ہوا، تو موت کو زندگی کے ساتھ اس طرح سے وابستہ کرنا، اور اس کو زندگی کی ایک بُخت میں عجیب طریقے سے لانا، یہ کچھ ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی ذات پر پورا کا پورا اعتماد رکھتے ہیں، اور ان کا ایمان جو ہے وہ بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ تو میں یہ اکثر سوچتا تھا، اور میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ زندگی کو Protect کرنے کے لیے اس کی حفاظت کرنے کے لیے موت جو ہے، یہ بڑی اہم، اور بڑی ضروری چیز ہے، اور اس کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ وہ جو ایک Red Indian تھے شامان جسے کہتے ہیں، سیانا آدمی۔ تو اس کے پاس کیلی فورنیا کا ایک طالب علم گیا۔ اشਤھر دپالوجی کا اس سے پوچھنے کے لیے۔ اس نے کہی باتیں اس سے پوچھیں۔ جزئی بوسیوں کے بارے میں۔ تو اس نے کہا کہ ڈان جوآن، (سیانے کا نام ڈان جوآن تھا)۔ اس کی اصلی روپورث میں نام شاید کچھ اور ہو۔ تو اس نے کہا، ڈان جوآن بات یہ ہے کہ زندگی میں بہت سارے مشکل سوالات سامنے آ جاتے ہیں، ان کو کیسے حل کیا جائے۔ اس نے کہا کہ مشکل سوال تو آنے ہی نہیں چاہیں۔ سوال تو تم خود بن کر اس میں خود کو پھنسا لیتے ہو۔ سوال کوئی چیز نہیں ہے، لیکن یہ زور دینے لگا کہ صاحب ہم شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتا ہے۔ خیر ان کا کچھ جھگڑا شروع ہو گیا۔ وہ کہنے لگا، دیکھیں میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ میری ایک ملکیت ہے۔ میری اس سے کئی سوالوں سے متعلق چل رہی ہے۔ اب ایک اور لڑکی ہمارے درمیان میں آگئی ہے۔ مجھے اپنی ملکیت بھی اچھی لگتی ہے، وہ بھی اچھی لگتی ہے۔ میں اس کا حل کیا کروں؟ میرے پاس اس کا کوئی حل نہ لگتا نہیں ہے، اور میں بڑا چھا آدمی ہوں۔ میری ملکیت بہت اچھی خاتون ہے، اور وہ لڑکی بھی بہت اچھی ہے۔ ڈان جوآن نے کہا، بھی اگر اتنی مشکل پیش آ جائے تو پھر آپ اپنی موت سے پوچھ لیا کریں۔ ہر آدمی کے

ساتھ بائیں ہاتھ پر پانچ فٹ کے فاصلے پر اس کی موت چلتی ہے۔ ہر وقت ساتھ رہتی ہے تو اس کو کہو، اے موت تو بتا اب کیا کریں؟ تو اس نے کہا، کیا وہ جواب دیتی ہے۔ اس نے کہا، ہاں پہلے تو آپ کو اس اس کے ذریعے سے پتا چلے گا۔ پھر جوں جوں آپ کے ساتھ رابطہ گھرا ہو جائے گا، تو وہ بات بھی کرے گی آپ کے ساتھ، آواز بھی آئے گی۔ تو وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کیسے موت اس کے ساتھ بات کرتی ہے۔ خدا نخواست کسی کی موت پیچھے رہ جائے۔ کہیں اچھرے میں، انارکلی میں اور آدمی آگے نکل جائے اور ایکسیڈنٹ ہو جائے تو وہ چیزیں مارے گا کہ میرا کوئی بندوبست کرو۔ بہت اچھی بات ہے۔ Logical وہ کہتا ہے کہ پھر ان کی بات آہستہ بیجھ میں آنے لگی توزندگی کے بارے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس بنت میں اس طرح سے آتی ہے۔

میری ایک بھائی تھی بڑی دیری کی بات ہے۔ اس کو اپنے دادا سے بڑا پیار تھا۔ ہوتا ہے پوتیوں کو اپنے دادا سے پیار تو، دادا اس کے سیر کرنے جاتے تھے۔ اچانک فوت ہو گئے، تو اس کو بڑا صدمہ ہوا۔ ایکلی بیٹھی رہتی تھی۔ ذرا زیادہ ہی پریشان رہتی تھی؛ تو ایک دن اس کے گھر کی ملازمت نے کہا، ”منی تیر ادا کیا گیا۔“ اس نے کہا میرے دادا وزخم سیر کو جاتے تھے تو میرے دادا اور اللہ میاں اکٹھے سیر کیا کرتے تھے۔ بہت لمبا چکر لگایا تو میرے دادا تھک گئے، تو اللہ میاں نے کہا، اب تم واپس کدھر جاؤ گے۔ تم میرے گھر میں ہی رہ لو۔ ریسٹ کرلو تو میرے دادا وہاں ریسٹ کر رہے ہیں۔ تو اللہ ان کے بڑے دوست ہیں۔ اتنی گھری بات اس نے کہی، بڑی عجیب و غریب بات کر دی، تو یہ مشرق کے لوگ بات کرتے ہوئے مانتے ہیں کہ موت زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔

میں 1948ء میں پڑھتا تھا گورنمنٹ کالج میں۔ پاکستان نیا نیا بناتھا، اور قائدِ اعظم ابھی زندہ تھے تو کالج میں ممتاز مفتی آیا۔ سائیکل ہاتھ میں پکڑے ہوئے تو مجھے کاس کے پاہر بلا کر کہنے لگا، تم فارغ ہو؟ میں نے کہا، کالج سے فارغ ہونا کوئی ایسی بات نہیں۔ اس نے کہا، ذرا چلتے ہیں۔ میں آیا ہوں پنڈی سے کہ مجھے خبر لیں ہے ایک بزرگ کی۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے مانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا چلو ہم اکٹھے چلتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے ہم کرشن نگر میں گئے۔ وہاں ایک جگہ تھی ”لولی لاج“۔ پرانی وضع کے گھر تھے تو اس کے اندر گئے۔ ایک ذرا سے تاریک کرے میں ایک بزرگ ایک پرانی وضع کے پلنگ کے اوپر لیئے ہوئے تھے جس میں شیشہ وغیرہ لگا ہوتا تھا۔ وہ بزرگ کافی تکلیف میں نظر آتے تھے۔ ان کی چار پائی یا پلنگ کے گردان کے دوست بیٹھے ہوئے تھے جو مسجد میں دوست بن جاتے ہیں۔ زندگی میں ایک تو آپ کے دوست وہ ہوتے ہیں، جو آج کل ہیں۔ ایک وہ جب آپ ریثا رڑھوں گے تو پھر آپ دور ہو جائیں گے ان قریبی دوستوں سے تو اس وقت ہمارے سیانے یہ رائے دیتے ہیں کہ جب آپ ریثا رڑھوں گے تو کم از کم اس وقت مسجد میں جانا شروع کر

دیں اور وہ ایک ایسا قیمتی مقام ہوتا ہے کہ آپ کی نئی Freindship ڈولپ ہوتی ہے جو اس سے پہلے کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تھیک ہے نانی دوستی پیدا کریں اور نئی دوستی کا پیدا ہونا بڑی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ خیر وہ دوست تھے۔ سامنے ان کی بہو اور بیٹا کھڑے تھے۔ بہو بڑی زار و قطار رورہی تھی۔ تو ممتاز مفتی نے جا کر کہا، میں ممتاز ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہاں میں نے پہچانا ہے۔ ممتاز مفتی کہنے لگے، آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ کہنے لگے، میرے گردوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ یہ مکمل طور پر فیل ہو گئے ہیں، اور میرا یور جو تھا، اس کا 1/4 حصہ کام کرتا تھا، اب وہ بھی کام نہیں کرتا۔ اور سانس جو ہے میری وہ تھیک ہے۔ ہاں دل بھی تھیک ہے۔ لنگر کے اندر جو ریشہ ہے۔ وہ مجتمد ہوتا جا رہا ہے۔ از روئے شریعت (مجھے لفظ ان کے یاد ہیں۔) یہ حکم ہے کہ جو تم سے کوئی احوال پوچھتے تو جزئیات کے ساتھ بیان کرو۔ یہ میں نے جزئیات کے ساتھ آپ کو بیان کر دیا۔ ویسے میری کیفیت اللہ کے نفضل سے بہت اچھی ہے۔ واقعی میں تھیک ہوں، جو کچھ گزر رہا ہے، میں اس پر راضی ہوں، لیکن چونکہ حکم ہے بتا دو تو میں نے بیان کر دیا۔ تو وہ بہو جو کھڑی تھی۔ بے چاری نرم دل اڑکی، وہ رو نے الگی۔ وہ کہنے لگے، تم گھبرا یامت کرو۔ میں تھیک ہوں.....

میں یہ نگ تھا بہت اس وقت Sixth year میں پڑھتا تھا۔ مجھے بہت گھبراہٹ طاری ہوتی۔ ایک آدمی کو اس طرح سے لیئے ہوئے دیکھ کر، اور اس کو جاتے ہوئے دیکھ کر..... باقی لوگ جو تھے جو صد مندوں کو ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں شیخ صاحب! انشاء اللہ تعالیٰ آپ تھیک ہوں گے۔ کہنے لگے، ہاں یوں نہیں میں تھیک ہوں۔ پھر انہوں نے ذرا سا اوپنے ہو کر وہ جوڑھو ہوتی ہے، اس کا سہارا لے کر ہارنس کے اوپر رکھی ہوئی اپنی گپڑی، کلاو کو ہاتھ سے اٹھالیا، اور اٹھا کر اس گپڑ کو سر پر رکھ لیا، بڑی اچھی وہ گپڑی باندھی ہوئی تھی سر پر رکھ کر بیٹھ گئے، اور سب کو ایسے دیکھنے لگے تو میں بھی کھڑا تھا۔ ممتاز مفتی کی طرف ہاتھ پڑھا کے کہنے لگے، اچھا جی السلام علیکم، السلام علیکم۔ سب سے ہاتھ ملا یا۔ دوستوں سے میں بھی شامل تھا ان میں۔ تو کہا، اچھا جی صاحبزادے السلام علیکم، اور پھر ہو گائی، اور گپڑی بندھی ہوئی، ویسے کے ویسے آنکھیں بند کر لیں، اور خوشی کے ساتھ برضائے ذات چلے گئے۔ بالکل کوئی جھگڑا نہیں، کوئی پچھوئیں۔ تو میں چونکہ متجسس Cureous تھا، نوجوان تھا۔ میں نے کہا، یہ گپڑی ان کی ایسے بچپنی ہوئی ہے۔ اتنا دیں تو ان کے جو دوست تھے کہنے لگے، نہیں نہیں۔ میں نے کہا، جی یہ گپڑی مجھے سمجھو نہیں آئی۔ کہنے لگے، یہ موت کی تقدیمیں کے طور پر اس کی عزت افزائی کے لیے، نگے سر بر الگتا ہے۔ اب وہ آرہی ہے تو اچھا نہیں لگتا، اس لیے مشکل سے اٹھا کر انہوں نے سر پر لے لی ہے۔ یہ ساری بائیں ہو چکیں، تو اب جہاں سے بات چلی، وہ میں آپ سے عرض کروں کہ وہ معروف نظم آپ بھی جانتے ہیں۔ ہم بھی جانتے ہیں، یہ جو ہم اور آپ سب پڑھا کرتے تھے کہ:

”تاج تیرے لیے ایک مظہر الافت میں ہی، تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہے۔ میرے

محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو..... یہ تو جوتا ج محل میں ہمیں مل لیتی ہے۔ یہ تو نہیں ہے وہ مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا۔ یہ پھنس زار، یہ جمنا کا کنارا یہ محل، یہ منعکس درود دیواریہ محراب یہ طاق، ”جب تک تو ہمیں زبانی یاد آئی، آج بھول گئی) اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق، میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو۔ تو صفائی کرتے ہوئے یہ نظم پڑھتے ہوئے، جو میں نے آج سے 40-45 سال پہلے پڑھی۔ ہم سب نے پڑھی تھی کہ یہ خیال آیا کہ وہ شہنشاہ جو یہاں سے چلا گیا، اور جس نے اپنی محبت کا symbol ایک خوب صورت سفید پتھر میں محفوظ کر دیا۔ اپنے طور پر وہ بھی ایک انسان تھا۔ شاعر بھی انسان ہوتا ہے۔ دانش و رہنمائی انسان ہوتا ہے۔ شاعر نے اس کو اپنے ایک اور انگل (زاویہ) سے دیکھا اور بادشاہ نے لاشوری طور پر ایک، اور روپ سے دیکھا، اور پرسوں مجھے خیال آیا الماری صاف کرتے ہوئے کہ شاعر جن غریبوں سے محبت کرتا ہے، اور جن کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انہیں سوائے اس نظم کے کچھ نہیں دے سکا، اور وہ شہنشاہ جو فوت ہو گیا ہے، اور جو بادشاہ ہے، اور جو symbol اچھا نہیں کھلاتا ہے، وہ اس وقت ہندوستان کو پونے دوازب ڈال رہا تھا تو رازم کے طور پر دیتا ہے، اور آگرے کے سائز ہے تیرہ ہزار گھرانے تاج محل کی وجہ سے اپنی اعلیٰ درجے کی روٹی کھاتے ہیں۔ جن میں فنون گراف فر بھی ہیں، سینکڑا ش بھی ہیں، نقاش ہیں۔ پتھل کے وہ برتن جن کے اوپر تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں، وہ بھی بناتے ہیں، تو آج ایک، اور انگل سے مجھے یہ بات یاد آئی کہ ہم شاعر دانش و راپنی جذباتی کیفیت میں ہر ایک بات کرتے چلتے ہیں، اور ہندوستان کو بڑا ناز ہے، اپنی فلم انڈسٹری پر، یہ اس کے لیے فارن ایکچینج مہیا کرتا ہے، ہر سال آپ نظم لکھ سکتے ہیں کہ جذباتی بات بہت اچھی ہوتی ہے۔ میں وہ نہیں کہتا، میں اپنے ایک نئے زاویے کی نئے رخ کی بات عرض کر رہا ہوں۔ غریبوں کو اتنا پیسا مل رہا ہے، وہاں پر، اور آگرے اور اس کے گرد و نواح کے لوگ اتنے مزے سے ایک تاج محل کی وجہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سینکڑوں سالوں وہ ایک صدقہ جاریہ ہے، جو اس بندے نے جوچھ مجھ محبت کرنے والے نے، پچھچھ ایک شخص سے محبت کرنے والے۔ وہ اس کی بیوی ہو، کچھ ہو، اس کے جواز سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا کی۔ جس سے کئی غریبوں کی کفالت ہو رہی ہے۔

آپ کے لیے بھی یہ سوچنے والی بات ہے۔ چلا میں کہاں سے تھا اور پہنچ کہاں گیا۔ یہ بڑی عجیب و غریب چیزیں ہوتی ہیں۔ بڑی مہربانی آپ تشریف لائے۔ میں تو اپنی الماری صاف کرتا ہوا، ایک یاد لے کر آگیا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

شیرنگ

میرے اس پروگرام پر جہاں اور بہت سے اعتراض ہوتے ہیں، خاص طور پر ایک بات بار بار کہی جاتی ہے اور پوچھی جاتی ہے کہ آپ کے جو مہمان ہوتے ہیں وہ کوئی بات خود سے نہیں کرتے یا آپ انہیں کہنے نہیں دیتے۔ تو میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ میں کہنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ میں اپنی داستان گوئی ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تاک شو نہیں ہے، ڈسکشن شو نہیں ہے۔ اسے ایک اور انداز میں ہم نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اسی انداز میں چلنے تو بہتر ہے۔ اگر آپ اس میں تھوڑی سی آرزو بھی رکھتے ہیں کہ آپ کو بھی شامل کیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ابتداء میں بھی ایسے کیا تھا آج میری آرزو ہے۔ روکیں کے طور پر یہ چاہوں گا کہ کچھ سوال آپ سے پوچھوں، میں ہی بات نہ کرتا رہوں۔ ہمارے یہاں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی نیو کمپس سے نکلتے ہوئے اگر آپ ایک علاقہ ہے فیصل ناؤں، اس کی طرف جائیں تو راستے میں ایک مقام پر جہاں بڑی تیز رفتار گاڑیاں جا رہی ہوتی ہیں، کچھ جھلکیاں ہیں، ان میں جلوگ وہاں رہتے ہیں، میں بھی بھی ان سے کچھ باتیں کرتا ہوں، کیونکہ بہت ساری کہانیاں مفت ہی میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہاں پر ایک ماں عمری ہے، جو بڑی دانشور، اور ویدہ و قسم کی خاتون ہے۔ وہ بڑی اچھی باتیں کیا کرتی ہے۔ تو ان سے میں تھوڑے دن ہوئے ملا تھوڑی دیر کے لیے۔ تو ان سے ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہوئی جس پر میں غور کرتا رہا، لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا، جیسی کہ میری آرزو تھی کہ پہنچا جانا چاہیے۔ فی الحال یہ بات عرض کرنی چاہ رہا تھا کہ عطا جو ہے Giving، ڈومنیٹ کرنا کسی کو یہ بڑا آسان کام ہے، الحمد للہ ہمارے پاکستان میں اس کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے، اور لوگ بڑے مختبر ہیں، اور وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر بھی اس میں حصہ لیتے ہیں، اور وہ دیتے ہیں لوگوں کو ضرورت مندوں کو، مبتا جوں کو، لیکن ایک چیز ہوتی ہے سانجھ یعنی Sharing۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ شیرنگ کی طرف آدمی راغب نہیں ہوتا۔ میری بیوی کہتی ہے۔ آج مجھے ایک بڑا خوفناک خواب آیا ہے، تم یہ پیسے لے جاؤ، صدقے

کا بکرا وہاں سے لو، اور زخم کراؤ اور دے آؤ۔ اور اگر کوئی شخص آکر شیرنگ کی بات کرے کہ میرا یہ دکھ ہے اور اے اخبار والو میرا دکھ سنو، اس کو چھاپو مت، پچھہ مت کرو، لیکن میرا بوجھ ہلاکا تو ہو۔ وہ کہتے ہیں شیرنگ ہمارا کام نہیں۔ ہم آپ کو کچھ دے دل سکتے ہیں لیکن شیرنگ کا کام نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اس کائنات میں جتنے بھی جاندار ہیں، وہ اللہ نے شیرنگ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں یہ شیر، چیتا، پرندے، درخت، پودے یہ سب اسی کائنات میں اسی کرہ ارض پر رہ کر ہمارے ساتھ شیرنگ کرنے، سانجھ بٹانے کے آرزومند ہیں۔ اس میں ایک بڑی حیرانی کی بات یہ ہوئی منظور صاحب (ہال میں ایک صاحب کو مناطب کرتے ہوئے) کہ جو جانور تھے جو درندے تھے جو چوپائے تھے۔ انہوں نے تو شیرنگ میں پورا ساتھ دیا ہمارا۔ آپ غور کریں، لیکن انسان نے ان کے ساتھ شیرنگ میں، سانجھ میں وہ سلوک نہیں کیا جو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیے تھا۔ یعنی ایک معمولی سے ہاتھی دانت کی خاطر اتنے بڑے ہاتھی کو مار دیتے ہیں، اور بے دریغ مارتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ڈسپوزل کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ اب رو تے چھٹے پھر تے ہیں کہ شیر جو ہے Tiger جو ہے، اور لائن جو ہے، یہ کم ہو رہا ہے اس کو بچایا جائے۔ لیکن ایک وقت تھا کہ بے دریغ گورے نے خاص طور پر اسے قتل کیا، اور ختم کیا۔ پاغڈا ایک جانور بڑا پیارا قلب ابازیاں لگانے والا بدھوسا، اس کو بالکل ختم کر دیا۔ تو انسان نے شیرنگ کا فن نہیں سیکھا، اور اب لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے میں بھی وہ شیرنگ کی طرف نہیں آتا، نہیں آنا چاہتا۔ یہ ایک بڑے الیے کی بات ہے، جنگل تھے بہت گھنے۔ خوب صورت، اعلیٰ درجے کے جو آپ کے حسن میں، اور آپ کے کرہ ارض کی تقویت کا باعث تھے، اسے کاٹ کر صاف کر دیا۔

میں پہلی مرتبہ جب امریکہ گیا 1963ء میں، تو صحیح انھوں کے میں نے اخبار لیا نیو یارک نیوز۔ وہ میں لے کے چلا تو مجھے ایک لڑکی کہنے لگی Hay, you will take rest of it. تم تو بیچ میں سے اتنا انھوں کے لے چلے ہو تو میں نے کہا باتی پچھا اور بھی ہے۔ اس نے کہا تم تو سارا اخبار پھوڑے جا رہے ہو۔ کوئی تقریباً 270 صفحے کا اخبار Sunday Edition چھپتا ہے وہاں۔ تو میں تو اسے انھا بھی نہ سکا، چونکہ میں پہلی منزل پر تھا اس لیے میں کندھے پر رکھ کے چلا، اور وہاں پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے اسے پھیلا کے دیکھا۔ یا اللہ میں یہ کہاں سے پڑھنا شروع کروں؟ تو سیانے آدمی سے پوچھا کہ بھی اس اخبار کو کیسے پڑھتیں۔ اس نے کہا، یہ سارا نہیں پڑھا جاتا جو خواتین ہوتی ہیں وہ نکال لیتی ہیں کہانے پکانے والا حصہ۔ جو کپڑے سینے والے ہوتے ہیں وہ اپنا حصہ، وہ اپنے ایتھلیٹ جو ہوتے ہیں وہ اپنے سپورٹس کا سیکشن نکال لیتے ہیں۔ بہت کچھ ہے پڑھنے کو تو دغیرہ دغیرہ۔ میں بڑا حیران ہوا لیکن میں نے سوچا، میں ان کو فون کر کے پوچھوں۔ میں آپ کا دفتر دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا، چلے آئیے۔ جب میں

گیا تو میں نے ان سے پوچھا، یہ جو آپ اخبار کا Sunday Edition چھاپتے ہیں۔ اس پر کتنا کاغذ خرچ آتا ہے، تو انہوں نے کہا، ہمارے سند بے ایڈیشن پر تقریباً تقریباً 101 یکڑا درخت کھاتا ہے، تو پھر اس کا پلپ بنتا ہے تو پھر یہ کاغذ بنتا ہے، اور پھر اس پر چھپتا ہے۔ ایک انفرمیشن دینے کی خاطر جو میں سمجھتا ہوں، اتنی زیادہ اعلیٰ پائے کی انفرمیشن بھی نہیں ہے، جو انسان کو وہ کچھ عطا نہیں کرتی جو انسانیت کا شرف ہے۔ اتنا سارا کاغذ پلپ کی صورت میں بنا کر درختوں کو کاشتے چلتے جاتے ہیں۔ تو پھر میرے تجسس اور تحقیق کا دائرہ بڑھا، تو تاکم نیوز والوں کا کاغذ ہر ڈاٹھن Thin ہوتا ہے، اور خاص قسم کا۔ انہوں نے کہا، ہم اپنا کاغذ خود بناتے ہیں۔ اب چونکہ جنگل ختم ہوتے جا رہے ہیں اس لیے ہم نے ایسے Ships بنائے ہیں جن کے اوپر پلپ بنا کر کاغذ تیار کرنے کے کارخانے ہیں، اور دنیا کے ہم ایسے علاقوں میں وہ شب پر کر گھومتے رہتے ہیں جہاں جنگل قریب ہوں، وہاں سے کاٹ لیں۔ پھر یہی اخبار والے رونے لگ گئے ہیں کہ خدا کے واسطے اس کرۂ ارض کو بچایا جائے۔ اس میں بڑی پولیوشن Pollution ہو رہی ہے۔ اس کی لیس Layer جو ہے وہ پھٹ گئی ہے۔ یہ سب کچھ انسان ہی کی وجہ سے ہوا۔ یہ درناک قصہ بڑی دردمندی سے اس لیے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ ہم عطا کرنے میں تو شیر ہیں لیکن شیرنگ کرنے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ قدرت کے بڑے مظاہر ہیں، جو بڑی طاقتیں کہہ لیں، ان کو ہم سب شیر کرنے پر مجبور ہیں۔ چاند ہے، سورج ہے، ستارے ہیں، ہوا ہے، آسمان ہے یہ سارے ہم شیر کرتے ہیں، کیونکہ اللہ کی مہربانی ہے۔ اگر خدا نخواستہ ان پر بھی ہمارے قبضے ہونے شروع ہو جائیں، جیسا کہ ہو رہے ہیں۔ بڑے فخر سے کئی دفعہ ہم نے لکھا ہوتا ہے کہ کائنات کے اوپر ہم کندیں ڈال کے اس کو اب تنفس کرنا ہے، کائنات نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ اسے تنفس کریں گے۔ کیا کریں گے تنفس کر کے۔ یہ کہا جائے کہ ہم اس کے ساتھ ایک دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اک محبت کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے ساتھ انسانوں کے ساتھ بھی آدمی محبت کرے۔ اور انسان اگر غور سے دیکھے تو سب سے بڑی چیز جو وہ سانجھ میں رکھتا ہے، وہ اس کا تنفس ہے، سانس ہے۔ میں جو انسان اس وقت لے رہا ہوں، یہ غالباً چلتا چلتا کسی جنگل میں پہنچتا ہے۔ کسی ہاتھی، کسی مگر مچھ کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کا تنفس آیا ہوا یہاں پہنچتا ہے۔ ایک تعلق ایک Relatedness کی بات ہوتی ہے انسان ایک انسان سے ثوٹ کر، بکھر کر پریشان و حیران ہو رہا ہے، اور اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، اور باوجود اس کے کہ وہ بڑی گہرائی کے ساتھ، اور گیرائی کے ساتھ اپنے سارے مسائل کو سمجھنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ ایک مسئلے کو جو ہمارے بزرگان دین صوفی کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ مثلاً وہ حال ان پر دار تھا۔ وہ اس مشکل میں بنتا ہوئے، اور اس مشکل کو سمجھ کر پھر اس کا حل نکالا کرتے تھے۔ میں، آپ یا اور پڑھے لکھے آدمی اس مشکل کے اندر داخل نہیں ہوتے۔ میں نے

آپ سے پہلے بھی شاید ایک دفعہ بتایا تھا کہ ہمارے بابا جی کے پاس ایک لڑکی آئی۔ اس کے بازو کے اوپر پھنسیاں تھیں۔ بڑی موٹی موٹی خوفناک قسم کی دودھیا۔ پیپ سے بھری تو انہوں نے دیکھا تو کہا، اس کا کرتے ہیں کچھ۔ ایک دن گزر گیا۔ شام کو مغرب کے وقت میں نے دیکھا تو وہ، اور اس کا باب بیٹھے ہوئے۔ میں نے کہا بابا جی، اس پر کوئی دوائی لگانے والی لگادیتے۔ تو کہنے لگے، دوائی بھی ذہن میں نہیں آ رہی۔ میں نے کہا جی کیوں ذہن میں نہیں آ رہی۔ کہنے لگے، جب یہ پت میرا حال ہو گا تو مجھے سمجھ میں آئے گی نا، یہ چیز کیا ہے۔ اب تو یہ میرا حال نہیں۔ میں نے کہا۔ حال کیا ہوتا ہے۔ کہنے لگے۔ مجھے نہیں پتا چل رہا اس بیماری کا۔ تو دوسرے دن ان کے بدن پر ویسی بھی پھنسیاں نکل آئیں، اور ان کی آرزو بھی پوری ہو گئی۔ پھر انہیں پتا لگا، یہ مر چیز کیسی لگتی ہیں۔ دیکھیں نا، آپ کا کوئی دوست کہتا ہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے، تو آپ کو محض کتابی سا اندازہ ہوتا ہے کہ سر درد ہے لیکن وہ جس کیفیت سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کیسا ہے۔ جب تک آدمی اس سانجھ میں داخل نہیں ہو گا تب تک وہ صاحبِ حال نہیں بنے گا۔ مجھ پر ہنتے ہیں۔ میرے بچے یہ سارے پڑھے لکھے ہیں، اور گھر میں بھی، اور باہر بھی۔ یہ آپ کیا بات کرتے ہیں، صاحبِ حال کی۔ زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ سامنس کہیں پہنچ گئی ہے۔ کلوونگ ہو گئی۔ بھیز اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس نے دو بچے بھی دے دیے ہیں، اور آپ ابھی تک وہیں بچنے بیٹھے ہیں بابوں کی بات کرتے چلے جاتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں، کلوونگ بھلے ہوتی رہے۔ سامنس آپ کی آگے بڑھتی رہے، لیکن انسان کا رشتہ قدرت کے ساتھ، اور روح کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آئے گی نہیں۔

اللہ نے حقوق انہیں طے کر دیئے ہیں جو اللہ کی سفت ہے اس کے مطابق کام چلتا رہے گا۔ بڑے بڑے معاشروں کی زندگی میں دن آتے ہیں جو دن وہ مناتے ہیں، وہ دن اس وقت تک نہیں منایا جا سکتا، جب تک سب کی شیرنگ نہ ہو۔ نہیں کہ ایک آدمی کھڑا ہو جائے اور کھڑا ہو کر کہے، جناب! ہم نے یہ کام کر دیا ہے یا یہ توپ چلا دی ہے۔ عید آتی ہے نا، اگر صرف آپ کا ہی گھر انا عید منائے۔ بہت اچھے کپڑے پہنے، اور باقی کے لوگ اس میں شامل نہ ہوں، تو پھر وہ عید نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے اسی طرح سے کوئی اور دن آجائے بڑا خوبصورت، 14۔ اگست کا آپ مناتے ہیں۔ بازار میں نکلتے ہیں وہاں Display ہوتی ہے۔ تو جبھی ہوتی ہے جب اس کو سارے مل کے کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسے دنوں کو آپ عطا کے حوالے کر دیں کہ جاؤ تم میری طرف سے دیکھا آؤ کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہاں آپ کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ اب مثلاً دیکھیے اب ہمارا یہ 28 مئی کا دن ہے (اس دن پاکستان نے اپنی دھماکے کیے تھے)۔ کتنا بڑا دن ہے، لیکن یہ سب سارے کا سارا سامنس دنوں یا نیکناوجیز کا دن نہیں ہے۔ پوری قوم اس میں شامل ہے۔ آپ کا، سب کا ہے۔ ان لوگوں کا بھی ہے،

جنپوں نے اتنی گہری سرگنگ کھو دی۔ ان لوگوں کا بھی ہے جو بڑھنی اور ترکھان، ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ وہ ولیڈر جن کو ہم نہیں جانتے جن کو ضرورت ہوتی ہوگی، وہ بھی اس میں ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ چلیے وہ تو وہ ہو گئے، ہم ان کو سلام کرتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے آپ کو بھی سلام کرتے ہیں کہ ہم چودہ کروڑ آدمی اس آرزو میں، اور اس دعا میں برابر کے شریک تھے، اور یہ کارنامہ ہمارا کارنامہ ہے، اور ہم اس میں چلے آ رہے ہیں۔ اچھا یہ تو ہوا ایک بہت بڑا کارنامہ، ایک بہت طاقتوں کا کارنامہ ہے، اور جس نے پوری دنیا کو وہلا کے رکھ دیا، اور ہمارا سفرخز سے اوپنجا کیا۔ اس کی دھمک چاغی میں سے ہوتی ہوئی واشنگٹن ڈی سی کی اس جگہ گئی، اس مشین کے اوپر جس نے واضح طور پر بتایا کہ اس کی طاقت اتنی ہے، اور اس کا جنم ایسا ہے، اور اس کی مابینت ایسی ہے۔ تو یہ بات طے پا گئی۔ اس میں ہم سب شریک ہیں۔ بہت بڑی طاقتوں چیز جو ہو، وہی آپ کو Unite کر دے۔ بہت ہی کمزور چیز، اور بہت ہی دشمنی چیز شوال کا چاند ہوتا ہے، کبھی نظر آتا ہے، کبھی نظر نہیں آتا۔ تھوڑی دری کے لیے ہوتا ہے، اور سب دیواروں پر چڑھے، کوٹھوں پر چڑھے اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں نا۔ تو وہ کھڑے ہو کے دیکھتے ہیں، اور وہ بڑا دھیما سا ہوتا ہے، وہ بھی ہمیں تقویت عطا کرتا ہے۔ یہ شیرنگ کی برکت ہے۔ اگر یہ سانجھ نہ ہو تو یہ کوڑی کے کام کی نہیں ہے، اور نہ رہ جاتی ہے۔ صرف عطا کرنا یاد بینا ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ پانچ ہزار روپے ہیں، دے آؤ۔ یہ اتنا ہے، سکول کو دے دو۔ یہ اس کو چندہ دے دو۔ تھیک ہے لیکن چندے کے ساتھ رہنے والے اور لوگ بھی ہیں، جو یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ آئیں، اور ان کو دیں، ہم کو یہ تقویت حاصل ہو، اور ہم کو یہ عزت ملے کہ ہم سب مل کر یہ کام کریں۔

تو میں یہ جو عرض کر رہا تھا کہ وہ سڑک جس سے میں کبھی کبھی گزر اکرتا ہوں، وہاں جو ماسی عمری ہے، وہ مجھے بتا رہی تھی۔ چار پانچ دن ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا، تم لوگ بڑے خوش ہو، اور تمہاری جھگیوں میں یہ بڑے بڑے ڈبے پڑے ہیں۔ تو اس نے کہا، یہ شیخ صاحب نے بھی ہیں۔ تو کہنے لگی، جی ان میں سو گاتیں ہوتی ہیں۔ تھنے ہوتے ہیں اور بھی خواتین آ کر اکٹھی ہو گئیں۔ کہنے لگی، اللہ بھلا کرے شیخ صاحب کا، بڑے اچھے آدمی ہیں۔ پھر کہنے لگی، بابا جی ہم نے کبھی شیخ صاحب کی شکل نہیں دیکھی۔ کبھی آج تک دیکھا نہیں، کون ہیں جب انشاء اللہ ہم فوت ہوں گے، اور شیخ صاحب بھی فوت ہوں گے، تو پھر وہاں جا کے ان سے ملیں گے۔ فوت ہوئے بغیر شیخ صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم یہ آرزو لیے بیٹھے ہیں مرنے کی۔

تو یہ لمحہ فکر یہ ہے کہ ہم نہ صرف کرے شیر نہیں کرتے، کھانے نہیں کرتے، ہم نفاسی میں کیوں بنتا ہیں؟ آج میں آپ سے بھی پوچھنے آیا تھا، اور اب میں آپ سے ضرور پوچھوں گا، اس لیے

کہ آپ مجھ پر ازہم دیتے ہیں کہ آپ ہی بات کیے جاتے ہیں۔ ہم زیادہ بہتر بات کر سکتے ہیں۔ یقیناً آپ زیادہ بہتر بات کر سکتے ہیں۔ یہ بتائیجے کہ کیا ہم لوگ عام لوگ، ساری دنیا کے لوگ سوچنے میں سمجھنے میں غور کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے۔

بالکل رکھتے ہیں لیکن ہم چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ چیز میں مکان بھی ہے، پیسا بھی ہے، لی وی بھی ہے، موڑ کار بھی ہے، صرف موڑ کار نہیں، اچھی موڑ کار ہے، اس سے بہتر موڑ کار، ہم چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ تو پھر جو جاندار کے ساتھ شیئر کرتا ہے، اس کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ بھاگنا ہی پیدا ہو گیا، یعنی یہی تو مسئلہ ہے۔

آپ کا جو شیلی ویژن پروگرام ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہی بھگار ہا ہے چیزوں کے پیچھے۔ کیونکہ اس کے پروگرام جو ہیں ان پروگراموں میں جو ناتم ہے، اس ناتم میں سے آدھا ناتم یہی ہوتا ہے کہ آپ فلاں چیز خریدیں، فلاں چیز خریدیں۔ فلاں چیز بڑی گلیسرس، اور فلاں چیز میں آپ بڑے حسین لگیں گے۔ ان میں لی وی کمرشل کا بڑا ہاتھ ہے۔ دیکھیے! کیسا اچھاٹاک شو ہو گیا ہے۔ آپ ان چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، جو آپ کی من چاہی چیزیں ہوتی ہیں، بالکل تمبا کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ نہیں پسند کرتے یا جو آپ کے تفاخر میں اضافہ نہیں کرتی ہیں۔ ان چیزوں کو آپ چھوڑ دیتے ہیں تو یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے کہ جتنی آسانی کے ساتھ ہم نے کہا۔

مذہب سے جو دوری ہو گئی ہے روحانیت سے، بس یہ جو ہم نے چیزوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے اندر جو روح ہے نا اس کا گلاڈ بادیا ہے۔

میرے ابا جی تھے، اور میرے دادا تھے۔ ان کی روح کا گلاڈ تو نہیں دبا تھا، اب یہ کیوں دب گیا ہے۔

اس وقت تر غیب کے چانسز، اور موقع کم تھے، کیونکہ میڈیا کا پھیلاو کم تھا۔ اس وقت تعلیم پانا ضروری تھا۔ میں جا کے لی وی دیکھتا ہوں، اور لی وی پر کسی اچھی چیز کے پراڈکٹ کا اشتہار دیکھتا ہوں، اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے، میں اس کو خریدوں۔

تو کیا لوگ سوچنے سمجھنے، غور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور کیا وہ سوچنے سمجھنے، اور غور کرنے پر اپنے آپ کو مامور کرتے ہیں؟ یہ آج کا سوال ہے۔

لوگ سوچ رہے ہیں دو طرح سے، ایک دائرے کے لوگ ہیں جو لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق سوچنے پر مائل کر رہے ہیں۔ ایک وہ دائرة ہے، جو ان کے تابع ہو چکا ہے، اور ان کا اسیر ہے، اور جس طرف وہ پہنچانا چاہتے ہیں، اس طرح سے لوگ سوچنے چلے آ رہے ہیں۔ اب اس میں مجھے ایسا لگتا ہے جیسا کرہلائزیشن، جیسا منظور صاحب بات کر رہے تھے کہ چیزوں کی فیضی نیشن اس

قدرا ہو چکی ہے۔ ان کے اندر کشش اس قدر ہے کہ وہ مقناطیس کی طرح ہمیں سمجھنے لیتی ہے، اور اس معاشرے میں جس میں ہم آج موجود ہیں، اور زندہ ہیں، اس میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہماری ہی کوتا ہیوں کے باعث بہت ساری Negative چیزیں اس قدر بڑھنی ہیں کہ اب ہم لوٹ نہیں سکتے۔ میں لوٹ کے پھر اس طرف آؤں گا، اور بار بار ایک سکول ٹیچر کی طرح رہوں گا کہ کیا ہم سوچنے سمجھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں یا نہیں آپ تو یہ Indicate کر رہے ہیں کہ ہم بالکل سوچنے سمجھنے نہیں ہیں، جیسی بنی بنائی چیزیں ہمیں دی جاتی ہیں، ان کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں
بات بالکل آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ ایک بندہ تو آپ کو بھاگاتا ہے، اب آپ، اور باقی نوے نانوے فیصد اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، تو وہ نہیں سوچتے ہیں، تو پھر وہ ایک فیصد والا بھی نہیں سوچتا ہے۔ کیونکہ وہ تو غرض مند آدمی ہے۔ وہ سوچ والا آدمی نہیں ہے۔ اس کو ایک چاہت ہے۔ غرض کا بندہ ہے۔ ڈاکٹر عاصم کا میں ذکر کر رہا تھا، سائیکا لو جست کا۔ وہ کہتا ہے کہ کچھ لوگ سوچنے سمجھنے کی آرزو نہیں رکھتے ہیں۔ بیشتر وقت شترنج کھیلنے میں، تاش کھیلنے میں گزارنا پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گاڑی لے کر گھومنا شروع کرتے ہیں۔ اتنی توے میں بلا مقصد گھوم جاتے ہیں، اور اسی بلا مقصدیت کے اندر انسان جو ہے، وہ اپنے آپ کو گم کرتا چلا جا رہا ہے، میں آپ کو یہ ایک لحر فکر یہ دے کے جارہا ہوں کہ اب آپ نے کل سے کیا کرنا ہے۔ کیا اپنی سوچ کو لے کر چلتا ہے، یا بنی بنائی سوچ کے انتظار میں صبح آنکھیں ملتے ہوئے انھ کے دروازے پر سے سوچ کو اٹھانا ہے، جیسی کہ آپ کو فید کر دی گئی ہے، اور اس کو اپنا حریز جاں بنایا ہے۔ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے، اور اللہ آپ کو بہت آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسان کو شرمندہ نہ کیا جائے

آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

کئی دفعہ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی قصور و انبیس ہوتا، مجرم نہیں ہوتا لیکن وہ مجرم، قصور و اگر جدا نہ جاتا ہے، پکڑا جاتا ہے۔ زندگی میں ایسی باتوں سے اگر ہم زیادہ شدید نہ ہوں، سنجیدہ نہ ہوں تو نہیں آتی ہے کہ اس میں میرا کوئی عمل دخل ہی نہیں تھا تو میں کیسے پکڑا گیا۔

ہم ڈیرے پر حاضر تھے تو پانچ پڑھے لکھے، اچھے، شریف، ذہین، دانش مند لوگ جو وہاں موجود تھے، وہ پکڑے گئے۔ باباجی نے ہماری پیشی کروادی حالانکہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا، اور ہم نے کوئی ایسی خرابی نہیں کی تھی۔ لوگی ہماری سرزنش شروع ہو گئی۔

اصل میں باباجی کسی بڑے جلے سے آئے تھے، اور زندگی بھروسہ کسی بڑے جلے میں نہیں گئے تھے، لیکن ان کا کوئی مرید ہمارے انہر اہال میں جو اس زمانے میں بڑا اہال متصور ہوتا تھا، لے گیا۔ وہاں پران کو ایک ایسے پکھر ارکا پکھر سننا پڑا جو بڑی اچھی درودمندی کی باتیں کر رہا تھا، اور پاکستان کو دل و جان سے چاہتا تھا، اور باباجی اس کی باتیں سن رہے تھے۔ لیکن جب سب لوگ سرد ہن رہے تھے، تو اکیلے شاید وہی تھے جو اس کے اوپر ویسی توجہ نہیں دے رہے تھے جیسی کہ دی جانی چاہیے تھی۔ اس شخص نے کہا۔ دیکھو! میرے پیارے ہم وطن پاکستان بن گیا۔ اللہ کی ہم پر بڑی مہربانی ہوئی ہے۔ یہ خاص عطا یہ خداوندی ہے اور ہم جتنا بھی اس کا شکر یہ ادا کریں، کم ہے۔ اگر یہ پاکستان نہ بنتا تو میں جو اس وقت آپ کے سامنے کھڑا ہوا، اس وقت ایک یونیورسٹی کا واکس چانسلر ہوں، میں یا تو ایک چیز اسی ہوتا یا معمولی ایک گلرک ہوتا، اور یہ پاکستان ہی کی وجہ سے ہے کہ ایسے اونچے مقام پر کھڑا ہوں۔ آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔ بڑی اچھی بات تھی۔ ہم اکثر یہی کہتے ہیں، آپ نے اکثر تباہوگا اب ہم کو انہوں نے بلا لیا، اور قطار میں کھڑا کر کے کہا، دیکھو! پیارے بچو! ایسی بات نہیں کرتے۔ ہم نے کہا اگر اللہ ہمیں موقع دے، ہم بھی ضرور ایسی ہی بات کریں گے۔ کچھ بہت اچھے اچھے رب تے پر ہیں، اور جارہے ہیں تو

ہمیں یہی کہنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ خبردار جس شخص نے یہاں رہ کر ذرا سی بھی تربیت حاصل کی ہے، میں اس کو یہ بات کہنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ سری یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے، اور اس کا تو اعلان عام ہونا چاہیے، اور ہم پاکستان کی سارے شعبوں کی بات کرتے ہیں، لیکن انہوں نے بڑی سختی سے منع کیا، اور پتا یہ چلا کہ یہ جو دو تین ہزار آدمی اس شخص کی بات سن رہے تھے، وہ شرمندہ ہو رہے تھے کہ یہ اس مقام پر پہنچ گیا پاکستان بننے کے بعد جبکہ ہم دیے ہی چھوٹے مقام پر ہیں۔ ان کے دل پر کیا بیٹھی؟ بابا جی کو دل کا بہت خیال تھا، اور آدمی کا بہت خیال تھا، ترقی کا، سامنہ کا، یا رہتے کا بالکل نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بات کہنا، اور اپنے ہم وطنوں کو اپنے قریبی عزیزوں کو شرمندہ کرنا جو ہے، بڑا ہی فتح فعل ہے، اور پھر وہاں پر رہنے کے بعد ایک اور بات کا اس میں اضافہ ہوا۔ ایک اور بات کا، وہ یہ کہ ہم کو بڑی سختی سے منع کیا گیا کہ چونکہ آپ ایک ایسے مقام پر رہتے ہیں جہاں روحانیت کی باتیں ہوتی ہیں۔ تو اگر تم میں سے کسی کو خوش نصیبی سے نبی کریم ﷺ کی زیارت ہو خواب میں، وہ ہرگز ہرگز کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہ کرے، یعنی اتنا بڑا رتبہ اتنی بڑی سعادت اور یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ہرگز یہ بات نہ کریں۔ چونکہ ہم بولتے نہیں تھے۔ تو ہم نے کہا، بہت بہتر لیکن یہ بات ہمارے دل میں رہی، اور تجسس پیدا ہوا۔ ایک دن گزر گیا دو دن گزر گئے۔ میں جو بہت بے چین تھا کہ اس بات کی وضاحت ہونی چاہیے اور تھوڑا سا میں منہ چڑھا بھی تھا۔ میں ان سے ڈرتے ڈرتے بہت سی عجیب و غریب سی باتیں بھی پوچھ لیتا تھا۔ میں نے کہا، حضور یہ بتائیے کہ اس دن یہ بات کی تھی کوئی ایک ہفتہ ہوا کہ اگر کسی خوش نصیب کو زیارت نصیب ہو حضور پاک ﷺ کی تو اس کا ذکر نہ کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ جو سننے والے ہوں گے۔ وہ بہت خفت محسوس کریں گے کہ دیکھو یہ آدمی بڑا خوش نصیب ہے۔ اس کو تو زیارت ہو گئی، ہم بڑے کم نصیب لوگ ہیں۔ ہم میں کوئی نہ کوئی خرابی موجود ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں اتنا بڑا یہ اعزاز، اور شرف حاصل نہیں ہوا۔ خبردار کسی کو شرمندہ کرنا تمہارا اشعار نہیں ہے۔ اگر تم آدمی کو شرمندہ کرو گے، تو تمہارا یہاں آنا مدد و دہو جائے گا، اور آپ کے Rights ریزرو ہو جائیں گے۔

خواتین و حضرات! ہم تو اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے اپنی ذات کو چوگا دیتے رہتے ہیں، اپنا میک اپ کرتے رہتے تھے۔ اور حکم ہے کہ خبردار دوسرے بھی لوگ تمہارے ساتھ رہتے ہیں، باقی کے بارہ کروڑ جتنے بھی آدمی ہیں، ان کو شرمندہ کرنا آپ کا منصب نہیں۔ آپ اس دنیا میں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ آپ لوگوں کو خفیف کریں، ان کو شرمندہ کریں۔ یا باعث نہیں ان کی نگفت کا، ان کی خجالت کا۔ تو اس ٹریننگ میں سے گزرتے ہوئے بڑے سال لگے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ ٹریننگ پوری نہ ہو سکی۔ چونکہ ڈیرے کے باہر جو عمل چل رہا تھا، وہ استکبار کا عمل تھا، تکبر کا عمل تھا، اور ہماری

ساری کی ساری قوم تکبر کی راہ پر گامزن تھی، اور تکبر کی وجہ سے ہر شخص اپنی ذات کا ہو کر رہ گیا تھا، اور مجھے رہ رہ کر ایک ہی خیال آتا تھا کہ کسی زمانے میں ایک نگین کا رثون دیکھا تھا سینما میں۔ کہ ایک کشتی ہے۔ وہ سمندر کی لمبی لمبی جاری ہے، اور اس میں آٹھ آدمی سوار ہیں۔ چار ادھر پیشے ہیں، اور چار اس کے آگے نوک کے اوپر، تاکہ کشتی کا وزن، اور توازن برابر رہے۔ اچانک جو آگے کا حصہ ہے، اس میں سوراخ ہو جاتا ہے اور تیزی سے پانی اس کے اندر داخل ہونے لگتا ہے اور کشتی بھرنے لگتی ہے۔ تو جو پیچھے پیشے ہوئے آدمی تھے، ان میں ایک انختا ہے ایک ذبائے کر، اور وہ چاہتا ہے کہ پانی نکال دے تو دوسرا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے خبردار! سوراخ ان کی طرف ہوا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے اس کام میں، وہ جانیں یا ان کا کام جانے۔ پیشے جاؤ آرام سے۔ وہ واقعی آرام سے بیٹھ جاتا ہے، تو کبھی کبھی اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے، وہ کارثون یاد آ جاتا ہے۔

اس پروگرام میں میں تو صورت حال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ ہماری زندگی میں یہ داخل نہیں ہوا تھا کہ دوسرے آدمیوں کو کبھی شرمندہ نہیں کرنا۔ ہم تو پڑھتے ہی اس لیے تھے، اور ڈگریاں اس لیے حاصل کرتے تھے کہ دوسرے آدمی کو شرمندہ کر سکیں۔ آپ کے ملک میں دیکھیے، اتنی اتنی بڑی خبریں چھپتی ہیں کہ ہمارا ملک اس وجہ سے ترقی نہیں کرتا کہ اس میں پچاس فیصد لوگ جاہل اور ان پڑھ ہیں۔ میں ان سے بڑی درخواست کرتا ہوں۔ میں نے دفتر وی میں بھی حاضر ہو کے کہا تھا، طریقے سے یہ خبر بتایا کریں۔ چونکہ جو آدمی کسی وجہ سے پڑھا نہیں ہے، اس کو کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ میرے ساتھ اس طرح کا ایک واقعہ بھی گزر چکا ہے۔ ڈھاہاں سنگھ ایک منڈی ہے۔ دانہ منڈی میں وہاں پر ڈریکٹر سے بوریاں اتار کے مزدور لوگ وہ منڈی میں پھیک رہے تھے۔ اور دانہ منڈی کے ایک آڑھتی کا غشی یہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ ہمارے ملک کی بڑی حالت ہے۔ اس میں 85% لوگ ان پڑھ ہیں جو کچھ نہیں کر سکتے، نہ ملک کا بنا سکتے ہیں، نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ جب تک ملک تعلیم یافت نہیں ہوگا، اس وقت تک اس کی حالت نہیں بدلتے گی۔ وہاب اونچی آواز میں پڑھ رہا تھا۔ میری آڑھتی کہ اگر یہ خبر اونچی نہ پڑھ تو کوئی حرج نہیں، اور وہ جو بے چارے مزدور، اور کسان بڑے خوب صورت، صحت مند بوریاں اٹھا کر نیچے لا رہے تھے، اور وہ گندم آرہی تھی پور میں، اور وہ گندم میرے گھر میں پہنچ رہی تھی، جس سے مجھے، اور میرے بچوں کو پلنا تھا، جو ہماری زندگی کا سہارا تھی۔ جوانہوں نے بڑی محنت سے بڑی محبت سے اگالی تھی اور جسے بڑی محنت، اور محبت سے مجھ تک پہنچا رہے تھے۔ ان کو یہ سنایا جا رہا تھا کہ دیکھو تم تو جاہل لوگ ہوتے ہو، اور جاہل جب تک رہیں گے، ہم ترقی نہیں کر سکیں گے۔ میں ضرور رچاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں علم کی شمع روشن ہو، اور اس کی روشنی دور دور تک پہنچے، لیکن جب تک یہ لوگ شرمندہ کرتے رہیں گے تو آپ کا ملک کمزور ہوتا رہے گا۔

ہر آدمی جاہل تو نہیں ہوتا نا، جاہل ہونا کچھ اور بات ہے۔ یہ ابھی تک معلوم ہی نہیں کہ پڑھنے لکھنے آدمی کی Definition کیا ہے، کس base پر کھا جا رہا ہے یا پھر اس کو جوا خبار پڑھ رہا ہے، اس کو پڑھا لکھا کہا گیا ہے، اور پھر یہ بات ہے کہ ہم ابھی تک یہ لکھنے کر سکے کہ پڑھنے لکھنے آدمی کی Definition کیا ہے۔

یو این اونے ساری دنیا کے لیے پڑھنے لکھنے کی Definition مقرر کر دی ہے جو شخص حرف شناس ہو۔ اب پت کو پہچان سکتا ہو، اور اپنا نام لکھ سکتا ہو۔ اس کو یو این اونے والے پڑھا لکھا آدمی متصور کرتے ہیں۔

پاکستان میں بھی یہی ہے کیا۔

وہ تو ہم U.N.O کے ساتھ چل رہے ہیں نا۔ دنیا کا وہ ادارہ ہے۔

ہر مردم شماری میں یہ بدل جاتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں پیرا گراف پڑھ سکتا ہو تو اس کو ہم پڑھا لکھا کہیں گے۔ کبھی کچھ اور ہوتا ہے، کوئی کرائیٹری یا نہیں ہے، ہمارے ہاں۔

دیکھیے ہمارا فورم ڈسکشن کا نہیں ہے، لیکن پڑھنے لکھنے کی تعریف انٹرنیشنل سٹھ پر مقرر ہو چکی ہے۔ میرے نزدیک کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بی اے ہے۔ آرمی کے نزدیک پڑھا لکھا آدمی کم سے کم ایم اے ہے۔ ڈاکٹر کے نزدیک کم سے کم پڑھا لکھا Ph.D ہے، اس طرح یہ تو کام آگے چلتا ہے۔

مشکل یہ پڑھی ہے کہ جو پڑھا لکھا آدمی ہوتا ہے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی صلاحیت دی ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچتا نہیں ہے۔ ایک شیخ پر کھڑا ہو کے کہے گا دیکھو پاکستان بن جانے سے میرا رتبہ کتنا بڑھا ہے۔ میں اپنے رتبے کی بات کرتا رہوں گا۔ میرے ذہن میں، لاشعور میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے سننے والے جو کسی بھی رتبے تک نہیں پہنچ سکے، لیکن وہ کثری بیوٹ کر رہے ہیں کسی نہ کسی طرح سے ملک کی اکانومی میں۔

فرض کریں وہ کثری بیوٹ نہیں کر رہے، لیکن وہ انسان ہیں، اور ان کا استحقاق ہے زندہ رہنے کا۔ میری پیاری بی بی اس کائنات میں جب دوسرا شخص پیدا ہوا تھا۔ پہلے کے حقوق آدھے رہ گئے تو دوسرا شخص کون تھا، کیسا تھا۔ کثری بیوٹ کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا لیکن یہ رہ گیا۔ میں جو اس ملک میں رہتا ہوں۔ میرے حقوق 1/14 کروڑ ہیں، میں یہ کہوں کہ میں چونکہ یہاں بیٹھا ہوا بات کر رہا ہوں اور آپ میری شکل دیکھ رہے ہیں، میں تعلیم یافتہ ہوں۔ حقوق کے معاملے میں ہم برابر ہیں۔ یہ مساوات ہم کو خاص طور پر دی گئی ہے۔ آپ لوگ اکثر پوچھتے ہیں اور اس بات پر غم کا اظہار کرتے ہیں، اور یہ جائز طور پر آپ کے دل کا غم بنا ہوا ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق کیوں نہیں ہے؟ بہت سوچتے ہیں ہم۔ ہمارے ہاں ہی نہیں ساری ملتِ اسلامیہ میں ساری امت میں عالمِ اسلام میں اتفاق کیوں نہیں ہے۔ یہ واقعی دکھ ہے

ہمارا، اور بڑی دردمندی کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں، لیکن موٹی سی بات یہ ہے کہ اس وقت تک ناقابل قائم رہے گی جب تک دوسروں کے حقوق کسی جگہ تلف ہو رہے ہوں گے۔ جو نبی آپ ناقابل کو محسوس کریں آپ فوراً اندازہ لگائیں۔ آپ کے پاس ایک تھر ما میٹر ہے کہ دوسرے آدمیوں کے حقوق جو ہیں، وہ تلف کیے جا رہے ہیں، ضائع کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے ناقابل ہے، اور جو معاشرے جو علاقے، اور جو ملک بڑے اتفاق سے رہتے ہیں، اور انصاف پسندی سے رہتے ہیں، ان کے اندر حقوق انسانی تلف نہیں ہوتے ہیں۔ آدمی پڑھا لکھا ہو، مونا ہو، باریک ہو، کالا ہو، پیلا ہو، اس کا حق ہے۔ ملک کے رشتے سے اس کو حق پورے کا پورا ملتا ہے، تو ہم سے یہ کوتاہی ہوتی ہے۔ ہمارے سارے بابے یہ بات کہتے ہیں، اور وہ تکلیف وہ بات ہے۔ اس پر چنانہم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بڑی مشکل بات ہے۔ وہ یہ ہے کسی محفلی میں، کسی مجلس میں، کسی گفتگو میں اگر آپ کے پاس بات کرتے ہوئے بہت اعلیٰ درجے کی دلیل آجائے۔ ذہن میں بہت اچھی Argument آجائے تو وہ دوسرے بندے کو جو آپ کا مخالف ہے، وہ گھائل کر دے جو آپ دلیل دیں یا زائل کر دے یا اس کو ملیا میٹ کر دے تو ہمارے بابے کہتے ہیں اسی دلیل روک لوبندہ بچالو۔

سامعین! بات تو بندے کی ہے، اور آپ ہمیشہ سے یہی بات کرتے رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں تو ہین آدمیت ختم ہونی چاہیے، اور ہر آدمی کی عزت نفس جو ہے، وہ بحال کی جائے۔ آپ نے کبھی محسوس کیا کہ یہاں سے بھاگنے والے لوگ یا کسی، اور ملک میں سیسل ہونے والے لوگ اس ملک کو پسند کرتے ہیں، جس ملک کے رہنے والے سارے کے سارے تو انہوں۔ ایسے ملک میں کبھی Migrate نہیں کرنا چاہتے، جہاں دو تین چار حکمران ہوں۔ باقی کے سارے بیچارے مینڈک ہوں کمزور اور ناتواں۔ ہمارے ملک میں بھی یہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کچھ لوگ تو ان طاقت والے ہوں، اور باقی کے چودہ کروڑ بے چارے ”ڈُو“ ہوں۔ ”ڈُو“ سمجھتے ہیں آپ؟ مینڈک۔ جس کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ تو اتنے مینڈوں کے درمیان رہنا آپ کو تقویت عطا نہیں کر سکتا۔ خواہ ذاتی طور پر آپ کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں اٹلی میں تھا، تو مجھے ٹینس کا کھیل دیکھنے کا بہت چسکا پڑ گیا تھا، اور مجھے ٹینس کا کھیل بہت اچھا لگتا تھا۔ یہاں کبھی اتنی شدودہ سے نہیں کھیلا جاتا تھا، ہمارے ملک میں۔ وہاں جتنے بھی میچ ہوتے تھے، میں بڑے شوق سے دیکھتا تھا تو ایک بڑی اعلیٰ درجے کی ٹینس پلیسٹر تھی، اس کی ولڈ چمپین تو نہ ہو سکی، لیکن اٹلی کی تھی، اور اس کا نام تھا Nena الوبتی۔ اس کی Opponent Santena تھی سنگینا۔ سنگینا ذرا بڑی عمر کی تھی، اور Nena نوجوان تھی، چھوٹی تھی، لیکن Nena کا جسم مضبوط تھا، ایک دن ان کا نیچ ہوا۔ سب کو سو فیصد یہ یقین تھا کہ Nena جیتے گی، کیونکہ ایک تو اس میں صلاحیت بڑی تھی دوسرے وہ نوجوان تھی اور ایک جسمانی ساخت بڑی

مضبوط تھی۔ تو پنج کھلیتے رہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ Santena جیت گئی۔ اس نے خوشی سے زور کا اندرہ لگایا، کیونکہ ہمیں بھی توقع نہ تھی، اور جب وہ Neto کے پاس جاتے ہیں، اور جا کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں، تو جب ہاتھ ملانے لگی تو جو Nena تھی، وہ شدت جذبات کے ساتھ رونے لگی۔ شکست بڑی ظالم چیز ہوتی ہے اور Santena نے بجائے اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کے اپناریکث زور سے پھینکا، اور وہ Neto جو بڑا Tight لگا ہوتا ہے، چھلانگ لگا کر اس کے اوپر سے گزرنی، اور جا کے ہاری ہوئی نینا کو گلے لگالیا، اور اس کا سرمنہ چومنے لگی۔ جخشی تیزی سے وہ رورہی تھی، اس سے زیادہ شدت سے جیتنے والی رورہی تھی۔ اور Santena نے اپنی جسمانی کامیابی کو ایک روحانی کامیابی میں تبدیل کر دیا، اور پھر اس نے اعلان کیا، میں کبھی بھی پھرا یے مقابلے میں نہیں اتروں گی جہاں کسی دوسرے کو رونا پڑ جائے گا۔ پھر وہ بڑی سہیلیاں بن گئیں، اور اخباروں میں تصویریں چھپتی رہیں، جیسے ایکسرسوں کی چھپتی ہیں۔

سامعین! یہ جذبہ تو ان لوگوں میں بھی ہے، خواہ وہ اٹلی کے بھی ہوں، کہ وہ کسی کو روتنے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ جہاں شکست خور دگی کے عالم میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارا پروپیگنڈا ہے کہ یورپ والے تو بالکل جذبوں سے خالی ہیں۔

لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں، سارے کاسارا ہمارا ملک، ہمارا علاقہ، یا لوگ ایسے نہیں ہیں۔ میں اس زمانے کو یاد کرتا ہوں۔ جب میں تحریک کر گیا صحرائیں۔ ایک ضرورت تھی، ایک ایسی تلاش تھی۔ میرے ساتھ میرے دوست متاز مفتی بھی تھے تو ہم گاؤں ہے چھوٹا جد و وہاں رہے۔ وہاں لوگوں نے ہماری بڑی خاطر مدارت کی، اللہ ان کو خوش رکھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں ہماری مالی بھاگی رہتی تھی، بہت اعلیٰ درجے کی گانے والی۔ نئی نئی اس نے بھیں خریدی تھی، اور اس کو نہلاتی تھی۔ ہم کو بڑا دودھ پلایا۔ یہ ہمارے بھائی آئے ہیں پنجاب سے۔ تو ہم ان کے مہمان تھے۔ گرمی بڑھ رہی تھی، اور جس چیز کی ہمیں تلاش تھی، وہ ابھی ہم سے دور تھی۔ ایک چورا لے کر ہم کو دے دیا۔ چورا جھوٹ پڑا کی کہتے ہیں۔ اس میں ہم رہتے تھے تو وہاں پر ایک لڑکا تھا کوں نسل کا۔ آپ سمجھتے ہیں ”کول دراوز“۔ کول قوم ہے، جو تحریک میں بہت رہتی ہے۔ کولین گوٹھ میں رہتے ہیں۔ گوٹھ گاؤں کو کہتے ہیں۔ آپ کے ملک میں رہ رہے ہیں۔ کبھی باہر نکلیں، اپنے ملک کو دیکھیں۔ کمال کمال کی چیزیں ہیں۔ تو وہ ایک لڑکا آیا کرتا تھا۔ گاچوں کا نام تھا۔ ایک اس کی بہن تھی چھوٹی سی۔ اور وہ گاچوں تھا، سر کے اوپر تو کرار کھ کے چھائیں بیچتا تھا۔ جنگل چھائیں۔ چھائیں تربوز کو کہتے ہیں۔ صبح بیچارہ لے کر آتا تھا۔ دونوں بیتیم تھے۔ جب دھوپ بڑھتی تھی، جب دس بجے کے قریب، تو سر کے اوپر ٹوکرا لے کر آتا تھا۔ میں اس سے چھائیں، جنگل چھائیں ایک دو پھیکے تربوز خرید لیتا تھا۔ تو وہ بچہ جب چل کے آتا تھا دھوپ میں تو اس کا جو سایہ پڑتا تھا پچھے تو وہ بھولی

یہ اس کی بہن وہ پچھے پچھے چلتی تھی اور وہ آگے ہوتا تھا۔ میں کہتا تھا گاچو تو اپنی بہن کو آگے کیوں نہیں چلاتا۔ تو کہنے لگا، سامیں ہم تقیم ہیں، ہم جھوپڑے میں رہتے ہیں تو گرمی بہت ہو جاتی ہے۔ میں جھوٹا بچھہ ہوں۔ میرا سایہ بڑا المباہ ہے۔ میں چاہتا ہوں میری بہن کو گرمی نہ لگے۔ وہ میرے سائے میں چلتی ہے۔ یہ پاکستان کے دریے کی بات ہے تو وہ گرمی اس کو نہیں لگتی دینا چاہتا تھا، تو یہ گاچو تھا۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں آپ کے ملک میں جو تکرے دور ہیں، اور دوسروں کے لیے بھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شگریہ۔ مہربانی۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

اندر اور باہر کی شخصیت کی میچنگ

اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

آج میں پھر آپ کو تھوڑی دیر کے لیے اٹلی لے جانا چاہتا ہوں۔ ابھی بیٹھے بیٹھے یاد آیا ہے یہ واقعہ۔ سمجھی پوچھر رہے تھے کہ آج کون سے موضوع پر بات کریں گے۔ کون سا موضوع ساتھ لے کر آئے ہیں، تو خواتین و حضرات کوئی خاص موضوع میرے سوچنے میں، میرے اشਾک میں ہوتا نہیں ہے۔ باتوں میں اگر کوئی چیز نکل آئی تو پھر اس پر آہستہ آہستہ عمارت کی تعمیر ہوتی رہتی ہے۔

میں روم میں اپنی یونیورسٹی سے واپس آ رہا تھا گھر کی طرف۔ تو جب سینٹ پیٹر کے بڑے میدان سے گزر اتوہاں پر ایک سکھ سردار نواری رنگ کی گپڑی باندھے بیٹھا تھا۔ وہ بڑے غور کے ساتھ سینٹ کی بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا، اور جو بڑے بڑے ستون تھے ان کو گن زہا تھا۔ میں نے کہا، سردار جی سرت سری اکال۔ و اگر وکی خالصہ، و اگر وکی فتح وہ بے چارہ کانپ گیا گھبرا گیا۔ ایک دم کہنے لگا، جی مینوں جانتے ہو؟ میں نے کہا، میں پاکستانی ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا، لو جی میری بڑی مشکل حل ہو گئی۔ میں دودن سے یہاں گھوم رہا ہوں میری بولی کوئی نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا، تم ان کی بولی نہیں سمجھتے۔ کہنے لگا نہیں۔ عجیب ملک ہے، یہاں انگریزی کوئی نہیں سمجھتا۔ میں نے کہا، نہیں یہاں انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ تو میں نے آپ کو چائے پلا کیں۔ میں اسے ایک قریبی ریسٹوران میں لے گیا، تو جب میں چائے کا آرڈر دینے لگا تو اس سے پوچھا، کافی پیو گے یا چائے۔ کہنے لگا، نہیں جی دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔ کچھ گرمی سی لگ رہی ہے۔ آنس کریم ہوں چاہیے۔ میں دو دن سے آنس کریم کی تلاش میں ہوں، لیکن مجھے پتا ہی نہیں آنس کریم کو کیا کہتے ہیں۔ میں انگلی ضرور لگاتا تھا کہ یہ دو، مجھے اور کچھ ہی چیز نکال کے دے دیتے تھے تو مجھے ایک لفظ وہ بتا دیں کہ آنس کریم کو کہتے کیا ہیں؟ میں نے کہا آنس کریم کو جلا تو کہتے ہیں۔ کہنے لگا، لو جی پہنان رکھ دتا ہے۔ ایہ جلان

والی چیز ہے یا تھنڈ پان والی چیز اے۔ میں نے کہا، بس رکھا تو یہی ہے۔ اس کا نام ہی یہ ہے۔ تو ہم بیٹھ کے باتیں کرتے رہے۔ میں نے کہا، سردار صاحب بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو دیکھ کر مجھے ایک طرح کی بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنا جو وجود ہے جو آپ کو احکام دیئے گئے ہیں، اس کو آپ پورا میں نہیں کرتے ہیں۔ کیس رکھتے ہیں۔ ڈاڑھی آپ کی ہے، کڑا آپ کا ہے، پگڑی اتنی خوب صورت پہنچتے ہیں۔ تو اس نے کہا، ہاں جی یہ ہونا چاہیے۔ یہ انسان کو شناخت کرنے میں بڑی مدد ویتی ہے۔ کچھ شخص کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا، لیکن پورا حادی نہیں تھا اس کے اوپر۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ تو میں نے کہا، سردار صاحب جی آدمی کا دل صاف پاک ہونا چاہیے۔ نیت تھیک ہوئی چاہیے۔ کہنے لگا، نہیں جی دل پاک صاف نیت اچھی ہو، اس کا پتا نہیں چلتا۔ جب تک اس کا ظاہر جو ہے وہ اس بات کی شہادت نہ دے۔ آپ کے دل میں کیا ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے کہا، باہر کا وجود جو ہے اس کے بارے میں جو آپ نے فلسفہ سازی کی، اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ۔ اس نے کہا، دونوں کا تال میں ہونا بہت ضروری ہے۔

چنانچہ اس نے بڑی عجیب بات کی جو بڑے سالوں کے بعد مجھے یاد آئی۔ اس نے کہا، آدمی جو ہے، وہ اپنی وردی سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر شخص کی ایک وردی ہوتی ہے، اور وہ وردی طے کرتی ہے کہ وہ کسی قسم کا آدمی ہے۔ تھانیدار کو دیکھ کر اسے بولنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ طلباء کو معلوم نہیں کرنا پڑتا۔ تھانیدار کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ تھانیدار ہے۔ میجر کی وردی کو پہچان لیتا ہے، اور یہ باتیں کرتے رہے۔ وہ تو چلا گیا لیکن میرے لیے سوچ کا ایک سامان چھوڑ گیا۔ ایک شخص کا جو *Indicator*، باہر کا اشارہ ہے، وہ آدمی کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے۔ تو میں یہ سوچنے لگا کہ اگر ایک لڑکی ہو، بڑی شوخ و شنگ۔ اس نے جیز پہنی ہوئی ہو، اور شرشر کر کے چل رہی ہو، اور سر جنم کو وہ اوزار بھی کانوں کو اس نے لگایا ہو، کیست پلیس کا ہیڈ فون، اور شرشر کر کے چل رہی ہو، اور سر جنم کو وہ اوزار بھی دے رہی ہو لیکن وردی اس نے نہ پہنی ہوا اور وہ کہنے میں نہیں ہوں، کام بھی وہی کر رہی، تو اس کو سر جنم صاحب کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے۔ اگر وردی نہیں ہے اس کے بغیر تو ہم نہیں مانتے کہ یہ کام ہو رہا ہے، ہم اس کا شخص چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں، ہم شناخت کریں، فوراً پتا چل جائے یہ کون ہے؟ مثلاً دیکھیے ایک بہت خوب صورت اعلیٰ درجے کا نوجوان ہے، اور پڑھا لکھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اس نے ایک سلک کی بنیان پہنی ہے، اور چھوٹی سی چڑی پہنی ہوئی ہے، اور پاؤں میں قینچی چپل پہنی ہوئی ہے اور وہ جبو جیٹ چلانے کے لیے کاک پٹ میں آنے کی کوششیں کرتا ہے۔ آپ اسے روکیں گے۔ وہ کہے گا میں پائلٹ ہوں، قینچی چپل والا، تو کہے گا جی میرا لائنس دیکھیں، اور لائنس بچ بچ ہو۔ اور وہ کہے، میں ہزار گھنٹے فلاںگ کر چکا ہوں اور اس وقت دنیا کی وزنی تین مشین کو ہوا میں لے جا

رہا ہوں۔ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں، اور اپنے کاغذات پورے دکھائے تو اس کو ہوائی جہاز میں بیٹھنے نہیں دیا جائے گا اور کاک پٹ میں آپریٹ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ اس کی ورودی نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی میں عجیب سی بات ہے جو انسان کے عمل کے اندر حائل ہوتی ہے۔ نیت اس کی اچھی ہے۔ نیت نیک ہے، وہ جانتا بھی ہے، لیکن چونکہ طے شدہ پیشہ کے اندر چوکھے کے اندر نہیں ہے، اس لیے ہم اسے قبول نہیں کرتے۔

مثلاً ابھی میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ چوک ہے، چورا ہے یہ، لا ہور، کراچی کے بہت پیچیدہ، اور کلیف ٹرینک والے، اور مشکل چورا ہے پر ایک نوجوان موچھوں والا کھڑا ہو۔ اس نے بدن کو تیل ملا ہوا ہو، اور لگوتا باندھا ہوا ہو، اور ہاتھ میں اس کے ایک بانس پکڑا ہوا ہو، اور جھکاٹھک مار کے ٹرینک کنشول کر رہا ہو، کبھی کسی کے سر پر کبھی گاڑی پر مار دیا، اور کبھی سکوٹر پر، اور وہ کنشول کر رہا ہو تو سار جنت آ کر پریشان ہو کے پوچھے گا تو کون ہے؟ وہ کہے گا جناب میں محمد صدیق ٹرینک کا نشیبل۔ 32721262 اپنا نمبر بھی بتائے گا، تو وہ کہے گا تو کیا کر رہا ہے۔ وہ کہے گا، سر میں ٹرینک کنشول کر رہا ہوں تو وہ کہے گا تیری وردی کہاں ہے۔ وردی کی کیا ضرورت سر دیکھیے میں کتنے اعلیٰ درجے کا ٹرینک کنشول رہوں۔ ہاتھ میں بانس ہے، تیل ملا ہوا ہے، اور ساروں کے سر پر مار رہا ہوں۔ لگوٹی میں نہ پہنی ہوئی ہے لیکن ٹرینک کنشول کر رہا ہوں۔ وردی کی کیا ضرورت ہے۔ تو کان سے پکڑ کر نہ صرف لائن حاضر کر دیا جائے گا، بلکہ میرا خیال ہے معلم بھی ہو جائے گا۔ تو خالی یہ کہہ کر گزر جانا کہ میرا دل بڑا نیک ہے، میری نیت بہت اچھی ہے۔ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ اس سے بھی اجتماعی زندگی میں شکوک و شبہات پیدا ہونا لازمی ہیں۔ جس طرح کہ باہر کی شکل و صورت دیکھ کر آدمی کو یقین نہیں آتا کہ یہ آدمی اندر سے ایسا ہوگا۔ لیکن جب آپ نے اجتماعی طور پر ایک وردی طے کر دی ہے تو پھر وردی والے کو بھی اس بات کی حیا ہوتی ہے کہ جو اس کے لیے طے کیا گیا ہے، اس پر قائم رہے، اور جو مجھ سے توقع کی جاتی ہے، وہ توقع پوری کروں تو جب یہ بات مجھے وہاں معلوم ہوتی تو میں غور کرتا رہا، اور پھر آج تک سوچتا ہوں، مجھے بعد میں نفیات دانوں نے یہ بتایا بھی کہ انسان کا باہر کا شخص اس کی اندر کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس فلسفے کے تحت ہم نے انسان کی اندر کی بیماری دور کرنے کے لیے بہت سی ایسی چیزیں اختراع کی ہیں، جو باہر سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ ریڈی ایشن کا عمل ہے، کچھ نہیں ہوتا۔ نہ بندے کو دوائی پلاتے ہیں، نہ کھلاتے ہیں۔ باہر سے ریڈی ایشن کر کے اندر کی بیماری جو ہے، دور کی جاتی ہے۔ تو اندر کا باہر کا بڑا قریبی رابطہ، اور ایک رشتہ ہے، اور اس رشتے کو آپ جھی اپنا سکتے ہیں جب کہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوں، اور اس پڑی پر دونوں اسی استقامت کے ساتھ قائم ہوں۔ جس طرح ان کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی سلطنت کا

کوئی بادشاہ بہت اچھا، نیک بادشاہ، صلح کل لیکن طبیعت میں بڑا اُسپاہ تھا، اور اس کو اپنے ملک کی صحت و صفائی کا بڑا خیال تھا۔ مجھے صفائی کی بات کرتے ہوئے یاد آیا کہ اپنی رعایا کی صحت برقرار رکھنے کے لیے، چونکہ وہ صفائی کا بڑا دیوانہ تھا، اس لیے اپنی مملکت میں بھی اس نے خاص صفائی کا انتظام کر کھا تھا، اور ظاہر ہے گھر کا بھی محل کے اندر بھی صفائی کا انتظام بطور خاص دیکھا جاتا تھا۔ قریب ہی اس کے ایک چھوٹی سی کالوں تھی۔ بہت اچھے لوگوں پر مشتمل۔ صفائی کا وہ بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ تو ایک اماں بوڑھی جو کہ صفائی کے معاملے میں بادشاہ کی ملکہ کی، اور شہزادی کی بڑی قابل اعتبار بھنگن تھی، اس کا بڑا مقام تھا۔ وہ آئے محل کے اندر زنان خانے میں صفائی کرتی تھی اور ان کی مرضی کے مطابق کام کرتی تھی، اور اس کا احترام تھا۔ بڑے آدمی کا احترام ہوتا ہے۔ اچھا کام کرنے والے کا احترام ہوتا ہے۔ کام چاہے کوئی بھی ہو۔

تو کہانی بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اماں بڑی بیمار پڑ گئی، اور شاہی خاندان کا کام کیا جانا ضروری تھا، تو اس نے اپنے نوجوان بیٹے سے جو بڑا سیم شجاع بڑا خوب صورت اچھا نوجوان تھا، اس سے کہا، بیٹا میں نہیں جاسکتی محل میں تو جا کر میری جگہ پر کام کر۔ چنانچہ وہ اپنا جہاڑو لے کر، تاکی لے کر جس طرح کا سامان اسے چاہیے تھا، وہاں چلا گیا۔ اس نے جا کر برآمدے میں جہاڑو تاکی لگائی، پھر دوسرے کمرے میں لگائی۔ وہ جب تیرے کمرے میں جہاڑو لگا کر باہر نکل رہا تھا تو شہزادی غسل خانے سے نہا کر کھلے پال آ رہی تھی اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ شہزادی کو دیکھا تھا۔ وہ شہزادی جس کا ذکر کہانیوں میں ہوتا ہے اور بے چارہ کھڑے کا کھڑا بست بنا رہ گیا، اور شہزادی اپنا منہ پیٹ کے وہاں سے بھاگی۔ دوسرے کمرے میں چل گئی۔ جب وہ گھر آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا، پیاری ماں یہ کیا مخلوق ہے۔ تو اس نے کہا، بیٹے کیا ہوا؟ اس نے کہا، ماں وہاں تو ایک لڑکی نکلی، لیکن جیسے آسمانوں سے اتری ہوئی لگتی تھی۔ کبھی ہم نے بازار میں، شہر میں تو ایسی مخلوق دیکھی نہیں۔ اس نے کہا، اودہ تیرا بھلا ہو جائے تو نے شہزادی کو دیکھ لیا۔ کہنے لگا، ماں میں اسے دیکھ تو آیا ہوں، لیکن میری آرزو ہے، میں اسے ایک بار پھر دیکھوں، اور قریب سے دیکھوں۔ اس نے کہا بیٹا اس بات کی کافیوں کافی خبر نہیں ہوئی چاہیے، کیونکہ ابھی جلا د بلا کر ہم ماں بیٹے کا سرتن سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس نے کہا، ماں میری زندگی کی آرزو ہے کہ اس حسنِ جسم کو قریب سے دیکھوں۔ میں بالکل بھونچ کا ہو گیا تھا۔ بوکھلا گیا تھا۔ میرے ذہن پر اس کے نقشِ تھیک طرح سے نہیں آئے۔ اس نے کہا، بھی ایسا نہ کر یہ نہیں ہو سکتا۔ تو وہ بیمار پڑ گیا، جان کے لالے پڑ گئے۔ اب ماں ہی ہوتی ہے تو اس نے حوصلہ کیا، سیدھی شہزادی کے پاس گئی۔ چونکہ شہزادی اس کا احترام کرتی تھی، سارے گھروالے کرتے تھے۔ اس نے کہا، بیٹی یہ بات ہو گئی ہے، اگرچہ بڑی ناقابل بیان تھی، میں نے بیان کر دی۔ ناقابل برداشت تھی، وہ تو

نے ہرداشت کر لی۔ مہربانی ہے، مشکل آپڑی تو اس کا حل نکال۔ اس نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اماں آمنا سامنا ہو گیا غلطی سے۔ اس نے کہا، مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ تجھے دوبارہ دیکھنا چاہتا ہے۔ تو پے نعوذ بالله، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہمارے ہاں ہوتا ہی نہیں۔ لیکن میرا اکلوتائیٹا ہے، مر جائے گا۔ شہزادی نے کہا، میں کیا کر سکتی ہوں۔ مرتا ہے تو تھیک ہے۔ اللہ کی یہی رضا ہے۔ وہ بڑھیارو نے لگی، چلی گئی۔ گھر بیٹھی بیمار بیٹھے کو دیکھا۔ جاں پہ لب بیٹھے کو۔ ماں تھی صبر نہ ہوا پھر لوٹ کر آئی اور فتنیں کرنے لگی۔ شہزادی نے ترس کھا کر کہا، اماں تو ایسا کراس کو ایک جھونٹا پیر بنادے۔ کوئی بزرگ بنادے۔ اس کو کہو، اللہ کی عبادت کیا کرے حق ہو کا نعرہ مارا کرے اور جنگل بیابانوں کی سیر کرے۔ میرے والد جو ہیں وہ پیروں، فقیروں کو بڑا مانتے ہیں۔ بزرگوں پر باادشاہ سلامت کا اعتقاد تھا، تو میں سمجھتی ہوں کہ ایک وقت ایسا ضرور آ سکتا ہے کہ اگر اس کا نام بہت دور دور تک پہنچ گیا کہ بڑا کمال کا فقیر ہے تو شاید میرے والد اس سے متاثر ہوں، اور متاثر ہونے کے بعد مجھ کو بھی کہیں، بیٹی جا ان کی زیارت کر آ۔ اس نے کہا، اللہ تیرا بھلا کرے۔ وہ گھر آ گئی۔ اس نے کہا، بیٹا انھے یہ لمبا پینڈا ہے، لیکن طے کرنا ہے اس مسافت کو۔ تو نہا دھوپ پڑی باندھ کے نیک بن جا۔ اللہ کا پیارا۔ اس نے کہا، اللہ کا پیارا کیسے بن جاتا ہے۔ اس نے کہا یہ تو مجھے بھی نہیں پتا، تجھے بھی نہیں پتا۔ اب جنگل میں جا کے بیٹھے کے اللہ سے کہہ، میں تیرا پیارا ہوں، اور وہ تجھ کو قبول کر لے گا۔ وہ چلا گیا جنگل میں جا کے بیٹھے گیا مزے سے، اور وہاں پر جا کر وقت گزارنے لگا، اور اللہ کی تسبیح جیسی بھی اس کو آتی تھی، اور آرزو دل میں رکھنے لگا کہ بھی شاید اللہ کی زیارت ہو، اور میں بھی اس راہ پر چل سکوں۔ اس راہ پر چل کر اس حسن آ را کو بھی دیکھوں جس کی آرزو لے کر میں نے یہ سارا ڈراما رچایا ہے۔ کچھ عرصے وہاں پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے اسے دیکھا، ایک نوجوان ہے، شکل صورت بھی اچھی ہے۔ بات کسی سے نہیں کرتا۔ آنکھیں بند کر کے، لوگا کے بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے جب اس کو دن رات وہاں اسے بیٹھے دیکھا۔ سردی میں، گرمی میں، دھوپ میں، بارش میں تو انہوں نے جھوپ پڑی ایک بنوادی اور وہ اس جھوپ پڑی میں رہنے لگا۔

وقت گزارتا رہا تو آہستہ آہستہ اس کے نام کا ڈنکا بننے لگا کہ ایک بہت کرنی والا بزرگ ہے، اور پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اور لوگ اس کی زیارت کو آنے لگے۔ ایک سلسلہ چل پڑا۔ کسی نے آ کے باادشاہ سے بھی ذکر کیا کہ آپ کی راجدھانی کے فلاں علاقے میں فلاں پر گئے میں بڑا بزرگ آیا ہوا ہے۔ لمبی ڈاڑھی ہے۔ لمبے بال ہیں، اور بڑا حسین آدمی ہے، اور بات نہیں کرتا کسی سے۔ تو باادشاہ کو اشتیاق ہوا۔ انہوں نے سواری نکالی، چیخ ہزاری دس ہزاری امیر وزیر اس کے ساتھ چلے کہ، زیارت کرنے چلتے ہیں۔ جنگل میں پہنچے، کثیا کے پاس کھڑے ہو گئے۔ باادشاہ نے دیکھا، اس کو سلام کیا۔ آنکھیں بند کر کے بیٹھا تھا، اس کو کیا پرواتھی۔ اس نے کہا، میں وقت کا باادشاہ ہوں۔ تجھے سلام کرنے

آیا ہوں۔ اس نے کہا بابا تیری مہربانی، ہم نے تیرا سلام قبول کیا، اب چلا جا۔ اس نے کہا، نہیں میں یہاں بیٹھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کہنے لگا، کھلی جگہ پڑی ہے بیٹھ جا۔ بادشاہ نے کہا، ساتھ میرا سارا لاوہ لشکر بھی ہے۔ اس نے کہا وہ بھی بیٹھ جائے، فقیروں کا خواصا نا ہے۔ چنانچہ وہاں پر بادشاہ پکجھ دری بیٹھا رہا۔ اس نے اندر سے محسوس کیا اس کا vibration جو ہے، ارتعاش اس کا روحاںی، بہت طاقتور ہے، جس نے بادشاہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ خواتین و حضرات! وہ بادشاہ وہاں پر آنے جانے لگا، ملنے ملنا نہ لگا۔ اس کی رعایا کے لوگ بھی ظاہر ہے، وہ بھی آنے لگے۔ اس کی ڈاڑھی بڑھ چکی تھی۔ بال لمبے تھے۔ کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ بادشاہ نے ایک دن اپنی بیٹی سے کہا کہ پیاری بیٹی ایک بہت بڑے بزرگ ہماری سلطنت میں آئے ہیں، اور ہماری خوش قسمتی ہے، ہمارے قلم رو میں اتنا بڑا بزرگ آیا ہے، تو کسی دن جا اس کی زیارت کرنے۔ تو اس نے کہا، بالکل ٹھیک ہے ابا جی میں جاتی ہوں۔

اس کو تو پتا تھا کہ یہ کون ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سہیلوں کے ساتھ پالکی میں بیٹھ کر پہنچی اور جا کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی، دیکھ تیرے دل کی آرزو پوری ہو گئی میں نے جو بات بتائی تھی، اس کے مطابق اتنے سالوں بعد تیرے سامنے آگئی ہوں؛ تو اب آنکھیں کھول اور جس طرح سے چاہتا ہے میری زیارت کر، دید کر، میں تیرے سامنے کھڑی ہوں۔ وہ کہنے لگا، اچھا اچھا مہربانی، مہربانی، تین دفعہ کہا۔ دیے ہی بیٹھا رہا آنکھیں بند کر کے۔ اس نے کہا، بد بخت میں اتنا مبارک طریقہ کر کے آئی ہوں اور تو آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہے۔ تو اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو لکھنے والے لکھتے ہیں کہ شہزادی نے کھنچ کے ایک تھپڑا اس کے منہ پر مارا تراخ سے۔ کہنے لگی، آنکھیں کھول۔ جس کے لیے اتنا بڑا اور اما رچایا تھا، وہ گوہر مقصود تیرے سامنے موجود ہے۔ تو اس نے کہا۔ بی بی اب آنکھیں بند ہی رہنے دو۔ وہ سچا ہے جس کو لوگ تلاش کرتے ہیں۔ وہ مل جائے گا کبھی نہ کبھی آنکھیں بند کرنے سے۔ اب تجھے میں کیا رکھا ہے۔ اس نے کہا، سن بی بی، سچا تو کوئی ایسے ہی ہوتا ہے، لیکن اگر جھوٹ کی دھارنا دھار کر بھی آدمی چلے، اور اس کے سامنے اس کا سفر موجود ہو، اور اس کا رخ جو ہے ٹھیک ہو، تو وہ سچائی کی طرف جانے لگتا ہے، لیکن اگر بد قسمتی سے شروع ہی سے اس کے سفر میں ٹیز ہ پڑ جائے، جیسے ہمارے معاشرے میں بڑی تکلیف وہ صورت حال پیدا ہونے لگی ہے تو پھر وہ بھی اس منزل تک نہیں پہنچتا جس کی آرزو اس نے جھوٹے انداز میں کی ہے۔ چنانچہ وہ آنکھیں بند کیے ہی بیٹھا رہ گیا۔ اور گوہر مقصود جو تھا، وہاں سے واپس آ گیا۔ تو باپ نے پوچھا بھی کیسے بزرگ ہیں۔ کہنے لگی، ابا جی ابھی کچا ہے۔ یہ اس کا اپنا انداز تھا، لیکن ایک وقت آئے گا، یہ بہت بڑا بزرگ بنے گا۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض اوقات باہر کی وردی اختیار کرنے سے بھی اندر کے وجود پر، اندر کی ذات کے اوپر اس کے اثرات

مرتب ہونے لگتے ہیں، جس طرح سے باہر سے کیمو تھر اپی کر کے آپ اندر کے کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ روحانیت میں بھی ایسا عمل ہوتا ہے۔ آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ، مہربانی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ خواتین و حضرات! اللہ آپ کو بھی آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

مُطْكَلِی

ہم سب کی طرف سے سب کو سلام پہنچے۔

یہ آج ہی کے دن تھے، اور تقریباً ایسا ہی موسم تھا، اور ایسے ہی ماہ و سال تھے، لیکن وقت اس سے بہت پہلے کا تھا، اور ہم اس آرزو کو لے کر چل رہے تھے کہ ایک ایسا ملک بنے گا..... ایک ایسا نہرا دلیں..... جس کے اندر لوگوں کو آسانیاں ملیں گی، اور وہ ذہنی طور پر، روحانی طور پر اور نفیاتی طور پر آسانیوں کے اندر رزندگی بس رکریں گے، کیونکہ ہم اس دعویٰ کو لے کر چلنے والے تھے کہ یہ ایک ایسا ملک ہو گا جو ایک مشائی دلیں کی صورت میں ہو گا..... اور ہم لوگوں کو دوسرے ملکوں کو یہ بتا سکیں گے کہ دیکھو پیارو! حمرانی، جہاں بانی اس طرح سے کی جاتی ہے..... اور جس طرح سے آپ لوگ اپنے اپنے ملکوں میں کرتے ہیں۔ وہ کوئی زندگی گزارنے کا، زندگی بس رکرنے کا، کوئی ایسا کمال کافی نہیں ہے جس کا کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں..... یہ ایک ایسا دور تھا، اور ایسا عجید تھا، اور ہم اپنے انداز میں تھے ہماری سرشت میں، اور ہماری سوچ میں، اور ہماری سائیکلی میں، اور ہمارے دل میں ایک عجیب بات تھی..... جیسا کہ میں نے پہلے ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ ہم دیے میں سے دینے کے عمل پر، اور دیے میں سے دینے کے فن پر عمل پیرا تھے، اور ہم یہ جانتے تھے، اور ہمیں اس بات کا بہت پکاش عورت تھا کہ زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے یازرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے جب تک ہاتھ سے، اور پلے سے کچھ دیا نہیں جائے گا، اس وقت تک کسی بھی قسم کی فلاج، اور ترقی نہیں ہو سکے گی۔

کسان اپنے گھر کے اندر جا کر اپنی بھڑولی کھول کر اس میں سے انماں نکال کر، یا بوری کی تناویں کاٹ کر اس میں سے دانے نکال کے، جھوپلی بھر کے کھلے میدان میں جاتا تھا، اور وہ اچھے بھلے دانے..... اچھا بھلا انماں جس سے اس کے گھرانے کی زندگی کا سامان بڑی آسانی سے کیا جا سکتا تھا، باہر لے جا کر یا تو پورے کے ذریعے یا نیچ دریچ..... یا چھٹے کے ذریعے ایک عجیب و غریب زمین پر پھینک کر اس امید پر، اور اس سوچ پر چلا آتا تھا کہ اس کے اندر سے اب ایسے ہی بے شمار دانے، ستر،

ستر، اور سات سات سو، اور سات سات بزار ہو کر نکلیں گے۔ یہ پہلے دینا ہوتا ہے، پھر اس کے بعد لینا ہوتا ہے۔ یہ تصور ہمارے ساتھ تھا کہ دیں گے، تو ہم دے چکنے کے بعد کیا ریوں دروازوں میں سے چھوٹے چھوٹے پودے جھاکن کر دیکھتے تھے کہ گھروالے لکھیت میں آئے ہوئے ہیں کہ نہیں، یا ہم اکیلے ہی نشوونما پار ہے ہیں۔ تو کبھی کبھی بونے والے وہاں موجود ہوتے تھے، اور کبھی نہیں بھی ہوتے تھے، لیکن وہ پودے نشوونما پاتے چلے جاتے تھے، اور جب وہ بڑے ہوتے تھے، تو وہ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

تو دوستو! ہمارے پاس وقت کچھ بھی نہ تھا۔ ہم اپنی دولت، شہرت، عزت، شفقت، محبت، مروت، یہ سب کچھ لے کر اپنے وطن کی بنیادوں میں ڈالنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے پاس سوائے ہمارے بدنوں کے، ہمارے وجود کے، اور سوائے ہمارے اپنے خون کے کچھ بھی نہ تھا۔ ہم نے اپنے وجود کو، اپنے جسم کو، اپنے خون کو اس وطن کی بنیادوں کو پیش کیا۔ جو احمد اللہ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور یوں اس ملک کی بنیاد پڑی۔ یہ تصور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اور آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی وھنڈ لانے لگا کہ دینا اتنا ضروری نہیں ہے، اور ان کھیتوں میں ان مرغزاروں میں، ان باغوں میں ایسے لوگ بھی آئے جنہوں نے کاشت میں کوئی مدد نہ کی۔ البتہ اس کا فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس کی طرف پل پڑے، اور یہ ہمارے ذہنوں سے نکلا گیا کہ ہمیں دینا بھی ہے، کیونکہ دیے بغیر کام آگے نہیں چل سکتا، اور جوں ہی دینے سے ہاتھ روکتے ہیں، تو کہیں نہ کہیں اس کا اثر ضرور پڑتا ہے، اور ویرانی، اور بر بادی کے سامان ضرور شروع ہو جاتے ہیں۔

چند نوں کی بات ہے۔ آپ کے اسی ملک میں میں ایک پروگرام دیکھ رہا تھا، اور میں پوری توجہ اس پر نہیں دے سکا، چونکہ کان میرے تیز ہیں، اور زگاہ اب کمزور ہونے لگی ہے، لیکن وہ بات جو تھی، وہ میں نے ساری کی ساری سن لی تھی۔ کوئی ڈاکٹر تھے، ڈاکٹر شاہ۔ کمپیسر نے یہ سوچا تھا کہ یا شاید حقیقت بھی تھی کہ شاہ اتنے عمر رسیدہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ اتنے بوڑھے، Old Surgeon میں، لیکن اس چھوٹی سی عمر میں انہوں نے بہت سارے آپریشن کیے۔ اتنے بزاروں آپریشن کیے کہ گینشر بک میں اس کا نام آتا ہے، یا آنے والا ہے، یا آئے گا۔ تو میری توجہ ان کی طرف ہوئی۔ وہ اچھے سے، سمارٹ سے، پیارے سے، اچھی گفتگو کرنے والے ایک ڈاکٹر تھے، اور وہ یہ بتاتے رہے کہ میں نے کتنی تیزی سے کتنے سارے آپریشن کیے، اور اتنی تیزی سے کیوں کیے۔ میں مال بھی ہنانا چاہتا تھا، اور ایک یہ بھی کہتے تھے کہ میری انگلیوں میں بھی کچھ اس قسم کی ایک لگن آباد تھی، ایک Creativity تھی، ایک تخلیق تھی کہ میں جلدی سے جلدی زیادہ کام کرنے کا خواہ شمند ہوں۔ تو کمپیسر نے پوچھا کہ آپ یہ بتا میں کہ آپ کی زندگی کا کوئی بہت مشکل آپریشن تھا؟ تو انہوں نے کہا، یوں تو بہت سارے آپریشن مشکل ہوتے ہیں، لیکن ایک آپریشن بہت مشکل تھا جس نے بہت زیادہ وقت لیا، اور میری بہت زیادہ توجہ

لی، اور میں بہت سپٹا یا، لیکن میں بڑی کوشش کے ساتھ، اور جمل کے ساتھ اس پر لگا رہا۔

آپ لوگوں سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے خواجہ دل محمد کا ایک شعر یاد آیا ہے۔ خواجہ دل محمد ہمارے بہت کمال کے شاعر تھے، اور مجھے بہت افسوس ہے کہ لوگ اب انہیں نہیں جانتے۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو ان سے بالکل واقف نہیں ہے، لیکن وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ ایک جگہ پر سرجن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرجن کیا ہوتا ہے..... یعنی آپ پریشن کرنے والا کیا ہوتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ”سرجن کی صفت اور خوبی یہ ہے کہ نظر باز کی، سرفلاطون کا، جگر شیر کا، اور ہاتھ خاتون کا.....“ یعنی سرجن وہ ہوتا ہے جس کی نظر باز کی ہوتی ہے۔ Plato کی طرح اس کا سر غور کرتا ہو۔ اس کی نظر باز کی ہو، اور ہاتھ خاتون کا..... تو ان سرجن کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ اس انداز کے ڈاکٹر ہیں۔ کہنے لگے کہ میں اپنے سرجنی ہاصل میں تھا کہ اچانک وہاں پر ایک اپانچ آدمی کو جو ابھی اپانچ ہوا تھا۔ کوئی ایک آدھا گھنٹا قبل، اسے چار پائی پر ڈال کر لائے۔ وہ ایک نوجوان تھا جس کی دونوں ٹانگیں، ایک تیز دھار آ لے سے کٹ گئی تھیں، اور اس کے ساتھیوں نے اس کی رانوں پر بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے روپاں یا کوئی رسیاں باندھی تھیں، تاکہ جریانِ خون نہ ہو اور وہ جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں حیران تھا کہ میں اس کا کیا کروں۔ اس کے فوراً بعد ہی دو آدمی، بھاگے بھاگے آئے، اور انہوں نے کہا کہ جی اس کی دونوں ٹانگیں مل گئی ہیں جس تیز دھار آ لے سے کٹ گئیں، مشین میں کام کرتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگیں ران سے نیچے کٹ کر دور جا گری تھیں، تو یہ واقعہ اور یہ سانحہ گزر اتحا پاکستان سٹیل ملز میں۔ ایک کوئی بڑا تیز چکر گھوم رہا تھا۔ کشاور دار جس میں وہ کام کرتے ہوئے قریب آیا تھا کسی کام کی غرض سے۔ وہ مزدور بڑا ڈیں، بڑا قابل اور بہت سمجھدار تھا، لیکن وہ اس کی پیٹ میں آ گیا، اور پیٹ میں آتے ہی اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں، اور بہت دور جا گریں، اور اس کے ساتھیوں نے تلاش کر لیں، اور وہ اس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے کر آگئے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ میرے لیے ۰٪ سے امتحان کا وقت تھا۔ میں، اور میرے ساتھی، اور میرے اسٹنٹ میرے ساتھ لے گئے۔ ہم کوئی مسلسل 18 گھنٹے اس پر کام کرتے رہے، اور اللہ کا فضل یہ ہوا کہ ہم ان کی دونوں ٹانگیں جوڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب خطرہ، اندیشہ، شائبہ یہ تھا کہ بہت ممکن ہے کہ Nerves اس کے ساتھ تھیک طرح سے نہ جڑی ہوں، جو شریانیں، اور دریہیں ہیں، وہ اپنی جگہ پر نہ لگی ہوں، کیونکہ یہ آپریشن ہی بہت بڑا تھا، لیکن ہم خدا سے دعا مانگ کے اس کام پر لگے ہوئے تھے، اور جب آپریشن ختم ہوا تو ہم ڈاکٹر بینٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے تو وہ جو اس کے دوسرے ساتھی مزدور تھے انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب ہم اس کو چار پائی پر لے کر چلے ہیں تو وہ صاحب جو تھے، جن کا نام شکور تھا، وہ تھوڑے سے ہوش میں تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر کہا کہ مشین بند نہ کرنا، کیونکہ اگر یہ مشین ایک دفعہ بند ہو گئی تو اس کے چلانے میں 10 لاکھ کا خرچ اٹھتا ہے۔ تو

اس مشین کو بالکل بند مت کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ملک کو یا میرے اس کارخانے کو کوئی نقصان پہنچے۔ تو اس کے بعد وہ نیم بے ہوشی میں چلا گیا۔

اب میرا مقصد اس سارے واقعہ کو سنانے کا یہ ہے کہ وہ کون آدمی ہے، اور وہ کس طرح سے اس ملک کے ساتھ وہ استہ استہ ہے، اور ہم کیا کریں، اور کہ ہر جا میں کہ ہم اس کو سلام کر کے آئیں، اور جب تک وہ زندہ رہے، اور ہم زندہ رہیں، ہمارے اور اس کے درمیان سلام کا یہ سلسلہ قائم رہے۔ اس قسم کے جو لوگ ہیں، انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ اس کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ اس کو لے کر چلے اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دردناک بات جو میں آپ کی خدمت میں ضرور عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ اس کارخانے میں اس سلسلہ میں اسی قسم کے پاکستانیوں نے جو اس سے بہتر تعلیم یافتہ تھے، وہاں سے اتنا کچھ کھوئا، اور جس شدت کے ساتھ لوٹا۔ اس کی خبریں آپ نے اخباروں میں پڑھی ہوں گی، اور وہ خاتون جنہوں نے بڑا اعتراض کیا تھا کہ کیوں میری فونو کھینچی گئی ہے۔ کیا ہو گیا اگر میں نے 15-10 کروڑ نکال لیا ہے تو؟ تو یہ دردناک کہانی بھی ساتھ لے کر چلنی پڑتی ہے۔ ایک بات البتہ 14 اگست کے رشتے کے حوالے سے ہے۔ کافی دیر کی بات ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے ایسی باتیں سرزد ہو گئی ہیں، اور اب بھی ہوتی ہیں۔ وہ یہ کہ میری بڑی آرزو تھی کہ کبھی کوئی 14 اگست ایسا بھی منایا جائے جس میں ان شیر بہادروں، اور ان Creative Persons کو جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، اس کی تعمیر کی ان کو بھی آگے لایا جائے، اور آگے بٹھایا جائے۔ یہ ایک میری بڑی آرزو تھی۔ جب بھی تھی، اور اب بھی ہے۔ یہ آرزو، اور یہ تمنا، اور یہ خواہش لے کر میں وقت کے President کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے خوشی، اور فخر ہے کہ انہوں نے مجھے شرف ملاقات بخشنا۔ بڑی مہربانی فرمائی یہ ہمارے جزءِ خصیاءِ الحق صاحب تھے میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔ میں نے کہا کہ سر اس مرتبہ جب ہم 14 اگست منا کیں تو کچھ اس طرح سے ہو کہ جہاں آپ جھنڈا چڑھاتے ہیں، اور عمائدین ملک، اور غیر ملکوں کے سفیر، اور وزراء، اور نمائندے اکٹھے ہوتے ہیں، وہاں پر ایک Sitting Arrangement کچھ اس طرح کا بھی ہو کہ کریمیوں کے اس Lay Out میں اب کی بار اول قطار جو کریمیوں کی ہو، وہ ان مقامی لوگوں کی ہو جو مال و دولت کے اعتبار سے یا نام و نمود کے اعتبار سے جانے، اور پیچانے نہیں جاتے، لیکن ان مقامی لوگوں کو دین، اور قرآن کی پرداہ ہے۔ دین، اور قرآن کہتا ہے کہ ”تم میں کوئی بڑا نہیں، تم میں کوئی Superior نہیں، مساوئے اس کے کہ جو تقویٰ رکھتا ہو۔“ تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم 22 کریماں آگے لگائیں، اور 22 تقویٰ والے لوگ ہوں۔ سفید دو دھیا چادروں والے۔ چھوٹی چھوٹی ان کی گپڑیاں ہوتی ہیں، وہ باندھ کر وہ تشریف فرمائیں، اور ان کے بعد غیر ملکی سفیر، اور باہر کے نمائندوں کی ہوں۔ اس کے بعد پھر کوئی، اور تاجر وغیرہ، اور ہم جو آرٹسٹ لوگ خواتین اور زبانی باتیں کرنے والے

ہیں، ہم سب سے آخر میں ہوں، اور ہم سے بھی آخر میں پیور و کریٹس ہوں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ تو وہ کہنے لگے کہ اشراق صاحب میری بھی بیکی آرزو ہے۔ آپ بہت اچھی Suggestion لے کر آئے ہیں۔ لیکن تقویٰ والے لوگ ہم کہاں سے لیں۔ تو میں نے کہا کہ سر تقویٰ والے لوگ تو ہمارے اردو گرد بہت سے ہیں۔ آپ کے اس محل میں بہت سارے مالی ایسے ہیں۔ بہت سارے بابے ایسے ہیں۔ بہت کمال کے پیارے لوگ ایسے ہیں جن کی وجہ سے میرے پیارے ملک کی بنیادیں استوار بھی ہیں، اور پائیدار بھی ہیں۔ وہ سب دعا دینے والے لوگ ہیں۔

آج سے کوئی پانچ چھوٹے میں لاہور کے میوہا سچل میں گیا۔ مجھے کوئی ضرورت تھی۔ وہاں مجھے رکنا پڑا تو اس کے کینسر کے وارڈ میں ایک گاؤں کی اچھی سی، جسے انگریزی میں Well Meaning کہتے ہیں، اچھے سمجھا والی پیاری سی شکل کی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں آئی ہو یہاں بی بی؟ وہ کہنے لگی، مجھے کینسر کی شکایت ہے، اور مجھے یہاں تحریر اپی کے لیے آنا پڑتا ہے۔ کہنے لگی کہ بھاجی یہ زانکیف د عمل ہے، جس سے میں گزر رہی ہوں، لیکن میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں، اور جب میں سوریے سب سے پہلے اٹھتی ہوں، تو میں نماز پڑھنے کے بعد دعائیں سب سے پہلے اس دنیا کے بندوں کے لیے دعا کرتی ہوں کہ یا اللہ کل عالم کی خیر ہو۔ ہماری نانیاں، دادیاں اکثر یہی دعائیں کا کرتی تھیں کہ کل عالم کی خیر ہو۔ اللدان سب کا بھلا کرے۔ اور پھر میں کہتی ہوں کہ یا اللہ، میرے پاکستان کی خیر ہو، اور اس کے بعد میں کہتی ہوں کہ یا اللہ حکمرانوں کی خیر ہو۔ تو میں نے ایک اچھے جنائب کی طرح کہا، حکمرانوں کی خیر کیوں ہو؟ وہ تو بڑے خراب ہوتے ہیں۔ کہنے لگی، بھاجی اگر حکمران ہوں گے۔ جیسے تیسے بھی ہوں، تبھی گاڑی آگے چلے گی تا۔ اللدان کی بھی خیر کرے، اور جہاں جہاں ان کی کمیاں ہیں، ان کو بھی اللہ پورا کرے۔ میں ان کے لیے ضرور دعائیں مانگتی ہوں، تو ایسے ایسے بندے بھی موجود ہیں۔ ہاں اگر وہاں کریاں رکھی جائیں تو میں ان بی بی کو بھی ضرور تشریف لانے کے لیے کہتا، تو یہ آرزو تھی کہ یہ کریاں ہو تو میں تقویٰ کی بھی۔ تو اللہ نے ہی تعریف کی ہے، اور اللہ نے ہی اس کو پسند فرمایا ہے۔ توجہل ضیاء الحق نے کہا کہ آپ نے بالکل صحیح کہا ان لوگوں کو آگے لانا چاہیے لیکن اشراق صاحب یہ Tradition نہیں رہی۔ یہ رسم نہیں رہی۔ ہم کیا کریں، اور کیسے کریں۔ آپ مل کر ہمارے ساتھ کام کریں۔ میں نے کہا کہ جی میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ تو ہم نے یعنی میں نے، اور مرحوم نے بھی (اللدان کے درجات بلند کرے) اپنے طور پر زور لگایا۔ یہ سوال پیش کیا، لیکن وہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں نا، انہوں نے کہا کہ سر آپ کیا فضولی بات کرتے ہیں۔ یہ تو طے شدہ ہے۔ پان سارا تیار ہو گیا ہے اس کے چارٹ بن گئے ہیں۔

یہ لوگ جو آپ کے اردو گرد موجود ہیں، اور جن سے آپ لوگ استفادہ کر رہے ہیں، لیکن آپ کو علم نہیں ہے۔ آپ بحثتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی ذات سے اپنے علم سے اپنی تعلیم سے اپنی خوبصورتی

سے اپنی پاور سے اس ملک کو فائدہ پہنچا رہے ہیں، نہیں۔ وہ لوگ جو خاموش رہ کر کام کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو آپ کے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دعا میں دیتے ہیں، اور دعا میں سمیتے ہوئے آپ کے ارد گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں وہ لوگ، وہ تقویٰ والے ہیں جن مقنی لوگوں سے ہم واقف نہیں ہیں اور جن سے ہم واقفیت حاصل کرنا بھی نہیں چاہتے۔ تو میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ جب تک گھر سے داتا و انا لَا کر بکھیر انہیں جائے گا، واپس نہیں ملے گا۔

پیارے لوگو! ہم سندھ کے مشہور Desert تھر پار کر میں تھے، اور کافی دور تک گئے تھے۔ صحراء کو تو آپ جانتے ہیں کہ جب وہاں کوئی آدمی پھنس جائے تو بڑی پیاس لگتی ہے۔ ننگ پار کر ایک جگہ ہے۔ اس کے بعد انڈیا کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے رن کچھ ہے، دلدلی قسم کی جگہ ہے، تو ہم راستہ بھول گئے۔ میں، اور متاز مفتی۔ ہم کافی عمر کے تھے، مگر جو ہمارا گروپ تھا، وہ Younger ہوا تھا۔ اب پیاس بڑی شدت کی گئی، اور خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ شاید Desert کے اس کارنر میں کوئی پانی بھی ایسا نہ ملے گا جو کہ پینے کے قابل ہو۔ دلدلی علاقہ تھا۔ چل تو ہم رہے تھے، اور مشکل بھی ہمارے ساتھ تھی، اور علاقہ بھی ایسا تھا جو کہ نہایت نامانوس تھا۔ وہاں ایک بڑا سادرخت تھا۔ ایک بڑی عجیب قسم کا درخت، جو شاید صحراء کے اس دلدلی علاقے میں ہی ہو سکتا تھا، اور اس علاقے کی سرحد کے قریب ہی سرخ رنگ کے پہاڑ تھے۔ وہ پہاڑ جن سے ہماری بادشاہی مسجد بنی ہوئی ہے۔ عجیب جگہ تھی۔ ہم خوفزدہ بھی تھے۔ توجہ ہم نیچے پہنچے تو آپ سن کر حیران ہوں گے کہ وہاں ایک ہینڈ پپ لگا ہوا تھا تو میں نے کہا کہ متاز یہ تو پانی ہے۔ یہ اللہ نے ہی ایسا لگایا ہے۔ اس نے کہا کہ کہیں یہ پانی زہر میلانہ ہو۔ خیرو ہیں پر ایک پرانی وضع کی ملکی ہی بھی تھی مٹی کی، اور اس پر بہت ساری کالی جبی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں دھا گاؤں کر ایک کارڈ سا بھی لٹک رہا تھا، جس پر سندھی، اور اردو میں ایک عبارت تھری تھی کہ خبردار! اس ملکی کا پانی نہ پینا۔ سب سے پہلے آپ اس ملکی کو اٹھا کر اس کے پانی کو نلکے میں ڈالیں اور جب وہ پورا بھر جائے تو پھر آپ ہینڈل چلا میں، اور پانی پی لیں۔ چنانچہ ہم نے ملکی اٹھائی۔ پانی اس میں ڈالا، ہینڈل چلا یا، اور پانی فافٹ چلنے لگا۔ اور ہم سب نے پیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک آخری تھی۔ یاد رکھیے! جاتے وقت اس ملکی کو پانی سے بھر کر رکھ کر جائیں۔ اگر آپ نے پانی لیا Instruction ہے تو آپ کو پانی دینا بھی پڑے گا، اور رکھنا بھی پڑے گا، ورنہ یہ بیشہ بیشہ کے لیے سوکھ جائے گا، اور وہ لوگ جو اس علاقے میں آئیں گے، وہ ٹھنڈے پانی سے محروم ہو جائیں گے..... الحمد للہ..... اس ملکی کے حوالے سے ایک بات مجھے معلوم ہوئی جو آج مجھے بڑی دیر کے بعد یاد آئی۔ آپ کے سامنے عرض کر دی۔ اللہ آپ کو بہت ہی آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف بھی عطا کرے، اور وہ ملکی آپ کے ساتھ جائے۔ ہر وقت، اور ہر گھری جس میں سے ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ اللہ حافظ۔

انا کی لڑکے

ہم سب کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

ایک بڑی مشکل آپ لوگوں کے ساتھ گفتگو کے شروع سے اب تک رہی ہے، اور وہ بدستور اس کے ساتھ چلی آرہی ہے، اور اس کا مداوا مجھ سے کوئی تھیک طرح سے نہیں ہو پاتا، تو میں بڑی ایمانداری سے اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ ان خامیوں، اور کمیوں کو کس طرح سے دور کیا جائے، تاکہ اس میں آپ کی بھی تسلی ہو، اور میری بھی تسلی ہو۔ وہ یہ ہے کہ میں ”بابوں“ کا بہت ذکر کرتا ہوں، اور آئندہ بھی موقع ملا تو میں ان کا ذکر ضرور کروں گا۔

بابوں کی میں نے اپنے طور پر تعریف بھی آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، اور اس کی بھی بتائی تھی کہ ضروری نہیں کہ وہ بابا ایک بڑا مباسا چوغن پہنے ہو، گلے میں ایک ہارڈ الہ ہوا ہواں نے منکوں کا رتھکوں کا، اور چھوہاروں کا، اور لال ڈاڑھی بھی ہو، اور آنکھوں میں سرخ سرمہ بھی ڈالا ہو، اور سر پر چوگوشیاٹوپی بھی ہو، صرف وہی ہوتا ہے بابا، یہ ضروری نہیں۔ ایک بابا میں نے بتایا تھا کہ بہت ماڈرن، اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوت پہنے ہوئے سرخ رنگ کی چوڑی پھن دارثائی لگائے ہوئے۔ اس کے اندر گولڈ کا بروج ناکے ہوئے۔ اعلیٰ درجے کا کیمرا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے، اور جتنی بھی اس موجودہ دور کی ساری Equipment ہیں، وہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ وہ بھی بابا ہو سکتا ہے۔

بابا کی ایک Basic Qualification یہ ہے کہ وہ اس فریم ورک کے اندر رہتا ہے، جو اللہ نے اپنے نبیوں کے ذریعے انسان کے لیے طے کر دیا۔

ہم گھوڑی کے اوپر اپنا بچہ بٹھا کر مری کی پہاڑیوں کے اوپر دوڑا دیتے ہیں۔ گھوڑے کو پتا ہے کہ اس پتھر پر پاؤں رکھنا ہے، اور اس پتھر پر پاؤں نہیں رکھنا۔ ایک کتا ہے، وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کو پتا ہے کہ مجھے یوں بولتی ہے ایک چیز کی، اور یوں اگر کوئی غیر بندہ گھر میں آئے تو اس پر حملہ آور ہونا ہے۔

ایسی طرح سے جو سارے جانور ہیں، وہ پختہ پیدا ہوئے ہیں، اور ان کا فریم ورک ان کا چوکھٹا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک بے چارہ انسان ہی ایسا ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ تعلیم حاصل کر کر کے، پوچھ پوچھ کے، توجہ دے دے کے، استفسار کر کر کے اپنی زندگی کا ڈھانچہ بناتا ہے، اور ایک ڈگر تیار کرتا ہے جس پر کہ وہ چلتا ہے۔ پھسلتا ہے پھر چلتا ہے، پھر پھسلتا ہے۔ مثلاً کتنا ہو، اور گھر میں چور آ جائیں تو آپ اس کی سانگھی کھول دیں، اور اس کو کہیں کہ ہش.....، اور وہ کہے کہ جی میں نے تو ابھی F.A. ہی نہیں کیا تو میں کیسے حملہ کر دوں۔ کوئی Education تو دینی چاہیے نہ اس کو۔ تو کتنا آرام سے بیٹھ جائے کہ جی میں B.A. کروں گا تو حملہ کروں گا، ورنہ مجھے تو نہیں آتا، یا میں نے تاپ نہیں سیکھی، یا میں نے کمپیوٹر نہیں سیکھا۔ تو اللہ میاں سے پوچھا گیا کہ جی میں کیا کروں تو اللہ نے فرمایا کہ دیکھو! میں نے تمہارے لیے انبیاء کے ذریعے تمہارا ایک فریم ورک پہلے ہی پہنچا دیا ہے۔ جیسا وہ فرمائیں، اسی کے مطابق کرنا ہے، اور مزے سے سیٹی بجائتے ہوئے، زندگی کے سارے مزے لیتے ہوئے اپنی آکسیجن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، سیفری سے دریاؤں سے پہاڑوں سے چٹانوں سے زندگی کے سفر کو طے کرنا ہے۔

تو ہم اس مقام پر آ کر پھنس جاتے ہیں، اور ہمارے درمیان وہ جو چوکھٹا یا فریم ورک دیا ہوتا ہے، اس میں، اور بھی بہت ساری چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، جو انسان کو تنگ کرتی ہیں۔ جس مخلوق کا میں نے نام لیا، اس کا طے شدہ پروگرام ہے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق چلا جا رہا ہے۔ کبھی اس کے اندر اس قسم کا ٹیکھا پن نہیں آتا، جیسا کہ انسان کے اندر آتا ہے۔

تو یہ جو بابے ہوتے ہیں نا، جنہوں نے مجھے بہت Attract کیا، جو ایک سیدھے راستے پر سیدھی لائن پر صراطِ مستقیم پر چلے جا رہے ہیں، وہ پکار کر کہتے ہیں اهدنا الصراط المستقیم، اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہے، اور وہ کہتے ہیں بسم اللہ، ہم اس پر چلیں گے، اور وہ انعمت علیہم والے لوگ ہیں ان پر انعام نازل ہوتا ہے وہ بن جاتے ہیں اور میں اس کی آرزو میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا ہوں، اور بھاگتا رہوں گا کہ میں انعمت علیہم والے کسی بندے کو پکڑ لوں جس کے اوپر انعام نازل ہو، اور جب انعام کسی بندے کو ملا ہے، اور جس راستے پر وہ جا رہا ہوگا، اس کا راستہ صراطِ مستقیم ہی ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔ اب میرے اندر ایک چالاکی ہے میں اس کے ذریعے ایک خودکلامی یعنی ایک Self Dialogue کرتا رہتا ہوں۔ مجھے کس طرح وہ راہ ہاتھ آئے، جو آسان ہو۔ ہم لوگ جو ہیں وہ کم کوش Fiction Writer ہونے کی حیثیت سے، یہ سوچتا ہوں کہ میں، مثلاً کبھی منڈی جاؤں، بہتری منڈی۔ اب میری صحت ٹھیک ہے، میں جا سکتا ہوں۔ تو وہاں پر مجھے کوئی انعام یافتہ بندہ مل جائے جس نے کچھ گا جریں،

کچھ مولیاں، کچھ کو بھی خریدی ہوئی ہے، اور میں اس کو پچھا نوں کہ یہ اصل بابا ہے۔ تو میں اس سے کہوں کہ سر میں آپ کا سامان اٹھا لوں۔ تو وہ کہتا ہے، کتنے پیسے۔ میں نے کہوں، جو آپ دیں گے میں لے لوں گا۔ اب وہ انعمت علیہم والا بندہ ہے۔ وہ کہے گا کہ اچھا۔ توجہب وہ چلے، اور میں اس کا سامان لے کر سر پر اٹھا کر چلوں تو جس رستے پر وہ جا رہا ہے، میری آرزو یہ ہے کہ میں یعنی اس کے steps کے اوپر چلتا جاؤں، کیونکہ احمد ناصراط المستقیم جو ہے نا، وہ دکھایا انہوں نے، اور وہ صراط المستقیم پر چلا جا رہا ہے۔ اللہ نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ لوگ جن پر میں نے انعام کیا، وہ میرے بندے ہیں۔ خیر، تو میں اس تلاش میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ وہ بابے جو، جو سید ہے راستے پر چلتے ہیں؛ جو کبھی کسی منڈی میں نظر آ جائیں، سڑک پر مل جائیں تو میں ان کو Follow کروں، اور جب تک میری سانس نہیں ٹوٹی، میں ان کا چیچھا کروں، کیونکہ یہی میری زندگی کی آرزو ہے، کیونکہ میں اور جانداروں، جانوروں کے مقابلے میں ایک Human being Animal of Soul ہوں، میں Soul کے اندر روح بھی ہے۔ بکرے، کنے، اور دوسراے جانوروں کے اندر جان ہوتی ہے۔ Spirit کہہ لیں ہوتی ہے، Soul نہیں ہوتی۔ میرے اندر اللہ نے Soul بھی رکھ دی ہے، اور پھونک اپنی مار دی ہے، تو میں اس کی تلاش میں رہا اور یہی بات میں نے آپ سے ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ کی ہے۔

تو آج میں آپ کو ایک آسانی بتانے لگا ہوں، اور اس کی مثال جو ہے اس علاقے سے۔ اس شیلیوبیزٹن سے ہے، جہاں پر میں نے 1964ء سے لے کر اب تک کا وقت کسی نہ کسی صورت میں گزارا ہے۔

میرے اور سب سے زیادہ گرفت اس بات کی ہوئی ہے کہ جناب ہم کو بھی بتائیں کہ بابا کہاں ہوتا ہے؟ ہم کو تو بھی ملائیں۔ بچی بات ہے وہ صحیح کہتے ہیں کہ ہم کو تو ملائیں۔ کئی دفعہ تو یہ ہوتا ہے کہ میں گاڑی میں جا رہا ہوں، تو ریڈنگ آ جاتی ہے آگے۔ تو کوئی بندہ شیشہ نیچے کر کے کہتا ہے کہ اشFAQ صاحب! وہ بابا ہم کو بھی بتائیں، اور پھر شیشے چڑھا لیتا ہے۔ تو وہ اس طرح سے کہتا ہے کہ جیسے میری دکان ہو گئی تو میں بتا دوں گا کہ یہ اپنا فلاں سور ہے وہاں سے جا کر لے لیں۔ بابا کو تو تلاش بھی اور طرح سے کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی میں ابھی آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ وہ بابا جو ہوتا ہے، اچھے، خوش نصیب انداز کا بابا، جس کے پاس راستہ ہے یا نہیں ہے۔ اس کی نگاہیں راستے کے اوپر رہتی ہیں۔ کسی نہ کسی طریقے سے۔ اور وہ لکی ہوتا ہے، اور وہ آپ کے قریب، آپ کے ارد گرد۔ آپ کے لوگوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک ہوتا ہے، اور میری، اور آپ کی انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں ایک ایسے آدمی کو بابا سمجھ لوں، جو میرا چیڑا سی ہے۔ یہاں پھنستی ہے بات۔ کیوں نہیں ملتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ کہتے ہیں جی کیا آج کل بھی بابا ہوتا

ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں۔ تو اس معاملے میں ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو، وہ ماضی جھوٹا ہے۔

اس عہد کو شہادت دینی پڑے گی کہ پہلے کے جو لوگ گزرے ہیں، وہ ٹھیک تھے تو ایک آدمی دیسا یہاں ضرور ہے، پھر ہی کہے گانا۔ درنہ تو یہ کہانی ہی ہے نا۔ قصہ ہی ہے نا۔ تو وہ شاہد موجود ہوتا ہے۔ اب وہ مجھے، میرے جیسے اندر ہے آدمی کو، جس کے دیدے ہیں، اس کو کیوں نظر نہیں آتا، کیونکہ میرے اوپر اناکی، تکبر کی، استکبار کی ایک گھری تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں برائند رتھروڈ میں ایک دکان کرتا ہوں۔ وہاں کا جو بابا ہے، جس کے اوپر میں سامان صندوقی (Sandwich) چکوا کر بھیجا ہوں کہ جا فلانی دکان پر جا کے دے آ۔ یہ کس طرح سے بابا ہو سکتا ہے کہ میں اس کو کہوں، سلام۔ بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ کی نگاہیں میری نگاہیں، اس آدمی کو تلاش نہیں کر سکتیں، اور کبھی بھی تلاش نہیں کر سکیں گی کیونکہ آپ کے، اور اس کے درمیان ایک گھر اپر وہ لٹک رہا ہے۔

جب میں 1964ء میں ٹیلی ویژن کے ساتھ متعلق ہوا۔ یہ ٹیلی ویژن 64ء میں آیا تھا تو میں ریڈ یو میں کام کرتا تھا تو یہاں اسلام اظہر تھے۔ اس کے پہلے مدارالمہام۔ تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا کہ اشFAQ صاحب آئیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہم ٹیلی ویژن کھول رہے ہیں، اور انشاء اللہ یہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔ چونکہ آپ کاریڈیو کا کافی تجربہ ہے، اس لیے آئیں دیکھیں کہ ڈرامہ کیسے کریں گے تو میں ڈر گیا کہ یا اللہ ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ میں تو کہیں باہر سے پڑھ کر بھی نہیں آیا۔ ہمیں پتا ہی نہیں کہ یہ سب کیسے ہو گا۔ تو اگلے دن میں کرسی پر بیٹھا تھا، اور اسلام صاحب اندر کچھ کام کر رہے تھے، اور مجھے ان سے ملنا تھا لیکن خوف دل میں بدستور قائم تھا، ڈرامے کے بارے میں یہ ڈرامہ کیسے لکھا جائے گا۔ یہ کیسے ہو گا، ہماری تو کوئی ٹریننگ نہیں ہوئی۔ تو جہاں میں کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے قریب ہی ایک اور نیچ تھا۔ اس کے اوپر نوجوان لڑکا بیٹھا تھا۔ تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو بھی ملنا ہے، تو اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو میں نے کہا کہ اچھا بڑی خوشی کی بات ہے۔ پھر میں اندر چلا گیا۔ باہمی ہوتی رہیں۔ کچھ ڈسکس کرتے رہے، اور میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان بھی اندر چلا گیا ہو گا۔ اس نے بھی کچھ باتیں کی ہوں گی، اور وہ جس نوکری کے لیے آیا تھا، اسے اس نوکری پر رکھ لیا گیا۔ وہ صاحب کا ڈرامہ سور تھا۔ اس شخص کا نام میں آپ کو آج بتاتا ہوں، وہ مغل حیدر تھا۔ وہ اس ٹیشن میں اس چار دیواری کے اندر صاحب کی بڑی گاڑی چلانے پر مأمور ہو گیا لیکن جب میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کے انداز سے اس کے چہرے سے اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنے کے انداز سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا کہ یہ آدمی کچھ مختلف سا ہے۔ بہر کیف اس کی نوکری لگ گئی۔ چلتا رہا یہ سب۔ پھر ہم یہاں آتے رہے، اور وہ متاثر ہا۔ سلام کرتا رہا بڑے ادب کے ساتھ، اور ہماری اور اس کی

گفتگو ہوتی رہی، لیکن میرے سارے ساتھی جو 2000 بندے یہاں کام کرتے تھے، ان کے مقابلے میں میری نگاہ مختلف تھی کہ یہ ڈرائیور جو ہے گل حیدر، یہ کچھ اور طرح کا ہے۔ لوگ اپنی تنخوا ہیں بڑھانے کے لیے نظر مارتے تھے، جیسے چھوٹے ماز میں وغیرہ جو ہیں کرتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک کونے میں پرے کھڑا ہوتا تھا۔ تو میں کہتا تھا کہ گل حیدر تم بھی نظرے لگاؤ۔ وہ کہتا تھا نہیں صاحب اور سب کھڑے ہیں نا، وہ Community اپنی۔ لیکن اس کے اندر ایک احتجاجی رنگ نہیں اختیار کر سکا۔ پتا نہیں کونسی بات تھی یا کوئی بات نہ تھی کہ میں یوں کر کے کہہ دوں کہ یہی بات تھی، لیکن میں اس سے متاثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کے متعلق بات نہ کر کر کے کچھ اس سے اتنا خوفزدہ سا ہو گیا تھا کہ میرے اندر ادب کی وہ لہر جو ایک اچھے آدمی کے لیے دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ زیادہ دیزیز ہو گئی، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے زیادہ Face کروں یا وہ میرے سامنے آئے۔ ایسے بھی ہوا ہے کہ میں یہاں سے کوئی ایک دو پروگرام کر کے نکلا ہوں تو اسلم صاحب نے کہا کہ چلیں گل حیدر آپ کو چھوڑ دے گا۔ ڈرائیور تھا نا۔ تو میں نے کہا کہ جی میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اور مجھے اسلم صاحب کہتے کہ کیوں جی کیا ہو گیا۔ یہ تو بڑا اچھا ہے۔ یہ ہمارے سارے لوگوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ بڑا Safe ہے اور بہت دھنے مزاج کا آدمی ہے، تو میں کہتا کہ نہیں سمجھے کسی اور کے ساتھ بھیج دیں، کیونکہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ خیر ان کو سمجھنہ آئی میری بات۔ آج میں ایک بڑا عجیب سارا ز آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں جو شاید اگر آج یہ بات چیت نہ ہو رہی ہوتی تو میں کبھی بیان نہ کرتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھیجے میری انا، اور میرا انکہ اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس کے زیادہ قریب نہ ہوں جتنا کہ آدمی آ جایا کرتا ہے۔

میں ایک بڑا پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بڑا placed Well ہوں، اور میرا رتبہ بہت ہے، اور لوگ مجھے بہت زیادہ سلام کرتے ہیں، لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ جتنی دیر وہ یہاں رہا، اور جتنی دیر میں وہاں رہا، اس کے سامنے اپنے آپ کو ایک معمولی انسان ہی سمجھتا رہا، اور مجھے یقین ہے، اور میرا ایمان ہے کہ میں ٹھیک تھا، اور میں سچائی پر تھا..... اور میں حق پر تھا۔

ایک وقت ایسا آیا کہ ہم یہاں پر کسی ڈرامے کی شوٹنگ کرنے کے لیے باہر گئے۔ کسی پانی کنارے، کسی دریا پر، راوی کے اوپر، تو ہاں پر گل حیدر کا جو بیٹا تھا، اس کو بھی انہوں نے Cable boy یعنی جو تاراٹھاتے ہیں مقرر کر دیا تھا۔ تو door out شوٹنگ تھی۔ گل حیدر کا بیٹا بڑا اچھا، بڑا پیارا سا، خوبصورت سا جیسے پٹھانوں کے بچے ہوتے ہیں، وہ تھا۔ بچہ کچھ شراری ساتھا۔ اس نے جیسے بچے Rowdyism کرتے ہیں، پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب وہ ایسی خوفناک جگہ تھی کہ جہاں پر اس بچے کے ڈوبنے کا لوگوں کو 100 فیصد خدش ہو گیا تھا، اور کسی کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اسے نکالا جائے۔ جو تیرنا

جانتے تھے، ان کی بھی نہیں تو اس Cable boy نے کیبل چھوڑ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگادی، اور جا کر اس کو پکڑ لیا۔ ڈوبنے سے اس کو بچالیا۔ لیکن خود ڈوب گیا، اور سب لوگ جو شونگ کے لیے وہاں موجود تھے، ان کے دلوں پر اس کا بڑا ابو جھوٹھا۔ اور ہم اس کے جسدِ خاکی کو لے کر گئے۔ ایک جیتا جا گتا اچھا بھلا آدمی لے کر گئے تھے لاش لے کر آگئے۔ واپس لے کر آئے۔ اب میرے لیے اس کو Face کرنا مشکل ہو گیا، وہ ایک باپ تھا، اور اس نے بڑی امکنوں، آرزوؤں کے ساتھ اس کو پالا تھا، تو میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا، لیکن میں میں چاہتا تھا کہ میں ضرور جاؤں۔ تو آخر میں اس کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ گل حیدر یہ حادثہ ہو گیا ہے، اور مجھے اس کا بڑا افسوس ہے۔ کہنے لگا، نہیں سرافوس تو تب ہوتا جب یہ حادثہ ہوتا۔ یہ تو بس اللہ کا حکم ہی ایسا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ صاحب اللہ کی کتاب ہوتی ہے نا۔ بس اس میں ایسے لکھا تھا۔ اب میں Faith کی بات کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ صاحب اس کا حکم تھا، اب ہم اس کے حکم کے آگے گئے سننہیں اٹھا سکتے۔ میں نے کہا، افسوس ہے۔ کہنے لگا، ہاں جی افسوس ہے۔ میں نے کہا کہ غم ہے، کہنے لگا، جی غم ہے۔ میں نے کہا شکایت ہے، کہنے لگا، شکایت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی شکوہ ہے۔ کہنے لگا، کوئی شکوہ نہیں۔ بس جی جب میں گھر جاتا ہوں تو میں بیٹھتا ہوں، مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں غم میں ڈوب سکتا ہوں، کرب میں مبتلا ہو سکتا ہوں، اپنے آپ کو پامال کر سکتا ہوں، لیکن میں شکایت نہیں کروں گا۔

میں نے بہت سا وقت اس کے قریب مختلف زاویوں سے گزارا کہ دیکھیے! ایک بڑے آدمی کو Face کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اور جب آپ کا اندر مانے لگے، تو پھر تو اور بھی مشکل ہے۔ دیکھیے نا پولیس آفیسر آتے ہیں۔ ان سے لوگ ڈرے ہوتے ہوتے ہیں۔ جب آپ کا اپنا اندر مانے لگے تو بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہر کیف اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ لمبا وقت گزر گیا۔ نام کتنا سارا چلا گیا اور گل حیدر اس نیلی ویژن کے دفتر سے اس شیش سے ریٹائر ہو گیا، اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ میں اب ریٹائر ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں کچھ موقع نہیں ملا۔ کچھ نام نہیں ملا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دن وہ مجھ مل گیا، اور وہ بہت خوش تھا۔ میں نے کسی ریٹائر آدمی کو اتنا خوش پہنچ بھی نہیں دیکھا۔ میں نے کہا کہ ریٹائر ہو گئے ہو۔ کہنے لگا، جی صاحب جی۔ میں نے کہا، آپ خوش ہیں۔ کہنے لگا کہ جی اللہ کا بڑا فضل ہے۔ میں نے کہا کہ اب تم کیا کرو گے۔ کہنے لگا، کہ سب سے پہلا کام میں یہ کروں گا کہ میں اپنا ڈرائیور نگ لاسنگ پھاڑ کے پھینک دوں گا کہ دوبارہ آرزو پیدا شہ ہونو کری کرنے کی، ڈرائیوری کرنے کی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں خساب نہیں لگاؤں گا۔ وہ لگاتا تھا روزانہ اپنے آپ کو سیٹ رکھنے کے لیے، اور تیسری بات یہ اس نے کہی کہ اشفاق صاحب میری بڑی آرزو ہے کہ اب میں دبا کر عبادت کروں۔ میں اکیلا بیٹھوں گا، اور اپنے اللہ سے کچھ باتیں کروں گا۔ یہ میری بڑی آرزو ہے۔

بڑا جی چاہتا ہے۔ بس وہ یہ تین خواہشیں تھیں اس کی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میرا دل سے اس کو سلام پہنچتا رہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری انا، آپ کا تکبر، آپ کی سوچ، ہمارا اپنے آپ کے اندر پھنسنے رہنا۔ ہمارے قریب سے یقیناً اس قسم کے بڑے آدمی گزرتے رہتے ہیں، اور ہم پوچھتے رہتے ہیں کہ جناب ہم کو تو کوئی نہیں ملا۔ ہم نے اتنی بڑی انا کی لٹھ مونڈھے (کندھے) پر کھلی ہوئی ہے کہ کوئی قریب تو آئے ہم اس کا بو تھا (منہ) سینک دیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچ۔

ہم ایک دن تحریر کے بارے میں لفتگو کر رہے تھے۔ کوئی ہم سے پوچھ رہا تھا کہ جو تحریر ہے، اس کو آپ کس طرح سے وہ صور میں تقسیم کرتے ہیں کہ ایک تحریر صحافت کی ہوتی ہے، اور ایک تحریر ادب کی ہوتی ہے، اور ان میں کیا فرق ہے؟ تو میں ان سے یہی عرض کر رہا تھا کہ صحافت کی تحریر ایک وقائع نگار کی تحریر ہوتی ہے۔ وہ جو جو واقعات دیکھتا ہے، انہیں کے ساتھ کو دیکھ پر کہ کر ایک فریم ورک میں موجود کر کے لکھتا ہے، اور وہ حق کے پیچھے، اور تحقیق کے پیچھے جانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اور سعی کرتا ہے، اور ان واقعات کو جو گزرے، وہ واقعات جو آنے والے ہیں، اور جس کے بارے میں وہ ان حال کے واقعات سے اندازہ لگاتا ہے، وہ صحافت کی تحریر کہلاتی ہے۔

اور جو ادیب ہوتا ہے، وہ اس حقیقت سے ایک رمز تلاش کرتا ہے۔ ایک مختلف حقیقت کی طرف جاتا ہے، جسے آپ Separate reality کہتے ہیں۔ ایک Reality تو وہ ہے جو آپ زندگی میں ہر روز ملاحظہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک Reality، ایک حقیقت وہ ہے جس کو ایک صاحب نظر یا صاحب بصیرت آدمی اس کی تہہ تک پہنچ کر تلاش کرتا ہے۔ مثلاً درختوں کے پھل جب پکتے ہیں، اور پکنے کے بعد آخری مرحلے کو پہنچتے ہیں تو شاخوں سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور یہ ایک دنیا بھر کے سارے ملکوں میں، سارے علاقوں میں، ساری جگہوں پر ایک طے شدہ معاملہ ہے کہ اشجار پھلوں کو جب وہ پک جاتے ہیں تو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن جب نیوٹن ایک نیچے کے اوپر پہنچ کر اپنے کوٹ کے کارکھرے کر کے اس پھل کو جو پک چکا ہے، گرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ ایک Separate Reality بیان کرتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ Gravity ہے۔ ادیب بھی اس رمز کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو بین حقیقت میں موجود نہیں ہوتی۔ آپ سے یہ بات کرتے ہوئے مجھے ایک بہت دریکا پڑھا ہوا واقعہ یاد آیا، جو شاید ہم سب کو یہ بات سمجھنے میں مدد دے۔ ہمارے یہاں

گولڈہ شریف میں پیر مہر علی شاہ تھے۔ ان کے نام سے آپ سب واقف ہیں۔ ان کے صاحزادے تھے غلام محمد الدین صاحب، جن کو عرف عام میں لوگ ”بابو جی“ کہتے تھے۔ وہ بابو جی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کو کوئی اپنی طبع علمی کے اظہار کا اتنا چاہو نہیں تھا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضری دینے کی بڑی آرزو تھی، ایک دفعہ بڑی کوشش کر کے میں گولڈہ شریف پہنچا، دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کہا کہ میں بابو جی سے ملنا چاہتا ہوں، تو انہوں نے کہا کہ وہ سور ہے ہیں، لیکن چونکہ آپ لاہور سے آئے ہیں، اس لیے ان کو جگادیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، ایسی گستاخی نہیں ہونی چاہیے۔ میرا ملنائے ملنا کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کا سوتا، وہ بہت ہی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں ان سے مل نہیں سکا، اور یہ حسرت میرے دل میں ہی رہی۔

باو جی جب بہت چھوٹے تھے، بالکل بچے تھے۔ آپ نے اگر گولڈہ شریف دیکھا ہو، اور اس کے قریب سے گزرے ہوں جو اسلام آباد والے ہیں، وہ تو روز ہی گزرتے ہیں۔ تو آپ دیکھیں گے کہ بستی کے میں ساتھ ساتھ ایک ریلوے لائن ہے۔ گاڑی بستی کے قریب سے گزرتی ہے، یعنی گولڈہ شریف کا، اور ٹرین کا ایک بڑا گہرا رشتہ ہے۔ گاڑی جب گزرتی تھی تو بابو جی اس گاڑی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ بہت چھوٹے تھے نا۔ تو وہ گاڑی کی محبت میں بنتا ہو گئے۔ اسی گہری محبت میں بنتا ہوئے کہ دنیا مافیہہ کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ وہ گاڑی کے عشق میں ہی بنتا ہو گئے تھے، اور اسے دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اس کو ایک انگریز چلا رہا ہے۔ پیچھے جو جھنڈی ہلانے والا ہے، وہ بھی انگریز ہے، اور جب وہ جھنڈی ہلاتا ہے تو گاڑی Whistle دیتی ہے، اور پنڈی کی طرف روانہ ہوتی ہے بابو جی۔ پہلے تو کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے تھے، اور گاڑی گزرتی تھی۔ جب اس چھوٹے بچے کا، اس مقصوم کا ہاتھ ہلانا، اور ہر روز اس گاڑی میں استغراق دیکھا، تو جوڑ رائیور تھا وہ بھی جواب میں ہاتھ ہلانے لگا۔ انگریز میں یہ خوبی بڑی تھی، اور آج بھی ہے۔ پھر انہوں نے کیا کیا کہ ایک چھوٹا سا ڈنڈا لیا، اور اس کے اوپر گرین کپڑا باندھ کے اس کی جھنڈی بنائی، اور جیسے ریلوے شیشن پر جھنڈی لہرا کر گاڑی کے نکاس کی اجازت دیتے ہیں نا، یہ بچہ بھی وہاں کھڑا ہو کے گرین جھنڈی ہلاتا تھا، اور وہ گاڑی جاتی تھی۔ کچھ دن تو یہ کھیل رہا، پھر اس کے بعد جب وہ گرین جھنڈی ہلاتے تھے تو ڈرائیور Wistle دیتا تھا کہ Yes Sir آپ کا Order بھی ہم نے تسلیم کیا، اور ہم گزر رہے ہیں۔ وہ جھنڈی ہلاتے رہے۔ گرین جھنڈی کے ساتھ گاڑی وہاں سے گزرتی رہی۔ پھر ان کو ریلوے شیشن پر جانے کے بعد پا چلا کہ ایک چیز سکنل بھی ہوتی ہے، اور جب سکنل ڈاؤن ہوتا ہے تو گاڑی گزرتی ہے، اور جب Up ہوتا ہے تو گاڑی نہیں گزرتی۔ چنانچہ انہوں نے لکڑیاں وکڑیاں جوڑ کے اپنے مریدوں سے کہہ کھلوا کے رسیاں ٹاکیاں لے کے ایک لکڑی کا بڑا سا سکنل بنایا، اور اس کو گھر کے کوٹھے کے اوپر لگا دیا، اور انہوں

نے تنا و باندھ لی۔ اب جب گاڑی کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ رسی ڈھیلی کر دیتے تھے۔ گلشن ڈاؤن ہو جاتا تھا اور گاڑی فرائے بھرتی ہوئی، اور Wistle دیتی ہوئی وہاں سے گزر جاتی تھی۔ اس چیز نے ان کو بڑا مشکل میں ڈال دیا، اور نائم کا پابند بنادیا۔..... کیونکہ بھی ظاہر ہے کہ گاڑی تو وقت پر گزرتی ہے، اور ان کورات کو جانے پر بھی مامور کر دیا، کیونکہ رات کو بھی جا گنا پڑتا تھا، تو پھر گاڑی ان کا گلشن Receive کر کے گزرتی تھی۔

تو ایک دفعہ شام کے وقت جب وہ کھیل رہے تھے تو وہ بھول گئے، اور گلشن up رہ گیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کھلیتے رہے تو وہ جب انگریز نے گلشن up دیکھا تو گاڑی اس نے روک دی کہ گلشن up ہے۔ میں کیسے گزر سکتا ہوں، اور اس نے بڑی Wistles دیں، اور جب اس نے ولیں دیں تو یہ اپنا کھیل چھوڑ کر بھاگے، اور جا کر گلشن کو ڈاؤن کیا، اور گاڑی چھکا چھک چھکا چھک دوز نے لگی۔ جب تک یہ گلشن ڈاؤن نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کی محبت میں بتلا صاحب جو تھا، وہ ان کو ویسے ہی جواب دیتا تھا جیسا کہ ایک ڈرائیور کو اپنے گلشن میں کا جواب دینا چاہیے، اور وہ اس کے عشق میں مسلسل بتلا چلے جاتے رہے جو مرید حضرات پیر مہر علی شاہ صاحب کے پاس آتے تھے، اور صاحبزادہ کو دیکھتے تھے ان میں گوالیار کے کوئی صاحب بھی تھے۔ نام تو مجھے ان کا یاد نہیں کیونکہ بڑی دیر کی بات ہے، تو انہوں نے کہا کہ صاحبزادے آپ اس کا لکلوٹ (انجمن) کے عشق میں کیوں بنتا ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں چار وجہات کی بناء پر اس کے عشق میں بنتا ہوں، اور ان چار وجہات کی وجہ سے مجھے انجمن بہت ہی پیارا لگتا ہے۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ صاحب انہوں نے تو ایک فلسفہ نکالا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آگ کھاتا ہے۔ انگارے ہضم کرتا ہے۔ اپنی جان پر دکھ سہتا ہے، اور یہ دکھ سہہ کر جس منزل کا تھیہ کرتا ہے اس کی طرف جاتا ہے۔ دوسرے یہ مجھے اس لیے پسند ہے کہ یہ جس منزل کا ارادہ کرتا ہے، اس پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ اب اگر اس نے یہ تھیہ کیا ہے کہ میں سماں جاؤں گا تو کوئی طاقت اس کو نہیں روک سکتی، اور تیسرا صفت یہ ہے، اور سب سے پیاری بھی کہ جس نے مجھے اس کے عشق میں بنتا کیا کہ یہ First class کے ڈبے کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے، اور Third Class کے ڈبے کو بھی، اور گندی بوگی کو بھی لے کر چلتا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ تو یہاں رہ، میں تو First class کے ڈبے کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اور چونچی چیز یہ ہے کہ یہ صراط مستقیم کا مالک ہے۔ نہ ایک انج ادھر جاتا ہے، نہ ایک انج اوہر۔ جو راستہ اس نے طے کر لیا ہے، اس کے اوپر چلتا ہے۔ اب انجمن تو ہم سب نے دیکھا ہے، لیکن جو reality Seperate اس نوجوان لڑکے نے اس کی بیان کی ہے، وہ ایک اور Reality ہے۔ تو یہ جو ہم لکھنے والے چھوٹے بڑے درجے کے اس کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ایک حقیقت تو یہ ہے جو ہمارے سامنے چلی آ رہی ہے، اور ایک حقیقت

وہ ہے جو کہیں، اور پوشیدہ ہے۔

سامنے کے شوہر نہیں یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے کہ جیسے معلوم کی دنیا ہے ایسے ہی
نا معلوم کی دنیا بھی ہے۔ اور جو اس کو تسلیم نہیں کرتا، اس کی سوچ بڑی محدود ہو جاتی ہے، کیونکہ لا معلوم کی
دنیا پھیل جاتی ہے اور جب کہ اللہ نے فرمایا کہ ”ہم نے آپ کو علم دیا ہے۔ القلیلا..... یعنی تھوڑا اسادیا
ہے تو با وجود اس کے کہ اس کا Separate Reality کا تعلق نہیں ہے، لیکن بھی بھی میں آپ کو تسلیم و رضا کی خواہ کے، کچھ ایسے خفیہ راز بھی بتا دیتا ہوں جو
میری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں ایک لکھنے والا ہوں۔ جیسا کیا بھی ہوں، میں بھی جانتا ہوں، اور آپ بھی جانتے ہیں۔
اس میں ایسی کوئی فخر کی بات نہیں ہے، لیکن انسان کے اندر ایک چیز ہوتی ہے، اور وہ اسے محسوس کرتا ہے
کہ شاید مجھ سے بہتر کوئی اور نہیں ہے۔ مجھے ایک دن خیال آیا اور میں نے سوچا کہ میں لکھنے والے کی
حیثیت سے Broadcaster کے انداز سے کچھ تھوڑا سا معروف آدمی ہو گیا ہوں، اور لوگ مجھے کتنا جانتے ہیں، تو میں نے
اس کا ایک ٹیکٹ اکالا۔ میں نے ایک کارڈ لیا خالی اور میں نے اس کے اوپر لکھا کہ۔

محترمی جناب اشراق صاحب!

آپ سے ملنے کو بڑا دل چاہتا تھا۔ اللہ کرے، آپ سے ملنے کا کبھی کوئی موقع ملے وغیرہ
وغیرہ..... !!

جیسے اپنے Fans وغیرہ کو خط لکھے جاتے ہیں نہ۔ ویسے ہی میں نے بھی لکھا، تو اب جو میں نے
ایڈریس لکھا تو وہ یہ تھا کہ ”اشراق صاحب مشہور ڈرامہ نویس۔ لاہور، باقی Details نہیں دیں کہ میں
کس محلے میں رہتا ہوں۔ پہلے کہ میں نے اس کو سپرد ڈاک کر دیا، تو وہ تقریباً تین دن کے بعد مختلف
مہریں لگا ہوا مجھے مل گیا۔ اس میں بہاولپور کی مہر بھی تھی۔ رحیم یار خان کی بھی تھی، اور مختلف جگہوں کی
تھیں، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ یا اللہ یہ بڑے کمال کی بات ہے، اور میں ماشاء اللہ کافی معروف آدمی
ہوں۔ تین دن کے بعد ملا، لیکن ملا تو سبی۔ اب اتفاق دیکھیے، اور قدرت کی ایک Reality کو اجاگر
کرنے کا ایک انداز ملاحظہ فرمائیے۔ تقریباً ایک مہینے بعد یا 15-20 دنوں کے بعد مجھے ایک لفاقتہ ملا۔
بڑا چھاسا۔ خوبصورت سا، اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ ”اشراق احمد۔ بکواسی BroadCaster کو
ملے“..... اس پر نہ لاہور لکھا تھا، اور نہ میرے گلی محلے کا نام..... اس کے اوپر صفحہ 30:9 کی راوی پندتی کی
مہر تھی، اور شام 4:30 کی اس کی Delivery کی مہر تھی۔ یعنی اسی دن وہ مجھے مل گیا، یعنی بظاہر اس کا اس
سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن میں کبھی کبھی رمز کے انداز میں سوچتا ہوں کہ جب زمیں واضح ہونے لگتی ہیں

تو کئی کئی طریقوں سے... عجیب عجیب انداز سے کھلتی ہیں تو لکھنے والوں کے لیے، اور غور کرنے والوں، اور محسوس کرنے والوں کے لیے اس Separate Reality کی طرف نگاہ کرنا، اور نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے، کیونکہ وہ اس Reality کو اس مختلف حقیقت کو جان کر پھراپنے لوگوں کے قریب آ سکتے ہیں۔ جو لوگ صرف ایک ہی حقیقت کے مارے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پھر ایک ہی لائن پر چل سکتے ہیں۔ ان کو کبھی ان لوگوں کی تکالیف کا اندازہ نہیں ہو سکتا، جن کی تکالیف ان سے مختلف ہوتی ہیں، بلکہ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اپنے جیسی تکالیف ہوں تو ان کا بھی اندازہ نہیں ہوتا ہے۔

چونکہ ابھی تحریر کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، لیکن ہمارے زاویہ میں ہر طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، اور ہم اس پر ہر ایک زاویہ سے ایک اور Angle سے غور کرتے رہیں گے۔ یہ تو تھی میری بات، جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کروی، اور آپ کے سامنے پیش کروی، لیکن اب میرا بھی ایک مسئلہ ہے جو میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا، اور اسے آپ حل کریں گے۔ کوئی ایسا پیچیدہ تو نہیں ہے، لیکن اکثر مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں وہ مجھے، آپ کو، ہم سب کو گھیرے میں لیے ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر نوجوان لڑکے، لڑکیاں خاص طور پر اس بات کا اعتماد کرتی ہیں کہ اس دنیا میں مجھے کوئی سمجھنے نہیں سکا اور افسوس کہ کسی نے میری حقیقت کو نہیں جانا۔ آپ کی اردو شاعری بھی اس سے بھری پڑی ہے۔

کوئی محروم نہیں ملتا جہاں میں

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

لوگوں کو یہ شکایت عام ہے کہ میرے دل کو کوئی نہیں سمجھتا۔ تو یہ فرمائیے کہ یہ بات کس حد تک درست ہے؟ کیا واقعی آدمی دوسرا آدمی کو نہیں سمجھتا؟ کیا واقعی ناسمجھے جانے والے انسان کے پاس اتنا کچھ ہوتا ہے کہ جس سے دوسرا آدمی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہوتا؟ کیا واقعی ناسمجھے جانے والے انسان کا وجود اتنا قسمی ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر ہر وقت روتا پھرتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا ہے؟

حاضرین میں سے اشFAQ صاحب! بات یہ ہے کہ اگر آپ نے شاعروں کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو میں بڑی سخت بات کرتا لیکن آپ نے شاعری کا حوالہ دیا ہے تو مجھے نہ بتا نرم رو یہ اختیار کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی گمراہ ہو تو دوسروں کو بھی جہالت میں بٹلا کر دیتا ہے، اور ان کو اپنی ہی نظروں میں چڑھا دیتا ہے، اور وہ اپنی نظروں میں چڑھتے چلے جاتے ہیں، اور دنیا کی نگاہوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ جو لوگ اپنی نگاہ میں خود ہی چڑھتے چلے جاتے ہیں، وہ عموماً سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے ہیں مگر دنیا ہمیں نہیں سمجھ پائی۔ یہ ان کی ایک بہت عجیب صورت حال ہے۔

اشFAQ احمد: آپ اختر عباس! کیا سمجھتے ہیں کہ یہ رو یہ درست ہے؟

آخر عباس: سر بات یہ ہے کہ توجہ طلبی کا سارا مسئلہ ہے اوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے دنیا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہمارا مشاہدہ زیادہ تیز ہے، اور اسے شیر کرنے والے زیادہ ہونے چاہئیں کیونکہ لوگ ان سے شیر نہیں کرتے۔ ان سے پوچھتے نہیں ہیں تو پھر وہ شکوئے سے بھرے ہوئے بولتے ہیں۔

اشفاق احمد: یہ یہ گلہ بڑا عام ہے آخر عباس صاحب!

آخر عباس: لیکن سر یہ گلہ بے جا ہے۔ میری اپنی Feeling یہ ہے کہ یہ بے جا ہے۔ اس پر اس طرح سے اصرار کرنا نہیں چاہیے۔

اشفاق احمد: آپ خالد صاحب کیا سمجھتے ہیں؟

خالد صاحب: سر میرا خیال ہے کہ جب ایک فرد اپنے مفادات کے مطابق Society میں عمل کرنا چاہتا ہے اور سامنے والے افراد اپنے مفادات کے مطابق عمل کرنا چاہتے ہیں اور جب دونوں کے مفادات میں نکلا اوپریدا ہوتا ہے تو جو ہارتا ہے یا جس کے مفادات ضرورت کے مطابق پورے نہیں ہو پاتے، تو وہ شکوہ کنال ہو جاتے ہیں۔ لیکن..... میرے خیال میں ایسے آدمی کی اپنی Personality میں کمی ہوتی ہے۔ وہ صحیح طور پر سمجھا نہیں پاتے یا اس کی Personality واضح نہیں ہو پاتی، تو وہ اس کا گلہ عوام الناس سے کرتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں سمجھتا ہے۔

اشفاق احمد: آپ لوگوں نے کبھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسا اعلان کیا؟

ایک سامع: اشفاق صاحب اہوتا ہے اکثر..... اس میں کوئی ایسی بات نہیں۔ ہر بندے کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے..... ایسا موز آتا ہے کہ جب وہ Emotional ہو جاتا ہے تو وہ سمجھا نہیں پاتا، لیکن جب وہ بندے دل سے سوچتا ہے تو وہ خود ہی Realise کرتا ہے کہ اس میں میری ہی خامی تھی۔ تب وہ بندہ خود ہی منصف ہوتا ہے، لیکن Emotional ہونے کی صورت میں وہ دوسروں کو Blame دیتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لیکن میرا مشاہدہ ہے کہ اس میں ضروری نہیں کہ ان میں پڑھے لکھے اوگ ہی شامل ہوں۔ وہ خواتین جو بہت تعلیم یافتہ نہیں ہوتیں، وہ بھی یہ شکایت کرتی ہیں اپنی پڑوسنوں سے کہ مجھے کوئی سمجھنے والا ہی نہیں ہے۔

تو وہ جذباتی ہوتی ہیں نا، اس لیے ایسا سوچتی ہیں۔

لیکن (اشفاق صاحب) ہم سب کا جو Angle ہے، وہ شاید بڑا محدود ہو۔ آپ کی نظر مختلف حوالوں سے مختلف چیزوں پر لوگوں پر زیادہ پڑی ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑا اپنے حوالے سے، اپنے مشاہدے کے حوالے سے بتائیں کہ آپ کو اس کی کیا وجہ لگتی ہے، اور اس کو کس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے، تاکہ اس کا عملابھی کوئی فائدہ ہو۔

اشفاق احمد: اختر عباس صاحب! میرے ایک استاد تھے جب میں روم میں تھا۔ ان کا نام تھا او زگاریتی..... پروفیسر او زگاریتی..... میں ان کی باتیں بیان کرتا رہوں گا۔ ان کو ہم پروفیسر کہتے تھے، لیکن یہ پروفیسر سے اور پر کا درجہ تھا۔

جب وہ تشریف لاتے تھے تو ہم سارے کے سارے، کسی کے پاؤں میں بوٹ ہے، کوئی نگلے پاؤں ہے۔ کوئی ٹکھے کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے تھے، اور سب ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ آگئے ہیں انہو سب، پروفیسر او زگاریتی، اور وہ تھے Pop Lorlate اٹلی کے..... اب ان کی دو کتابیں آئی ہیں ترجمہ ہو کے۔ جب کوئی مشکل ہمیں پڑتی تھی تو ہم ان سے اس قسم کے سوال کرتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے پوچھا ہے کہ آپ کا بہت وسیع مشاہدہ ہے۔ ایک دفعہ ایک پروفیسر کا اس کی بیوی سے براشدید بھگڑا ہو گیا، اور اس میں بہت حد تک وہ خاتون حیک بھی تھیں..... تو جب بھگڑا زیادہ ہو گیا، اور یہ معاملہ شاف روم میں پروفیسر او زگاریتی کے پاس پہنچا، تو انہوں نے کہا کہ دیکھو بھگڑا اپنی جگہ، لیکن تم قوت کے سارے اعضاء جو ہیں، ان کو استعمال کیا کرو..... اور خاتون سے کہنے لگے کہ بی بی تم صرف آنکھیں استعمال کرتی ہو، پوپٹے استعمال نہیں کرتیں، تو جب تک یہ نہیں ہو گا ساتھ، اس وقت تک کام نہیں ہو گا۔

تو ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ جو آدمی کہتا ہے کہ زندگی میں مجھے کوئی سمجھا ہی نہیں ہے، اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ اس شخص کو خدا کالا کھلکھل کردا شکردا کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی کمینگیاں، اور حماقتیں، اور نالائقیاں لوگوں کے سامنے نہیں آئی ہیں۔ اسے اللہ کا شکردا کر کے سونا چاہیے، اور یہ شکوہ بھی نہیں کرنا چاہیے کہ لوگ مجھے سمجھتے نہیں۔

آپ کا بہت بہت شکریا اور جو میرے ساتھی ہیں، وہ بھی شکریے کی اس ادائیگی میں میرے ساتھ ہیں۔ اللہ آپ سب کو آسانیاں دے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا کرے۔

تائی کریم بی بی اور الیگز نڈ فلیمنگ

میرا بینا سایکالوجی میں ڈاکٹریٹ کرنے امریکہ گیا ہوا ہے تو اس کی ڈاکٹریٹ میں ذرا دری
گلی میرے حاب سے..... تو میں ایک احساس والے باپ کی طرح ناراض ہوا کہ بھی اتنی دیر کیوں
لگائی ہے..... آپ لوگ بھی کبھی کبھی گھر میں ناراض ہوتے ہوں گے..... میں نے کہا کہ میں اس
سے جا کے پوچھوں کہ کیا بات ہے..... پچھلے سے پچھلے سال میں وہاں گیا، تو اس کے Head of the
Department سے ملا، تو انہوں نے کہا کہ نہیں، یہ تو بڑا Perfect ہے۔ کوئی شکایت نہیں، بلکہ ہم تو
یہ چاہیں گے کہ یہ اور کچھ دیر تک ہمارے پاس رہے، اور ہم اس سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ یوں میری
تلی ہو گئی۔

یونیورسٹی سے گھر جاتے ہوئے میں اس کی کار میں جیسا تھا، اور وہ کار چلا رہا تھا۔ ہماری
گاڑی سے آگے ایک اور شخص گاڑی لے جا رہا تھا، اور وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا، اور چکو لے بھی کھا
رہا تھا، تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ہارن بجاو، اور اس کو ایک طرف کرو۔ تو اس نے کہا کہ ابو میں
ابھی کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ بھی آپ اس کو ہارن دیں۔ تو وہ کہنے لگا کہ ابو یہاں
ہارن دینے کا رواج نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ Silence Zone ہوتا ہے، یہ تو ویرانہ ہے۔ تو اس
نے کہا کہ بس ہارن نہیں دیتے ہیں نا۔ میں نے کہا کہ کیوں نہیں دیتے۔ کہنے لگا، کہ میں اس لیے نہیں
دیتا ہوں کہ یہ آگے جانے والا مجھ سے عمر میں ذرا بڑا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے نئی گاڑی چلانی
سکھی ہو، اور میں اگر ہارن دوں گا تو وہ گھبرا جائے گا، اور اس کا نقصان ہو گا، تو میں یہ نہیں چاہتا۔ میں
نے کہا کہ دفع کرو، اس کا نقصان ہوتا ہے تو ہو، تمہیں اس سے کیا۔ بجا ہارن، اور اس کو ہٹا۔ کہنے لگا، کہ
نہیں..... میں معافی چاہتا ہوں ابو۔ یہ ذرا مشکل ہے۔ میں یہ اس لیے نہیں کر سکتا کہ یہ میرا
Colleague ہے۔ اوہ میں نے کہا، اچھا۔ کیا یہ یونیورسٹی میں تمہارے ساتھ پڑھتا ہے یا پڑھاتا ہے۔
اس نے کہا کہ نہیں، پڑھتا پڑھاتا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تمہارا Class Fellow ہے؟ تو اس نے

کہا کہ نہیں، ابو یہ میرا Road Fellow Class Fellow ہے، بلکہ یہ میرا Road Fellow ہے۔ ہم ایک ہی سڑک پر جا رہے ہیں۔ اس رشتے سے ہم ایک دوسرے کے Fellow ہیں، ہم اسے تنگ نہیں کر سکتے۔ تو میں نے کہا کہ یقیناً! تجھے یہ علم حاصل کرنے کے لیے یہاں بھیجا تھا نالائق آدمی۔ تم کو کہا تھا کہ Ph.D کر کے آؤ۔ یہ تو تم بالکل ہی میاں، میاں سے ہو گئے ہو۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ دیکھو وہ اپس اپنے گھر لا ہو رچلو، اور بے صبری کی زندگی بس رکرو، اور وہاں کا ٹرینیک دیکھو۔ یہاں آ کر تو تم بالکل نالائق ہو گئے ہو۔ اس آدمی کو اپنا Road Fellow بتا رہے ہو، اور اس کی عزت افزائی کے لیے، اور اس کو فحصان نہ پہنچانے کے لیے یہ سب کر رہے ہو۔ ہم تو وہاں ذرا کوئی قریب آجائے تو ایسے دھکا دے کر گزرتے ہیں کہ اس کی جان نکال دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ صبر کی بات تم نے کہاں سے سمجھی۔ اس نے کہا کہ صبر ہمارے ہاں عام ہے بلکہ ہمارے مسلمانوں میں تو صبر کی بہت تلقین ہے، اور ہم اسے پڑھتے تھے، لیکن اس کو بہت گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہاں آ کر مجھے عملی زندگی کا پتا چلا کہ صبر کے کیا معنی ہیں، اور اس کے کیا فوائد ہیں، اور یہ انسانی زندگی کو سقدر استحکام عطا کرتا ہے۔ یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ اللہ جو ہے، آپ اس پر پورا پورا بھروسہ رکھیں اور اللہ جو ہے، وہ آپ کے ہر مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ کے خالق کے طور پر موجود ہے، اور ”لَا تَقْنُطُ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ“ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، جب تک آپ کے ہاتھ میں صبر کی ڈوری نہیں ہوگی، اس وقت تک آپ لَا تَقْنُطُ کے معنی نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں نے کہا کہ بھائی یہ تو کچھ عجیب سی بات کر رہا ہے، میں دین کے بارے میں اتنا گہر امطاع نہیں رکھتا۔ جتنا کہ تو مجھ سے بات کر رہا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ عمل ہو، تیزی ہو۔ آگے بڑھنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ ایک آڑن ہوتی ہے۔ آڑن جسے کہ Anvil کہتے ہیں۔ جس کے اوپر لوہار لوہار کھکھ کر کوئتے ہیں تو وہ بے بس کر دینے کا سب سے بڑا Symbol ہے۔ اس نے کہا کہ جب لوہار آڑن کے اوپر چیزیں کوئی ہتھوڑے ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن آڑن اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

جب صبر کی اس نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں اپنا بچپن آگیا کہ میرے گاؤں میں ایک ہماری تائی تھی۔ تائی میری اصلی تو نہ تھی، لیکن گاؤں کی تائی سب کی تائی ہوتی ہے۔ جب میں آٹھویں میں ہوا تو میں اپنی تائی سے اچھے طریقے سے ملا۔ اس کا خاوند تیل تھا، وہ فوت ہو چکا تھا۔ میری پیدائش سے پہلے فوت ہو چکا تھا جس وقت تایا فوت ہوئے، اس وقت تائی کی عمر کوئی 19 برس تھی۔ تائی کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا، اور ایک بیٹی۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ میں اپنی زندگی خود بناؤں گی، اور ان دو بچوں کا بوجھہ اللہ کے فضل سے ساتھ لے کر چلوں گی لیکن کام تو مشکل تھا۔ بیل کی نگہداشت کرنا، کوہبو چلانا، تیل پیلنا، اور پھر اس کے بعد شام کے وقت کندھا لگا کے اس کو زکالنا۔ بہت مشکل کام تھا،

یہ کام ایک بہت تگڑا، اور تنومند مرد کر سکتا تھا۔ تو میں جب اس سے ملا تو وہ میرے لیے ایک ایسا کردار تھی جیسا کہ آپ نے ریڈرز ڈائجسٹ میں عام طور پر پڑھا ہوگا۔ The most unforgettable character I ever met وقت اس کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ نیل کے پیچھے چل رہی ہے تو پیڑھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ کھانا پاکارہی ہے تو پیڑھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ نگین سی، بڑی خوبصورت سی تھی۔ کوئی بھی کام کر رہی ہے تو پیڑھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کو ہر وقت اپنے قریب ترین رکھتی تھی۔ میں نے بھی اس کے بارے میں اس سے پوچھا نہیں، لیکن میں اس سے متاثر ضرور تھا کہ یہ ایک نئی طرز کی چیز ہے جو اس نے بڑی احتیاط سے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے۔

ایک دن جب اس نے مجھے ساگ اور روٹی دی، اور میں قریب رکھی پیڑھی پر بیٹھنے لگا، تو اس نے کہا کہ نہیں، نہیں پت (بینا) اس کے اوپر نہ بیٹھنا۔ دوسری دو پڑی ہیں۔ ایک چھوٹا سا مورہا بھی پڑا ہوا ہے۔ تو میں نے کہا کہ تالی اس کے اوپر کیوں نہ بیٹھوں۔ تو اس نے کہا کہ یہ بڑی ادب والی پیڑھی ہے۔ کہنے لگیں کہ جب تیرا تایا نوت ہوا تھا، اور میں 19 برس کی بیوہ تھی۔ ایک لڑکی سی تھی نہ تو میرے اوپر مشکلات کا ایک پہاڑ نوٹا تو ہمارے گاؤں کے ایک مولوی صاحب نے کہا کہ کریم بی بی فکرنا۔ اللہ جو ہوتا ہے وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے: ان اللہ مع الصابرین ۵۰ اگر تو صبر کرے گی تو اللہ تیرے ساتھ ہوگا، اور اللہ سے بڑی Company کس کی ہو سکتی ہے۔ کہنے لگی کہ میں بڑی خوش ہوئی، اور میں نے تہیہ کیا، اور میں نے دور کعت نما نفل پڑھے، اور میں نے کہا کہ ”اے اللہ مجھے تقویت عطا فرما کہ میں صابر ہوں میں سے ہو جاؤں، اور صابر انہ زندگی بسر کروں“۔ چنانچہ اسی تھی کے ساتھ میں نے زندگی بسر کرنا شروع کر دی، اور میں کرتی رہی۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیا واقعی اللہ ہر وقت میرے ساتھ موجود ہے۔ یہ خیال آنے کے ساتھ ساتھ میرے اوپر ایک ذمہ داری عائد ہو گئی کہ اللہ جب موجود ہے تو ہے، آتا بھی ہے تو میں اس کو بھاؤں گی کہاں؟ اللہ کے لیے تو ایک اچھی سی کری ہوئی چاہیے نا۔ وہ میرے ساتھ جو ہے تو میں نے ایک پیڑھی لی۔ بڑی اچھی سی، نگین سی، اور اس کے اوپر یہ نوار لگائی، اور میں اس کو ہر وقت ساتھ رکھتی ہوں۔ چونکہ: ان اللہ مع الصابرین ۵۰ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہے۔ اس لیے ہم میں سے کوئی بھی اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ جبر کی ایک کہانی میرے سامنے ہے، میری زندگی کے درمیان سے ہو کر گزری ہے، تو پھر مجھے خیال آیا کہ یہ جو میرا بیٹھا ہے، یہ ٹھیک ہی کہتا ہے، اور اس کی یہ بات وزن رکھتی ہے، لیکن میری زندگی کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ دبادب ”چھیتی“، زیادہ جلدی، ترقی کرنے کی خواہش کرنا، زیادہ اور چڑھنے کی کوشش کرنا، اور وہ خوبی نہیں ملتی تھی جو انسان

کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے، لیکن ذہن میں یہ خیال آچنے کے بعد بھی میرا جو دل ہے، وہ اس پر نکالنیں۔ پھر میں جب امریکہ سے یہاں آگیا، تو میں نے یہاں آ کر سوچا کہ مجھے کسی مولوی سے یا کسی دین کے معاملات کو گھرائی سے کھٹھنے والے سے یہ پوچھنا چاہیے کہ صبر کیا ہوتا ہے، اور کیا کرنا چاہیے اس کے لیے۔ تو میرے ایک دوست تھے مولوی موسیٰ۔ وہ بہت چھریرے بدن کے آدمی، بہت پیارے مولوی۔ بڑے عجیب طرز کے آدمی تھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میری ان کے ساتھ وابستگی کیسے ہوتی۔ جس زمانے میں میں سمن آباد رہتا تھا، یہ لاہور کا ایک علاقہ ہے۔ وہاں جمعہ کی نماز میں جس مسجد میں پڑھنے جاتا تھا، وہاں مولوی موسیٰ جو تھے، وہ نماز پڑھاتے تھے، اور خطبہ دیتے تھے۔ وہاں ایک دفعہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے، اور منبر پر کھڑے تھے، اور لوگ بالکل چوکس ان کی باتیں سن رہے تھے، اور وہ خطبہ یہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق نے کہا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا میں ان سے بکرے کے گلے کی رسی تک لے کر رہوں گا، کیونکہ میرے نبی کا یہی حکم ہے۔ سب انکاری ہو گئے تھے ناکہ ہم زکوٰۃ نہیں دیتے۔ پیسوں کے معاملے میں انسان کمزور ہوتا ہے۔ جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ بات غصے سے کہی۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا، اے امیر المؤمنین! ذرا آپ رکیں، اور اس کے اوپر غور فرمائیں، تو انہوں نے غصے سے کہا کہ ”اے عمر! یہ تیرے منہ سے میں کیا سن رہا ہوں۔“ جب مولوی صاحب نے یہ بات کی، تو پیچھے ایک مڈل سکول میں کچھ بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ زور سے کسی نے کک جوماری تو وہ فٹ بال ہوا میں تیرتا ہوا، چھلتا ہوا مسجد کے صحن میں آگرا۔ جہاں ہم سب نمازی بیٹھے تھے۔ تو مولوی صاحب منبر پر کھڑے تھے۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کے Rowdyism کے، وہ ہم کو چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ وہاں فٹ بال پڑا تھا۔ تین قدم پیچھے ہٹ کر انہوں نے اتنی زور سے کک لگائی کہ وہ دو بلندگ طے کرتا ہوا واپس سکول میں جا گرا جہاں سے بچوں نے کک مار کر اس کو مسجد میں گرا دیا تھا، اور پھر وہ آ کر منبر پر کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ ”اے عمر! تو یہ کیا کہہ رہا ہے اور میں چیران ہورہا ہوں کہ جاری یہ کے زمانے میں تو تو اتنا مضبوط تھا، اور جب کہ یہ معاملہ درپیش آیا ہے تو اتنا نحیف ہو رہا ہے۔ مجھے قسم ہے اللہ کی کہ جو حکم مجھے دیا گیا، میں اس پر پورا عمل کروں گا۔“

میں نے کک مارتے ہوئے ایک مولوی کو دیکھا تو عجیب سالگتر ہے نا۔ جب خطبہ ختم ہو گیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ مولوی صاحب یہ سب.....! تو کہنے لگے کہ وہ بچے کھیل رہے تھے، اور بچوں کا شوق ہوتا ہے تو ان کافٹ بال آگرا تھا، تو وہ بچے خوفزدہ تھے کہ مسجد میں کیسے جائیں۔ بڑے بزرگ لوگ جھٹکیاں دیتے ہیں نا۔ تو یہاں بھی بہت سے ایسے لوگ ہوں گے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ان کافٹ بال تو ان کو واپس ملنا چاہیے نا۔ تو میں نے وہاں جا کر کک لگادی، اور اس کو واپس پھینک دیا۔

میں نے کہا کہ مولوی صاحب میں آپ کی تلاش میں ہوں۔ مجھے یہ بتائیے کہ صبر کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اشراق صاحب! آپ وہاں سے Start لے سکتے ہیں کہ جب بہت زیادہ ٹرینیگ ہو، اور جب گاڑیوں میں گاڑیاں پھنسی ہوئی ہوں، آگے نکلنے کا کوئی راستہ ہو، اور آپ اپنی کار چلا رہے ہوں تو آپ پس پیس نہ کریں۔ ہارن نہ بجا میں، اور نہ صرف ہارن نہ بجا میں بلکہ Steering پر اپنی انگلیاں بھی بے چینی کے عالم میں نہ بجا میں اس کو صبر کہتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ پھر ہم کیا کریں۔ کہنے لگے کہ بجائے اس پر انگلیاں مارنے کے یا کسی کو جھٹکنے کے آپ اس وقت ورد شروع کر دیں۔ اللہ کا ذکر کیونکہ یہ آپ کو آسانی رہے گا۔ آپ اس وقت آرام سے یا لطیف، یا ودود، پڑھنا شروع کر دیں۔ آپ ٹرینیگ میں پھنسنے ہوئے ہوں تو بے چینی کا مظاہرہ نہ کریں، کیونکہ ایک مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بے چین ہو، کیونکہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اس کا دین اس کے ساتھ ہے، اور اس کو جو روشنی ملتی ہے، وہ اپنے پرانوں سے، بزرگوں سے، اپنے پرکھوں سے، ساتھیوں سے ملتی ہے اس کو بھگانے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔ آپ اس وقت ورد کریں، یا لطیف، یا ودود تو آرام سے بیٹھنے رہیں۔ جب ٹرینیگ کھلے گا، مشکل دور ہو گی، تو پھر آپ نکل پڑیں۔ بجائے اس کے کہ آپ بے چینی کا شکار ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں چھوٹا تھا۔ چھوٹے سے مراد، جب میں میرک میں تھا تو میرے ایک خالو تھے۔ ان کے پاس ایک بڑے اعلیٰ درجے کی موڑ سائیکل تھی، بڑے سائز کی۔ انڈین موڑ سائیکل۔ میرے خالو پر پشوپ شوز کیوں کہا جاتا تھا؟ بس یہ ایک لفظ تھا خاص ان کے لیے۔ وہ پر پشوپ جس کے اوپر کالی نالی لگی ہوتی تھی، پہن کر بڑی شان کے ساتھ موڑ سائیکل پر بیٹھ کر لا ہو رکی سڑکوں پر دوڑاتے تھے۔ اس زمانے میں لا ہو مری 30-25 کاریں ہوں گی، اور وہ ایک ہی موڑ سائیکل تھا، جو پتا نہیں اکیلا ہی 120000 روپے تک تھا۔ اتنی اوپنجی آواز، اور اتنی اوپنجی شان، اور اس کے اوپر نہایت خوبصورت آدمی بیٹھا ہوا ہے۔، اور جب وہ لا ہو کا چکر لگاتے تھے تو ساری دنیا ان کو مند میں انگلیاں ڈال کر دیکھتی تھی۔ اوپنجی گھٹری باندھتے تھے، یعنی تھوڑی اوپر کو، اور عجیب طرح کی خوشبوئیں لگاتے تھے، میں ان کو دیکھتا تھا جو ہماری خالہ تھیں، خالہ رابع۔ جب یہ موڑ سائیکل پر نکلنے لگے، اور خوب چکر لگانے لگے، تو میں نے اپنی خالہ کو کافی پریشان دیکھا، کیونکہ میرے خالو کی زندگی میں کچھ اور ہی طرح کا ٹیز حاپن پیدا ہو رہا تھا، اور وہ کچھ اور طرح سے، اور کچھ اور لوگوں میں Popular ہو رہے تھے اور جب خاوند میں ذرا سی بھی ٹیز ہ پیدا ہو جائے تو یوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری خالہ پوچھتی تھی کہ کس طرح سے ہو کہ اکرام خان صاحب (میرے خالو) جو ہیں، وہ راستے پر آ جائیں، اور میری محبت میں بیتلار ہیں، اور ہمارا گھر آبادر ہے۔ تو اس وقت مجھے یاد ہے، کسی نے ان کو بتایا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی یہ ذکر بڑا کار آمد ہو گا، خاص طور پر خواتین کے لیے کہ جب گھر میں

اس طرح کی الجھنیں ہوں تو کیا کیا جانا چاہیے۔ تو انہیں کسی نے یہ بتایا تھا کہ آپ ایک ہزار مرتبہ یا ودود کا ورد کر کے اپنے خاوند کو کھانے پر دم کر کے کھلائیں، اور آپ بھی بیٹھ کر کھائیں۔ اس سے محبت، اور یگانگت بڑھتی ہے۔ یہ ہی ذکر ہے نا، جو مولوی موسیٰ نے بتایا تھا کہ شیئر گپ پر انگلیاں نہ بجا میں، بلکہ یا لطیف، یا ودود کا ورد کریں۔ اس سے آپ کا بھی فائدہ ہو گا۔ اللہ کا ذکر بھی ہو گا، بے چینی بھی کم ہو گی جو ہمارے ہاں Build up ہو رہی ہے، میں اپنی خالہ کو دیکھتا تھا کہ وہ بہت پریشان تھیں، لیکن اللہ کے نفل سے، اور اس رخ پر استقامت اختیار کرنے سے، ان کی یہ الجھن دوڑ ہو گئی، اور میرے خالوں جو تھے، وہ پہلے والے خالوں بن گئے۔

پھر مجھے یہ یاد ہے کہ وہ Piles کی ظالم یماری سے فوت ہو گئے، ان کا جنازہ رکھا تھا گھر میں۔ میری والدہ، اور چچی تھیں، لیکن روئے والی عورتوں میں کچھ عورتیں ایسی بھی شامل تھیں، جو بہت زور سے رو رہی تھیں، جن کو ہم نہیں جانتے تھے۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ کتنا صبر کیا جانا چاہیے۔ مولوی موسیٰ نے کہا بے چین ہونے سے لگبراءہٹ سے، چین چین کرنے سے، گھروالوں سے لڑنے سے، وہ حسن جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر عطا کیا ہے، وہ نصیب نہیں ہوتا۔ باہر کا حسن تو آدمی میک اپ کر کے کر لیتا ہے، لیکن وہ زیادہ دریٹک ساتھ تو نہیں دیتا ہے نا۔ ایک اندر کا حسن بھی ہوتا ہے۔

میں بڑی دریٹک روم جو کہ اٹلی کا دار الحکومت ہے، وہاں رہا ہوں۔ وہاں میں پڑھتا تھا اور پڑھاتا بھی تھا۔

خیر..... وہاں 53ء میں ایک صاحب ہماری یونیورسٹی میں پکھر دینے آئے جو کہ بہت نامی گرامی انسان تھے۔ ان کا نام تھا..... سر الیگزینڈر فلیمنگ یہ، وہ صاحب تھے جنہوں نے بہت سی باتیں ہوئیں، لیکن ایک موٹی بات جو انہوں نے کی تھی کہ دنیا میں سب سے زیادہ صبر کرنے والا شخص جو ہوتا ہے، وہ Scientist ہوتا ہے۔ تو یہ میرے لیے تی بات تھی، اور اچنہبھے کی بات تھی۔ مجھے مشرقی نوجوان ہونے کی حیثیت سے شاید حق پہنچتا تھا کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے پوچھوں کہ سر اس کی تفصیل کیا ہے.....؟ تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا..... ہوٹل میں نائم طے کیا۔ بڑی مہربانی تھی آنجمانی کی کہ انہوں نے نائم دیا۔ بڑی دریٹک ان کے پاس بیٹھا..... بڑے سوالات کیے..... میں آج اس کا ایک چھوٹا سا حصہ آپ کو عرض کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ سر یہ جو آپ ایجادات کرتے ہیں، اور جو آپ اتنے رتبے کے Scientist ہوتے ہیں، یہ آپ کو کیسے آ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارا کوئی اتنا بڑا کمال نہیں ہوتا۔ ہم تو ہس لیبارٹری میں جاتے ہیں، اور لیبارٹری میں

حاضر ہے ہیں، اور چوکس رہتے ہیں، اور ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ بس ہم لیبارٹری میں ڈائنس کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ درویش کا مطلب جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ سروہ تو ہے ہی ہمارا۔ یہ آپ نے تو Borrow کیا ہے ہم سے۔ کہنے لگے، جیسے ایک درویش ناج کرتا ہے، اسی طرح سے ایک Scientist اپنی لیبارٹری میں ہر وقت ہمہ تن اس ناج میں لگا رہتا ہے۔

The dance of intelligence---dance of life--- The dance of something to have----

اچھا میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اور انہوں نے کہا کہ علم جو ہے، وہ عالم مطلق کے پاس ہے۔ اللہ کے پاس ہے۔ انسان کے پاس نہیں ہوتا۔ پھر وہ ذرا سے ڈرے کیونکہ میں بالکل Young تھا۔ کہنے لگے Do you believe in God? میں نے کہا سر Believe کیا کرنا ہے، وہ تو ہے ہی ہمارا..... تو کہنے لگے اچھا..... Thanks God that you believe in God میں آپ کو بتاتا ہوں کہ علم جتنا بھی ہے، وہ اللہ کے پاس ہے، اور وہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتا ہے انسانوں کو عطا کرتا رہتا ہے..... نہ پہلے نہ بعد میں..... انسان اپنی کوشش، اور جدوجہد سے اور اپنی ہمت سے علم حاصل نہیں کر سکتا..... میں نے کہا کہ جی یہ کیا بات ہوئی..... ہم تو کوشش، جدوجہد اور Struggle کے بندے ہیں..... اس کے بغیر تو ملتا ہی کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں اس کے لیے آپ کو ایک Constant مسلسل حاضری اور ڈائنس کرنے کی ضرورت ہے۔ جھوٹی پھیلا کر، کشکول اپنا لے کر موجود ہو کر علم عطا ہو۔ وہ جب چاہتا ہے، دیتا ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ کئی ہزار برس سے درختوں کے اوپر سے سیب ز میں پر گردہ ہے تھے کسی نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ سیب تو گرتا ہی رہتا ہے نا۔ پھر اللہ نے جب علم عطا کرنا مقصود جانا تو پھر اس نے ایک فرشتے سے کہا کہ جایہ جو ایک بابا کوٹ پہن کر سیب کے درخت کے پاس بیٹھا ہوا ہے، اس کے کان میں جا کر کھدے کہ یہ Gravity ہے، تو فرشتے نے غالباً کہا ہو گا کہ Gravity..... Gravity کر دیا، اور اس طرح سے۔ علم صرف عالم مطلق اپنی مرضی سے عطا فرماتا رہتا ہے۔

پھر انہوں نے مجھے بتایا دیکھو! عمل اور کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک بیماری بڑی خوفناک ہے، اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے، اور بڑے لوگ اس سے مر رہے ہیں۔ اس کی ریسرچ پر ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ڈالر خرچ ہو رہے ہیں، اور ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں پاؤ نڈ خرچ ہو رہے ہیں، لیکن اس کا کوئی سرپریز معلوم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ میں ڈر گیا، میں نے کہا کہ یہ ایسی کوئی بیماری ہے۔ کہنے لگے، اس کو یمنہ رکھتے ہیں۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ یمنہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا جی۔ میں نے تو بھی نہیں سن۔ ہاں ایک بیماری لئی بی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ لئی بی سے بھی خطرناک ہے۔ ہم کوشش کرتے رہیں

گے۔ ہم ڈھونڈتے رہیں گے..... ہم تلاش کرتے رہیں گے..... لیکن اس کا علم صرف اسی سے عطا ہوگا، اور وہی اس کی Date مقرر کرے گا..... کوشش ہماری جاری رہے گی۔ کیونکہ یہ اس کا علم ہے۔ میں نے کہا سر! آپ کے خیال میں اس کا علاج کب مل جائے گا؟ تو کہنے لگے کہ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، میرا اندازہ ہے کہ شاید 1960ء یا 1962ء میں اس کا علم ہو جائے۔

تو پیارے لوگو! 1960ء 1962ء گزر گیا..... 90ء گزر گیا..... 92ء گزر گیا..... اب 98ء ہے..... وہ جب چاہے گا، عطا کرے گا۔ ہمیں اپنی جھوولی پھیلا کر اس کے حضور مسلسل رقص کرتے رہنا چاہیے، تاکہ وہ دے۔ اور صبر اختیار کرنا چاہیے جو وہ Scientist اپنی ریسرچ میں، اور اپنی تحقیق میں کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں دے، اور آسانیوں کو تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت صالح کی اونٹی اور پاکستان

ہم اہل زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کبھی اونٹ کی سواری کی ہے یا نہیں۔ پھر بھی ایک اندازے کے مطابق یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے اونٹ دیکھا ضرور ہے۔ ہم نے اپنے بچپن میں اونٹ کی بہت سواری کی۔ اس لیے کہ ہمارے گھر کے قریب جس گاؤں میں میں رہتا تھا، وہاں بلوچوں پر ایک ذیرہ تھا۔ بلوچ، اور اونٹ لازم و ملزم چیزیں ہیں، اور بلوچ لوگ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ میری زندگی پران کا بڑا خوشگوار اثر ہے۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے جھڑکا اور شاید ایک تھہڑ بھی مارا۔ میں منہ بسوارتا ہوا ماں بلوچن کے گھر چلا گیا۔ تو اس نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا، ابا جی نے مارا ہے۔ وہ چادر لے کر غصے سے ہمارے گھر آ گئی۔ اور کہنے لگی، ڈاکدار تو نے بچے کو کیوں مارا؟ کہنے لگے، میں نے اس کو مارا نہیں بلکہ جھڑکا۔ کہنے لگی جھڑکا بھی کیوں۔ وہ سمجھتی تھی کہ جھڑکا بھی اس قسم کی چیز ہے۔

اونٹ پر ہم بہت سواری کرتے رہے۔ پھر اس کے درمیان ایک بڑا مباوقہ آ گیا۔ 1946ء میں جب پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی تو ہمیں دریائے ستلج کے کنارے ایک لمبے سفر پر تبلیغ کے لیے جانا تھا تاکہ پاکستان کی طرف لوگوں کا جھکاؤ پیدا کیا جاسکے۔ وہاں تقریباً کچھ ایسے لوگ تھے جن کا جھکاؤ پاکستان کی طرف بہت کم تھا اور وہ مسلم ایگ سے ناواقف تھے۔ ہمیں وہاں اونٹ پر جانا پڑا۔ ہمارے پاس دو اونٹ تھے۔ دونوں جوان علی گڑھ یونیورسٹی سے آئے تھے۔ یہ ایک لمبا سفر تھا، ہم نے ایک دن میں سانچھ میل کی مسافت اونٹ پر طے کی، پھر ہماری خوش قسمتی سے وہاں راستے میں دو ڈاکوں گئے۔ ایک کا نام گامن تھا، ایک کا نام سجاول تھا۔ رنگ دار بندوقیں تھیں۔ انہوں نے ہمیں روک لیا، تم کہہ جا رہے ہو۔ ہم نے بتایا ہم ایک مشن پر جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا، ہم ڈاکو ہیں، ہمیں ایک کراڑ (ایک ہندو قوم) کو لوٹنے جانا ہے، ہمیں اونٹ دے دیں۔ ہم نے کہا، اونٹ ہمارے لیے بہت

ضروری ہیں، تم کراڑ کو بعد میں لوٹ لینا ہمارا کام زیادہ ضروری ہے۔ انہوں نے کہا، نہیں ہمارا کام تم سے زیادہ ضروری ہے۔ خیر وہ ایک بھی کہانی ہے، وہ پھر کبھی بعد میں سناوں گا۔ پھر دونوں ڈاؤن ہمارے دوست بن گئے، اور اونٹ پر بیٹھنے کا طریقہ بتایا کہ اگر کاٹھی نہ بھی ہوتا پھر اونٹ کی کوہاں پر لانگڑی مار کر بیٹھا جاتا ہے، ہر ایک کام کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا تھا آپ سے کہ چند دن پہلے کراچی جانے کا اتفاق ہوا، میں تقریباً آدمی صدی کے بعد سن پینٹا لیس کے بعد پاکستان کی سرحد کے اندر اونٹ پر بیٹھا۔ کلفشن میں آپ نے دیکھا ہوگا، اور تم نے بھی اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کیا، اونٹ پر بیٹھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اونٹ اٹھنے کے انداز میں دوسرے جانوروں سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنی بچپنی نالگیں کھڑی کرتا ہے دنیا کے دوسرے سارے جانور اگلی نالگیں پہلے کھڑی کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے اس کے اوپر بیٹھنے والا سب سے پہلے بجدہ کرتا ہے، یہ اللہ نے اس کا ایک کام رکھا ہے۔ آدمی چاہے یا نہ چاہے بجدہ خود بخود ہو جاتا ہے، پھر وہ اگلی نالگوں پر کھڑا ہوتا ہے، ہم نے کافی وقت ان اونٹوں کے ساتھ گزارا، لیکن میرے ساتھ عجیب و غریب واقعات گزرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ اس اونٹ کے رشتے سے، اور اس کے حوالے سے بھی میں یوں ایک الجھن میں بھی گرفتار ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اونٹ کے بارے میں بھی قرآن پاک میں کہتا ہے: کیا تم نے اونٹ کو دیکھا کہ کس طرح کا جانور بنایا۔ یعنی اس کے عجائب و غرائب ابھی تک پوشیدہ ہیں، اور سارے کے سارے اس کے خصائص لوگوں کے سامنے نہیں آئے، اتنا ہم جانتے ہیں یہ میلوں اور دونوں تک سفر کر سکتا ہے پانی کے بغیر۔

یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف نظریات ہیں، لیکن یہ اپنے انداز کا بڑا ہی خوب صورت جانور ہے۔ بے حد خوب صورت۔ اگر آپ نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا، اب آپ کو موقع ملے تو اسے ضرور دیکھیے گا۔ اللہ کرے آپ جائیں یا آپ گئے ہوں گے، جدے سے مدینے جاتے ہوئے بڑی خوب صورت مرکیں ہیں، کبھی بھی ریگستان کے لق و دق ٹوٹے اور کچے علاقوں میں آجائے پر آپ کو چلتے پھرتے اونٹوں کی کچھ قطار میں نظر آئیں گی۔ ان کے مالکوں نے کھلے چھوڑے ہوتے ہیں، چاندی جیسی ریت پر جیسے چاندی سے بدن لے کے دھوپ کے اندر ایک عجیب گل کھلاتے ہوئے چلتے ہیں، وہ نظارہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ہم بس پر سفر کر رہے تھے اور بس سے سر زکال نکال کر بڑی دریتک ان کو دیکھتے تھے، اللہ میاں نے کیسی خوب صورت مخلوق پیدا کی ہے۔ اس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ اسی سلسلے میں مجھے کچھ یاد آیا۔ پاکستان میں جب امریکہ کا صدر آیا، ابھی تک شاید ایک ہی آیا ہے، جس کا نام Lindon B Jhonson تھا۔ وہ کراچی اترا، تو جس چیز نے لندن بی جانسون کو متاثر کیا، وہ عجیب چیز اونٹ تھا۔ ہماری بہت گاڑیاں تھیں جو سامان، اسے بُل نقل و حرکت میں کام آتی تھیں، بہت

سارا سامان ڈھونتی تھیں۔ اونٹ گاڑیاں تھیں، یہ 1952ء کی بات ہے، وہ اونٹ سے اتنا متاثر ہوا تو اس نے کہا میں تو اونٹ امریکہ لے کر جاؤں گا، اور اس کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اونٹ کو تو نہیں لے جا سکا اس اونٹ کا سارا بان جو کہ شتر بان تھا بشیر اس کو ساتھ لے گیا، اور بشیر بچارے کو بڑی مصیبت پڑی، اور وہ روتا تھا کہ اونٹ کی وجہ سے مجھے امریکہ جانا پڑ رہا ہے۔ وہ امریکہ جانے سے گھبرا تا تھا کہ مجھے وہاں کی بولی نہیں آتی۔ اخبار میں بیان دیا، میں وہاں جا کر کیا بات کروں گا، امریکہ جا کر مجھے کیا لیں ہے۔ مجھے اونٹ گاڑی چلانی ہے، الغرض اس کو جانا پڑا۔ اس نے تنی رومی ٹوپی خریدی۔ اگر آپ نے تصویریں دیکھی ہوں تو بے چارے نے یہ کچھ کیا، وہ آزاد آدمی تھا۔

پچھلے دنوں میں اونٹ کے بہت قریب رہا۔ مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا، اونٹ کے جسمانی طور پر قریب رہ کے، اس عمر میں اس کی سواری کرنے کے بعد، ایک اور انداز سے اونٹ میری زندگی کے میری روح کے، اور میرے وجود کے، اور میری سائیکی کے قریب آجائے گا۔

میں آپ سے اونٹ کی باتیں کر رہا تھا تو میرے ذہن میں اس اونٹ کا خیال بار بار آتا ہے، جو اونٹی حضرت صالح کی اونٹی تھی، اور جو ایک مجرمے کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ قوم ثمود کی طرف صالح کو اللہ نے بھیجا تھا، اور وہ بہت اوپنے درجے کے نبی تھے انہیں حکم ہوا کہ جا کر اس بے ہودہ قوم کو راہ راست پر لاو۔ وہ بڑی بگڑی قوم تھی۔ بیشتر میں خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس دولت بہت زیادہ تھی، علاقہ بہت سربرز تھا، اردن کے علاقے سے لے کر عرب تک، اور مدینے شریف سے لے کر تبوک کے درمیانی علاقوں میں۔ وہاں جا کر ثمود کی جغرافیائی خدمت ہوتی ہے۔ لمبا چوڑا علاقہ تھا، اور ثمود کے لوگ اپنے تینیں تکبر کے مارے ہوئے اور اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتے ہوئے اوپنے پہاڑوں کو تراش کر چھینی ہتھوڑی سے اسے چھیل چھیل کر ان پہاڑوں کے اندر نہایت خوب صورت محل بناتے تھے۔ یہ ان کا بڑا کمال تھا، یعنی انہوں نے کوئی لینے نہیں ڈالا، کوئی اینٹ و پتھر جمع نہیں کیے، پہاڑ کو چھیننا، کھرچنا شروع کر دیا، اور اس کے اندر ایسے اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے ستون محابیں بنائی ہیں کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اگر آپ چاہیں تو اردن کے علاقوں میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ سلاسیڈیں بھی ملتی ہیں۔ اگر آپ کو جغرافیہ کا شوق ہے تو جیوگراف فیگزین میں گاہے بگاہے ان مخلات کی وہ تصویریں فوٹو گراف کی صورت میں، اور ڈرائیگ کی صورت میں آتی رہتی ہیں۔

تو وہ لوگ بڑے معتبر لوگ تھے، اور وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے، تب اللہ نے ایک پاکیزہ نبی حضرت صالح کو ان کے پاس بھیجا کہ جا کر ان کو اللہ کا پیغام دیں تو ان لوگوں کو نبیوں کے اوپر جو اعتراض رہا تھا، جتنے بھی نبی ان کے پاس بھیجے گئے ہیں ایک ہی اعتراض رہا ہے کہ آپ کیسے نبی ہو سکتے ہو؟ آپ ہمارے جیسے انسان ہو۔ اور کہتے تھے کہ تو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور پھر تیسری بات کہ تو

غیرب آدمی ہے، اور غریب آدمی کیسے نبی ہو سکتا ہے؟ نبی تو بہت امیر آدمی کو ہونا چاہیے۔ منتکبر کو ہونا چاہیے۔ فرعون نے بھی یہی کہا تھا کہ تم کیسے نبی ہو سکتے ہو، تیرے بازوں میں سونے کے لگن بھی نہیں۔ اور بھی جتنے پیغمبر تھے، ان کے ساتھ بھی یہی تھا۔ نوح علیہ السلام کے ساتھ بھی۔ وہ یہی بات بار بار دہراتے کہ اگر تو سر بلند ہوتا اور تیرے بھی اتنے اوپر مغل ہوتے جتنے لوگوں کے پاس ہیں، تم نے بھی ایسی عمارتیں بنائی ہوتیں، اے صالح تو ہم تم کو پیغمبر مان لیتے، لیکن اب تو تو ایک عام آدمی ہے۔ ٹھیک ہے بھلے آدمی ہو لیکن تمہاری اقتصادی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیں ہم بھی بار بار Acknowledged Condition کی بات کرتے ہیں، جب بھی کبھی مصیبت پڑتی ہے، بو جھ پڑتا ہے، تو آپ بجائے اس بو جھ کو بلا واسطہ طور پر Directly برداشت کرنے کے لیے ہمیشہ پلٹ کر اکنا مکس کی طرف جاتے ہیں۔ ہماری اکنا مکس کمزور ہے اس لیے کام نہیں کرتے۔ ہم یہی اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ ہم بہادر اس لیے نہیں ہو سکتے کہ ہم مالی طور پر کمزور ہیں۔ اچھے انسان اس لیے نہیں بن سکتے کہ مالی طور پر کمزور ہیں۔ تو وہ بھی یہ کہتے تھے کہ تم مالی طور پر بہت کمزور ہو۔ تمہارے پاس اتنے بڑے مغل ہوتے، جتنے ہمارے پاس ہیں، پھر ہم نبی مانتے۔ لیکن وہ کہتے، مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں تم کو بھلانی کرتے کی طرف بلاتا ہوں۔ تمہارا اس میں فائدہ ہے۔ میں تم سے اس کے عوض کوئی یوشن فیں نہیں مانگتا، جو کچھ ہے میں مفت میں دیتا ہوں، اور میرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ تو انہوں نے کہا ہم تجھ کو پیغمبر نہیں مانتے، اگر ہم طبیعت پر بو جھ ڈال کر آپ کو پیغمبر مان بھی لیں، تو اس کے لیے ایک شرط ہے کہ ہمیں کوئی مجرزہ دکھا دو، ثمود قوم نے کہا۔ حضرت صالح نے فرمایا، آؤ تم کون سا مجرزہ چاہتے ہو، لیکن انہوں نے Warn کیا کہ مجرزہ رونما ہو چکنے کے بعد پھر اگر تم نے خدا کو اور اس کے پیغمبر کو نہ مانا تو پھر تم پر عذاب آجائے گا۔ خوش نصیب ہیں وہ تو میں، جنہوں نے مجرزہ طلب نہیں کیا، لڑائی جھنڑا کرتے رہے ہیں، لیکن مجرزہ نہیں مانگا، وہ بچ گئے لیکن اگر مجرزہ مانگ لیا جائے اور مجرزہ طلب کر لیا جائے اور وہ رونما ہو جائے، پھر بھی نہ مانا جائے تو پھر عذاب طے شدہ بات ہے۔ انہوں نے کہا کوئی بات نہیں، ہم برداشت کر لیں گے لیکن اگر تو مجرزہ رونما کرے گا تو۔ دیکھیے ان ظالموں نے مجرزہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا، ہم یہ چاہتے ہیں سامنے چیلیں پہاڑ ہے، اور بہت چکنا و مضبوط ہے، کروڑوں سال سے اپنی جگہ پر قائم ہے، ہم یہ چاہتے ہیں تیر اللہ اس پہاڑ سے ایک اونٹی پیدا کرے۔ اب پہاڑ کا اور اونٹ کا کوئی تعلق نہیں، اور وہ اونٹ آئے ہمارے ساتھ ہماری بستی میں رہے، تو پھر ہم مانیں گے تم پیغمبر ہو۔

چنانچہ انہوں نے دعا کی، اور اللہ سے اس مجرزے کو طلب کیا کہ اگر یہ لوگ اس طرح سے ہی مان جائیں تو ان کا فائدہ ہے۔ ان چیلیں چکنے پہاڑوں کے درمیان میں سے اللہ کے حکم سے اونٹی نمودار ہوئی، اور ان کے آگے چلتی آ رہی ہے۔ پہاڑوں کا قدیمت بھی بہت بلند تھا، وہ اونٹی بھی چاندی

کا ایک مرقع نظر آتی تھی، چلتی ہوئی آگئی اور بستی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور ظاہر ہے ادھرا دھر دیکھنے لگی ہو گئی، وہاں آ کے۔ ان لوگوں نے اسے دیکھا، اور جیران و ششدار بھی ہوئے کہ اونٹی تو پیدا ہو گئی ہے لیکن اب ہم اس کو کیا کریں۔ تو حضرت صالح نے فرمایا تمہاری خواہش کے مطابق، تمہاری آرزو کے مطابق یا اونٹی انہی پہاڑوں کے درمیان میں سے پیدا ہو کر آپ کے درمیان آگئی ہے، اور اب یا آپ کی مہمان ہے۔ اب اللہ نے ایک شرط عائد کی ہے کہ بستی کے ایک کنویں سے یہ پانی پئے گی، اور اس کا ایک دن مقرر ہو گا۔ اس دن وہاں سے کوئی دوسرا آدمی پانی نہیں لے سکے گا۔ نہ مویشی نہ چند پرندہ نہ انسان۔ اونٹی ہماری معزز ترین مہمان ہے، اس کی دیکھ بھال کرنا ہمارا فرض ہے، انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم ایسا ہی کریں گے۔ کچھ دن تو انہوں نے اونٹی کو برداشت کیا، اور باری کے مطابق جو دن مقرر تھا، اسے پانی دیتے رہے، لیکن پھر انسان انسان ہے ان میں ایک آدمی ایسا پیدا ہوا جس نے، مزید آٹھ آدمیوں کو ورگلایا اور وہ نو ہو گئے۔ انہوں نے کہا، یہ کیا شرط ہم نے اپنے آپ پر عائد کر لی ہے، اور اس اونٹی کی کیا حیثیت ہے، ہم اس کا کسی نہ کسی طرح سے قلع قلع کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے رات کے وقت اس اونٹی کی کوچیں کاٹ دیں، جو کہ مخنوں کے اوپر کا حصہ ہوتا ہے۔ تو اونٹی ظاہر ہے وہاں پر اپائچ ہو کر بیٹھ گئی۔ صبح کو جب سب لوگ بیدار ہوئے، اور اونٹی کے پانی پینے کی باری تھی، لیکن وہ تشریف نہ لائی، کیونکہ وہ وہاں نہ تھی۔ جب حضرت صالح کو علم ہوا کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ تو پھر انہوں نے اپنی قوم سے کہا، یہ بہت برا ہوا، نہ صرف تم نے اس مجرم کو جھٹالایا بلکہ اس مہمان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اب تین دن کے اندر اندر تمہارا قلع قلع ہو جائے گا، اور تم نیست و نابود ہو جاؤ گے۔ پھر آنے والی تاریخ میں لوگ انگلیاں اٹھا کر بتایا کریں گے کہ یہ شمود کے رہنے کی جگہ تھی، اور یہ ان کے محل تھے جو دیران پڑے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح ویران رہیں گے۔ چنانچہ جیسا فرمایا گیا تھا بالکل ویسے ہی ہوا پہلے دن، جیسے کہ بتاتے ہیں کہ ان کے منہ پیلے ہوئے۔ اگلے دن بے حد سرخ ہو گئے پھر کالے۔ پھر ایک ایسی چلکھاز، جیسے آج کل بم بنے ہیں، چلکھاز آئی، وہ سارے کے سارے اونڈے منہ گر گئے، اور نیست و نابود ہو گئے۔

ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہوا تو اسلام آباد پہنچ کر مجھے ایک پیغام ملا کہ ایک بابا ہیں جو آپ سے ملا چاہتے ہیں، میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں۔ آپ کو علم ہے۔ پچھلے ہفتے آپ سے بابا کی بات کر رہا تھا، جو ہمارے ساتھ اسی لٹی وی شیش کا رہنے والا تھا۔ لیکن بابوں کے زار پر بابوں کی شکل و صورت، اور ان کے ڈھانچے، ان کے حلیے ان کے مزاج بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھ سے یہ آ کرنہ پوچھیں، ہر بابا میٹھا بابا نہیں ہوتا، میرے سامیں فضل شاہ صاحب جیسا۔ ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ دھوپ تھی پہاڑی علاقہ تھا۔ میرے گلے میں چھوٹا سا

صاف (لبکپڑا) تھا۔ آپ کو پتا ہے پہاڑوں کی دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے، تم بڑی مختار مختار کے باقیں بناتے ہو، اور باقیں نہ اسے ہو، میں تم کو Warn کرتا ہوں۔ یہ لفظ انہوں نے استعمال کیا۔ Warn کرنے کے لیے بلا یا ہے یہاں پر۔ تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو، اور تم لوگوں نے توجہ دینا چھوڑ دی ہے اور تم ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ دیکھو! کہنے لگے، میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ملک ایک مجزہ ہے، یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو، ہم نے یہ کیا، پھر یہ کیا، پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا، پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے، ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو۔ پاکستان کا وجود میں آنا ایک مجزہ تھا، اتنا بڑا مجزہ ہے جتنا بڑا قوم شمود کے لیے اونٹی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالحؐ کی اونٹی سمجھنا چھوڑ دو گے، نہ تم رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ میرے گلے میں موجود صافی کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری کیا کیفیت ہو گی۔ انہوں نے کہا تم نے صالحؐ کی اس اونٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ پاؤں برس گز رگئے تم نے اس کے ساتھ وہی رو یہ اختیار کیا ہوا ہے جو شمود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں، اور باہر کے رہنے والوں دونوں کو Warn کرتا ہوں، تم سنپھل جاؤ، ورنہ وقت بہت کم ہے، اس اونٹی سے جو تم نے چھینا ہے، اور جو پکھ لوثا ہے، اندر کے رہنے والوں کو لوٹاؤ، اور اس کو دو، اور باہر کے رہنے والوں کو ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں، اس کو کوئی عام چھوٹا سا، معمولی سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالحؐ کی اونٹی ہے، ہم سب پر اس کا ادب، اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا، اور اب تک جو کوتا ہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو، اور اس کو Recompensate کرو۔

میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا، اور خوف زدہ ہو کے کھڑا رہا، اور پھر ان کو سلام کر کے، سر جھکا کے واپس چلا آیا۔ میری دعا ہے، اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

We don't live in present but in future and past

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

آج کا دن میرے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ اہم ترین دن ہے، جتنے بھی زاویے گز رے، ان میں سے اہم دن ہے۔ اور شاید یہ میرے اور آپ کے درمیان ایک جدائی کا باعث بھی ہو، کیونکہ جس طرح محبت، اور یگانگت، اتفاق، قربت، اور بھائی چارہ بہت اہم چیز ہے، اس طرح جدائی بھی بہت اہم ہے۔ وصال تو اہم ہے، فراق اس سے اہم تر ہوتا ہے۔ صوفیاء اکرام کہتے ہیں، جب تک فراق کی لذت نہ چکھی جائے، اور اس میں داخل نہ ہوا جائے، اور آدمی اس کا صاحب حال نہ ہو اس وقت تک وہ منازل طے نہیں ہوتیں، جن منازل کو سامنے رکھ کر سالک نے پہلا قدم اٹھایا ہوتا ہے، اور یوں بھی حال جو ہے، یہ بہت اہم چیز ہے۔

آج کا دن ہر شخص کے لیے بہتر دن ہے، لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ آدمی بھی بھی حال کے اندر موجود نہیں رہتا۔ آپ نے یہ رسمی ہو گی کہ وہ بڑے صاحبِ حال بزرگ تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بزرگ نہ ماضی کی یاد میں بنتا تھا، نہ مستقبل سے خوف زدہ تھے، جوان کوں رہا تھا، اس پر شکر نعمت بجا لار ہے تھے۔ ہماری سب کی بد قسمتی یہ ہے، خاص طور پر سیانے پڑھے لکھے آدمی کہ وہ حال کے اوپر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ یا تو لوگ ماضی میں رہتے ہیں یا مستقبل کی تلاش میں سر گردان رہتے ہیں۔ جو لذتیں آپ کو اللہ نے حال پر عطا کی ہوتیں ہیں، ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آپ نے اپنی زندگیوں میں اکثر دیکھا ہو گا، ہم کہتے ہیں ایک وہ وقت تھا جب میرا دوست یہاں کا ڈپی کمشز تھا۔ اس نے کہا، بس یہ عرضی لکھ کر لے آ، میں تجھے کارنر پلات دیتا ہوں، پلازہ بناسکتا تھا، آج جتنا کہیں کے کہیں پہنچ ہوتے۔ تو ساری بات ماضی کی کرتے ہیں، یا یہ کچھ کرو، کل کا کچھ پتا نہیں ہے، مارے جائیں گے۔

زمانہ خراب آ رہا ہے مشکلات بڑھ جائیں گی۔ ابھی سے بندوبست کرلو۔ کبھی کبھی ہمارے گھر میں پانی ڈینگی میں ختم ہو جاتا ہے، رات کو میری بیوی ٹوٹی کھولتی ہے تو سوں سوں کی آواز آتی ہے۔ وہ کہتی ہے میں نے پہلے ہی کہا تھا، اس کا کچھ بندوبست کرلو۔

میں کہتا ہوں جگ میں پانی پڑا ہے کچھ لوئے میں بھی ہے، ہم تو رات کو سو جائیں گے، خدا نخواستہ آگ تو نہیں لگ رہی۔ کہتی ہیں آپ کیسی فضول باتیں کرتے ہیں۔ صحیح انٹھ کروہ اتنی پریشان ہوتی ہے۔ میں نے مستقبل کے بارے میں اتنی خوفزدگی کا اظہار کیا تھا، وہ مستقبل ابھی تو آیا ہی نہیں، لیکن ہم سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے آگے رکھے ہوئے اعلیٰ درجے کے پھل سے ہم لطف اندوں نہیں ہو سکتے، ماضی کی ان بیریوں کو یاد کرتے رہتے ہیں، کائنے دار جھاڑیوں کے اوپر چڑھ کے جو ہم یہ کھایا کرتے تھے۔ اکثر ہم ذکر کرتے تھے کہ جناب وہ زمانہ بہت اچھا تھا۔ مستقبل کے باغوں کو دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے ٹوکرے اتر اتر کے پھل آئیں گے۔ ہمارے ملازم کھڑے ہوں گے، رسیاں باندھ کر ان کے اوپر ترپال ڈال کئے ناکے لگا کئے دوستوں کو تھنے بھیج جا رہے ہوں گے، منڈیوں میں ہمارا پھل جا رہا ہو گا، لیکن یہ جو سامنے موجود ہے، آپ کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑا ہی آسان اور بڑا ہی مشکل کام ہے۔ ہمارے سمیت دنیا بھر کی ٹریننگ ہی ایسی ہوتی ہے۔ صاحب حال بڑا چالاک ہوتا ہے کیونکہ اس کو جتنا مل رہا، جو مل رہا، اٹھا کے جیب میں ڈال رہا ہے، مزے سے کھا رہا ہے۔ گا جرمل گئی تو گا جر کھا رہا ہے میں اور آپ اس کے انتظار میں ہیں کہ انناس ملے تو لے لوں گا، ہم کبھی بھی حال سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ حال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ زندگی کی سب سے ضروری حقیقت یہ ہے کہ حال سے فائدہ اٹھاتا رہے، اور اس کے گن گاتا رہے۔ اس سے لطف اندوں ہوتا رہے کہ اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔ ہمارے بابا جی فرمایا کرتے تھے جو حال میں جنتی ہے مستقبل میں وہی جنتی ہو گا۔ کیونکہ اسی حال کا مستقبل بننے والا ہے۔ بڑی غور طلب بات ہے، اور جو حال میں جتنا مشکل میں بنتا ہو گا، عذاب کی زندگی بسر کر رہا ہو گا، مستقبل میں بھی اتنا ہی ہو گا۔ آپ اپنا حال خراب کر کے دیکھ لیں، آپ کا مستقبل لا محالہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اس میں سیدھا آئے گی ہی نہیں۔ آپ ایک تحریک کر کے دیکھ لیں، ہم نے اس نیز ہے چمٹے کو جو حال کا ہے سیدھا کر لیا، مستقبل خود بخود خوب صورت سے خوب صورت تر ہوتا چلا جائے گا۔ میری زندگی میں صوفیائے اکرام کے علاوہ ایک ایسا شخص بھی آیا، جو بغیر جانے ہوئے حال کی کیا اہمیت ہے، اس پر حاوی تھا۔

سراج دین نامی ایک مزدور تھا، آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے میں اپنا ففتر بنوار رہا تھا، جب مزدور کی دیہاڑی تمیں روپے روزانہ ہوتی تھی، سراج چیس گھسانے کا کام جانتا تھا، بہت ذہین اور خوب صورت آدمی تھا، اچھی بات کرتا تھا اور بہت کم گو تھا۔ خوب صورت بات کرتا تھا اور لوگ اس کو

30 روپے دیہاڑی کے بجائے 50 روپے دیتے تھے، کیونکہ وہ اپنے فن کا ماہر تھا۔ وہ اپنے فن پر پوری استقامت کے ساتھ حاوی تھا۔

ایک بہت اچھا دن تھا 25 دسمبر کی بات ہے، دھوپ بہت اچھی نگلی ہوئی تھی، عام طور پر اگر آپ نے غور کیا ہو، یا کہیں گے کہ 25 دسمبر کے بعد، یا اس دن آسان ابر آؤ دھوتا ہے، لیکن وہ 25 دسمبر کا دن ایسا خوب صورت اور شفاف تھا۔ سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ میں جب دفتر آیا تو سب لوگ کام کر رہے تھے۔ کام بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا سرانج نہیں آیا؟ اس نے کہا، نہیں آیا۔ میں نے کہا، کیوں نہیں آیا؟ کہنے لگے کوئی پتہ نہیں۔ میں نے کہا، اس نے کوئی اطلاع پہنچی؟ کہا کہ نہیں پہنچی۔ میں نے کہا ٹھیکیدار صاحب کو تو اس کا نوش لینا چاہیے تھا، پتا ہونا چاہیے آج تو اس کی بہت سخت ضرورت ہے اتنا اچھا دن ہے، رگڑائی ہوئی ہے اس نے وعدہ کیا تھا کہ میں آؤں گا۔ پھر میری طبیعت میں اللہ جانے کہاں سے طیش آیا، ایسے ہی۔ حالانکہ میں تو کبھی بھی افسر نہیں بننا، لیکن اس دن میں ایک مشکل سا افرین گیا۔ کہا، اس کو حاضر کیا جائے، ورنہ اس کو کام سے نکال دیا جائے گا۔ کہنے لگے، نہیں صاحب آج نہیں آیا تو کل آجائے گا۔ میں نے کہا، نہیں وہ کہاں رہتا ہے؟ ٹھیکیدار نے بتایا اچھرہ کے پیچھے ایک کچھی آبادی ہے وہاں رہتا ہے۔ میں پتا کرنے جاتا ہوں۔ میں نے کہا، جائیں۔ جب وہ سکوٹر پر جانے لگا تو میں نے کہا ٹھیکیدار صاحب! رکیے رہنے دیں، میں جاتا ہوں۔ ڈرائیور نے گاڑی نکالی، ہم چلے گئے۔ وہاں گئے تو ایک آدمی کو ساتھ لیا۔ اس نے کہا، گاڑی یہاں روکنی پڑے گی، کیونکہ پیچیدہ گلیاں ہیں، اور کچھی آبادی ہے۔ میں نے کہا، چلو میں شدید غصے میں تھا۔ وہ لمبی چوری پیچیدہ گلیوں سے گزرنے کے بعد ایک گھر میں جس کے باہر ایک پھٹا سا پردہ لٹک رہا ہے۔ وہ جو چوکیدار میرے ساتھ گیا تھا، اس نے آواز دی سرانج! اس نے کہا، کون؟۔ میں محمد علی ہوں۔ اس نے کہا، آمودی علی بسم اللہ! اس نے کہا، باہر آ صاحب آیا ہے۔ اس نے کہا، صاحب کون؟ کہا، اشقاق صاحب آئے ہیں۔ اس نے کہا، یہاں! وہ بے چارہ حیران ہو کر چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ کہنے لگا، بسم اللہ۔ میں نے کہا، کوئی بسم اللہ نہیں اور میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو۔ میں سخت طیش میں ہوں، تمہاری مرمت کروں گا، چلو تم چلو۔ کہنے لگا، صاحب! میں کل آ جاؤں گا۔ میں نے کہ نہیں تم میرے غصے سے واقف نہیں ہو، افرار لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں، چاہے وہ بعض اوقات کتنا ہی مسکراتے رہیں، تمہیں ابھی چنان پڑے گا۔ کہنے لگا، میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں، آپ اندر آئیں، آپ آئیں اندر تشریف لائیں مجھے فخر ہو، مجھے خوشی ہو، میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ میں نے کہا، بالکل جھوٹی محبت ہے، غلط کہتے ہو، مجھ سے محبت ہوتی تو تم ضرور آتے۔ اس نے کہا، مجھے آپ اجازت دیں کہ میں کل آ جاؤں۔ اس نے کہا، آپ آئیں تو سکی۔ میری بیوی

سے تو ملیں۔ میں نے کہا، میں کسی سے نہیں ملتا، میرا آپ کا کوئی رشتہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ اس نے کہا، جناب آپ اندر آگئیں چائے کی ایک پیالی پہیں۔ میں نے کہا تو بے کرو، میں پانی بھی نہیں پپوں گا، تم چائے کی بات کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو، اور میرے ساتھ چلو، تو پھر اس کی بیوی آگئی پردے کے اس طرف۔ چاچا جی آپ آجائیں۔ مجھ کواب تھوڑی خفت ہونے لگی کہ بے چاری کہہ رہی ہے۔ اچھا بی بی میں ایک سینڈ کھڑا ہوں گا، تیرے کہنے پر اندر داخل ہوں گا۔ ورنہ یہ بہت جاہل آدمی ہے۔ اندر گیا، اس نے کہا بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا نہیں۔ تو مجھے بتا تو آیا کیوں نہیں۔ اس نے کہا، کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ میں نے کہا، کیوں نہیں آیا، تمہیں ساری وضاحت دینا پڑے گی۔ اس نے کہا بات یہ ہے کہ یہ جو نکست ہے ناں جی مشی ڈال کر نرگس کا ایک پودا لگایا تھا کل شام جب میں گھر آیا ہوں تو اس میں ایک پھول کھلا ہوا تھا تو مجھے بڑا اچھا لگا۔ دیکھیں ہمارے گھر میں آج ایک نرگس کا پھول ہے۔ یہ میں آپ کو دیتا ہوں، اس کی خوبصورتی دیکھیں کتنی اچھی ہے۔ میں تمہارے اس پھول کو بالکل قبول نہیں کرتا۔ میں تمہارے اس نکست کو باہر پھینکوادوں گا۔ تم کیا فضول بات کے لیے یہاں رہ گئے، تم کو آنا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی کہنے لگا، سر جی جب میں گھر آیا ہوں تو میری بیوی نے مجھے کہا کہا کا چلنے لگ گیا ہے، پہلے رُختا، گھننوں چلتا تھا۔ آج پہلا دن ہے کہ وہ دُگ مگ دُولے چلا ہے۔ میں نے کہا، وہ تو سو گیا ہے۔ کہنے لگی ہاں۔ میں نے کہا، اس کو جگاؤ میں تو اس کو چلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کمال کرتے ہو کا کا تو سویا ہوا ہے، میں اس کو کیسے جگاؤں۔ کہنے لگا، صح اٹھتے ہی پہلا کام میں نے یہ کیا ادھر وہ چوہبھی کے پاس بیٹھ گئی، اور میں ادھر بیٹھ گیا تو تیج میں اپنا بیٹا چھوڑ دیا وہ بھی ادھر جاتا تھا، صاحب زندگی روشن ہو گئی۔ نکست میں پھول کھلا تھا، چھوٹا بچہ تھب تھب کرتا ادھر ادھر جاتا تھا، سر جی! ہمیشہ آج کا دن دھندا دن ہوتا ہے، لیکن آج بڑا خوب صورت دھوپ والا دن تھا۔ اتنا خوب صورت دن پچاس روپے میں تو نہیں بیجا جا سکتا۔ سر میں کل آ جاؤں گا، رات بھی لگاؤں گا آپ کہیں گے تو، اور آدھی چھٹی بھی نہیں کروں گا۔ لیکن اس خوب صورت دن کو آپ رہنے دیں۔ اتنا ستانہیں بیجا جا سکتا۔ میں نے کہا، پانچ سور روپے کا بیچتے ہو۔ کہنے لگا، نہیں۔ وہ تو حال پر راضی تھا۔ وہ اکیلا آدمی میں نے دیکھا جس کا تعلق روحانیت سے ہرگز نہیں تھا، لیکن وہ صاحب حال آدمی تھا، وہ اس خوشی میں بتا تھا کہ میں ایک اچھا دن گزار رہا ہوں۔ اگے دن دیباڑی پر لگ جاؤں گا، اگلے دن یہی کام تو کرنا ہے، لیکن اس کو میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔

پرسوں میں اسلام آباد میں تھا۔ تو مجھے سراج یاد آ گیا۔ کتنے بڑے بڑے آدمیوں سے میں زندگی میں ملا ہوں لیکن سراج ان میں بہت بڑا آدمی تھا۔ میں اس کے گھننوں کو ہاتھ لگا کر آج تک یاد کرتا ہوں۔ پھر وہ دہنی چلا گیا تھا۔ پتا نہیں آج کل کہاں ہو گا۔ پرسوں میں اسلام آباد میں تھا، سیر کر رہا

تھا، اچانک مجھے سراج یاد آگیا۔ کسی کو آئن شائن یاد آ جاتا ہے، کسی کو نصرت فتح علی خاں۔ بڑے لفظوں میں کسی کو ہمارے اجمل صاحب یاد آتے ہیں، وہ فلمے کے استاد تھے۔ قدرت اللہ شہاب یاد آ جاتے ہیں میں چلتا جا رہا تھا۔ سراج یاد آ گیا۔ اس وقت میں شکر پڑیاں میں تھا۔ بہت اچھا موسم تھا، شام کا۔ میں نے سوچا اور تو میں کچھ کرنیں سکتا، پڑھا لکھا ہوں، تسلیک کامرا ہوا، مگر باہت میرے اندر شروع سے جنم لے چکی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس طرح کے فریم میں تو سیٹ نہیں کر سکتا، جیسا کہ سراج نے کیا تھا لیکن اب کوئی دیکھنیں رہا میری آرزو ہے، کچھ اس طرح سے لطف اندو زہونے کی کوشش کروں، جس طرح میں نے سراج کے چہرے کو دیکھا تھا۔ پیارے بچو! میں وہاں ایک پتھر پر بیٹھ گیا میں نے وہاں سب سے پہلے اس خدا کا شکر ادا کیا، ڈھیروں ڈھیر کیا اور دل کی گہرائیوں سے کیا، جو مجھے قیمتی ترین چیزیں مقامافت دے رہا تھا، اور وہ آ کیسین تھی، ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے اس کی آ کیسین سے قیمتی چیز کوئی کائنات میں زندگی کے لیے ہے ہی نہیں، اور وہ سب کو مفت ملتی ہے، اور میں مزے سے اس کو Inhale کر رہا تھا، موسم بڑا خوب صورت تھا۔ شام ڈھل چکی تھی، اور میں بڑے مزے سے اعلیٰ قسم کی آ کیسین کو اپنے رگ دریشے میں سمورہا تھا، اور آپ یقین کریں اور کریں گے کہ کسی سپاہی نے آ کر سیٹ نہیں بجائی، اونے بے وقوف بڑھے بابے تو Province کا آدمی ہو کے فیڈرل کی کیوں ساری آ کیسین کھینچ رہا ہے۔ میں خوش و خرم بیٹھا رہا۔ کسی نے مجھے برا بھلانیں کہا، پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ ہر حال میں موجود ہو، ماضی کی یاد میں بتلانہ ہونا، مستقبل سے خوفزدہ نہ ہونا، اس حال کے اندر موجود ہو۔ جب میں نے موجود ہونے کی کوشش کی کہ کوئی گانا بھی گانا چاہیے۔ اچھا ب مجھے گانا نہیں آتا۔ میں نے بڑا ذریغ لگایا، سوچا ہم لی وی پر، بہت اچھے اچھے گانے پیش کرتے ہیں۔ بھی کچھ اچھا سایا دآئے۔ آخر میں جب میں بالکل کچھ روہا نساہ ہو گیا، میں نے سوچا اتنا اچھا موسم ہے، سراج کو میں یاد کر رہا ہوں، جو میرا گرو ہے۔ میرا mentor ہے اور میرا یڈر ہے اب میں چپ چاپ بیٹھا ہوں، تو پھر اللہ نے میری مدد کی اور میں نے گانا شروع کیا۔ ”لب پ آتی ہے دعا بن کے“، چوتھی جماعت میں آخری مرتبہ یہ گایا تھا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر۔ سکول میں دعا کے وقت گایا تھا۔ پھر موقع ہی نہیں ملا۔ پھر اس کے بعد ہم گانے کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ خرابی یہ ہوتی ہے خواتین و حضرات! کہ ہم مستقبل سے اتنے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ہم سارا حال، ساری زندگی ساری سوچ سب برپا کر دیتے ہیں، اور بڑے سنتے بھاؤ میں پنج دیتے ہیں۔ جس چیز سے ہم فائدہ اٹھاسکتے تھے اس کو تباہ و برپا کر دیتے ہیں اور ہماری حالت بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی ہماری ایک بزرگ محترمہ تھیں۔ ایک وزیر کی بیوی، کسی زمانے میں چین کا مشہور بادشاہ تھا ”منگ“، ”ذائنائشی“ کا۔ اپنے وزیر کو ناراض ہو کے کسی وجہ سے پھانسی کی سزادے دی۔ مقررہ وقت پر جب اس کو پھانسی دی جاتی تھی۔ بادشاہ کا دستور تھا کہ جس

قیدی کو بھی پھانسی دی جاتی تھی تو بادشاہ خود صبح سوریے اٹھ کر بندی خانے (قید خانے) میں آتا تھا، اور اس سے پوچھتا تھا تیری کوئی آخری خواہش ہے، تو میں اس کو پوربی کرنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ ایک خوب صورت سفید گھوڑے پر سوار ہو کر آیا، اور اس نے اپنا گھوڑا بندی خانے کے باہر بروکا، اور اندر گیا۔ اپنے وزیر سے ملا۔ وزیر سے کہنے لگا، کہو کیا حال ہے۔ کہنے لگا، میں بڑا خوش و خرم ہوں۔ آج شام مجھے پھانسی ملے گی اور اب آپ مل گئے۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا، تم تکڑے ہو، ہاں میں تکڑا ہوں، لیکن ذرا بادشاہ سلامت آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ چھوٹے سے جھروکے میں سے ایک نہایت خوب صورت سفید گھوڑا باہر بندھا ہے۔ میں نے ایسا گھوڑا کبھی دیکھا نہیں۔ میرے بڑوں کا علم میرے پرکھوں کا علم، مجھے یہ بتاتا ہے کہ یہ تو اڑنے والا گھوڑا ہے، چلنے والا نہیں۔ بادشاہ نے کہا، یہ تو میرا گھوڑا ہے۔ سوار ہو کے آیا ہوں۔ اس نے کہا، حضور یہ آپ کو کہاں سے مل گیا۔ میں نے تو آپ کا سارا اصطبل دیکھا ہے۔ بادشاہ نے کہا ابھی کچھ خراسان سے سو دا گر آئے تھے، اور گھوڑا دے گئے ہیں۔ وزیر نے کہا حضور یہ تو اڑنے والا گھوڑا ہے۔ یہ تو کمال کی چیز ہے، بادشاہ نے پوچھا لیکن یہ کیسے اڑے گا۔ اس نے کہا، اس کوڑینگ دینی پڑے گی۔ بادشاہ نے پوچھا ٹریننگ کون دے؟ وزیر کہنے لگا، میں دوں گا۔ بادشاہ بولا کتنی دیر لگے گی۔ کہنے لگا، ایک سال لگے گا۔ آپ اس پر بیٹھیں گے جیسے بوٹنگ جاتا ہے، شکا گو سے ٹیکاس۔ جدھر مرضی جائیں، گھوڑا اڑے گا۔ کہنے لگے تھیک ہے، کھول دو دروازہ۔ باہر آ جاؤ، اور گھوڑے کی یہ باغ پکڑو۔ تم اس کوڑینڈ کرو۔ تمہیں ایک سال کے بعد پھانسی دی جائے گی۔ اس نے کہا، منظور ہے۔ وزیر گھوڑا لے کر چھلانگ مار کر اس کے اوپر بیٹھا، اور ایڑی لگا کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کی بیوی نے چھینیں مارنا شروع کر دیں، یا اللہ تو کیسے آ گیا؟ تجھے تو پھانسی ہو گئی تھی۔ اس نے کہا، پرواہ کر۔ یہ بات میں نے بادشاہ کے ساتھ کی ہے اب ایک سال کی چھٹی ہے۔ مزے کرتے ہیں، گائیں گے، خوش رہیں گے۔ اس نے کہا، ایک سال ابھی ختم ہو جائے گا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس نے کہا، تم اس حال کے اندر کیوں رو رہی ہو؟ لیکن وہ بدستور روتی رہی۔ کہنے لگی، ایک سال تو ایک مٹ میں ختم ہو جائے گا۔ پھر وہی کیفیت آ جائے گی۔ بہتر یہ تھا کہ تجھے آج ہی پھانسی مل جاتی۔ میں ذہنی طور پر تیار تھی، جیسے انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر یہ سال میرے سینے پر خیز کی طرح نکلتا رہے گا۔ نہیں نہیں ایک سال کے اندر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وزیر گھوڑا لے کر صبح نکل جاتا، اور مزے سے جو جو گھبیں نہیں دیکھیں تھیں، وہ بھی دیکھیں، اور اعلیٰ درجے کا اسے گھوڑا ملا ہوا تھا، اور کیا چاہیے تھا۔ چنانچہ وقت گزرتا رہا، دن پر دن گزرتے رہے۔ وہ روتی ہوئی بیوی کو کہتا، بھلی لوگ کچھ بھی ہو سکتا ہے تو کیوں فکر کرتی ہے۔ اس نے کہا، نہیں میرا جو فکر ہے، اندر سے نہیں جائے گا، لیکن وزیر خوش و خرم رہا۔

خواتین و حضرات! ہوا یہ کہ تین مہینے بعد تنہوں مر گئے۔ بادشاہ، وزیر، اور گھوڑا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور آدمی اپنے حال کو بر باد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرتا رہتا ہے۔ میں آپ سے یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا۔ اپنے حال کو خوش تر، خوب تر بنائے رہتا، اور خوش و خرم رہنا۔ آپس میں محبت کی رسم جو ہے اگر پہلے اس کی بنیاد نہیں ڈالی تھی، تو ضرور ڈال کے دیکھنا۔ اس کے بڑے فائدے ہوتے ہیں اور اس کی لہرس بڑی دور دور تک پہنچتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو محبت مجھے آپ نے اس پروگرام کے ذریعے دی، سب کو دی۔ سارے ٹوی والوں کو دی۔ وہ آپ کا بہت بڑا ایک انعام ہے اور بہت بڑا حسان ہے۔ ہم اس کے لیے دنیاوی طور پر اور انسانی طور پر آپ کے شکر گزار ہیں اور خالق کائنات کے اس اعتبار سے کہ سب کچھ نعمتیں وہی عطا کرتا ہے۔ اپنے بندوں کے ذریعے اپنے بادلوں کے ذریعے، اپنی ہواویں کے ذریعے۔ آپ اتنی جلدی خوفزدہ نہ ہو جایا کریں۔ میں نے اخبار کے لوگوں سے پوچھا، آپ اتنی خوفناک خبریں کیوں چھاپتے ہیں، تو انہوں نے کہا کہ، خبر ہوتی ہی خوفناک ہے، جو خوفناک نہ ہو وہ خبر نہیں بنتی۔ میں نے کہا، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے کہا، ہر روز تیز گام پشاور سے کراچی چلتی ہے، کوئی خبر نہیں بنتی۔ جس دن اس کا ذبہ الٹ جائے، تیرہ آدمی مر جائیں تو وہ خبر بن جاتی ہے۔ سیدھے سے چھا آدمی بڑے مزے سے تاش کھیل رہے ہیں۔ ایک آکر کہتا ہے السلام علیکم، کیا حال ہے بھائیو! خوش ہو، راضی ہو، دیکھو میں ایک اعلیٰ درجے کا کھیر الایا ہوں۔ نمک لگا کے ایک ایک پھاڑی سب کو دیتا ہے، خبر نہیں بنتی۔ اگر چھا آدمی تاش کھیل رہے ہیں، ایک آدمی پستول لے کر آیا، اور تین بندے پھر کادیے، یہ خبر بن گئی تو ایسی خبر بنانے سے پہلے پر سکون بات محبت کی بات ہے۔ ہمارے آپ کے درمیان چلتی رہنی چاہیے، جو چیزیں آپ کو ڈراتی ہیں، وہ مصنوعی ہوتی ہیں۔ ڈرانے والی چیز کوئی نہیں۔ اگر کوئی چیز ڈرانے والی ہے، تو وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، بہت خوش رکھے۔ بہت سی آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

دُعا

میں سوچتا ہوں کہ آپ لوگ بھی میری طرح کے ہی ہوں گے، کیونکہ جو جو کوتا ہیاں خامیاں مجھے میں سراٹھاتی ہیں، ان مشکلات سے آپ بھی گزرتے ہوں گے، آپ بھی تو میرے ہی بھائی بہن ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں کئی بار اس کا اعتراف کر لیتا ہوں، کئی دفعہ نہیں کرتا، اور آپ کیونکہ معزز ارکان ہیں سوسائٹی کے اس لیے، چھپا کے گزر جاتے ہیں۔ مثلاً میں یہ سوچا کرتا ہوں اور میری یہ ایک مشکل ہے کہ جب کبھی کوئی سڑک چوراہا کراس کرتا ہوں تو مجھے سرخ ہتی ہی کیوں ملتی ہے۔ میں جب بھی گزر ا رہوں، مجھے سرخ ہتی ہی ملتی ہے۔ یہ پتا نہیں میری قسمت ہے۔ اچھا چیلے مل گئی، میں وہاں کھڑا ہو گیا، پھر یہ کیوں ہوتا ہے کہ سرخ ہتی کالمحروم ہے وہ آدھے گھنٹے پر محیط ہوتا ہے، بزر جو ہوتی ہے وہ دس سینٹ میں بدلتا ہے، بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے، کہ یا اللہ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور اس میں میں بہت پریشان ہوتا ہوں کہ کیوں یہ ہوتا ہے۔

میں پرانے زمانے کا آدمی ہوں، جب میں نئے زمانے کا آدمی نہیں تھا تو میں لال صابن سے نہاتا تھا، ہمیشہ۔ اب بھی لال صابن سے نہاتا ہوں، تو میری بہو جو ہے وہ بہت چڑی ہیں اور وہ شرمندہ ہوتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں ماموں یہ آپ خدا کے واسطے چھوڑیں لال صابن نہانے کے لیے نہیں ہوتا۔ تو میں نے کہا، بھی ہم ایک زمانے سے یہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ کہتی، دیکھیں میں آپ کو اچھے والا صابن دے رہی ہوں، اس سے نہا میں، وہ صابن ہوتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ ”ایکر سوں کے حسن کا راز اس صابن میں ہے“، کچھ اس قسم کی چیز ہوتا ہے اور بہت اچھا خوب خوشبودار اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے، تو میں اس سے جب نہاتا ہوں، خاص طور پر اپنے پیارے لال صابن سے بھی تو خواتین و حضرات یہ کیوں ہوتا ہے کہ نہاتے وقت جب صابن ناٹھ سے چھوٹ جاتا ہے تو وہ غسل خانے کے آخری کونے میں ہی کیوں جاتا ہے۔ پاؤں کے پاس کیوں نہیں گرتا، میں پھر منہ کو صابن لگا ہوا ہوتا ہے اور میں اس کو نلاش کرتا کرتا بڑی مشکل سے وہاں پہنچتا ہوں، اور پھر نہاتا ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ

صابین گرے قدموں میں گھننوں کے پاس آ کر ٹھنون کے درمیان کھڑا ہو جائے۔ میں آرام سے پکڑوں اور نہانا شروع کر دوں، لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ یہ مشکلات ہیں میری۔ مثلاً میری بیوی مجھ سے کہتی ہے کہ آپ جائیں، یہ بہت ضروری فارم ہے، یہ آپ بینک میں خود جمع کرو کے آئیں۔ پچھلے دنوں جب میزرک کے امتحان تھے ناکسی ملازم کا بچہ وہ میزرک کا امتحان دے رہا تھا، وہ باہر سے آئے ہوتے تھے، تو اس نے (میری بیوی) کہا کہ جی آپ کروا کے آئیں۔ آپ کا بھی یہ تجربہ ہو گا، اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اس مشکل مرحلے سے گزرے ہوں گے، اور گزرتے ہوں گے۔ جب آپ بینک میں جاتے ہیں تو بعض اوقات بینک کا نیجر دباؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے دو قطاریں لگا دیتا ہے، تاکہ جلدی جلدی کام ختم ہو۔ ڈاکٹر صاحب! اکثر یہ ہوتا ہے، میں جس قطار میں کھڑا ہوں وہ آہستہ چل رہی ہے، اور وہ جو دوسری ہے تیز چل رہی ہے، بڑا دکھ ہوتا ہے مجھے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں مفلوک الحال اُس ملک کا، یہ کیوں سُست چل رہی اور وہ کیوں تیز چل رہی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں۔ پھر اللہ نے مجھے عقل عطا کی ہے۔ میں اپنی سُست والی روچھوڑ کے تیز والی میں چلا جاتا ہوں، یوں میں وہاں پہنچتا ہوں تو وہ سُست چلنے لگ جاتی ہے، وہ دوسری والی جس کو میں نے چھوڑا تھا وہ تیز چلتی ہے۔ تو زندگی کے اس پیچ و خم سے مجھے بڑی شکایات رہتی ہیں اور میں جھگرتا بھی رہتا ہوں، لیکن ہوتا یہی ہے، پھر جب میں شام کو تھک ہار کے واپس آتا ہوں، تو پھر میں شکوہ شکایت نہیں کرتا، کیونکہ یہ ہوتا ہے تو سب کے ساتھ ہوتا ہے، یا میرا دُڑن ایسا ہے یا مجھے یوں لگتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کے سارے پہاڑ بھی پر ٹوٹے ہیں، یہ سرخ بھی کوملتی ہے، میرا ہی صابین پھسل کر کونے میں جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں ایک تکلیف دہ بات جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا، وہ یہ ہے کہ یہ جو دعا ہوتی ہے ناجب ہم دعا مانگتے ہیں، اس کے مانگنے کے وقت اور اس کے مانگنے کے طریق کو اپناتے ہوئے مجھے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب بھی پڑتا تھا بھی پڑتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ کبھی کبھی نماز پڑھنے کے بعد جب میں الْحَيَاةِ پر پہنچتا ہوں تو میری جان آفت میں پڑ جاتی ہے، پھر میں کھنکھٹ اس کو ختم کر کے، اور سلام پھیرنے کی کرتا ہوں، اور جب میں سلام پھیرتا ہوں! تو پھر آگے آتا ہے دعا کا مرحلہ تو دعا کے مرحلے میں دینا آتِنَا فِي الدِّنِ حَسِنَاتُ وَ فِي الْآخِرَةِ حَسِنَاتٌ وَقَنَا عَذَابَ النَّارِ کر کے بھاگتا ہوں تو اس کا لکشن جو ہے، جس کے حضور میں دعا پھیل کی جاتی ہے، جڑتا نہیں۔ پتا نہیں کیوں دعاء مانگتے وقت مجھ پر یہ کیا کیفیت طاری ہوتی ہے کہ میں اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں، حالانکہ دعا تو بنی اس لیے ہے کہ آپ اپنی عرضہ اشت لے کر جائیں تھا میں رکھ کے، روتے ہوئے منہ بسورتے ہوئے، اور جو دہاں ایک بالکل جس کو کہتے ہیں نا ”پچھے“ پڑ کے، بس وہیں کے ہو رہیں، اور اس سے کہیں یا اللہ اس کو منظور کرنہیں تو میں نے واپس گھر نہیں جانا۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ جو چیز ملتہا ہے مقصود

ہوتی ہے ساری عبادت کی، وہاں پر آ کر ہم رک جاتے ہیں۔ میرے خیال میں، اور وہ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہو گا، کیونکہ میں نے عرض کیا کہ بہن بھائیوں کا رشتہ بڑا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اب یہ بھی ایک مسئلہ رہا میری زندگی میں کہ دعا کو کس طرح سے اپنایا جائے، اور کس طرح سے اس کو اپنی آغوش میں لیا جائے، گرفت کو مضبوط کیا جائے، لیکن یہ فن ہمیں کسی نے سکھایا نہیں، ہمارے بڑوں نے ٹھیک طرح سے بتایا نہیں۔ یہ ذہونڈنا پڑتا ہے خود ہی۔ اب جب دعا اتنی تیزی سے مانگی بھی جاتی ہے تو پھر اس میں دوسری کوتا ہی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم اکثر ویژتھری یہ شکایت کرنے لگتے ہیں کہ بڑی دعائیں مانگیں، بہت وہاں ایڑیاں رگڑیں پکھ فائدہ نہیں ہوا۔ اللہ ہماری دعاتو قبول ہی نہیں کرتا۔ پہلی بات تو میں یہ سمجھ کر کرتا ہوں کہ جو دعا میری طرف سے مانگی گئی ہے وہ تو پچھی ہی نہیں۔ جو تار ہے کہت کہت والا وہ تو پورا گیا ہی نہیں، وہاں جلدی سے ہم نے کر دیا تو اب جب تک کیوں کیش نہیں ہو گی، تو بڑی مشکل بات ہو گی، پھر کیسے ہمارے درمیان رابط قائم ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ قبول کیوں نہیں ہوتیں دعا میں۔ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ آدمی اکثر سوچتا ہے، دعا میں بڑی خلوص نیت کے ساتھ مانگی جاتی ہیں، اور بڑی درد مندی کے ساتھ مانگی جاتی ہیں، تو قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ تو میں جسے اکثر ذکر کیا کرتا ہوں اپنے پروفیسر انگارتی جو پروفیسر تھے انہیں کے اور ملک الشعر ابھی تھے ہم مشکل باتیں ان سے پوچھا کرتے تھے۔ ان کا نہ ہب ہی اور تھا اور زبان بھی اور تھی، لیکن وہ اتنے بڑے استاد تھے کہ ہم سارے یونیورسٹی کے پروفیسر کھڑے ہو جاتے تھے ان کے احترام میں، جب بھی وہ تشریف لاتے تھے۔ خود زیادہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن ان کی دانش کی وسعت ایسی تھی کہ اس کی آغوش میں ساری چیزیں سارے مشکل سوالوں کے حل موجود ہوتے تھے۔ تو میں نے پروفیسر انگارتی سے پوچھا کہ سر مجھے آپ یہ بتائیں دعا کے بارے میں کہ یہ دعا قبول کیوں نہیں ہوتی، اور آدمی دھکے کیوں کھاتا پھرتا ہے۔ بچپن، اور جوانی پروفیسر انگارتی کی سکندریہ میں گزری تھی، مصر کی بند رگاہ جو ہے۔ ان کے والد کا وہاں پر ایک چھوٹا سا سور تھا اگر وسری کا۔ یہ وہاں پڑھتے تھے، اور ظاہر ہے جب بچہ وہاں بڑھا پلا، تو وہ عربی زبان پر بھی حاوی تھے، بہت اچھی طرح سے جانتے تھے، اور انہیں ان کی مادری زبان تھی جس میں وہ شاعری کرتے تھے۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اشراق بات یہ ہے کہ میں اس معاملے میں بہت تخصیصی اندازِ فکر رکھتا ہوں، کیونکہ میں نے دعا کے بارے میں بہت غور کیا ہے، نہ صرف خود بلکہ اسکندریہ کے علماء بھی میں نے اس پر بحث و مباحثہ کیا، تو ہمارے سکندریہ کی ایک چھوٹی مسجد کے جو مولوی تھے، عالم تھے، ان سے میں نے یہی سوال پوچھا جو آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ کہا کہ دعا کے قبول ہونے کے تین رخ ہیں۔ ایک یہ کہ جیسی دعا آپ نے مانگی ویسی ہی قبول ہو گئی۔ اور ایک دعا اس کی قبولیت کے لیے، اللہ کو، ظاہر ہے وہ تو مکلف نہیں ہے، کوئی زحمت نہیں ہو سکتی۔

ایک دعا آپ کی رک جاتی ہے، وہ یہ کہ آپ نے اللہ سے ایک پھول مانگا ہوتا ہے کہ یا اللہ مجھے زگس کا ایک پھول عطا کر، مجھے اس کی بڑی آرزو ہے، اور اللہ نے ایک ٹوکرہ تیار کر کھا ہوتا ہے پھولوں کا آپ کے لیے۔ جب آپ بار بار ایک پھول کی رٹ لگاتے ہیں۔ تو اللہ کہتا ہے میں اس کو کیسے سمجھاؤں کہ میں نے تو اس کے لیے، بڑی نعمتوں کی تیاری کر رکھی ہے، لیکن جب آدمی بہت اصرار کرتا ہے، بہت زور دیتا ہے، تو پھر کہتا ہے، چلو اسے ایک پھول ہی دے دو تو کراں بھی رکھ لو۔ لیتا ہی نہیں ہے اب کیا کریں اس کے لیے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ آپ نے مانگا ہوتا ہے، وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ملتا ہے آپ کو۔ آپ کی Judgment آپ کی عقل پر، آپ کی دانش پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ آپ کو زیادہ ملتا ہے۔ تیرسا انہوں نے کہا یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دعا مانگی تو جاتی ہے، لیکن وہ Deffer (رد) کر دی جاتی ہے۔ تاخیر میں ڈال دی جاتی ہے ملتوی کر دی جاتی ہے کہ ابھی اس کو یہ نہیں دیں گے۔ مثلاً دیکھیے! جس طرح آپ اپنے بچے کو اس کے بہتر مستقبل کے لیے کچھ پیسے دینا چاہتے ہیں، تو آپ اس کو اسی وقت نہیں دیتے، اس کے لیے آپ ایک ڈیپنس سیونگ سرٹیکیٹ خرید لیتے ہیں کہ وہ سال کے بعد ایک تو اس کی رقم بھی زیادہ ہو جائے گی، اور ایک انعام بھی پائے گا۔ جو لوگ بہت زیادہ گھبرا تے ہیں، اور گلے پڑتے ہیں، اور سینہ زوری کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میری دعا کیوں نہیں قبول ہوئی؟ میری جو بھیجیاں بھا بھیجاں ہیں وہ میز پر مکامار کے کھتی ہیں، دادا دیکھیے Why me؟ یہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ میری بھتی کیوں بند ہوئی۔ میں موڑ چلا رہی ہوں، یہ Red (سرخ بھتی یار کرنے کا اشارہ) جان بو جھ کر دیتے ہیں۔ بہت غصہ ہوتا ہے ان کو۔ میں نے کہا، تم میں اتنی Courage کہاں سے آگئی؟ تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اچھا ہے اللہ میاں مجھ سے محبت فرمارہا، کبھی میرا کام ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہے، لیکن تم تو مکامار تی ہو میز کے اوپر اتنی زور سے، کہ نہیں جی میں تو بہت مقدار حیثیت رکھتی ہوں، میرا درجہ بہت بڑا ہے۔ پروفیسر یہ کہتے تھے کہ سکندریہ کی مسجد کے مولوی صاحب نے کہا، کئی دفعہ تو ایسا ہو گا کہ جب آپ آگے (آخرت میں) جائیں گے تو تاخیر کے لیے رکھی دعاؤں کے وہ جو انعام ہوں گے وہ اتنے بڑے، اور اتنے ارفع ہوں گے کہ آپ کو سرت ہو جائے گی کہ یا اللہ کا ش وہ دوسرا دعا دنیا میں پوری نہ ہوتی، یہاں ملتا تو اس کا مجھے فائدہ ہوتا۔

عبد کی شان بھی ہے کہ وہ دعا کرتا ہے، ہماری بھی تو ایک شان ہے نا۔ ہم بھی تو کوئی گرے پرے لوگ نہیں، ہم دعا کریں گے۔ دے گا تو پھر وہی دے گا۔ اسی کی مرضی کے مطابق ہو گا ہم اس میں گھبرا جاتے ہیں کہ یہ چونکہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے ہم میں کوئی کوتا ہی ہے یا پھر ہمارے مالکے جانے میں کوئی کمی.....؟ تو میں سمجھتا ہوں، مالکے میں کوئی ایسی کوتا ہی ضرور ہے جس کے اوپر توجہ دی جانی چاہیے۔ بعض اوقات کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آتا کہ ہے کہ پشیمانی جو اس کی ہے

وہ خود بڑی اچھی دعا کا ایک روپ اختیار کر لیتی ہے۔ کوئی شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کو منانے کے لیے وہ اللہ کے حضور میں اپنے تخلیل میں، جو لحاظ اس کو میر آتے ہیں، اسے نالئے کی کوششیں کرتا ہے کہ مجھ سے یہ کوتا ہی ہو گئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن دعا مانگن مشکل یوں ہے کہ دعا مانگنے والا آدمی سب سے پہلے اپنی ذات کے آگے کھڑا ہو کے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میں نہایت نالائق، کم ظرف، جھوٹا ملتکبر، کینہ، گھٹیا آدمی ہوں، مجھ سے کوتا ہیاں ہوئی ہیں اور اب ان کوتا ہیوں کو دور کرنے کے لیے میں ایک سبک رہا چاہ رہا ہوں اور وہ اللہ کے واسطے مجھے سہارا عطا کیا جائے، لیکن انسان میں تکبر، اور انا اتنی ہوتی ہے، یہ جو میں عرض کر رہا تھا کہ جلدی سے ”ربنا ظلمنا انفسنا“ پڑھا اور پھر بھاگتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ انا اتنی بھری ہوتی ہے دعا کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ انا کا پورے کا پورا توڑنا، اور پھر ایک بھکاری کی طرح اپنا ایک ٹھوٹھا (کشکول) لے کر جانا۔ انا اتنی خالم چیز ہے، اور اتنی ملتکبر، اتنی ٹھوڑی چیز ہے کہ یہ نسبت آگسانی تھے، نصاریٰ کے بہت بڑے بزرگ صوفی۔ ٹھیک اللہ کے پیارے تھے، تو وہ ایک دن دعا مانگ رہے ہیں، بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ، اور ان کی دعا مشہور ہے، وہ کہتے ہیں:

O God make me pious but not today

”اک دن ہور دے دے شرارتاں کرن لئی،“ یعنی اللہ میاں مجھے نیک بنادے، لیکن آج ہی نہ بنادینا، تھوڑا سا وقت مجھے مل جائے، اور۔

میں اتنا کی بات کر رہا تھا، ایک بڑے طوفان میں گھر گئی ایک ملاج کی کشتی، جو پرانے زمانے میں باوبانی کشتی لے کر چلتے تھے وہ ملاج وہ بھری قراقر قسم کا آدمی تھا کشتی ڈولنے لگی، طوفان کی لپیٹ میں آگئی، تو بچے عورتیں آدمی چھین مار کے رو نے لگے۔ تو انہوں نے کہا، اے بد بخت ملاج ہم سارے دعا کر رہے ہیں اللہ سے، تم یہ شکایت عرض لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہیں کہ ہم کو بچا، تو چپ کر کے ہیجا ہوا ہے، تو بھی کچھ کہہ۔ اس نے کہا میں نے کبھی دعا مانگی نہیں، میں تو ملاج ہوں، ڈوہتی ہے تو ڈوہبے؟ انہوں نے کہا، نہیں تو خدا کے واسطے ہم میں شامل ہو تو اس نے کہا، اچھا ٹھیک ہے۔ اس نے کہا، اے اللہ یہ لوگ مجھے اس بات پر مائل کرتے ہیں کہ میں تجوہ سے دعا کروں، اور درخواست کروں، میں نے پچھلے پندرہ سال سے تجوہ سے کوئی دعا نہیں مانگی، لیکن ان کے مجبور کرنے پر دعا مانگ رہا ہوں، مہربانی فرمائے اس طوفان کو بند کر دے، تاکہ یہ سلامتی سے کنارے پر اتر جائیں اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ اگلے پندرہ سال میں تجوہ سے کوئی دعا نہیں کروں گا۔ انسان کے ذہن میں یہ بات چلتی رہتی ہے۔ اسی لیے دعا مانگتے ہیں، ورنہ یہ کمال کا کام ہے دعا کرنا۔ کبھی آپ کو ایک دیوار میسر آجائے، اور مغرب کے بعد کا وقت ہو، اور اس سے ڈھونگا ناصیب ہو جائے اور پھر آپ کا جو

Hot line پر کیوں نیکیش آرام آرام کے ساتھ، پھر وہ جو دعا چلتی ہے، ادھر سے اس کا Response ملتا ہے، اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ ہاں یہ دعا قبولیت کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض اوقات کوئی خفت شرمندگی جو ہے، وہ بھی دعا کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ چلتی رہتی ہے جو نبی آدمی خفیف ہوا، شرمندہ ہوا، اس کی انا ثوںی، وہ بڑی نعمت کی گھری ہوتی ہے، پھر انسان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ وہ ابدیت کے دائرے میں پورے کاپورا سمaja تا تھے۔

میرے دفتر میں ایک اکاؤنٹ آفسر تھے، بیشن نام تھا ان کا۔ وہ کام کرتے تھے، وہ بڑا ریگول آدمی تھا وقت پر آنا، نکا کر کام کرنا، وقت پر جانا، اور پچھہ کام Over time کا ہوا۔ اس نے کبھی اور ناکم جوان نہیں کیا۔ وہ دل و جان کے ساتھ، اور لمس کے ساتھ کام کرنے والا تھا۔ ایک دن وہ دفتر صح آن کے بجائے ساز ہے بارہ بجے کے قریب آیا، تو میں باہر کھڑا مالی کے ساتھ کوئی بات کر رہا تھا، تو وہ گزر۔ میں نے کہا، یہ آپ کے آنے کا وقت ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا، لیکن شاید میں تھوڑا غصے میں تھا۔ اس نے کہا، میں معاف چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں معاف کہنے سے تو کام نہیں بنے گا، ساز ہے بارہ کوئی نام نہیں ہے، چلیے آپ دس منٹ پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتے تو خیر.....؟ میں تو اس کا بہت سختی سے نوش اول گا اور میں آپ کی A.C.R. میں لکھوں گا۔ کہنے لگا، نہیں سر۔ یہ ساری بات کر کے میں نے کہا، آپ میرے دفتر میں آئیں، بات کریں، تو وہ آ کے بینجھ گیا۔ وہ انا کی بات جو میں آپ سے عرض کر رہا تھا اس نے آ کر کہا، میں بہت معاف چاہتا ہوں، میں بڑا شرمندہ ہوں کہ میں وقت پر نہیں آ سکا۔ میں نے کہا خالی شرمندگی سے پچھنہیں بنایا تو آپ کو Explain کرنا پڑے گا۔ کہنے لگا، نہیں، بس آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں باس تھا، جیسے ہوتا ہے باس، ایک نہایت بے ہودہ چیز۔ یعنی باس کچھ بھی نہیں ہوتا، انسانیت تو ہوتی ہی نہیں، اس میں۔ تو میں نے کہا، نہیں۔ وہ کہنے لگا بات یہ ہے کہ میری بیٹی تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے، وہ رات اپنی ماں سے جھگڑی اور غصے میں آئی، ماں کی اور بیٹی کی کچھ تو تو میں میں ہوئی، وہ گھر سے نکل گئی، میں آیا تو روکے کہا میری بیوی نے کہا شاہزادی تو نہیں ہے۔ میں نے کہا، میں کہاں ڈھونڈوں سردیوں کی رات میں اسے۔ ساری رات بے چارہ آدمی شریف سا، نیک سا آدمی اور جوان بیٹی، وہ چلتا رہا تلاش کرتا رہا۔ بعد میں کافی تلاش کے بعد مجھے خیال آیا، وہ ایک سیلی کا ذکر کیا کرتی تھی، وہ یہاں شہری مسجد کے پاس.....؟ تو میں اندازے سے، زور لگا کے، شاید جھگڑی ہے بڑی ہے، اللہ کرے اس کے پاس چلی گئی ہو، ورنہ زمان جیسا خراب ہے، آپ اسے جانتے ہی ہیں، اور بیاپ کا جو حال ہوتا ہے برا، تو میں گیا تو اس گھر کا دروازہ جا کے ٹکٹکھایا رات کے وقت ڈریڑھ بجے۔ تو اس سیلی کا والد نکلا، میں نے اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا شاہزادی، تو اس نے کہا دونوں سہیلیاں سوئی ہوئی ہیں۔ تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں نے کہا شکر ہے یا اللہ۔ صح میں اپنی بیوی کو لے کر گیا، اس کی منت خوشامدگی، تو میں ذرا

سائبینہ کے سو گیا کرسی پر ہی، تو سائز ہے بارہ بجے میری آنکھ کھلی، تو میں یہاں آگیا ہوں۔

جب وہ یہ بات کہہ چکا خواتین و حضرات، اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے پاس اس کو جواب دینے کے لیے یا خفت مٹانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں انھا میرا اپنا ففتر تھا، اس کے پیچھے چھوٹا کرتا تھا، اس میں جائے نماز بچھا کر میں نے دور کعت نماز خفت پڑھی، اور میں نے اللہ سے معافی مانگی، اب مجھ میں اتنی جرأت تو نہیں رہی تھی کہ میں اس سے معافی مانگتا، لیکن میں نے شرمندگی مانلنے کے لیے یہ دونفل جو تھے ادا کیے، اور وہ دون، اور آج کا دن، اس واقعہ کو سولہ سترہ برس ہو چکے ہیں، اب لڑکی کی ماشاء اللہ شادی بھی ہو چکی ہے اس کے دون بچے بھی ہیں، ایک بیٹا، اور ایک بیٹی وہ اس عید پر مجھ سے ملنے بھی آئے تھے۔ میں نے ان کو پانچ پانچ روپے دیئے۔ بچوں نے کہا دادا اس پر دستخط کر کے دو تو میں نے کہا بظاہر تو یہ پانچ روپے کا نوٹ ہے، میں دستخط کروں تو یہ پانچ ہزار کا ہو جائے گا۔ اس نے کہا، اسی نے کہا بظاہر تو یہ پانچ روپے کا نوٹ ہے، تو اس کا باپ بھی تھا، تانبا بھی تھا، وہ چلے گئے تو میں اب بھی اتنے برس گزر لیے تو ہم کروار ہے ہیں، تو اس کا باپ بھی تھا، تانبا بھی تھا، وہ چلے گئے تو میں اب بھی اتنے برس گزر جانے کے باوجود جب بھی کبھی موقع ملتا ہے، کیونکہ اس کی میں مکافات نہیں کر سکا جس سختی سے پیش آیا تھا، اب بھی میں جب کبھی موقع ملتا ہے تو پھر میں دونفل خفت کے ضرور پڑھتا ہوں کہ مجھ سے کوتاہی ہوئی، میں تھیک نہیں رہ سکا، یوں تو ہر ہر لمحہ ہر ہر قدم پر ہوتی رہتی ہیں، تو میں جلدی میں، چونکہ وقت کم ہوتی ہے پروفیسر انگارتی کی بات بتاتا ہوں، اور یہ راز کی بات ہے، جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی، خاص طور پر آپ کے لیے کہ دعا مانگنے کے لیے انہوں نے کہا کہ زبانی دعا مانگنے سے بہتر ہے کہ عرضی پر لکھ کر مانگی جائے، اچھا صاف ستھرا پاک سا کاغذ لیں، اور اس کے اوپر بسم اللہ لکھ کے محترم جناب اللہ میاں یا جو بھی آپ لکھ سکتے ہیں جمل جلالہ یا جو لکھ کے کہ حضور مجھ پر یہ مشکل ہے، اور میں یہ سوچتا ہوں، ایک پیر اگراف، دوسرا پیر اگراف، تیسرا پیر اگراف، اور ادب سے اس کو لپیٹ کے جیب میں ڈالیں۔

اگلے دن آپ نے کوئی Amendment کرنی ہوا س میں ترمیم کرنی ہو تو وہ بھی اس میں کرتے رہیں لکھتے رہیں، اور اس عرضی کے اوپر جب تک آپ توجہ نہیں دیں گے آپ میری طرح سے ہی دعا مانگنے رہیں گے، ربنا آتنا فی الدنیا حستناو..... اس میں تو پورے پورے داخل ہوں، ویسی ہی عرضی جو آپ سرکار کو ڈالتے ہیں دو لکھ کی سرکار کو، اور پھر اتنے چکر لگاتے ہیں اس کے پیچھے۔ ایسا ہی کاغذ۔ اللہ ان کا بھلا کرے میرے پروفیسر کا، انہوں نے کہا، یہ لکھا کرو۔ تو یہ دعا کا ایک طریق تھا، جوانہوں نے بتایا، میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، آپ اسے آزمائے دیکھیں، اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

قول اور عمل

اس محفل میں یہ بات طے نہیں ہوتی یا میں سوچ کے نہیں آتا کہ آج کیا بات کریں گے، پھر میں گفتگو کے دوران ہی پچھنے کچھ نکل آتا ہے، اور وہ آپ تک پہنچ جاتا ہے، لیکن آج پہلی مرتبہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ آپ اپنے بابا کے بارے میں بات ضرور کریں۔ پہلے پہلے ابتداء میں تو کی، پھر اس کے بعد پچھا اور موضوعات رہے، پھر کہیں ان موضوعات سے پھسل کر آگے نکل گئے، تو آج یہ فرمائش جو ہے مجھے بھی دل سے پسند آتی ہے۔

اور آپ سب نوجوان ہیں، اور یہ بات میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ بابے کون ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہماری زندگیوں میں آگئے، اور ان کے ساتھ کیا تعلق ہوتا ہے، اور ملتان میں بابے زیادہ کیوں ہوتے ہیں، اور شہروں میں کم کیوں ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ تو چونکہ یہ فرمائش کی گئی ہے تو میں یہ عرض کروں کہ ہمارا ایک ڈیرہ تھا، جہاں میں یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد ولایت میں رہنے کے بعد ولایت کی یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد جب لوٹ کے یہاں آیا، تو 1954ء میں اس ڈیرے پر گیا۔ اس ڈیرے والے کا نام تھا حضرت ساہ میں فضل شاہ صاحب۔ نوروالوں کا ڈیرہ اسے کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں اس کی، اور اندر کچھ بھیز بکریاں، اور ایک بھیں بھی ہوتی تھی۔ صفائی کا انتظام ایسا اچھا نہیں تھا، کیونکہ جب آدمی صفائی کی طرف توجہ دینے لگتا ہے تو باہر کی صفائی کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اندر کی صفائی کی طرف کم ہو جاتی ہے، خیر یہ میرے لیے ساری نئی باتیں تھیں، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس نوعیت کا، اور کسی قسم کا ہوگا۔ ہمارے بابا جی بے چارے تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا، لیکن انہوں نے کہیں سے انگریزی کا لفظ نوٹ Note سیکھا ہوا تھا۔ جب کوئی بات بہت خیال انگیز ہوتی تھی، نہایت provoking Thought کے کہتے تھے نوٹ۔ تو ہم سب چونکہ کرتوجہ ہو جاتے تھے کہ کوئی بات نہایت اہم ہوگی، اور ہم اسے سنبھال کر کھیس اور یہ آئندہ زندگی میں کام آئے گی۔ اسی طرح ان کے ارد گرد جلوگ تھے، ان کو بھی

انہوں نے خطاب دے رکھے تھے ماذر ان قسم کے۔ مثلاً وہاں پر ایک ڈاکٹر صاحب تھے اشرف فاضلی صاحب، تو دوسرے جوان کی خط و کتابت کا کام کرتے تھے وہاں ڈاک آتی تھی، جو اس کا جواب دیتے تھے ان کو وہ سیکرٹری صاحب کہتے تھے۔ جو حساب و کتاب پیسے دیے لوگ دے جاتے تھے کہانے والے کے تو ان کو وہ فنا نس سیکرٹری کہتے تھے۔ تو یہ لوگ بھی بڑے خوش ہوتے تھے کہ بیٹھنے بٹھائے اتنے بڑے رتبے مل گئے، ایک روز ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں بہت اچھی باتیں ہوتی ہیں، اور بہت توجہ طلب باتیں ہوتی ہیں کیوں نہ یہاں سے ایک رسالہ نکالا جائے، اور وہ چھاپا جائے، اور چھاپ کے لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ بڑی اچھی بات تھی، ایسے ہی ہوتا ہے۔ تو ہم نے بیٹھ کے رسالے کی پوری ایک ڈی تیار کی؛ اس کا فارمیٹ سوچا، ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب اس کے ایڈیٹر قرار دیجے۔ سیکرٹری صاحب ظاہر ہے منتظم اعلیٰ وہی تھے میں نے کہا، اچھا میں بھی کچھ لکھوں گا، سارا پکھہ تیار کیا تو ہم یہ ساری سکیم بنانے کے ان کی خدمت میں لے گئے۔ ہم نے کہا جی کہ ہم ایک رسالہ نکالنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے کہا، پہلے بھی ایک رسالہ نکالا یہاں سے، تھوڑی دیر کے لیے پھر بند ہو گیا۔ تو کہنے لگے، آپ رسالہ کیوں نکالنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، اس لیے کہ ہم آپس میں اتحاد اور Unity پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، اور میں گے، اور ان کو یہ Message جو ہے، یہ دو روز تک پہنچتا رہے گا، اور استفادہ ہو گا، ہماری بڑی آرزو ہے کہ مسلمان ایک ہوں، ان میں Unity ہو، ان میں اتحاد ہو، ان میں تکمیل ہو۔ تو آپ نے کہا Note۔ جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے اور صرف قول کے اندر رہنے سے فرض، اور حق پورا نہیں ہوتا، کیونکہ اس ساری چیز کا تعلق قول سے ہے اور عمل اس سے مختلف چیز ہے، اگر آپ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اور آپ بھی اکثر سوچا کرتے ہیں، اور گھر میں بات بھی ہوتی ہے، تو قول سے، گفتگو سے کہلی نہیں ہوگی۔

دیکھیے ہمارا اللہ ایک ہے، ہمارا رسول ایک ہے، ہمارا نماز پڑھنے کا طریق ایک ہے، ہمارا قیامت کے اوپر ایمان ایک سا ہے، لیکن اس کے باوصف یک جھیٹ نہیں ہوتی۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوچنے کی بات تھی تو ایسی باتیں بابوں کے ہاں سے ملتی ہیں کہ جب تک ایک دوسرے کا دکھور دنہیں سنو گے، ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانو گے، کون کس کیفیت سے گزر رہا ہے، تو اس محض گفتگو کر دینے سے کام نہیں بننے گا۔ کہتے تھے، Note، جماعت عملاً ایک دوسرے کا ساتھ دینے سے وجود میں آتی ہے، خالی قول کے ساتھ جماعت کی تکمیل کا حق ادا نہیں ہوتا، تو آپ عمل میں داخل ہوں گے تو پھر یہ حق ادا ہو گا، تو پھر یہ کام ہو گا اور نہیں ہو گا۔ ہم اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہ ایک کتاب رسالہ اخبار نکالتے ہیں، اگر ہم ایک پیچھر دیں، اگر پروفسر جا کے سچ پر کھڑا ہو کر ایک بات بتا دے اور وہ سٹوڈنٹ کے ذہن میں اتر جائے، اس سے ان کے اندر تکمیل پیدا ہو جائے ایسا ہوتا نہیں۔ کبھی بھی نہیں ہوا۔ دنیا

کے کسی خطے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قول کی اہمیت نہیں ہے۔ کہی جانی والی بات کی اہمیت نہیں ہے، یقیناً ہے۔ لیکن بایا جی فرماتے ہیں کہ Note، قول ایک سواری ہے، جو آپ کو عمل کے کنارے پر لے جاتی ہے۔ خرابی یہ ہوتی ہے کہ ہم قول کی سواری کو اختیار کرتے ہیں، اس کشٹی میں بیٹھتے ہیں، چھوپلاتے ہیں، عمل کے کنارے پر بیٹھتے ہیں، لیکن اس کشٹی کو چھوڑتے نہیں ہیں، اس کے اندر رہتے ہیں، وہ وہیں چکر کا ٹھی رہتی ہے، عمل کا کنارا سامنے رہتا ہے، اور ہم اس کی طرف جانہیں رہے ہوتے، اور ہم کوشش یہ کرتے ہیں پڑھنے لکھنے لوگ، نوجوان میرے ساتھ ہیں، ہم کوششیں صرف یہ کرتے ہیں کہ کمپنیکیشن سے، صرف ڈائیلگ سے، صرف گفتگو سے بات بن جائے گی، کبھی نہیں بن سکتی۔ کیونکہ انسان کا وجود اس کی سائیکلی، اس کا ہونا اس بات کا مقتضی ہوتا ہے کہ کوئی بندہ میری بات سے اور میرے دکھ درد میں شریک ہو۔ یہ جو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا، آج کل خود کشیاں ہو رہی ہیں، لوگ خود سوزیاں کر رہے ہیں، عام طور پر ایک اچھا جرنلست یہی کہتا ہے کہ چونکہ ملازمتیں نہیں مل رہیں، بھوک نگ بہت ہے، اس وجہ سے یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں، یہ بات نہیں ہے۔ اس وقت آپ کے پاکستان کا نوجوان خاص طور پر ایک عام آدمی اس کندھے کی تلاش میں ہے، جس پر وہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ بیان کر سکے، اور کوئی کندھادیتے کے لیے تیار نہیں، کسی کے پاس وقت ہی نہیں۔ اگلے زمانے میں، ہمارے زمانے میں، ہمارے باپ دادا کے زمانے میں، دکھ سکھ کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ان کے پاس اکنامکس کے اتنے مالک، اور اتنی پر اپلدر نہیں تھیں۔ ولایت والوں نے یہ طریقہ نکلا کہ وہ دکھ سننے کے لیے نہیں لیتے ہیں۔ یہ سائز کا ٹرست جو ہوتے ہیں سائیکلو تھر اپسٹ جو ہوتے ہیں، یہ آپ سے تین سو ڈالرنی گھنٹے لیتے ہیں، اور کہتے ہیں پرسوں پھر آ جانا، تم اپنے دکھ بیان کرو، مجھے پیسے دے دو۔ ہمارے ہاں بھی اب ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ اگر آپ لا ہو رکی نہر کے کنارے جائیں تو دو تین بورڈ آپ کو نظر آئیں گے ماہر نفیات کے۔ جو یہ کہتے ہیں، اگر آپ نے اپنا دکھ بیان کرنا ہے تو دوسرو پیسے گھنٹے مجھے دیں، دکھ اپنا بیان کر کے چلے جائیں تو وہ بھی ایک تھیراپی ہے، لیکن پہلے زمانے میں ہمارے ہاں مفت اور عام ہوتی تھی۔ اب لوگ اتنے مصروف ہو گئے کہ کسی وجہ سے، پھنس گئے تو جب تک عمل کے اندر آدمی داخل نہیں ہوگا، دوسرے آدمی کو یقین نہیں آئے کہ یہ میرا کچھ لگتا ہے، میرا کچھ بھائی بند ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے تقریر کر کے چلے جائیں گے، تو اس کی انفرمیشن میں اضافہ ہو جائے گا، اور خطرہ یہ ہے کہ وہ یہ ساری انفرمیشن سمیت کے ایک اگلے آدمی سے وہ بات کرنے لگ جائے گا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا، بھی آپ نے ہمارے ٹیلی وڈن کے پروگرام دیکھے ہیں دینی باتیں، سوالوں کے جواب بڑی تیزی سے دیے جاتے ہیں۔ وہ انفرمیشن ہوتی ہے اس کا ذات کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ یا اپنی سائیکلی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں

ہوتا۔ تو آپ نے ہمیں منع کیا کہ دیکھیے ایسے نہ کریں، رسالہ نہ چلا میں، چھوڑیں اس کام کو۔ کسی کے کام آسکتے ہیں تو وہ چھوٹا سا کام کریں۔ میں نے کہا، جی کام (اب میں اتنا پڑھا لکھا آدمی جب میں بہت نوجوان تھا، اور سوٹ پہنچتا تھا تحری پیش، اور سونے کی پن لگاتا تھا نائی میں)۔ میں نے کہا میں کسی کے کیا کام آسکتا ہوں، میں تو ایک معزز آدمی ہوں، پروفیسر ہوں۔ کہنے لگے، نہیں یقیناً آپ کام آسکتے ہیں۔ کہنے لگے، یہاں اماں جی رہتی ہیں۔ وہاں صابن کی پکھڑ دکانیں تھیں، وہاں پر ایک مائی تھی، والی کا وہ کام کرتی تھی، تو اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ تو کہنے لگے، اس کی بیٹی کی شادی ہے اور اس کا جو منگیر ہے اماں نے لڑا کا چننا ہے۔ وہ سینکلیر ہے، بابا جی نے پتا نہیں لفظ کہاں سے سیکھا، سینکلیر وہ ہوتا ہے جو موری کے اوپر تار باندھے، کہنے لگے وہ سینکلیر ہے ملکہ ڈاک بنگلہ میں۔ ڈاک بنگلہ نہر کا بنگلہ۔ انگریز کے زمانے میں یہاں ریل تار ڈاک کا انتظام بہت غصب کا تھا۔ جب یہ نہریں کھودیں انہوں نے ان کے کنارے پرے اعلیٰ درجے کے بنگلے بنوائے، بچ ٹریز واںے بنگلے، ان میں فلمیں بھی بڑی شوٹ ہوتی تھیں، اعلیٰ درجے کی اس کے اندر بلند تکمیں ہوتیں تھیں، اور وہاں پر ایک آفس بھی ہوتا تھا، جہاں پر سینکلیر کند کر تھا، خدا نخواستہ اگر نہر میں کوئی خرابی ہو، پانی روکنا ہو یا کوئی اور کھٹا کھٹ ہو۔ تو وہ سینکلیر کو بہت بڑی چیز سمجھتے تھے۔ 60 روپے تختواہ والا سینکلیر۔ وہ لڑکا بھی پسند کر لیا تھا۔ تو مجھے کہنے لگے، تمہارے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی ہے، وہ سینکلیر کا بابا جو ہے وہ آرہا ہے تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے کہ لڑکی کتنا کام کرتی ہے، چار پانیوں کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھتی ہے کہ نہیں، شام کو بسترے بچھاتی ہے کہ نہیں، گھڑا پانی کا بھر کے لاتی ہے کہ نہیں، تو وہ وہاں رہے گا پکھڑ دن، وہ جور و نیکی کھاتا ہے وہ گندم اور لکنی کا آٹا ملا کے کھاتا ہے، اب بخوبی دیکھیں اس کا۔ تو تمہاری ذیوٹی یہ ہے کہ تم وہ سیر پکا مکنی کا آٹا اپنی موڑ میں رکھ کر اماں جی کے پاس پہنچاؤ۔ میں نے کہا، مجھے کوئی اچھا سا کام دیں لکھنے کا یہ کیا ہے۔ مجھے کہنے لگے، وہ اس لیے دینا ہے کہ ہم نے اس بابے کی عزت افزائی کرنی ہے، اور ہماری بیٹی کی شادی ہے۔ تو میں نے کہا، اچھا جی تو میں گیا بھی، اس سے ملا بھی بابے سے انہوں نے کہا، خبر دار اس کی بہت عزت کرنی ہے، اور اس کو سلام کرنا ہے۔ میں نے کہا، جی میں دو مرتبہ کرنے کو تیار ہوں۔ جب میں لوٹ کے آیا گلے دن۔ تو کہنے لگے وہ حق پیتا ہے تو میں نے کیکر کی چھال جو ہے نا جس کو کیکر کے سکڑے کہتے ہیں، تو اس کا کولکہ بہت اچھا ہوتا ہے، اور جو پرانے بابے حقہ تمبا کو پینے والے ہیں، اس کی آگ دھرتے ہیں، تو یہ سکڑے جو ہیں یہ تھے سیر ڈیڑھ یہ نہیں دے دو۔ میں نے کہا، جی دفع کریں چھا سا آدمی ہے۔ وہ کہنے لگے نہیں نہیں، یہ نہیں کہنا۔ وہ اللہ کی مخلوق ہے، اور وہ انبیا کا بیٹا ہے۔ میں نے کہا، وہ بندہ۔ کہنے لگے، ہاں حضرت آدم کی اولاد جو ہے۔ اچھا وہ ہر ایک کو کہتے تھے کہ نبی کا بیٹا ہے، تو ہماری برکت ہو گی، لو جی یہ نبی کی دھی، ہمارے ڈیرے پر آگئی ہے۔ خیر ہمارے لیے یہ بات سکھنی بہت مشکل تھی، تو جب انہوں نے

یہ ڈیوٹی لگائی، ہم بہت روئے پیٹھے کہ رسالہ چلنے سے رہ گیا۔

امریکہ سے کوئی صاحب آئے ہیں، انہوں نے مجھے یہی فون کیا کہ اشناق صاحب! میں پتا نہیں کتنا ملین ڈالر اکیس ہر س امریکہ رہنے کے بعد کما کر لایا ہوں، میں نے اسلام آباد میں کچھ کام شروع کیا ہے اسلام یک جہتی، اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لیے، تو آپ آئیں۔ تو میں نے کہا، سنیں آپ جو بھی کریں گے ٹھیک ہو گا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے کیا کروں گا۔ میں آپ کو کوئی اچھا سماجھا و نہیں دے سکتا۔ کہنے لگے، نہیں آپ ضرور آئیں۔ تو میں نے یہی فون پران سے کہا، دیکھیے آپ ایک بہت بڑی ساری بلڈنگ بنائیں گے، پھر اس میں آپ ایک سیکیشن رکھیں گے، اس میں درس قرآن شروع کریں گے، پھر تجوید کا رکھیں گے، پھر آپ قرأت سکھائیں گے، بس یہی چیزیں ہوں گی۔ یہ آپ کرتے رہیں، اچھی بات ہے، لیکن وہ جو آپ کی آرزو ہے کہ لوگ جو ہیں، وہ ایک جماعت کا رخ اختیار کریں، تو وہ عمل کرنے سے کام ہو گا، اور رسالہ چھانپنے سے نہیں ہو گا۔ اب بھی جو دینی جماعتیں ہیں، وہ بار بار یہی کہتی ہیں، آپ نے دیکھا ہو گا بے شمار لوگ آپ کے پاس بھی آتے ہیں، کتنا میں آتی ہوں گی شاید، بڑی اچھی بات ہے۔ وہ کشتی ضرور ہے، وہ ساحل تک ضرور لے جاتی ہے، لیکن ساحل پر خود اس کو اترنا پڑے گا، اب ہمارے لیے یہ بات بڑی مشکل ہو گئی کہ یہ کیسے کریں؟ کہ ہم اس کو چھوڑ کر عمل کی طرف آئیں۔ انہوں نے کہا اگر Unity چاہتے ہیں آپ، اتحاد چاہتے ہیں، تو پھر آپ کو عمل کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ ایسے کام نہیں بننے گا۔

ایک مرتبہ ہم لاری پر جو ہر آباد جا رہے تھے، بڑی دری کی بات ہے میرے ساتھ لاری میں ایک، اور معزز آدمی پرانی وضع کے ریٹائرڈ تھے، گرمی بہت تھی، انہوں نے پگڑی رکھی ہوئی تھی گود میں، ہوا آرہی تھی۔ تو ایک خاص علاقہ آیا، تو انہوں نے پگڑی اٹھا کے سر پر رکھ لی، اور ادب سے بیٹھ گئے تو میں مجس آدمی تھا۔ میں نے کہا، جی یہاں کسی بزرگ کا مزار ہے۔ کہنے لگے، نہیں۔ میں نے کہا، جی کوئی درگاہ ہے یہاں۔ کہنے لگے، نہیں۔ تو میں نے کہا، معاف کیجیے گا، میں نے یہ دیکھا ہے کہ آپ نے پگڑی جو ہے وہ گود سے اٹھا کر سر پر رکھ لی ہے، تو با ادب ہو کے بیٹھ گئے ہیں، کوئی وجہ ہو گی۔ کہنے لگے، بات یہ ہے کہ میں اس علاقے کا واقف ہوں، یہاں ڈیزرت تھا، اور ریت تھی، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تو حکومت نے سوچا کہ اس میں کوئی فصل اُگائی جائے۔ تو لوگ آتے نہیں تھے، ایک آدمی آیا، اس نے آ کر جھونپڑا بنا کر یہاں پانی کی تلاش میں ٹیوب ویل وغیرہ سنک کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا آدمی تھا، جس نے یہاں سبزہ اگایا، جس نے عملی صورت میں اس زمین کو ہریالی بخشی، تو میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں، پتا نہیں وہ آدمی کہاں ہو، میں نے اس کے احترام میں یہ پگڑی اٹھا کے رکھ لی۔ دیکھیے یہ ایسی چیزیں ہیں، جو ہماری زندگی کے اوپر عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی ہیں، اور اگر آپ

اپنی آنکھیں بالکل کھلی رکھیں۔ ماشاء اللہ کھلی رکھتے ہیں، کان بھی، تو آپ کو اور دگر ذاتی کہانیاں ملیں گی، جن کے اوپر آپ نے اس سے پہلے توجہ نہیں دی ہوگی۔ ہمارے استاد تھے پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب، تو ہم سیانے تھے۔ میں فتح حابیر میں پڑھتا تھا ان کی ایک عادت تھی کہ جب کسی کی شادی ہوتی تھی تا، لڑکی کے گھر والوں میں، تو ان کے گھر جا کر بارات کو لکھنا کھلانے کا بندوبست ان کے سر پر ہوتا تھا۔ تو صوفی صاحب نے ہم کو کہا کہ چلو بھی فلاں گھر میں کھانا برٹانا ہے دینا ہے، بارات آگئی ہے۔ مجھے یاد ہے ہم بھائی دروازے بتیاں والی سرکار کے پیچھے ایک گھر تھا، وہاں چلے گئے۔ انہوں نے کہا، لوگی صوفی صاحب آگئے، فکر کی کوئی بات نہیں، نائی دلگیں لے آئے۔ اب جو بارات تھی اس کے بارے خیال تھا کہ 80 کے قریب بندے ہوں گے۔ وہ 160 کے قریب آگئے۔ اب صوفی صاحب کی آنکھیں، اگر آپ میں سے کسی کو یاد ہیں ماشاء اللہ بہت مولیٰ تھیں۔ گھبرا گئے، اور ان کے ماتھے پر پیشنا اور ناک پر بھی آ جاتا تھا۔ کہنے لگے، اشراق ہن کیہہ کریے۔ میں نے کہا، پتا نہیں، دلگوں میں پانی ڈال دیتے ہیں۔ پہلا موقع تھا۔ میں Fifth year کا سنوارہ تھا۔ انہوں نے ایک تھپڑ مارا میرے منہ پر۔ زور سے۔ کہنے لگے، یہ تو قوف آدمی اس میں پانی، ڈال کے مرتا ہے۔ وہ تو فوراً ختم ہو جائے گا۔ اس میں کھی کا پیپا ایک اور ڈالا ہے۔ گاڑھا ہو جائے گا تو کھایا نہیں جاتا۔ اب ہم اندر سروے کر رہے تھے، اور صوفی صاحب بیچ میں سے نکال کے ڈالتے جاتے تھے۔ ہم باراتیوں سے کہتے اور لامیں۔ وہ کہتے تھے گرم لاو جی۔ ہم تو بھاگے پھرتے تھے۔ اب آخر کیفیت یہ آگئی کہ دلگیں ختم ہو گئیں، اور ان کا چہرہ دیکھنے والا تھا وہ کانپ رہے تھے۔ اگر کسی نے اندر سے کہہ دیا کہ اور کاب بھیجیں، تو ان کے پاس دینے کے لیے صرف ایک رہ گئی تھی، لیکن وہ ذرے ہوئے تھے۔ جب خوفزدہ تھے تو اندر سے آواز آئی بس۔ جب دوسرا بندے نے کہا، بس جی صوفی صاحب۔ تو صوفی صاحب کے ہاتھ میں جو پکڑا ہوتا تھا وہ گرا، اور اتنی شدت سے پیچھے گرے کہ وہ بڑا سا کڑھا و تھا، شکر ہے، ان کے سر پر نہیں لگا تو ہم نے اٹھا کے ان کو بستر پر لٹایا، اور ناٹکیں پاؤں دبائے۔ جب تلی ماش کی اٹھ کے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا، خدا کے واسطے ایسی ٹینشن کا کام آئندہ نہیں کرنا۔ کہنے لگے، نہیں بالکل نہیں، میری بھی تو ب۔ وہاں سے ہم چل پڑے، پیچھے ہم شاگرد۔ اب آگے آگے صوفی صاحب، کوئی پندرہ میں گز سے زیادہ گئے ہوں گے۔ ایک مائی باہر نگلی، کہنے لگی، لو غلام مصطفیٰ میں تو تینوں لبھ دی پھر فی آں۔ ”تاریخ رکھ دتی اے۔ تیرہ بھا دوں دی کا کی دی“ تو صوفی صاحب جو توبہ کر کے نکلے، کہنے لگے، کاغذ ہے، ہاں پنسل ہے۔ کہنے لگے، ہاں۔ لکھ تیرہ سیر گوشت ایک بوری چوں صوفی صاحب لکھوار ہے ہیں۔ تو میں نے کہا، جی یہ پھر ہو گا۔ کہنے لگے، نہیں یہ تو ان کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا، آپ صرف پڑھایا کریں کتاب کی تشریح وغیرہ۔ تو یہ ان کا کام تھا، تو یہ جو عمل کی دنیا ہے، اس میں داخل ہونا ضروری ہے۔

عالم لوگ پڑھ لکھے میرے جیسے۔ پروفیسر بات کرنے والے، ایڈیٹور میں لکھنے والے، کہتے ہیں گفتگو اگر ہوتی رہے، اگر اس طرح کا مواد پچھتا رہے، تو لوگ ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے۔ جب میں بہت تنگ آ جاتا تھا، بھی لاڈ میں ہوتا تھا۔ تو میں پوچھتا تھا ان سے، کہ بابا جی یہ بتا میں کہ دین کیا ہوتا ہے، اسلام کیا ہوتا ہے، مومن کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے ایک دن پوچھا ان سے۔ میں نے کہا، جی بابا جی بتا میں کہ مسلمان کون ہوتا ہے؟ کہنے لگے، مسلمان وہ ہوتا ہے جس کا دل صاف ہو، اور ہاتھ گندے ہوں۔ میں نے کہا، حضور یہ بات میری سمجھے میں نہیں آئی۔ کہنے لگے، جو بھائیوں کے کام کرتا رہے گا، اس کے ہاتھ تو گندے ہوں گے، جو آرام سے بیٹھا ہو گا دستا نے پہن کے، اس کا تو سچھ نہیں خراب ہونا ہے۔ تو مسلمان وہ ہوتا ہے، جو اس کا گارانگا ہے، اس کی اینٹ اٹھانی ہے، اس کے لیے لکڑیاں لا کر دینی ہیں، جو روتا ہے اس کے آنسو پوچھنے ہیں۔ وہ ہوتا ہے مسلمان۔ ہم کو تو ایسی Definition کسی کتاب میں نہیں ملتی ہے۔ یہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے ایسی چیزیں ملتی ہیں تو اب عمل میں داخل ہونے کے لیے کیا سچھ کیا جائے، کیسے کیا جائے، یا یہ بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ گفتگو بڑی آسان ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، احسن صاحب، ٹیلی کمپنیکیشن کے چیف انجینئر ہیں۔ وہ کہتے ہیں جتنی بھی فارن کا اثر ہوتی ہیں، ان میں اکثر لوگ یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہور ساؤ کیہ حال اے۔ ہور ساؤ بھی کہتا رہتا ہے آدمی۔ یا زیادہ سے زیادہ موسم کا حال پوچھتا ہے۔ تو کہنے لگدے، اگر ان ٹرینک کاں میں سے لانگ ڈسٹنس کا زیں سے "ہور ساؤ کیہ حال اے" کو جمع کیا جائے اور جتنا ناکم وہ جنتا ہے، اس ناکم کے اندر ساؤ ہے تین میل بھی سرگنگ کھو دی جا سکتی ہے۔ وہ عمل میں ٹرانسلیٹ کر رہے ہیں نا اس کو۔ تو اب یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ نے دین کو کس حساب سے اختیار کرنا ہے۔ با بے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہوں اور اپنے ہاتھ گندے رکھو، اور دل اپنا صاف ستر رکھو، پھر تو مزہ ہے، پھر Unity ہو گی، کہے بغیر۔ لکھے بغیر۔ یہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا کہ آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کرنے سے ہوتا ہے، اور ان کے قریب جانے سے ہوتا ہے، ان کی دکھ درد کی کہانی سننے سے ہوتا ہے۔ نہ بھی کچھ کر سکیں تو ایک کان ضرور ان کے ساتھ لگا کر بیٹھیں، ان کو بڑی ضرورت ہے، سارے اس بات کے لیے تقاضا کر رہے ہیں کہ آئیں، اور ہمارے پاس بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

بaba جناح

پچھلے کئی پروگراموں سے ہم بابوں کے بارے میں بات کرتے رہے ہیں بطور خاص، یوں تو زاویہ کے سارے پروگراموں سارے ہفتوں کے اندر کوئی نہ کوئی بابا آکے کھڑا ہو جاتا رہا۔ لیکن پچھلے تین چار پروگراموں میں بطور خاص اس کا ذکر رہا ہے، کیونکہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں، اور سوال کرتے ہیں کہ یہ بابا ہوتا کیا ہے، اور اگر کچھ ہوتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں ملتا، آپ کو کیسے مل جاتا ہے۔ ہم بھی کیا بابا سے نہیں مل سکتے؟

میں نے جیسے عرض کیا تھا کہ سرخ بیتی کے اوپر کئی دفعہ جب کاریں رکی ہوتی ہیں، تو کئی آدمی شیشہ اتار کے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اشFAQ صاحب! کوئی بابا ہے؟ میں کہتا ہوں، جیسے کوئی سگریٹ مانگ رہا ہو میں کہتا ہوں، نہیں۔ بابا اس وقت تو نہیں ہے، لیکن ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہمیں تو کوئی نہیں ملتا۔ چلے جاتے ہیں تو جب تک اس کی آرزو تمنا نہ پیدا ہو، اس وقت تک بابا تو نہیں ملا کرتا۔ آرزو کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ میں آپ سے اس آدمی، اور پانی کے گلاس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں کہ پانی کیا ہوتا ہے، گلاس کیا ہوتا ہے، بابا کیا ہوتا ہے، لیکن ایک شدید پیاسا آدمی یہ سارے سوال نہیں کرے گا۔ اس کو یہ آرزو ہو گی کہ مجھے کہیں سے مختندا صاف سحر اپانی ملے، اور میں پی لوں، یہ آرزو ذہن میں یادل کے اندر پیدا ہو جائے کہ مجھے کسی چیز کی تلاش ہے، اور میں چاہتا ہوں، پھر ملتا ہے۔ لیکن میں آپ کی آسانی کے لیے عرض کرتا ہوں۔ جیسا کہ اب یہ بچی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اتنی ساری باتیں کیسے اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس ضمن میں مجھے یاد اور آپ کی آسانی کے لیے عرض کروں کہ بابا وہ ہوتا ہے، جو لینے کے بجائے دینے کے مقام پر ہو۔ بہت سی زبانوں میں بابا کے لیے بابا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، تو تھوڑی سی اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ کہیں اسے بابو کہتے ہیں اتنا لین میں۔ اسے باپ کہتے ہیں انڈو عشین میں۔ اسے باپو کہتے ہیں انڈیا میں، لیکن اس کا روٹ Root جو ہے وہ لفظ بابا سے ہے۔ باپ کی سب سے بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھر کے اندر، اپنے گھرونڈے کے اندر،

اپنے خاندان کے اندر، وینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ جو شخص بھی کسی انسانی گروہ کے درمیان دینے کے مقام پر ہو وہ بابا ہے، اور یہ مولیٰ سی اس کی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی آدمی کو ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر آپ سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔ اور لینے والا ہو، سیئے والا ہو، وہ بالکل اس کے الٹ ہوتا ہے، اور عیاری کی بہت ساری منازل طے کر کے ایک گانڈھی کی صورت میں انسان بن کے زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری زندگی میں جو سب سے پہلے بابا آیا، وہ دیری کی بات ہے، میں اس وقت سیندھ ائیر میں پڑھتا تھا، اور پڑھتا تو میں یہاں لاہور میں تھا، لیکن میرا ایک قبے کے ساتھ تعلق تھا، جہاں مجھے چھٹیوں میں لوٹ کر جانا پڑتا تھا، آنا پڑتا تھا۔ وہیں سے میں نے میڑک کیا تھا، تو وہاں کے لوگ دیہاتی لوگ، کسان لوگ، وہ ایک بابے کے عشق میں بنتا تھا۔ اور وہ بابا ایسا تھا، جسے ان لوگوں نے دیکھا نہیں تھا، لیکن وہ جان لیتے تھے، سن لیتے تھے نام کہیں سے، خبر پہنچ جاتی تھی، اور وہ اس کو بہت مانتے تھے، اور اس تمنا اور آرزو میں بیٹھے رہتے تھے کہ وہ آئے گا۔ یہ بابا جو ہمارے دکھی دن ہیں، ان کو کسی طرح سے ہماری زندگیوں سے دور کر دے گا، اور ہمیں آسانیاں عطا ہونے لگیں گی۔ لیکن وہ بے چارے اس کے بارے میں زیادہ کچھ جانتے نہیں تھے، تو میں بہت حیران ہو کے ان سے کہتا تھا کہ تمہارا بابا کیسا ہے، جو تمہارے درمیان میں نہیں ہے، اور تمہاری بولی نہیں بولتا، اور تم اس کی بولی نہیں سمجھتے، تو پھر کیسے تمہارا اور اس کا رابطہ ہو۔ وہ کہتے تھے، بھلے ہم اس کی بات نہ سمجھیں، وہ ہماری بات نہ جانیں، لیکن دلوں کے اندر جو آرزو میں پوشیدہ ہوتی ہیں، جو تمنا کیسی ہوتی ہیں، دل کی زبان ایک سانچھی زبان ہے، جو ساری دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اس بابے کو وہ بابا قائدِ اعظم کہہ کر پکارتے تھے، اور اس کا نام لے کر وہ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ میں کہتا تھا کہ ایسے بابے کو تم کس طرح سے اپنی زندگیوں میں داخل کرو گے، تمہاری کمیونیکیشن پر دشکیر کے ساتھ ہوتی ہے، جس کی بولی ہم نہیں جانتے، جس گیارھویں والے کی ہر گیارہ تاریخ کو ہم نیاز دیتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری بات سمجھتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ ہماری بات ان تک کیسے پہنچتی ہے؟ یہ جو پیر دشکیر کا ایک ادنیٰ غلام ہے اور ایک اس کا ماننے والا ہے۔ بھلے اس کی بولی ہم سے مختلف ہو، یہ بات ہماری جانے کا، اور سمجھنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح سے، جیسے ہمارے بڑوں کی زبان ہمارے بابوں کی زبان چاہے مختلف ہے، لیکن ہم اس سے اچھی طرح سے واقف ہیں، اور ہمارے درمیان رابطے کا ایک سلسلہ قائم ہے، میں بہت حیران ہوتا تھا کہ ان کا یہ ایمان کس قدر پختہ ہے۔ ہم اس وقت تھوڑے سے متزلزل تھے، پڑھے لکھے نوجوان لڑکے تھے کچھ دبدبے کا شکار تھے کہ کبھی آگے بڑھتے تھے، کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ انہی لوگوں نے لاہور کے اندر پنجاب یونیورسٹی کی پورٹس گراونڈ

میں، جہاں اب ایک ہوائی جہاز کھڑا ہے، اپنے بابے قائدِ اعظم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور کوئی ایک لاکھ کا مجمع بالکل Pindrop silence میں، بے حس و حرکت خاموش بیٹھا ہوا ہے، اور وہ اپنی زبان میں بات کر رہا ہے۔ جتنا بھی اس کا گھنٹے کا یا ڈیڑھ گھنٹے کا لیکھر ہوا اس میں، اور یہ لوگ سارے کے سارے اس زبان سے واقف نہیں تھے ایک ایک بات اپنے اندر سموکے اپنے رُگ و پے میں اتار کے وہاں سے اٹھے۔ باوجود اس کے کہ ان پر بہت مشکل وقت آیا ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ان معنوں میں بابا تھا کہ وہ عطا کرنے والا آدمی تھا، دینے والا آدمی تھا، لینے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس نے بڑی چوکھی اڑائی لڑکے برہمن کے خلاف، اور انگریز کے خلاف، اپنے مانے والوں کو ایک ملک لے کر دیا، اور جب ملک لے کر دے چکا، تو پھر اس نے اپنا آپ اپنا سرمایہ اپنا اور شان سے چھپا کر نہیں رکھا، اور جب وہ یہاں سے جانے لگا، تو اس نے اپنی ساری جاسیداد سب کچھ اپنی قوم کو دے دیا۔ سب سے بڑا حصہ اس نے پشاور کے اسلامیہ کالج کو دیا، حالانکہ وہ زیادہ وہاں گئے نہیں تھے، لیکن ان کو پسند تھا۔ پھر ایک حصہ علی گڑھ یونیورسٹی کو دیا، پھر سندھ مدرسہ کو دیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، اور یوں ہاتھ جہاڑ کے، اور فاطمہ جوان کی بہت چیختی بہن تھی اور بظاہر جس کے لیے انہیں بہت کچھ چھوڑ کے جانا چاہیے تھا، ان کی اتنی پرانی تھیں کی، اور وہ سب کچھ جوان کی گاڑھے پسینے کی اپنی کمائی تھی، جوانہوں نے وکالت کر کے کمائی تھی، یہاں سے کچھ نہیں لیا تھا انہوں نے آپ کے اس اکاؤنٹ سے۔ وہ ساری کی ساری رقم اس کو دے کر یہاں سے رخصت ہو گیا، اس لیے آپ کے والوں میں ہم جو آپ سے بڑے ہیں تھوڑے سے عمر میں ہمارے والوں میں ان کی قدر باتی ہے۔

آپ کبھی کبھی دیکھیں گے، یہ ہمارے بابوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، خواتین و حضرات کو ان کے مخالف ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ دینے کے مقام پر ہوتے ہیں، اور عام آدمی لینے کے مقام پر ہوتا ہے۔ اور جب لینے کے مقام پر آدمی ہو تو وہ زیادہ شرمند گیوں میں گھر جاتا ہے، کیونکہ اردو گرد کے لوگ دیکھتے ہیں ان کی نگاہیں ہر وقت دینے والے پر گلی رہتی ہیں تو لینے والا ان لوگوں کا دشمن ہو جاتا ہے۔

ہمارے بابے جوڑیے قائم کرتے ہیں۔ ان کی ٹرینگ کا بھی یہی حصہ ہوتا ہے کہ وہاں آنے والوں کو دینے کی تعلیم دی جائے، اور ایک عام آدمی کو کس طرح سے بابا بنایا جائے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے مرشد سائیں فضل شاہ صاحبؒ گوجرانوالہ گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا ان کو ساتھ وہاں لے کر گیا تھا۔ ہم جب وہاں گوجرانوالہ میں پوراون گزار کر مولوی یاسین صاحب سے مل کر واپس آ رہے تھے، تو بازار میں ایک فقیر ملا، اس نے میرے بابا جی سے کہا کہ کچھ دے اللہ کے نام پر۔ انہوں نے اس وقت ایک روپیہ بڑی دیر کی بات ہے، ایک روپیہ، بہت ہوتا

تھا، تو وہ اس کو دے دیا وہ لے کر بڑا خوش ہوا، دعا میں دیں، اور بہت پسند کیا اس بابا جی کو۔ انہوں نے اس سے پوچھا شام ہو گئی ہے کتنی کمائی ہوئی؟ وہ ایک سچا آدمی تھا۔ اس نے کہا، دس روپے بنالیے ہیں۔ تو دس روپے بڑے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بہت زیادہ۔ تو انہوں نے کہا کہ دس روپے تو بنالیے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا، میں نے آپ سے بات کی تھی، ”دستے میں سے دیا کرو۔“ یہ ان کا فلسفہ تھا۔ اس میں سے یہ نہیں ہوتا کہ جو بہت زیادہ رکھتا ہے وہی دے۔ جس کے پاس دوپیے ہیں، وہ بھی ایک پیسا دے۔ پھر بار جب بات کی، تو میں اس کی وضاحت کرنا بھول گیا کہ دستے میں سے دینا۔ اپنے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے دینے سے بھی تقویت آتی ہے۔ جب تک Post within نہیں کریں گے، اپنی جان کے ساتھ چمنا کے رکھیں گے، جس طرح تپ محرقة ساتھ جان کے چھٹ جاتا ہے نا، اور وہ جان نہیں چھوڑتا، اسی طرح سے یہ دولت، اور سرمایہ جو ہے، یہ انسان کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر چاہے تگڑا کر دے، روحانی طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ تو انہوں نے کہا اس فقیر سے کہ تو نے اتنے پیے بنالیے ہیں، تو اپنے دستے میں سے کچھ دے۔ تو اس نے کہا، بابا میں فقیر آدمی ہوں، میں کہاں سے دوں۔ انہوں نے کہا، اس میں فقیر امیر کا کوئی سوال نہیں ہے جس کے پاس ہے اس کو دینا چاہیے، تو اس فقیر کے دل کو یہ بات بڑی لگی۔ بابا جی سے کہنے لگا، ”میں کیہ کراں۔“ انہوں نے کہا، کسی کو تو کچھ دے۔ کہنے لگا، اچھا۔ وہاں دو مزدور کے دلیں کندھے پر ڈالے کہیں سے بیچارے دیہاڑی جوان کو ملتی ہے لے کر گھر کو واپس جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رسیاں تھیں غالباً بندیاں میں کھود کر آئے تھے، جو اس کا نشان لگاتے ہیں۔ تو وہ فقیر بھاگا گیا، اس نے چار روپے کی جیلیبیاں خریدیں، چار روپے کی ایک لکھو جیلیبیاں آیا کرتی تھیں، اور بھاگ کے لایا، اور آ کر اس نے ان دونوں مزدوروں کو دے دیں۔ کہنے لگا، اولادی ادھی کر لینا۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔ میں بھی کھڑا ان کو دیکھتا رہا تو لے کے، وہ خوش ہو کے چلا۔ اور وہ چلے گئے۔ کہنے لگا، بڑی مہربانی بابا تیری، بابا بڑی مہربانی، شباباش۔

تو وہ جو فقیر تھا کچھ کھسیانا، کچھ شرمندہ ساتھا، زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے خیرات دی تھی۔ وہ تو لینے والے مقام پر تھا تو شرمندہ سا ہو کر کھسکا۔ تو میرے بابا جی نے کہا، ”اوے لکیاں کدھر جانا ایس تینوں فقیر تو داتا بنا دتا اے، خوش ہو، رنج کے وکھا۔“ تو فقیر سے جب داتا بنتا ہے نا، تو اس کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے، اور اگر باہر نہیں تو اس کا اندر ضرور ناچنے لگتا ہے۔ میرے تو یہ مقدار میں نہیں کہ کبھی دینے کے مقام پر آیا ہوں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کو ضرور دیکھا ہے کہ جو دینے کے مقام پر ہوتے ہیں اور ان کی نوشیوں کو دیکھا۔ اسی طرح جا بے قائد اعظم نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیا، کبھی، اللہ آپ کو وقت دے اور میں کہ اس کو جانچنے لگیں، آنکھے لگیں، تو نے لگیں تو آپ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ وہ ایک دبلا پٹلا

تپ دق زدہ، جسے آخر میں کینسر بھی ہو گیا تھا، انہوں نے کسی کو بتائے بغیر کبھی اپنا گلہ کیے بغیر، کبھی بائے یا اُف کا لفظ نکالے بغیر، اسی معاملے میں لگا رہا کہ میں دوں گا۔ اور اب آج کے سچھدار سیاستدان، سیاست کے پندت، لکھنے والے، ولایت کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان نے پچھلے ایک سو برس میں صرف ایک ہی لیڈر پیدا کیا ہے، اور اس کا نام محمد علی جناح تھا۔ لیڈر ایک ہی تھا، باقی کے لوگ اور بھی بہت سے تھے۔ گاندھی جی کا ہم احترام کرتے ہیں، نھیں تو یہ لیکن وہ لیڈر نہیں تھے۔ نہرو، ایک لاڈا بچھے تھا اس کو سیاست میں دچپسی نہیں تھی۔ ادب میں البتہ تھی، اس نے خط و غیرہ لکھے، بڑے کمال کے، بہت اچھے لکھے۔ لیکن انگریز کے ساتھ سیاست کی لڑائی میں آج کے سیانے کہتے ہیں، وہ ایک ہی بندہ تھا جس نے انگریزوں سے کہا کہ آؤ اگر تم میرے ساتھ Consitutional fight کرنا چاہتے ہو تو میں، آئین کی جگہ میں لڑنے کے لیے تیار ہوں، میں ایک ایک بار یہ بات کو کھول کر بیان کروں گا، اوہرہ آؤ میں ہنر آزماؤں تو تیر آزماء، ہم بھاگنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ تو گاندھی جی نے اپنا بیاس تبدیل کیا، لوگوں کو دھرنے کی تعلیم دی۔ مرن برٹ (بھوک ہر تال) کئی کچھ کرتے تھے۔ ان کا اپنا انداز تھا، لیکن وہ انگریز کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ویسی fight کونہ دے سکے، جیسی کہ کرسی کے میدان میں انہی کے مقام پر اس کے چوکھے میں لڑائی لڑنے کے لیے یہ تیار تھے۔

قائدِ عظم کہتے تھے، میں لباس نہیں تبدیل کروں گا، تمہاری زبان میں تم سے بات کروں گا، میں تمہارے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق، میں تمہارے قانون کے مطابق تم سے لڑائی کروں گا، اور پھر بار بار انہوں نے کہا پاکستان تو بعد کی بات ہے۔ اللہ کرے آپ اس کو پڑھ سکیں، اور پوری تفصیلات کے ساتھ اس کی طرف جا سکیں، تو اس بابے نے جو کہ دیہا تیوں، کسانوں، وہ قانوں کا بابا تھا، قائدِ عظم اسے کہتے تھے، اس نے دینے کے مقام پر کھڑے ہو کر کیا کچھ عطا کیا، اس کی تفصیلات آپ اپنے طور پر جان سکیں گے، اور وہ جو بابا بابا میں ذکر کیا کرتا ہوں، وہ کہاں سے چل کر کہاں تک بابا آتا ہے، اور اس ذیل میں کون کون لوگ آ جاتے ہیں۔ میں نے آپ سے پچھلی مرتبہ گل سعید کا ذکر کیا تھا، جو ہمارے یہاں تھے، وہ بھی ایک بابا تھے، زندہ ہیں۔ قائدِ عظم وہ بھی ایک بابا ہیں، یہ گزر جانے والا فقیر جودا و دہش کرتا ہے۔ یہ بھی ایک اپنی طرز کا بابا ہے، تو اس میں ایک آخری بات جو بہت عجیب و غریب ہے، وہ یہ میرے پچھے، میرے پوتے، اور میری پوتیاں، اور بہت ذہین آپ جیسے لڑکے لڑکیاں، تھوڑے دن ہوئے وہ جیسے ہوئے تھے، اور یہ ذکر کر رہے تھے آپس میں کہ اگر اوپر کے لوگ نھیک ہو جائیں، تو پھر نچے کے لوگ خود نھیک ہو جائیں گے، یہ عام خیال ہے۔

میں نے کہا، دیکھا، مجھے اجازت دو گے۔ کہنے لگے، نہیں بابا، آپ بالکل اٹھی بات کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں اتنی سی اجازت دو کہنے کی کہ اگر اوپر کے لوگ نھیک ہو جائیں اور خدا نخواستہ نچے

کے نہ ہوئے تو پھر ہم کیا کریں گے۔ کہنے لگے، نہیں، دیکھیے یہ مفروضہ نہیں، اوپر سے دیکھ کر ہی لوگ متاثر ہوتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں۔ میں نے کہا، پیارے بچوں یاد رکھو، اور لکھ لواسے اپنے دل کی ڈائری میں کہ ایک ملک بنام پاکستان اور اس کے رہنے والے پاکستانی دنیا کی اس خوش قسم ترین قوم میں سے ہیں، جن کو نہایت نیک، نہایت ایماندار، نہایت Honest، نہایت شفاف، نہایت ذہین، نہایت بڑا سائنسدان، نہایت بہترین دوسرا زبان جانے والا، نہایت اعلیٰ درجے کا وکیل عطا کیا ہے، اور جس نے اس قوم سے تابے کا ایک پیسہ بھی محنت کے طور پر نہیں لیا، اور کمال کی اس نے لیڈر شپ فراہم کی۔ جو آپ آج مانگ رہے ہیں۔ لیکن قوم نے اس کے جواب میں کیا کیا کہ ایک پورٹ کے آدمی راستے کے اوپر اس کی موڑ کار کا پیٹرول ختم ہو گیا اور اس نے اپنی جان آدمی راستے میں جان آفریں کے حوالے کر دی۔ یہ ہوتا ہے زندگی میں۔ اس بات کی تلاش نہ کرو کہ وہاں سے ٹھیک ہوں گے تو نیچے آئیں گے۔ ہم سب کو اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہونا ہے۔ خدا کے واسطے، یہ مت کہا کرو، اے پیارے مزدور، کسانو، ان پڑھ لوگو! کہ اگر بڑے لوگ نماز پڑھیں گے تو ہم پڑھیں گے۔ ورنہ تب تک ہم بیٹھے ہیں، نمازو تو تمہاری اپنی ہے بابا۔ اچھے ہونا تو تمہارے اپنے بس میں ہے۔ ذمہ داری تو ہماری اپنی ہے۔ یہ کیا بہانہ لے کر بیٹھے گئے، یہ بات جو میں نے اپنے بیجوں سے کہی، یہ میں آپ سے بھی کہنا چاہ رہا تھا، اور کہہ رہا ہوں، اور بڑی درمندی کے ساتھ کہہ رہا ہوں، اور اس دین کو، اس ذمہ داری کو، جو ہمارے کندھوں کے اوپر ہے، اور جس کا ہم مدد اور نہیں کر سکتے کہ ہم نے کیا سلوک کیا، وہ شرمندگی ہمارے ساتھ ہے، اور ہمارے ساتھ چلتی رہے گی، اور ہم سارے کے سارے اس کے دیندار ہیں۔ کسی ایک بندے کو یا کسی ایک حکومت کو، یا کسی ایک سسٹم کو اس کا ذمہ دار نہیں تھہرا یا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے پچھلے پروگرام میں عرض کیا تھا کہ یہ ملک، یہ پاکستان، یہ حضرت صالحؐ کی اوٹی ہے۔ اس کا احترام اور اس کا ادب ہم پر واجب ہے۔ حکومت کا بالکل خیال نہ کریں، حکومت، الہاں کا ادب کریں، ان کو نہ مانیں، جو کہنا چاہتے ہیں، ان کے خلاف کہیں، مجھے اعتراض نہیں، لیکن اس ملک کے اس سرزی میں کے اس دھرتی کے خلاف اگر آپ نے کوئی بات کی تو پکڑے جائیں گے اور بڑے عذاب کی صورت سے گزریں گے۔ الحمد للہ ابھی تک کسی نے ملک کے خلاف کوئی بات نہیں کی باریکیاں سی نکال کے کچھ سیاست میں سے الٹی پلٹی باتیں بیان کرتے چلتے جاتے ہیں اور اگر آپ کو کوئی دریہ وہن یا ایسا گندا ذہن آدمی ملے، جو قائد اعظم کی ذات میں کوئی، کیڑے نکالنے کی کوششیں کرتا ہے، تو اس کو ضرور قریب سے جا کر دیکھیں، وہ دینے والوں میں سے نہیں ہو گا، لینے والوں میں سے ہو گا۔ پاکستان کے رہنے والوں زندہ رہو خوش رہو پاکندہ رہو۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ شرف عطا فرمائے، اللہ حافظ۔

”احترام آدمیت“

آج تک تو ہم پیشتر بابوں کے بارے میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ آج مجھے ایک چھوٹے سے بچے کی یاد بہت ستارہ ہی ہے جو ایک مرتبہ اپنے ماں باپ کے بغیر، اور شاید ان سے اجازت لیے بغیر ڈریے پر آ گیا تھا، وہ گول منول سا، پیار اسے بچھتا تھا۔ بڑا بنا لٹھنا تھا، اور آ کے بابا جی سے روتے ہوئے کہنے لگا، کہ مجھے اپنے بابا جی سے اختلاف، شکایت ہے، میں شکایت لگانے آیا ہوں۔ تو انہوں نے پوچھا، بابا جی سے ایسی کیا شکایت ہے بیٹا بیٹھو۔ کچھ لوکھا و پیو، مٹھائی وغیرہ رکھی تھی نا۔ تو اس نے کہا، نہیں میں کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ پوچھا، شکایت کیا ہے۔ اس نے کہا، یہ بھی نہیں بتاؤں گا میں۔ بس مجھے ہے۔ وہ آپ کے پاس آتے ہیں، اور وہ بڑا دعویٰ کرتے ہیں، محبت کا اور شرافت کا، لیکن وہ ان میں ہے نہیں۔ السلام علیکم کہہ کر وہ وہاں سے چلا جاتا ہے۔ تو بابا جی نے کہا، اس کے پیچھے جائیں اور اس کو منا کر لائیں، لیکن وہ بڑے غصے میں تھا، چوتھی پانچویں کا لڑکا ہو گا، لیکن رکا نہیں، اور وہ چلا گیا، اور اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا، اور نہ یہ پتا چلا کہ اس کے والد کون ہیں اور کس کے خلاف شکایت لے کر آیا تھا؟ لیکن وہ شکایت ہمارے ذہن کے رجڑوں میں درج کر گیا، اور ظاہر ہے ہم اس کا کوئی قلع قلع نہ کر سکے، کیونکہ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر سے آیا ہے۔ تو میں اس کی یاد میں جو کہ بڑی دیر کے بعد آئی ہے، اور اب وہ کہیں اللہ کے فضل سے بڑے عہد سے پر ہو گا، یا کوئی تاجر ہو گا، یا سیاست میں داخل ہو چکا ہو گا۔ وہ اگر کہیں ہمارا پروگرام دیکھ رہا ہو، تو اس کو ہمارا بہت سلام پہنچے۔

ہوا یہ کہ ہم پاکستان بنا چکے تھے، اور وہ زمانہ درمیانی مدت کا زمانہ تھا، یعنی ہمیں کچھ آدھا وقت گزر چکا تھا میں باہمیں سال۔ اور ہم لوگ competition کے میدان میں اتر چکے تھے۔ مسابقت کے میدان میں مقابلہ کے میدان میں اور ہم competition کو ہی اپنی زندگی کا معیار اور ذریعہ بنا چکے تھے۔ شرافت کا، نجابت کا، آگے بڑھنے کا، یہ جانتے ہوئے کہ competition جو ہے، یہ تخلیقی صلاحیت کی راہ میں ایک بہت بڑا پتھر ہے۔ ایک آدمی کے اندر جو تخلیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں نا۔ کچھ

کرنے کی، کچھ کرگزرنے کی صلاحیت، لیکن وہ competition میں اپنا آپ بھی بھلاچ کا ہوتا ہے۔ وہ پھر ایک انسان نہیں رہتا، وہ competition کی ایک مشین بن جاتا ہے، اور دن رات اسی میں الجھا رہتا ہے۔ وہ ساری صلاحیتیں جو انسان میں ہوتی ہیں، وہ ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بظاہر یہ بات نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے، جب بھی آپ competition کرتے ہیں، وہ انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ کبھی بھی کسی پتھر کے، کھبے کے، سڑیٹ لایٹ کے، پل کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ بھیں کے خلاف آپ نے کبھی competition نہیں کیا، جب بھی کرتے ہیں انسان کے خلاف کرتے ہیں۔ اور جب انسان کے خلاف کرتے ہیں، اور آپ کامیاب ہو جاتے ہیں، اور کامیاب ہو کر تمیں بندوں کو گردیتے ہیں۔ تو پھر پوچھتے ہیں کہ آپ تو کامیاب ہو گئے۔ اسلام میں competition کی یہ Spirit، یہ صورت بالکل منع ہے۔ ایک ہی اجازت ہے، اور وہ ہے تقویٰ کے لیے، آپ اس میں مسابقت کر سکتے ہیں۔ عالیٰ سے عالیٰ ہونے میں مسابقت، پیسے کمانے میں، حسین بنے میں، شیمہ عالیٰ درجے کا استعمال کرنے میں، کپڑے استعمال کرنے میں، یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ لیکن آدمی اس میں competition کرتا ہے۔ میری بچیاں کہتی ہیں کہ نہیں دادا یہ تو قمیض ہم پہن کے نہیں جائیں گی، یہ تو پہلے بھی ہم پہن کے گئی تھیں، سیلی کی مہندی کے اوپر۔ یہ ہماری بے عزتی ہے۔ ایک دفعہ پہن لی، کیونکہ یہ competition ہے۔ زندگی کے جو زمینی competition ہیں، وہ انسان کو بڑا ٹنگ کرتے ہیں، اور اس کی صلاحیتوں کے اوپر ایک جال ڈال دیتے ہیں۔

آپ کو اندازہ نہیں ہو گا، آپ تو سمجھتے ہیں کہ competition بہت Healthy فضائیں پیدا ہوا۔ کوشش، جدوجہد، سڑائیجو Strive، سرگل، بھاگ دوز یہ ساری کی ساری آپ کے اندر آنا اور تکبر پیدا کرتی ہیں۔ آپ دیکھیے امریکہ کو۔ آپ کے سامنے مثال ہے، کتنی بھاگ دوز کرتا ہے، کتنا تدد کرتا ہے، کتنا competition کرتا ہے، کتنا عالیٰ درجے کا ملک ہے، اور کیسا مٹکبر ہے۔ کسی کی کوئی بات بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ کہتا ہے، جو میں فیصلہ کرتا ہوں، وہی صحیح ہے، جو میں نے حکم دے دیا عراق کے بارے میں۔ وہ صحیح۔ تو یہ بہتر انسان ہونے کی خاصیت نہیں ہے۔ اسی لیے ہمارے یہاں پر حکم ہے کہ آپ competition نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک عجیب سی بات آپ سے کرنے لگا ہوں، آپ کے چہرے دیکھ کر۔ امید ہے آپ انشاء اللہ تعالیٰ اتنا برانہیں مانیں گے، جتنا عام لوگ مانتے ہیں۔ ایک بچہ کلاس میں فسٹ آتا ہے۔ کوئی تمیں بچوں کی کلاس میں سے اب وہ توفٹ آ گیا اور تمیں بچے جو ہیں وہ تو منہ کے بل گر گئے تا، زمین پر۔ اور ان کو شرمدہ ہونے کا موقع ملا۔ تو میرا دین Down پوچھتا ہے کہ یہ بھی تو Human being ہیں۔ یہ انسان ہیں۔ ان کا کیا بندوبست آپ نے کیا ہے۔ آپ نے تو ایک دکان بنالی، اور بڑے کمال کی چلائی۔ ایک لاکھ روپیہ روز کمانے لگے اور باقی کے بھی

بندے آپ کے اردوگر درجتے ہیں۔ ان کو بھی زندہ رہنا ہے۔ یہ بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں، جس طرح آپ کو حیات ملی ہے، ان کو بھی زندگی ملی ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں اس کے اوپر تکمیر کرنے والے کہ جناب ہم نے بہت بڑا اکمال کیا۔ تو یہ بندے کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ competition کی دنیا میں داخل ہو کر اپنی انسانی صلاحیت، اور انسانی تخلیقی قوت جو ہے، اس کو دیادیتا ہے۔ یہ آج میں بہت عجیب بات آپ سے کر رہا ہوں، جو کہ عام طور پر نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت ہم تو یہی کہتے ہیں کہ competition ہمارا بہت اچھا ہے۔ تو باقی کے بندے کیا کریں؟ کیا وہ مرتے ہیں تو میریں اور یہ بات میں نے اس لیے شروع کی کہ پہلے تو یہ بڑوں میں بات تھی، اب یہ ہمارے گھروں میں پہنچ چکی ہے۔ اور میں نے Recently دیکھا کہ یہ بات بچوں میں بھی اتنا روئی گئی ہے۔ اور بچے جو پڑھتے ہیں آپ جیسے ان کو بہت شرمندہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے شرمندہ کیا جاتا ہے کہ میں آپ کو اس کی مثال یہ دیتا ہوں کہ میرے گھرانے میں جو پڑھے لکھے لوگوں کا گھرانہ ہے۔ میں نے اپنے بہت قریبی عزیز جو میرے بچوں کی طرح مجھے عزیز ہے، وہ لڑکا اپنی بہن سے یہ کہہ رہا تھا اپنے بھانجوں کے بارے میں کہ ”آپ اتیرے منڈے دے کئے نمبر آئے نیں۔“ لڑکا بھی دیں کھیل رہا تھا۔ اس نے کہا اس کے تو 680 نمبر ہیں۔ کہنے لگا، اودہ یہ کوئی نمبر ہیں۔ پھر کہنے لگا، میرے لڑکے نے لیے ہیں اور دباؤ کے لیے ہیں 730۔ نھیک ہے۔ کہنے لگا آپ ان نمبر ہی نمبر کر دیے۔ گھر میں نمبر، اوپر نمبر، چوبارے میں نمبر، وہ کیا سیر ہی پر نمبر، ہمارے برائڈوں میں نمبر ہی نمبر۔ میرے کان لکھرے ہوئے، جب اس نے کہا تاکہ ہر جگہ نمبر ہی نمبر بکھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھر میں۔ میں نے کہا، شاید پتا نہیں یہ کیا بات کر رہا ہے، پھر میں نے اس کی بات غور سے سنی، اور میں نے محسوس کیا کسی خوفناک یا ماری کا نجاشن دے کر کوئی اس بے چاری کو جو میری نواسی ہے چلا جا رہا ہے۔ تو میں نے اس کو بلا یا کر کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس پر میری بھائی بولی، نانا یہ تو بڑی خوبی کی بات ہے اس نے زیادہ نمبر لیے تو آپ فخر کریں۔ میں نے کہا، اس نے زیادہ نمبر لیے لیکن کسی ایسے باپ پر فخر کرنا نہیں چاہیے، جو اس کی طرح سے ہدیاں لکھنے لگ جائے، جیسے یہ کر رہا ہے، وہ بھی انسان ہے، وہ تیری سگی بہن ہے، اس کا بھی دل ہے، اس کا بھی گھر ہے، اس کا بھی بچہ ہے، جیسا بچہ تھے عزیز ہے، ویسے ہی اس کو عزیز ہے۔ اس نے کہا، نہیں جی اگر کوئی کمزور ہو گا تو ہم تو اسے شرمندہ کریں گے۔ کہنے لگا، دیکھیں اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنا فضل کیا ہے۔ میں کم از کم پانچ ہزار روز کا کماتا ہوں اور ہے کوئی ہمارے خاندان میں ایسا آدمی، وہ ایک اکیلا آدمی نہیں ہے۔ آپ اپنے اردوگرد اپنے گھروں کے اندر اپنے شہر کے اندر دیکھیں۔ لوگ آپ کو، مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے اور شرمندہ کرنے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں، ایسے طریقے جن کی مناسی ہے، جو ہمارے یہاں ایک حرام چیز تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس کی طرف دھیان ہی

نہیں دیا، آپ نے کبھی انا اور تکبر کے بارے میں سوچا ہی نہیں، آپ یہ competition کرنے والے، مسابقت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ تکبر کا جو گناہ تھا، وہ تو انہیں نے کر لیا، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم تو بالکل تکبر نہیں کرتے۔ یہ تو جی کھلے میدان ہم کام کرتے ہیں، دوسرا بھی ہے تو میدان میں آئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی وجہ سے دوسرا نہیں آ سکے گا تو کیا تم اس کو شرمندہ کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں اللہ نے صرف یہ صلاحیت دی ہے، تم اپنا موبائل ٹیلیفون لاکا کے سارے محلے میں اس لیے چلتے ہو، کہ میرے پاس موبائل ہے، اگر ہے اور اس کوچھ بچھ استعمال کرتے ہو، تو اسے بند رکھو، اس کو چھپا کر رکھو، کیوں اس غریب کو دکھاتے ہو جس کے پاس نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس اعلیٰ درجے کی کار ہے، اور میرے پاس چھوٹی ہے تو تم مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو کہ لا کے میرے منہ کے آگے کھڑی کر دیتے ہو کہ اشتقاق صاحب اپنی چھوٹی سی پدی گاڑی نہ نکال سکیں، تو مجھے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، یہ زمین میری بھی ہے، یہ ملک میرا بھی ہے، اور جو نعمت آپ کو اللہ نے عطا کی ہے، وہ مجھے بھی عطا کی ہے، اور پھر یہ وقوف لوگوں یہ سمجھتے ہو کہ سب کچھ تمہاری کوششوں سے، تمہاری جدوجہد سے، تمہارے competition سے، تمہاری بھاگ دوڑ سے تم کو ملا ہے؟ نہیں! یہ خدا کی عطا ہے۔ اس کا شکر یہ ادا کرو، اور جوں جوں جوں عطا میں اضافہ ہوتا جائے، توں توں سرگاؤں ہوتے جاؤ، نیچے سر جھکاتے چلے جاؤ۔ تو میں جس چھوٹے بچے کا ذکر کر رہا تھا، کوئی تقریباً ایک بفتے کے بعد اس کا باپ ہمارے ذریعے پر وہیں آیا، بابا جی کے پاس اور کہنے لگا، میرا بیٹا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ براحال، رورہا تھا، اور چاروں طرف پولیس کو اطلاع دی ہے، اخباروں میں اشتہار دیا ہے، سلائیڈز میں چلا کیں، ٹیلی ویژن پر اس کا اعلان کیا، لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل رہا، اور وہ میرا نور نظر ہے۔ اس کی ماں کی ظاہر ہے اور بھی بری حالت ہو گی، بابا جی نے کہا، وہ تو یہاں آیا تھا۔ کہنے لگا، یہاں آیا تھا؟ کہنے لگا، ہاں کچھ شکایت کرتا تھا، لیکن وہ اتنا کھلی تھا کہ ہمارے قابو نہیں آ سکا۔ ہم نے بہت بہلانے اور پھلانے کی کوشش کی وہ بچج میں سے کھسک کر نکل گیا۔ اس نے کہا، جی ہوا کیا، کوئی خاص بات تو ہوئی نہیں، ایسے ہی وہ حاس تھا اور ناراض ہو گیا بغیر سوچے سمجھے۔ بات یہ تھی کہ اس نے امتحان دیا، اس میں اس کے کچھ کم نمبر تھے۔ جیسا ہوتا ہے بچوں کے ساتھ۔ تو سارے اس کو گھر میں عزیز رشتہ دار مولو کہہ کر پکارتے تھے۔ مولو اس کا نام رکھا ہوا تھا۔ یک نیم جیسے ہمارے گھروں میں بے ہودہ چیز ہوتی ہے، تو اس کو مولو کہہ کر پکارتے تھے۔ تو وہ برداشت کرتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا پیار تھا، جیسے باپ کے ساتھ بچے کا پیار ہوتا ہے، تو شام کو میں آیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کے نمبر کم آئے ہیں، سیکنڈ ڈویژن میں اس نے پاس کی چوتھی۔ تو میں نے اس سے کہا، او مولو تیرے نمبر کم آئے ہیں۔ کہنے لگا، میں نے پہلی دفعہ اس کو مولو کہا، سات سو آدمیوں کے مولو کہنے سے وہ مائنڈ نہیں کرتا تھا، برآ نہیں سمجھتا تھا، لیکن صرف ایک میرے کہنے سے اس کو اللہ جانے کیا ہوا، اس

نے اس کو برداشت نہیں کیا، اور وہ گھر سے بھاگ گیا۔ سات آنھو دن ہو گئے ہیں، ہم اس کو تلاش کرتے پھر تے ہیں، پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ تو یہ نمبروں کی کمی، اور اس کی تفصیل اور تذلیل۔ خدا کے واسطے میں آپ سے دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ انسان کی تذلیل نہ کیا کریں؟ میں اس کا حکم نہیں ہے۔ ہم کسی کوایے ہی نام سے پکار دیتے ہیں، ایسے تھی برا بھلا کہہ دیتے ہیں، کچھ بک ختم رکھتے ہیں نا۔ ایسے بالکل نہ کریں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پورے کا پورا ایک جیسا پیدا کیا ہے۔ یہ زندگی جو لے کر آپ پیدا ہوئے ہیں یہ آپ کی محنت، کوشش، جدوجہد سے نہیں ہوئی، یہ جو آپ لے کر بینتھے ہوئے ہیں، یہ تو اللہ کی عطا کی ہے، اگر آپ یہ کہیں کہ بڑی بھاگا دوڑی کی، پھر میں پیدا ہوا، اور میں نے بڑی کوشش کی، یہ غلط ہوگا۔

سب سے بڑی نعمت تو آپ کو مفت ملی ہوئی ہے۔ یہ زندگی، اور دوسرا کو بھی ایسی ہی زندگی ملی ہے۔ اب ہم کو بھی اس بات کی بڑی فکر ہوئی۔ وہاں مشترک دعا ہوئی سارے لوگ بڑے غمناک ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی کہ اللہ اس کو صحیح وسلامت رکھے اور جہاں بھی ہے، وہ واپس آئے، اور یہ کوتا ہی ہیں، یہاں آتے رہتے ہیں۔ کچھ کام کی باتیں آپ کے کان میں پڑتی رہتی ہیں۔ پڑتی رہتی ہوں گی۔ آپ کو تو یہ لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے تھا، الفاظ گولیوں کے مانند ہوتے ہیں، انہیں استعمال کرنے سے پہلے چیبر کو صاف کر کے استعمال کریں جس طرح آپ پستول کو صاف کرتے ہیں اور گولیوں کو ایک طرف رکھ لیتے ہیں، اسی طرح آپ گفتگو کے لیے جب اپنا منہ یادل استعمال کریں، تو دیکھیں کون سی گولی چلانی ہے، کون سی نہیں چلانی۔ آپ کے اروگرد اگر آپ کے پیارے بیٹھے ہیں خدا کے واسطے اس چیبر کی طرف ضرور دیکھیں۔ یہ لڑکیاں بے شیائی میں کوئی باتیں کر جائیں، اب یہ بڑی ہوں گی نا، تو ان کی شادیاں ہوئی ہیں، تو انہوں نے اپنی وہ کیا ہوتی ہیں نہیں، اور سامیں جاتی ہیں۔ تو پھر جو ظلم ہونا ہے، ان کی ذات پر بھی اور ان بے چاری بوزہیوں پر بھی اس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم نے دعا مانگی کہ یا اللہ تو مہربانی فرم اور وہ بہت پیارا، اور خوب صورت بچ تھا تو اس کو واپس لادے، پھر ہمارے باپا نے یہ کہا، یا اللہ آئندہ زندگی میں اس کو نمبر بھی زیادہ ملتے رہا کریں، اگر یہی بات ہے کم بخت زندگی میں تو اس کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم بہت غمناک ہوئے۔ آپ سے بھی میری بیگی درخواست ہے کہ جب آپ الفاظ کا استعمال کریں تو دیکھیں یہ گولیاں ہیں، جو آپ نے چیبر میں ڈالی ہوئی ہیں، اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں چلانا ہے یا انہیں چلانا ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر میں محسوس کر رہا ہوں، میرے پیارے ملک میں جو بھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، لوگ

جو ہیں وہ ایک دوسرے کا مان اور شن نہیں کر رہے ہیں، اور ان کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو رہا کہ دوسرے لوگ جو ہیں ان کے اندر بھی جذبات ہیں، وہ بھی کچھ ہیں۔ competition میں اور مسابقت، اور مقابلے سے آپ کو روکا گیا ہے اور تقویٰ، نیکی، اچھائی کے لیے آپ کو ابھارا گیا ہے کہ باں یہاں پر جتنا ایک مقابلہ ایک دوسرے کا کر سکتے ہیں کرو۔ راز اس میں یہ ہے کہ تقویٰ میں، اچھائی میں، نیکی میں، جب آپ اپنے مخالف کے ساتھ مقابلہ کریں گے تو ہمیں نیچے ہو کر دیکھنا پڑے گا، جوں جوں آپ نیچے ہوں گے، جتنی آپ عاجزی کریں گے، جتنا آپ جھکیں گے، اتنے آپ تقویٰ میں اوپر نیچے ہوں گے نا۔ جتنا تکبر کریں گے، جتنا اونچائی میں جائیں گے، جتنا آپ شجاعی بگھاریں گے، جتنا آپ اپنے آپ کو انا عطا کریں گے، اتنا ہی آپ کا مسئلہ جو ہے وہ ایک مختلف ردِ حرم اختیار کرتا چلا جائے گا۔ ہاں آپ ضرور competition کریں۔ میں competition سے منع نہیں کرتا، میرا دین competition سے منع نہیں کرتا، لیکن صرف تقویٰ کی حد تک لازم ہے، اخلاقی زندگی بس کرنے کی نیکی اختیار کریں۔

تقویٰ جس میں وہ competition ہو، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، تو وہ آپ کا طرہ امتیاز نہیں ہونا چاہیے، کسی بھی کسی صورت میں کسی بھی حال میں۔ آپ نے نام سنا ہوگا، حضرت جنید بغدادیؒ کا۔ سب سے بڑے ہمارے صوفی، ان سے ابتداء ہوئی، جس کو کہتے ہیں مذہلگا، لیکن وہ صوفی نہیں تھے وہ خلیفہ بغداد کے دربار میں ایک پہلوان تھے۔ ایک بہت بڑے رسیل تھے، جیسے آپ کے یہاں گام پہلوان تھا۔ جنید بغدادی بھی مشہور تھے، اتنے بڑے پہلوان کہ کوئی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے تھے اور خلیفہ بھی تھا وہاں ایک دباؤ پشا کمزور سا آدمی سرافراز نہیں تھا، بے چارہ شکل و صورت کا بہت پیارا، اور بہت اچھا، آیا اور خلیفہ وقت سے کہنے لگا کہ اے خلیفہ میں جنیدؒ کے ساتھ کشتنی لڑنا چاہتا ہوں۔ تو جتنے دربار میں لوگ بیٹھے تھے، نہیں پڑے۔ کہنے لگے کیا پدی کیا پدی کا شور بہ تو شکل دیکھا پیسی اور اپنے دل جو دیکھ، اور تو اتنے بڑے پہلوان کے ساتھ کشتنی کرے گا! اس نے کہا، نہیں جتاب مجھے کچھ دادا یے آتے ہیں، کچھ چیزیں میں ایسی جانتا ہوں جو کہ اور پہلوان نہیں جانتے، اور ہمارے پاس کچھ خاندانی گر ہوتے ہیں نا، وہ داؤ میں لگاؤں گا اور آپ کا جواہر بڑا نامی گرامی رسم زماں ہے، یہ چاروں شانے چت ہو گا۔ حضرت جنید بھی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے، اور تھوڑا سا گھبرائے بھی، اللہ جانے ان کو کچھ ایسا راز آتا ہوگا، تو انہوں نے کہا تھیک ہے، میں تیار ہوں۔ چنانچہ وقت مقرر ہو گیا، جگد طے کردی گئی، اور خلیفہ وقت وہاں پہنچ گیا، سارے درباری اور بغداد کے سارے لوگ کہ یہ آج کیا ہونے لگا ہے، وہ بھی خم نہوہک کے پدھہ، کمزور، دباؤ پشا آدمی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا، وہ بھی آگیا میدان میں۔ اور اصل پہلوان جو تھے وہ بھی اپنا

لئنگر لگوٹ کس کے آگئے۔ تو اس نے ہاتھ بڑھایا، انہوں نے ہاتھ پکڑا، سلام کیا۔ ایک دوسرے سے ملے،
سلامی لینا جسے کہتے ہیں، اور جب حضرت جنید بغدادی کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا تو وہ ذرا چھپے ہٹ گیا، پھر
اس نے ایک چھلانگ لگائی۔ دبائ پتا، کمزور سا آدمی جو تھا، وہ اچھل کر ان کے گلے سے لپٹ گیا، اب یہ تو
کوئی داؤ نہیں ہے کہ آدمی اس کے گلے میں..... جب لٹک گیا، تو ان کے کان کے پاس منہ کر کے کھینچا گا،
میں سیدزادہ ہوں، اور سات دنوں سے بھوکا ہوں، میرے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں یہ ڈھونگ میں نے
اس لیے رچایا ہے۔ اے جنید تاکہ میں لوگوں کو دکھا سکوں کہ میری کوئی عزت ہے۔ جنید بغدادی نے یہ
شنا، اور زمین پر دھڑکر کے گرے، اور اس سے ڈھنے گئے۔ وہ ان کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، اور تالی نج
گئی، دنیا حیران پریشان ہو گئی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے (جنید بغدادی) کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو ایسا
داو آتا ہے، جو دنیا میں کسی آدمی کو نہیں آتا، اور اس کے سامنے چلت ہو گیا ہوں، یہ واقعی طاقتور ہے۔ وہ
تو جناب خلیفہ نے جو بھی کچھ اعمالات اکرام خلعت وغیرہ دینی تھی دی، اور حضرت جنید جو تو یہ یا جو صافہ
گلے میں تھا جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں، اے اللہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا، لیکن
تیرے ایک بندے کی عزت رکھی ہے، اس کے بدے میں مجھے بھی تو کوئی روحانی درجہ عطا فرماء، جو تو اپنے
بڑوں کو دیا کرتا ہے۔ تو وہ ولی کامل ہوئے، اور ان کی جو تعلیم ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو کبھی بھی ذلیل، چھوٹا،
حقیر نہیں جانا۔ جوں جوں آپ ایسا جائیں گے، آپ کے درجات کم ہوتے جائیں گے۔ جوں جوں آپ
حضرت جنید بغدادی کا رویہ اختیار کریں گے، آپ کے درجات بلند ہوتے جائیں گے۔

ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے، میں پھر چلتے ہوئے آخری بات کہوں، ہم سوچے کچھ بغیر پہلے تو
کچھ بات منہ سے نکال دیتے ہیں، اور پھر اپنے تکبر میں اضافہ کرنے کے لیے اس چیز کو طرہ امتیاز بنا
لیتے ہیں جو آپ کے کمال کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ پھوپھوں کے نمبر آ جانا، آپ کا خوش شکل ہونا، آپ کا پھرہ
اچھا ہونا، آپ کی رنگت گوری ہونا، یہ محض عطاۓ خداوندی ہے۔ اس کو تم اپنی تلوار بنا کر لوگوں کی گرد نہیں نہ
اتارتے رہو، اور خدا نخواستہ اگر ایسا وقت آ گیا کہ صرف آپ ہی کی ذات اس کرہ ارض پر رہنے لگی تو آپ یا
آپ کے بچے کو یہ زندگی گزارنی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خالی ساری دنیا میں لوگوں کو آباد رہنے دیں
ان کے ساتھ ہنئے کھینچنے دو۔ ہم چلتے چلتے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بچل گیا تھا، پھر وہ ہمارے ڈیرے پر بھی
آیا، اور پھر جب تک اس نے میڑک کیا، جب تک وہ آتارہا، اور پھر ہم سارے اس سے معافیاں مانگتے
رہے، اور اس میں میں سب کو آپ کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں کہ جب بھی اس کی یاد آئے پتا نہیں وہ کہاں ہو
گا، آپ بھی اس بات کی معافی مانگیں کہ اس کے باپ نے اسے مولو کیوں کہا تھا۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔
اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

ریفاریجریٹرزندگی

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

یہ جو امر یکین قوم ہے اور امر یکین لوگ ہیں، یہ بھی بڑے کمال کے آدمی ہیں، اور ان کو کچھ ایسی سوچتی ہے، اور ان کے دماغ میں اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، جو عملی صورت اختیار کر کے مختلف کھلونوں کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھ لیں ساری دنیا کے اندر کیسی کھدیٹر مچائی ہوئی ہے۔ اپنوں کو کسی شخص کو اور کسی کمیونٹی کو کسی گروہ انسانی کو آسانی سے زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا بس ایک دتیرہ ہے۔ ان لوگوں میں سے بہت سے ہمارے دوست بھی ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں، وہ یہاں بہت اونچے عہدے پر فائز ہیں، مسٹر مورلک ان کا نام ہے۔ ان کے ساتھ ایک جھگڑا لیکن ہمیں کمزور رہنا پڑتا ہے ان کے سامنے۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت کر لیتے ہیں جھگڑا لیکن ہمیں کمزور رہنا پڑتا ہے ان کے سامنے۔ اس لیے کہ ان کی سوچ بھی بڑی تیز ہے، اور ان کی پیشافت بھی بڑی آگے کو بڑھنے والی ہے۔ مورلک ایک دن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم لوگ جو ہو یہ اچھے لوگ ہو، لیکن تم سارے ریفاریجریٹر کے اندر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو۔ میں نے کہا، ریفاریجریٹر میں کیسے؟

کہنے لگا، تم ہر چیز کو محفوظ کرنے کے لیے ریفاریجریٹر میں رکھنے کے عادی ہو۔ اپنی انسانی زندگی کو بھی۔ تمہارے بچے ہیں، مثلاً پیارے پیارے تم ان کو اٹھا کے ریفاریجریٹر کے اندر رکھ دیتے ہو کہ یہ فریش رہیں، اور تروتازہ رہیں، اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ جب ہم بزری کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، پھلوں کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے ان کو ریفاریجریٹر میں رکھتے ہیں، لیکن کہنے لگا کہ ریفاریجریٹر کے اندر رکھی ہوئی یہ چیزیں جو ہیں، باہر سے تو تروتازہ رہتی ہیں، آپ کا بھی تجربہ ہو گا، سب کا ہے نا۔ اندر سے وہ اتنی اچھی، اور مزید اور کھانے کے قابل نہیں رہتیں، نہ لذت میں، نہ تاثیر میں، جتنی کہ تازہ ہوتی ہیں، اس نے کہا۔ میں نے تمہارے ملک کا ایک عجیب و غریب روانج دیکھا ہے کہ والدین یہ

چاہیں گے کہ بچے جو ہیں وہ ہم اٹھا کے شام کو دن کو ریفریجریٹر میں رکھ دیں، تاکہ وہ تروتازہ رہیں، اور ان کی خوبصورتی جو ہے، وہ بظاہر صحیح نھاک رہے۔ بچے یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے والدین بوڑھے ہو رہے ہیں، ان کو بھی ہم ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ تو آپ لوگوں نے ایک عجیب سارویہ زندگی کا اختیار کیا ہوا ہے، جونہ تو Human ہے، اور نہ بہادر قوم سے اس کا تعلق ہے۔ تو میں نے کہا، تم یہ عجیب بات کر رہے ہو۔ صحیح ہے ریفریجریٹر میں والی بات لیکن اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ اس نے کہا، خرابی کی اس میں یہ بات ہے کہ ریفریجریٹر میں جب چیزیں رکھی جاتی ہیں تو ان کو مجموعی طور پر ایک ہی جگہ پر گھسیرہ ہی نہیں دیا جاتا۔ ان کو الگ الگ کر کے رکھا جاتا ہے، تاکہ ٹھماڑا ایک طرف رہیں، بینکن ایک طرف رہیں، مٹھائی ایک طرف رہے، پانی ایک طرف، تو ایسے ہی آپ الگ الگ کر کے رکھتے ہیں اپنے آپ کو۔ تو زندگی میں بھی آپ اپنے دوسرے گروہوں سے الگ الگ رہتے ہیں۔ یہ وہ کریں جو آپ کی ہے وہ ایسے فرج میں رہتی ہے کہ اس کے قریب کوئی جانہیں ممکن نہ ہے۔ آپ کے استاد جو ہیں، ٹیچر جو ہیں، پروفیسر جو ہیں، وہ بھی ایک اپنی خانہ بندی کر کے بیٹھے ہیں، ان کی بھی اپر وچ نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر ز لے لیں، وکیل لے لیں وہ سارے کے سارے ان لوگوں کے متعلق نہیں ہیں، جن لوگوں سے متعلق یہ ملک ہے۔ ان کو ضرورت پڑتی ہے، مثلاً ڈاکٹر ز ہیں، بینکنوں کی طرح پڑے ہیں، اور وہ وہاں سے ہی اپنا آرڈر جاری کرتے ہیں، ہونایہ چاہیے کہ ان کے، اور مریض کے ماہین ایک ارتباط باہمی رہے اور وہ ایک دوسرے کو جانتے پہنچاتے رہیں۔ ٹیچر جو ہے، استاد جو ہے وہ اپنے طالب علم کے ساتھ ملتا رہے، اور ان کو جانتا پہچانتا رہے، Human Being کے درمیان جب تک تعلق نہیں ہو گا کتاب آپ کو فائدہ نہیں دے گی۔ اگر کتاب ہی فائدہ پہنچا سکتی، تو اللہ تعالیٰ ایک رسی کے ذریعے دنیا میں ایک کتاب اتنا سکتا تھا ہر گھر میں۔ اس کے لیے کیا مشکل تھا، لیکن نہیں اس کے ساتھ پیغمبر ضرور بھیجنा ہوتا ہے، کیونکہ جب انسان نہیں ہو گا، ان کے سامنے اس کی مثال نہیں ہو گی، اس کی شکل و صورت سامنے نہیں ہو گی، تب تک ان لوگوں کو تقویت نہیں ہو گی کہ یہ ہمارے جیسا انسان ہے۔ مجھے سے اکثر پوچھتے ہیں کہ بابوں کی آپ بڑی بات کرتے ہیں۔ بابوں میں کیا خوبی ہوتی ہے۔ بابوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ بادشاہ وقت اپنے جوتے اتنا کر ان کی جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے، حالانکہ کیا ہوتا ہے ان کے پاس کچھ دینے کو۔ بابا جو ہوتا ہے وہ IMF نہیں ہوتا۔ ہم تو IMF کے پاس سر کے مل جاتے ہیں۔ بابے کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ابھی ایک بی بی کہہ رہی تھی کہ اخلاق کی سر بلندی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی جیران ہوتا ہے کہ انسانی وقار، اور یہ اشرف المخلوقات کا لیوں اتنا اونچا بھی ہو سکتا ہے، اور ہم جو ہوتے ہیں ”تم ردنه اسفل سفلین“ تو ہم ڈر کے مارے سر جھکا جاتے ہیں کہ ہم چوتھے لیوں کے آدمی ہیں۔ تو جیسا میں نے کہا کہ مور لک کی یہ بات مجھے بڑی دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے کہا، تم اتنے محاط ہو

کہ اپنے بچوں کے لیے پیش اعلیٰ درجے کے سکول بنادیے، وہ ایک اور طرح کے ریفریجریٹر ہیں کہ یہاں پر میں اپنا بچہ لے جا کر داخل کر دوں، اور یہ بالکل تروتازہ رہے، اور جب ضرورت پڑے گی تو نکال کر اس کو زندگی کے کاموں میں لے آئیں گے۔ پھر اس نے کہا میری تم سے محبت ہے اور تمہاری وجہ سے پاکستان سے محبت ہے، تم ایسے کرو ریفریجریٹر میں زندگی گزارنے کی بجائے تو ستر میں زندگی گزارا کرو، تاکہ تھوڑا سا سینک لگنے کو، اور جو تم میں کچاپن ہے وہ پچھلی میں تبدیل ہو اور جب تمہاری ضرورت پڑے چھلانگ مار کر باہر نکلو۔ تو سٹ دیکھا ہے، لکھتا ہے ہاں، اور اس کا فائدہ ہوتا ہے۔

تو تم تو نو ستر سے بہت گھبرا تے ہوا پنی زندگی کو سینک دینے کو تیار ہی نہیں ہو، تعلیم دلواتے ہو صرف نوکریاں حاصل کرنے کے لیے۔ وہ بات جوانسانیت پیدا کرتی ہے، وہ تو سینک لگنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں ہوتی، لیکن تم اتنے محتاط ہو اور اتنے خوفزدہ ہو کہ حالات اور زمانہ کو Face کرنے کے لیے تم اس قسم کی صورت حال پیدا کرتے رہتے ہو۔ اس نے کہا، میں تو تھوڑا سا خوش ہوں تمہارے ملک میں جو ابھی فوجی ٹریننگ ہے کا کول وغیرہ کی، وہ ٹھیک ہے، باقی کے تو آپ نے سارے ادارے بتا کر دیئے ہیں، اور مجھے اندیشہ ہے کہ کویا یہ اس کے ساتھ بھی تم لوگ یہی نہ کرو۔

میں پچھلے دنوں ایک پروگرام دیکھ رہا تھا، پتا نہیں کہاں۔ اس میں بالواسطہ طور پر تو نہیں بلا واسطہ طور یہ بات آتی ہے، اس میں کوئی بتا رہا تھا کہ لڑکیوں کے ساتھ رویہ اچھا نہیں ہوتا۔ آج کل یہی ہے نا، اور لڑکوں کے ساتھ بہت اچھا ہوتا ہے۔ لڑکوں کو کھانے میں ناشتے میں انڈہ پر اعتماد تھا، لڑکیوں کو کہتے ہیں تو کڑی ہے کوئی بات نہیں تو بعد میں کھانا یا نہ کھانا، ہمارے ہاں ایسا ہوتا رہا ہے۔

ہمارے گھر میں میری ماں کہتی تھی میری بہن سے کہ ابا کے بوٹ پاش کر۔ وہ بیٹھی بوٹ پاش کر رہی تھی اور ہم مزرے سے کھانا کھا رہے ہوئے تھے، تو یہ باتیں ساری رہتی رہی ہیں تو میں نے جب یہ دیکھا، میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ تو ہمیں کس طرف کھینچے لیے جا رہا ہے، تو میں نے اپنی ماں سے جو زندہ تھی۔ اس وقت یہ پوچھا۔

میں نے کہا کہ یہ رویہ جو تھا آپ کا اس کی کیا وجہ تھی۔ انہوں نے کہا، یہ بہت ضروری رویہ تھا، اس لیے کہ اس لڑکی کو آگے جا کر بچے پیدا کرنے تھے، اور ان بچوں کو پالنا تھا، اگر اس کو انڈہ کھانے کی عادت اب پڑ جاتی تو وہ سارے انڈے کھا جاتی اور بچے اس کے بیٹھنے رہ جاتے نہیں کے اوپر۔ یہ اس کی ٹریننگ تھی، یہ ہم جانتے تھے، اس بات کو اور کہنے لگی، میرے پیارے بچے یہ اسی طرح سے تھا کل کو تم روئے لگ جاؤ گے کہ جو غسل میں کیدت ہوتا ہے، اس کی کاکوں میں کتنی سخت ٹریننگ ہوتی ہے۔ صح سردیوں میں چار بجے اٹھادیتے ہیں، اس کو پھر پانی میں غوط لگواتے ہیں، پھر خاردار تار میں اس کا بدن چھلتا ہے، پھر اس کو کہتے ہیں کہ اس کنٹری ریس لگاؤ۔ کہ اس کنٹری بیچارہ لگاتا ہے۔ میں صدقے جاؤں

پھر آکے اس کو ناشتہ ملتا ہے۔ کتنی بڑی بات ہے لیکن ہرگز بری بات نہیں۔ اس کو تو کارگل کے اوپر Face کرنا ہے، دشمن کو، وہ تو وہاں کھڑا ہے ایسی برفوں میں، جہاں اور کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح عورت جو تھی وہ ایک طاقتور Phenomenon تھی، اور اس کو مضبوط ہونا تھا، اور ان کی مضبوطی دشمنی کی بات نہیں ہے۔ یہ جھا کا جو ولایت والے دیتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں۔ ہماری تو عورت بہت عزت دار ہے، اس سے بڑی محبت ہے اتنی محبت ہے کہ دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں ہر ایک شے کے پیچھے، ہر گاڑی پر ماں کی دعا لکھا ہے۔ کبھی کسی نے باپ کی دعا نہیں لکھا ہوتا۔ باپ سے نہیں۔ ہم محبت کرتے ہیں ماں سے کرتے ہیں۔ عورتیں پیاری ہوتی ہیں خیر۔ یہ ایک بات دوسری طرف بات چلی گئی۔

مورک کہنے لگا یہ تو سڑکی زندگی جو ہے یہ کامیاب آدمی پیدا کرتی ہے، اور سینک لگنے کی ضرورت ہے، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے اندر جور و یہ ہے وہ بڑا گذی گذی بڑائیے دیے رہنے کا انداز ہے۔ ہاتھ ملتے رہتے ہیں آپ ہر وقت ڈٹ کر اپنے آپ کو نہیں بتا سکتے کہ آپ پاکستانی ہیں، اور آپ کا، ایک فخر ہے، جیسا کیسا بھی فخر ہے۔ تو میں نے کہا، بھئی ہمارا کیا فخر ہے، ہم تو بالکل شرمند ہیں۔ مثلاً ہم میں کیا خوبی ہے۔ اس نے کہا کہ دنیا کی واحد قوم ہے جو بڑی مہماں نواز قوم ہے۔ غریب ہیں ہم چھوڑ رہے ہیں اپنی روایات۔ لیکن آپ سیالکوٹ میں جائیں کہیں گے جی کھانا کھا کے جائیں۔ ہمارے امریکہ میں یہ نہیں ہے، ہالینڈ میں یہ نہیں ہے، آپ اس پر فخر نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا، نہیں ہم ڈرے ہوئے لوگ ہیں، اور ہم فخر نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا، پھر اپنے آپ کو تھوڑا سا تو سڑک میں رکھا کرو۔ سینک لو، پھر فخر کی بات کرو۔ میں نے کہا، یہ یار تم بجیب کی بات کرتے ہو۔

کہنے لگا، جی بڑی دیر کی بات ہے پرانے زمانے میں چاننا میں جب منگ خاندان کے باوشاہ ہوا کرتے تھے، ایک آدمی کو سوئی کی ضرورت پڑی۔ غریب آدمی تھا چاننا کے لوگ بہت غریب بے حد و حساب غریب تھے، تو اسے سوئی نہ مل سکی۔ تو ایک دن چلا جا رہا تھا، خوش قسمتی سے، اس کو ایک لوہے کا اوزار، جس سے مٹی کھودتے ہیں وہ مل گیا، وہ بڑا خوش ہوا۔ ایک پھر مل گیا اس کو گھانے والا۔ اس نے کہا لو جی یہ تو بن جائے گی، سوئی سانچھ ستر سال میں۔ وہ گھا کے ساری اس نے باریک کر لی تھی۔ تو اس نے سانچھ سال کے اندر وہ گھا کے سوئی بنالی، اور اپنے کام میں لے آیا۔ یہ کرنے والے کا کام ہے، جو بھاگ جائے تھا۔ خوردہ ہو جائے، ڈر جائے، مرعوب ہو جائے، اس کے لیے پھر بڑا مشکل ہوتا ہے زندگی کا کام کرنا۔ جب اس نے یہ بات کی تو مجھے اپنے کانج کا زمانہ یاد آیا۔ میں سینک ایئر میں تھا، تو یہاں لا ہو رہا میں ایک جگہ فلینگ روڈ ہے، وہاں رہتے تھے، اب انے لے کر دیا تھا، ایک چوبارہ، ایک ملازم اور ایک کراس اسٹرچ تھا جہاں بینچ کے پڑھتے تھے، گاؤں سے آئے ہوئے۔ تو وہاں پر

پرانی میوہ منڈی میں ایک دکان کو آگ لگ گئی، وہ دکان تھی گرہ ساری کی۔ آنا، دال، نمک۔ بساطی کہہ لیں اس کی دکان تھی۔ اور وہ ایسی طالم آگ لگی، لوگ بچارے بھاگے بالٹیاں لے کر، پریشانی کے عالم میں، فائز بر گیلڈ بھی جیسا تھا اس زمانے میں گزگز اتا ہوا پہنچا، لیکن وہ ساری کی ساری دکان بالکل خاکستر ہو گئی۔ ہم اس آدمی کو جانتے تھے، جس کی یہ دکان تھی۔ اگلے دن کا جج جانے کے وقت میں وہاں سے گزر اتو میں بڑا حیران ہوا، وہاں جو راکھ کا ذہیر تھا ناسارا، اس کے اوپر ایک میز، اور کرسی لگا کر اس دکان پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا مالک۔

اور اس نے ایک گتہ لکھ کر لگایا ہوا تھا "ساری دکان جل گئی خاک کا ذہیر بن گیا، یہوی نج گئی، پچ نج گئے، الحمد للہ خدا کا شکر، کام بدستور جاری ہو گا، آج کے دن کی معافی چاہتا ہوں، کل دکان اسی میز پر کھولی جائے گی۔"

تو یہ ایک ارادہ اور ایک تہیہ ہوتا ہے۔ ایک میں میں ہوتا ہے، رونا پیننا، مارے گئے لوٹے گئے، جی برباد ہو گئے۔ اب ہم سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اب ہم اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ یہ ہم کام کر سکیں۔ توجہ تک آدمی کو زندگی میں سینک نہ لگے، اور وہ مقابلہ نہ کرے نامساعد حالات کا، تو اس وقت تک اس کے اندر پوری صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، جیسی ایک ٹرینڈ فوجی کی ہوتی ہے۔ اس میں آپ کتنے بھی نقائص نکال لیں، لیکن اس کا ایک چوکھا ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جو ایک اور قسم کے سکولوں میں پڑھے، ان کا میرے ساتھ آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں، بہت اعلیٰ درجے کی تعلیم دلوار ہے ہیں۔ ایک اس کے درمیان ہے۔ وہ بھی پڑھا رہا ہے، اپنی ترقی کر رہا ہے۔ زندگی کا اندازان کا، اور ہے۔ ایک، اور ہیں جو دینی تعلیم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، خاص قسم کی گھڑیاں باندھ کر، خاص قسم کے رومال کندھوں پر رکھ کر، بہت اچھا کر رہے ہیں، ٹھیک کر رہے ہیں، لیکن ان کے درمیان ایک ربط باہمی نہیں ہے۔ تعلیم بسم اللہ الگ الگ ہو، بالکل اپنی مرضی کے مطابق ہو، لیکن ان لوگوں کے درمیان نہ صرف پل ہنا ہوا ہو، ان کے اندر سر نکیں بھی چلتی ہوں، تاکہ جب موقع ملے، تو وہ سرگ سے گزر کر جا کر پوچھ سکیں کہ خان صاحب کیا حال ہے، کس طرح سے ہیں۔ توجہ تک ہم وہ فرنچ والی زندگی کا اعادہ کرتے رہیں گے، ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور ہم جواب پنے آپ کو فریش اور تروتازہ سمجھتے ہیں، اور ہم یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ اس طرح کی زندگی بسر کرنے میں ہم کونہ صرف آسانی میسر آئے گی، بلکہ ہم آگے بڑھ کر نامساعد حالات کا مقابلہ بھی کر سکیں گے، ایسا ہو گا نہیں۔

یہ بہت ضروری ہے کہ آپ کے حالات جو ہیں، وہ زمانے کے حالات کے ساتھ تکراتے رہیں، ورنہ گھوم پھر کر اسی طرف کو لوٹ کر آتے رہیں گے اور آپس میں جھگڑا کرتے رہیں گے کہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے، ہماری تعلیم کو اس طرح سے چلانا چاہیے، ہمارے آپس کے تعلقات اس

نوعیت کے ہونے چاہئیں۔ تعلقات توجہ ہوں گے جب آپ ایک دوسرے کے ساتھ ملیں گے۔ اس کے بغیر تو چارہ نہیں ہو سکے گا، پھر تو آپ کی آرزو نہیں ہی آرزو نہیں رہ جائیں گی۔ اور آرزو جو ہوتی ہے، وہ قال کی بات ہوتی ہے، گفتگو سے آگے کام بڑھتا نہیں ہے۔ میں آپ کو عرض کروں کہ مجھے بات یاد آگئی پتا نہیں کرنی چاہیے کہ نہیں۔ ہمارے یہاں پر ایک صاحب تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کے نام خط لکھے اور اس کمال کے خط وہ تھے، اتنی محبت تھی ان میں، اتنی یگانگت، اتنا پیار کہ میں نے باوجود ایک ادیب ہونے کے ایسی انشا پردازی کے نمونے اردو زبان میں نہیں دیکھے تھے اور اس کی بیوی نے جو بدستور اس کو خط آتے رہے وہ چھاپ دیئے، مجھے تو جبھی پتا چلا۔ ورنہ مجھے اس نے دکھانے تو نہیں تھے۔ کتابی صورت میں چھپ گئے۔ چھپ کے جب سامنے آئے میں نے پڑھئے میری بیوی نے پڑھئے ہم ایک دوسرے سے شرمند ہوئے کہ دیکھو محبت تو اس کو کہتے ہیں، اور یگانگت اس چیز کا نام ہے، اور ایک دوسرے کو جانتا۔ وہ صاحب کہیں باہر تھے، دور ملک میں، کہیں ناروے وغیرہ یا کہیں اور۔ ظاہر ہے وہاں سے لکھے تھے۔ تو مجھے تھوڑے دن ہوئے ان کی بیوی ملی، میرے ساتھ متعارف ہوئی۔ میں ان کو جانتا نہیں تھا میں نے ان سے کہا، بھٹی ہم نے خط پڑھئے تھے، بہت حیران و پریشان ہوئے اور تم نے بہت اچھا کیا جو تم نے اسے کتابی صورت میں شائع کرایا، تو کمال کی چیز ہے وہ۔ کہنے لگی، ہاں سر جب وہ کتابی صورت میں چھپے تھے، اس کے ذریعہ مہینے کے بعد ہماری طلاق ہو گئی۔ میں نے کہا، میں تم سے ان خطوں کی بات کر رہا ہوں۔ تو وہ کہنے لگی، سراصل میں وہ میں بھی آپ ہی کی طرح سمجھتی رہی۔ دراصل اس میں محبت کا شایبہ نہیں تھا۔ اس میں انشا پردازی کا کمال دکھایا تھا صاحب نے۔ ہوتا ہے نادسوں جماعت میں پرچا آتا تھا خط کشیدہ الفاظ کو اپنے فقروں میں استعمال کریں، ٹھیک ہے ناجی۔ مہنگائی، دردمندی، لمطراق وغیرہ۔ عجیب و غریب بات تھی۔ تو اس نے دکھایا تھا کہ دیکھو میں یہ لفظ بھی استعمال کرتا ہوں۔ محبت کے جتنے شعر ہیں۔ وہ بھی استعمال کرتا ہوں۔ تو اس نے لیے قال سے اور قول سے جو طاقتور لوگ ہوتے ہیں، وہ بڑی ہمت کے ساتھ بڑے طریقہ کے ساتھ۔ اور پھر میں یہ کہوں گا، بڑے سجاوے کے ساتھ سجاوے ایک خاص روایہ ہوتا ہے جس میں کسی کو ٹنگ کیے بغیر Irritate کیے بغیر، کسی کو کسی کے ساتھ جھکڑا کیے بغیر، آسانی سے آدمی اس پر سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ تو ابھی یہ بات چونکہ چلی تھی تو اس میں میں عرض کر رہا تھا کہ اب ہم کو اللہ کے واسطے اس قال کی دنیا سے کسی حد تک نکل آنا چاہیے۔ یہ آپ نے اکثر دیکھا ہواً اخباروں میں، کہ ہم کو چاہیے کہ ہم اسلام کے اصولوں پر عمل کریں یہ ”چاہیے“ جو لفظ ہے نا، یہاں ختم ہو جانا چاہیے۔ چھوٹے بچے کو ہم کہتے ہیں کہ پیارے بچے تم کو چاہیے کہ سید ہے پاؤں کا بوث سید ہے میں ڈالو، الٹے پاؤں کا بوث الٹے میں۔ چھوٹے بچے دیکھے ہیں، اکثر اثابوٹ پہنچتے ہیں تو ان کو ”چاہیے“ کہہ سکتے ہیں لیکن ایک قوم میچور

ہو جائے باولن برس اس قوم کی عمر ہو جائے اسے بار بار یہ کہتے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ہم ساری برائی ترک کر دیں۔ یہ بڑا مضمون خیز اور شرمناک سافقرہ لگتا ہے، یا ہم کو چاہیے ہم ایسا کریں۔

اس طرح کی جب نیوز آتی ہیں تو میں تو انہیں چھوڑ دیتا ہوں کہ یہ تو ایک لفظ چاہیے کا استعمال ہے، جیسے خط کشیدہ الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے، تو اس لیے اب ہم پیچور ہو گئے ہیں، اب ہم بڑے ہو گئے ہیں، اللہ کے فضل سے ہم تریپن سال میں داخل ہو رہے ہیں۔

تو ہمیں مقابلے کی جوت ہے، دوسری قوموں سے مقابلہ کرنا ہے اور سب سے بڑی ذمہ داری کی جو میں بات کرتا ہوں کہ ساو تھا ایشیا میں پاکستان وہ واحد ملک ہے جس کو دوسرے ملکوں کی Protection کرنی ہے، ان کو حفاظت عطا کرنی ہے، ورنہ ایک بہت بڑا ظالم ملک ہے یہاں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ملک، نیپال ہے، بھوٹان ہے، سکم ہے، سری لنکا، برما ہے، افغانستان ہے۔ یہ پاکستان کی ذمہ داری ہے، یہ میری اور آپ کی ذمہ داری ہے۔ ہم طاقتور قوم ہیں بڑی قوم ہیں، ہم ایک اتنا مک انجی کی مالک قوم ہیں۔ ہمیں تو نہ صرف اپنے آپ کو، بلکہ ساو تھا ایشیا کی ذمہ داری ہم پر آگئی ہے۔ اتنا مک پاور بننے کے بعد ہم نرم، اور ملپٹے ہو کر رہے تو پھر تو یہ کام نہیں ہو گا۔ پھر تو بہت مشکل پڑ جائے گی۔ ہم بہت پاسندہ قوم ہیں، اور ہر آدمی کو ہر وقت چلتے ہوئے سوچتے ہوئے کوتا ہیاں کتنی بھی ہو جائیں گرتا پڑتا رہے آدمی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرا تاریخ کیا ہے؟

حرم شریف میں مجھے ایک آدمی ملا۔ لمبی کہانی ہے، لیکن اس نے اپنی پگڑی دھو کے زم زم میں ڈالی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ کہنے لگا سائیں ہم پاکستانی ہیں۔ میں نے کہا، کہاں سے آئے ہیں۔ کہا، ہم سندھ سے آئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ کب سے ہیں یہاں۔ کہنے لگا، مجھے ایکس برس ہو گئے ہیں یہاں رہتے ہوئے۔ میں نے کہا، سبحان اللہ، کیا کرتے ہو؟ کہنے لگا، سائیں ہم منڈی بوجھا ڈھونڈتے ہیں۔ صبح وہاں سے چار پانچ روایاں مل جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا اللہ کا شکر ہے، پھر ہم حرم میں آ کے بیٹھ جاتے ہیں۔ سائیں اس کو دیکھتے ہیں۔ میں نے کہا، سبحان اللہ بڑے خوش نصیب ہو۔ تو میں نے کہا، سائیں تم یہاں حرم شریف میں اتنی دری سے کیا کرتے ہو۔ کہنے لگا، سائیں ہم گر پڑتے ہیں اور پھر انھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر گر پڑتے ہیں، پھر انھ کر کھڑے ہو نے کا کام بھی ہے، جو سندھی بابا نے بتایا۔ اس سندھی بابا کو سلام ہو جو مزدور تھا، جس نے لاکھ روپے کی، کروڑ روپے کی بات کی، کھڑے ہو جانے کی، تو ان کو سلام ہو۔ آپ کو سلام۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

Snap Shot

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

زندگی کے اطوار بھی عجیب و غریب ہیں اس میں نشیب و فراز، تاریکی، روشنی، ظلت، نور کے مظاہر آتے ہی رہتے ہیں، لیکن ہمارے بابے ایک بات سے بطورِ خاص منع فرماتے ہیں کہ اگر بھی خدا نخواستہ، اللہ نہ کرے آپ کو دوزخ میں جانے کا اتفاق ہو، تو وہاں سے جلدی فرار اختیار کر لیں۔ اگر مشرق کا دروازہ کھلا ہے تو اس کی طرف منہ کر کے نکل جائیں پچھم کا پورب کا جدھر سے بھی آپ آسانی کے ساتھ نکل سکیں، وہاں سے نکل جائیں، اور ہرگز ہرگز رکیں نہیں۔ زندگی میں ایسے مقام آ جاتے ہیں، آدمی پھنس جاتا ہے۔

لیکن بابے کہتے ہیں، ہمارا مشاہدہ ہے، اور ہمارا تجربہ ہے کہ جب بھی آدمی دوزخ میں جاتا ہے، اس میں پختا ہے تو وہ بجائے وہاں سے بھاگنے کے، دوزخ کے اندر دوزخ کے فوٹو کھینچنے لگتا ہے، وہاں کی تفصیلات کٹھی کرنے لگ جاتا ہے، اور پھر جب جا کے خوش قسمتی سے اس کو موقعِ نصیب ہوتا ہے، تو پھر وہ وہاں سے نکلتا ہے، وہ دوزخ اور جہنم کی تصویریں ہی اتارتا رہتا ہے، اور آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں گزرا ہو گا، جس نے یہ کام نہ کیا ہو۔ تو ہم بڑے حیران ہوتے ہیں، ان کی اس بات پر، اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ Snap Shot لینے کے بعد وہ بڑی محنت اور محبت کے ساتھ ان تصویریوں کو نہیں بروایت کی صورت میں کاغذ پر اتارتا ہے، بلکہ اینڈ وائٹ فوٹو تیار کرواتا ہے، اور ان کے الہم تیار کر کے زندگی بھرا پے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے، اب یہ بات بڑی عجیب و غریب سی لگتی ہے، لیکن جب وہ اس بات کو کھولتے ہیں، تو پھر پتا چلتا ہے کہ بات واقعی حقیقت ہے، اور وہ اعلیٰ درجے کی زندگی گزارنے کے باوصاف ہمیشہ آپ کی خدمت میں وہ فوٹو پیش کرتا رہتا ہے، جو دکھ اور تکلیف کے زمانے میں ایک لمحے کے لیے چاہے آیا ہو، اس نے گزارے تھے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ میرے الہم کو دیکھیں میں نے کیسی مشکل سے وقت گزارا ہے۔

ہم سارے تقریباً اسی طرح سے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ جب پاکستان بنا، اور میں یہاں آیا تو اکیلا میں یہاں تھا۔ میرے گھر کے لوگ ساتھ نہیں آ سکے۔ ہم بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ میں نے اللہ آباد یونیورسٹی سے بنی۔ اے کیا تھا، اور فرست ڈویژن میں کیا تھا اور لاکٹیشن لڑکا تھا۔ یہاں آ کر میں لاہور میں نہہر کنارے یہ جو نہہر ہماری لاہور کے بیچ چلتی ہے، کھڑا تھا اور بے یار و مددگار یہ سوچ رہا تھا کہ میں کہاں آ گیا ہوں، اور میری زندگی کس طرح سے یہاں پر بسر ہو رہی ہے۔ اتفاق ایسا ہے کہ مجھے ایک شخص مل گیا، اس نے کہا، میرے بیٹے کو تعلیم دو، تم کو میں سور و پسیہ مہینا یا پچاس روپیہ مہینا دیا کروں گا، چنانچہ کہنے لگا میں بڑی مشکل میں تھا جسکے حالی میں ایک چھوٹی سی کوئی خدمت میں ان کے بچوں کو پڑھاتا رہا۔ روٹی، کپڑا، اور مکان یہ چیزیں مجھے میراً میں، لیکن وہ بہت بڑے دن تھے، اور میرے اوپر بہت بڑا بوجھ تھا، اور میں بڑا دکھ تھا، اور مجھے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ وہ خوراک جس کا میں عادی تھا وہ مجھے یہاں نہیں ملتی تھی، یہاں کی کچھ اور طرح کی تھی۔ تو کہنے لگا، اس کے بعد میں نے C.S.S کا امتحان دے دیا جو پہلا امتحان ہوا تھا، تو اس میں میں آ گیا، تو پھر میں نے یہاں ٹریننگ لی۔ ٹریننگ لے کر میں یہاں پر ملتان میں A.C. لگ گیا، تو وہاں پر زندگی کے دن گزارتا رہا، اس کے بعد میری سرگودھا تبدیلی ہو گئی۔ سرگودھا تبدیلی ہو گئی، تو پھر میں تھوڑی دیر بعد شیخوپورہ کا D.C. لگ گیا۔ شیخوپورہ کا C.C. لگنے کے بعد، میری خدمات جو تھیں، وہ سنپل گورنمنٹ نے لے لیں، اور میں فشری آف کامرس میں چلا گیا۔ اکنامکس کا کوئی اچھا بندہ تھا۔ وہاں چلا گیا۔ وہاں جانے کے بعد چار پانچ سال کی سروس کے بعد میرے صوبے پنجاب نے مجھے پھر ماٹگا اور میں یہاں آ گیا۔ خیروہ ایک زمانے میں لاہور کے کمشنز بھی رہے، لیکن وہ کہتے ہیں میں بڑا دکھی ہوں۔

یہ میرے الہم دیکھیں۔ میں جس کسپہری کی حالت میں یہاں وقت گزارتا رہا ہوں، یہ بڑا درد ناک، اور تکلیف دہ وقت تھا، اور اللہ کسی کو ایسا وقت نہ دکھائے۔ اس کے بعد وہ یہاں سے ولایت چلے گئے۔ ولایت میں پاکستان کی نمائندگی انہوں نے O.N.U میں کی۔ اس کے بعد انہوں نے ولڈ پینک میں ہماری نمائندگی کی یا انہوں نے خود سروس کر لی، وہاں رہے، وہاں سے ریٹائر ہوئے پھر ان کی ایک اعلیٰ درجے کے گھر میں، کوئی یہاں بھی تھی، کراچی میں بھی تھی۔ لیکن جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے، وہ اپنے دکھ کا ہی ذکر کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں، بہت تکلیف دہ وقت میں نے گزارا۔ ان سے میں نے کہا، اتنا دکھی وقت کیا تھا۔ کہنے لگا، جس گھر میں میں رہتا تھا، وہاں پر ہر تیسے روز ٹینڈے پکتے تھے اور مجھے ٹینڈے اچھے نہیں لگتے، تو میری زندگی کا دکھ سب سے بڑا یہ ہے کہ مرضی کے خلاف ٹینڈے کھا پے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کمشنز بھی رہا۔ لاہور کا، لیکن مجھے ان ٹینڈوں کا دکھ نہیں بھولتا، اگر انہوں نے تھوڑا سا وقت جہنم میں گزارا تھا، تو اس کے پاس اس کے فوٹو گراف بہت

تھے۔ آپ کو اکثر آدمی ملتے ہوں گے جو ہر وقت زندگی میں اپنے ان دکھوں کی بات کرتے رہتے ہیں، جو تھوڑے عرصے کے لیے آئے اور پھر گزر گئے اور اب وہ اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا، اللہ نے مجھ پر کیسے اچھے دن لائے، اور میں کس خوش بختی کے ساتھ اپنی زندگی خوش و خرم گزار رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ بھاجی آپ کو کچھ نہیں پتا، ہم نے بڑے بڑے دکھ برداشت کیے ہیں۔ بڑے مشکل راستوں سے گزرے ہیں۔ میں سمجھا سکا ہوں تا اپنا مطلب، سمجھ گئے آپ؟ ایک ہماری خاتون مجھے ابھی تھوڑے دن ہوئے میں کہ وہ بے چارکی کہہ رہی تھیں، بھائی جان! میں بھی فیروز پور کی رہنے والی ہوں، اور میں شینکاں والی بستی میں تھی۔ میں نے کہا، اچھا وہاں تو ہمارے اچھے خاصے مسلمانوں کے گھر تھے۔ کہنے لگی، میں چھوٹی سی تھی میرے والد فوت ہو گئے، میرے والد گارڈ تھے وہ میری چھوٹی عمر میں فوت ہو گئے۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ دو میرے بھائی تھے، ایک اوپر کا، ایک نیچے، میں درمیان میں تھی۔ میری والدہ نے بڑے دکھ سے ہیں، اور بہت مشکلات میں وقت گزارا ہے، اور ہم نے بہت تکلیف دہ دن دیکھے ہیں، جب میں ان کو یاد کرتی ہوں، تو روئی رہتی ہوں ہر وقت۔ تو میں نے کہا، اب کیسی ہو۔ کہنے لگی، ٹھیک ہے، اللہ کا شکر ہے، جو بھی وقت گزر رہا ہے ٹھیک ہے، لیکن اتنے تکلیف دہ حالات سے گزرنما اور گزر کر یہاں پہنچنا یہ ایک ایسا تکلیف دہ عمل ہے کہ اس میں لوگ آسانی کے ساتھ دوڑتک چل نہیں سکتے۔ میں نے کہا، بی بی اب آپ کہاں ہوتی ہیں۔ کہنے لگی، میں وہاں ہوں چکالہ میں۔ تو میں نے کہا، آپ کیا کرتی ہیں۔ کہنے لگی، میرے خاوند بریگیڈ یہر ہیں اور تین میرے بچے ہیں۔ ایک نے C.A کیا ہے، وہ یہاں لگ گیا تھا ایک فارن فرم میں، پھر وہ اس کو امریکہ لے گئے وہ وہاں پر ہوتا ہے، اور جو چھوٹا ہے وہ پروفیسر ہے، وہاں پر راوی پنڈی میں، اور جو سب سے چھوٹا ہے وہ کمپیوٹر کا کچھ کر کے چلا گیا ہے باہر۔

تو بھائی جان ہم نے بڑے دکھی دن دیکھے ہیں، ہم بڑے مظلوم لوگ ہیں اور ہمارے اوپر بہت تکلیف دہ وقت گزرا ہے، اور بچپن جو تھا میرا اور جوانی، وہ ایسی مشکلات میں گزری تو سارا دکھ کا اظہار کرتی۔ تو میں نے کہا بی بی اب تو ماشاء اللہ بہت اچھی ہیں، بڑی اعلیٰ درجے کی، آپ کو کوئی بُنگلہ ملا ہوگا، کار ہوتی ہے آپ کی بڑی سیاہ رنگ کی، اس کے اوپر ایک شاراگا ہوتا ہے۔ کہنے لگی، آئی تو اس میں ہوں، وہ باہر کھڑی ہے، لیکن دکھ بڑا ہے جناب، ہم بہت مظلوم ہیں۔ توجہ یہ ساری باتیں میں نے سنیں تو مجھے خیال آیا کہ مجھے بھی کوئی اپنا دکھ یاد کرنا چاہیے۔ میں تو اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تو مجھے بھی ایسے دکھ اکٹھے کرنے چاہئیں۔ مجھے بھی پچھو دکھ کے جہنم کے فنوں کھینچ کے اپنی ابم تیار کرنی چاہیے تھی تاکہ میں بھی بچوں کو بتا سکوں، بیٹا تم کو پتا نہیں ہم نے بڑی مشکل میں وقت گزارا ہے۔

مجھے خیال آیا اور تھوڑا سا اس بات پر میری بیوی نے برامانا۔ ایک زمانے میں میں ایک پرچہ

رسالہ نکالتا تھا ماہنامہ براخو بصورت رنگیں ”داستان گو“، اس کا نام تھا، تو ہماری مالی حالت درمیانی تھی، لیکن اس پرچے کونکالنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ کیونکہ وہ لوگوں کو بہت پسند آ گیا تھا، تو اتنے پیے نہیں تھے۔ تو میں ایک دفعہ اس کا کاغذ خریدنے کے لیے گیا۔ وہاں ایک گپٹ روڈ ہے، وہاں پر کاغذ کی مارکیٹ ہے۔ وہاں کاغذ خریدنے گیا تو کاغذ کا ایک رم خریدا تو میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ میں اس کاغذ کے رم کو کسی تانگے میں، کسی رکشہ میں، یا کسی ریڑھی میں رکھ کے لے آتا تو میں نے کاغذ کا رم لیا اس کو دو ہر اکیا اور کندھے پر رکھا لیا۔ بائیکل میں چلاتا تھا بڑی اچھی بائیکل تھی میرے پاس۔ تو میں سائکل پر سوار ہو گیا اور جب چلا تو انارکلی میں اس وقت بھی خاصارش ہوتا تھا۔ تانگے آ رہے ہیں، ریڑھے آ رہے ہیں، سائکلیں اور جو بھی کچھ اس زمانے کی ٹریفک تھی وہ چل رہی تھی۔ تو کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ کاغذ کارم جو ہے، اس کے جو بیٹھن لگا ہوا ہوتا ہے اور پر کا، مضبوط خاکی کا کاغذ وہ بچھت گیا، اور پھر دیکھتے دیکھتے چھر۔ رکر کے پانچ سو کاغذ جو تھے وہ ساری انارکلی میں پھیل گئے، اور ادھر سے آنے والے جوتا نگے تھے، اس کے پیے ظاہر ہے گیلے ہوتے ہیں ایک کاغذ پیٹ کر چھر۔ ر، اور میں دیوانوں کی طرح بھاگ کر کھتاز راتا نگہ رکو ایک کاغذ وہ لے گیا۔ ایک کاغذ وہ لے گیا۔ تو پھر بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، میں نیچے بیٹھ گیا، اور کاغذا کٹھے کرنے لگا کہ جتنے بھی نجیج جائیں اتنے ہی غنیمت تھے۔ آہستہ آہستہ جتنے بھی کاغذ نجیج سکے۔ کچھ تین سو ساڑھے تین سو ان کو میں نے اکٹھا کیا۔ کسی شخص نے مجھے وہاں ایک چھوٹا سا ستی کاٹوٹا دیا، وہ میں نے باندھا، اور باندھ کے پھر اسے کندھے پر رکھ کے چلا، تو پھر مجھے اپنی زندگی کے اوپر، اور اس حالت کے اوپر، اور ہتھ عزت کے اوپر، اور ذلت کے اوپر، جو سب لوگ تما شادی کھرے تھے، اور میں جھک جھک کے وہاں سے کاغذا کٹھے کر رہا تھا بڑی شرمندگی کا بھی احساس ہوا، اور ندامت تو تھی ہی، ساتھ فقصان کا بھی دکھ تھا۔

جب یہ اکٹھے کر کے میں گھر آیا رونی صورت ہنا کے تو میں نے یہ سارا واقعہ اپنی بیوی سے بیان کیا۔ اس نے بھی مجھے تسلی دی، لیکن وہ بھی میرے ساتھ اس غم میں شامل ہو گئی۔ یہ واقعہ گزر گیا۔ کئی سال بیت گئے، تو میں نے بھی اپنا ایک الیم تیار کر لیا۔ دکھوں کے الیم ساروں کے پاس ہوتے ہیں۔ تو میں نے بھی اس الیم میں یہ واقعہ جو چھوٹا سا تھا، اور اگر چہ اتنا اہم نہیں رہا تھا کہ شامل کیا جاتا، تو میرے پچھے اسے پڑھنے لگے جب میرا پہلا بیٹا آٹھویں نویں میں پہنچا تو میں نے اسے کہا، تمہیں پتا نہیں ہم نے کس مشکل سے وقت گزارا ہے۔ میں نے اور تمہاری ماں نے کتنی محنت کی ہے، اور کن دکھوں سے، اور کن مشکل را ہوں سے گزرے ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنا کاغذ خریدنے گیا، اور میں اسے انارکلی میں کندھے پر رکھ کے۔ اور میرا بینا حیرانی سے دیکھ رہا ہے کہ بیچارہ ابوکندھے پر رکھ کے یوں بائیکل چلاتا ہوا گزرا، اور میں نے سارا واقعہ دیا۔ اس کے دل پر بڑا عجیب سائز ظاہر ہے ہوا ہو گا، تکلیف

وغیرہ۔ لیکن میں اس کی نظروں میں ایک ہیر و بن گیا، اور میں خود بھی اپنے آپ کو ایک ہیر و سمجھتا گیا کہ دیکھو کن مشکلات اور حالات اور کیسے تکلیف وہ اوقات سے گزر اہوں، پھر میرا دوسرا بچہ، اس کو بھی میں نے یہ بات سنانی شروع کی، اور جہاں جہاں میں بیٹھتا تھا، اپنا یہ الہم کھول کے اس میں سے یہ رسمیں تصویر نکال کے سب کو، اور پوری تفصیل کے ساتھ سناتا تھا، اس طرح بہت سارے سال گزر گئے۔ تو ایک دن میری بیوی نے مجھ سے کہا (ظاہر ہے وہ بھی بابا جی کے Influence میں آ گئی تھی) یہ نہایت گھنیمات ہے جو آپ کرتے ہیں اور جس کے ساتھ میں بھی شامل ہوں، کیا ہوا اگر ایک چھوٹا سا ذرا تکلیف وہ وقت آیا، اور تم نے اس کو اتنا پھیلا کر کے اس کو پورا و جو کیا ہوتی ہے پیو راما سکرین کے اوپر سنانا شروع کر دیا، اس کو بند ہونا چاہیے۔ تو میں نے کہا تو پھر میرے پاس تو یہ جوابم ہے، جس دکھ کی کیفیات میں نے بیان کی ہیں، یہ تو چلنی چاہیں، کیونکہ ہر شریف آدمی کے پاس اپنی الہم ہوتی ہے، اور وہ دکھ کے جوانہوں نے فوٹو کھینچنے ہوتے ہیں سکرین پر، وہ کبھی بھی ان کو نہیں چھوڑنا چاہتا، چاہے کتنے اونچے درجے پر پہنچ جائے۔ تو اس نے کہا، نہیں آپ اپنی الہم کو دیکھیں۔ میں نے اس میں تبدیلی کر دی ہے، ان تصویروں کو میں نے کارٹون میں بدل دیا ہے، ایک ہنسی کی چیز بنادی ہے کہ زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی آیا، اور یوں گزر گیا تو یہ ہنسنے والی بات ہے نہ کہ اتنا دردناک رو نے والی۔ خواخواہ آپ توجہ وصول کرتے ہیں، یہ صحت مند ذہن کی نشانی نہیں ہے، تو پھر مجھے خیال آیا کہ ان کی بات تو تمیک ہے۔ اب ہم اس کو ایک کارٹون کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور میرے بچے، اور پوتے تالیاں بجاتے ہیں کہ وادا کے ساتھ یہ ہوا ہوگا، کیسے کاغذ کے پیچھے بھاگے تھے۔ میں نے کہا، میں ایسے ڈھک کرتا ہوا بھاگتا تھا، تو خوش ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک اور دوست ہیں، وہ ہمارے علاقے ہو شیار پور کے ہیں، وہ جب بھی ہم میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں، جناب کیا وہ زمانہ تھا، اور کیا گھٹا میں کالے نیلے رنگ کی ہوتی تھیں، کوہ شوالک کے اوپر آتی تھیں، اور ہر گھنٹا کے آگے ایک بگلوں کی قطار ہوا کرتی تھی، یہاں پر وہ ساری چیزیں نظری نہیں آتیں، اور ہم کتنے خوبصورت آم وہاں کے کھایا کرتے تھے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کو بتاؤں، اور میرے دوست جو ہو شیار پور کے رہنے والے ہیں، مجھے معاف کریں کہ ہو شیار پور میں آم تو ضرور ہوتے تھے، لیکن اتنے کھٹے اتنے کھٹے آم کہ آپ نے زندگی میں سلفیور ک ایسٹ دیکھا ہوگا، وہ بھی اس سے تھوڑا سا پھیکا ہوگا۔ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ یہ آم تو ایسے ہیں کہ اگر مردے کے منہ میں نچوڑ دیں، تو انہ کر بیٹھ جائے گا، اور کہے گا السلام علیکم۔

تو ایسے آم وہ ہوتے تھے، لیکن وہ وہاں رہتے ہیں، اور وہ ہمیشہ ایک ہی بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اشفاق صاحب آپ کو یاد ہے نا کہ وہ آم ہوتے تھے، اور وہ نیلی گھٹا میں، وہ یہاں پر نہیں

ہوتیں۔ وہ ایک گھر، ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی ہمارے ساتھ، ایک شیش محل، اس کے پاس، بیچارے کرایے پر رہتے تھے، اس کو انگریزی زبان میں Nostalgia کہتے ہیں، بہت سے لوگ اس پر کہانیاں بھی لکھتے ہیں، ناول بھی لکھتے ہیں، جو جگہ چھوڑ کر آئے ہوں، اس زمان و مکان کو جس کو آپ نے ترک کر دیا ہو، یا جو ماضی میں آپ کی زندگی میں سے ہو کر گزرا ہوا اور آپ ادا کی حالت میں اس کو یاد کرتے ہوں، اس کو ”ناٹلچیا“ کہتے ہیں۔ اور اس کی ایک بڑی پکی نشانی یہ ہے کہ اگر ناٹلچیا کے مریض سے، جو یادوں کی کہانیاں، افسانے، ناول لکھتا ہے، اس سے اگر یہ کہا جائے کہ چل تھے اس جگہ وہ اپنے لے چلتے ہیں تو، کبھی نہیں جائے گا وہاں پر۔ کیونکہ یہاں پرانی آسائش کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

تو یہ ہمارے دوست ہمیشہ وہی پرانے زمانے کی بات دھراتے رہتے ہیں اور یاد کرتے رہتے ہیں۔ سارے ہوشیار پور میں تین چار یادیں آم میٹھے مل ہی جاتے تھے، لیکن اس وقت تو میں اس سے کہتا ہوں، ناٹلچیا والے بندے سے کہ تم اس کو یاد کرتے رہتے ہو، اور دلکھی ہوتے رہتے ہو، مجھے یہ بتاؤ، اب تم کہاں ہو؟ تو وہ کہتا ہے، آج کل میں ملتان میں ہوں، اور میرے دو آموں کے باغ ہیں۔

جس، وہ مالک ہے اس کا، ایک تو شر بہشت کا باغ کا ہے اس کا، اور ایک انور ٹول کا باغ ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ میں نے بڑی محنت سے تیار کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں ہم اسے بچ نہیں سکتے۔ میں اسے ایکسپورٹ کرتا ہوں، لیکن ان دونوں بڑے باغوں کے باوصف جن کا میں مالک ہوں وہ جو آم ہوتے تھے نا، وہ مردے کے منہ میں نچوڑنے والے ہوتے تھے۔ وہ میں ضرور یاد کروں گا، یہ ناشکر گزاری کی بات نہیں ہوتی ہے۔ انسان کے اندر بابوں کے کہنے کے مطابق ایک ایسی خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر وہ کبھی بھی تکلیف سے گزرے ہوتے ہیں، چاہے تھوڑے عرصے کے لیے ہوں، وہ اس کے زیادہ سے زیادہ فوٹو کھینچ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں، اور جب بھی آپ سے ملتے ہیں، اچھے بھلے ہیں، خیریت کے ساتھ ہیں۔ پہلے کے مقابلے میں دس گنا بیکھر سو گنا زیادہ آرام میں ہیں، لیکن وہ دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کئی خواتین کرتی ہوں گی کہ بہت مشکل میں وقت گزار اس صورت حال سے نکلنے کے لیے پھر ایک صحت مند ذہن، اور ایک صحت مند روح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ روٹیں بھی ماوف ہو جاتی ہیں، وہ بابے فرماتے ہیں کہ اگر بھی خدا نخواست آپ کو کسی وجہ سے دوزخ میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں سے بھاگ کر گزرنے کی کوشش کریں، وہاں کھڑے ہو کر اس کے فوٹو نہ اتارنے لگ جائیں اور ان کے الجم تیار کر کے لوگوں کے سامنے، جیسے فقیر دروناک نہیں دیکھے آپ نے، کچھ تو ہوتے ہیں پئی لپیٹ کے نڈے ہاتھ دکھا کے آپ سے رحم کی بھیک مانگتے ہیں، تقریباً تقریباً خواتین و حضرات اسی طرح سے وہ لوگ جو آپ کے دوست ہیں، عزیز ہیں، رشته دار ہیں، ایسی کہانی سن کر آپ سے جذبہ ترجم، آپ کی توجہ کی بھیک مانگتے ہیں، میں اور آپ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ

اے خدا ہم کو اس قسم کی مصیبت میں یا اس قسم کے عارضے میں بہلانہ کرنا، اگر ہمارے اوپر کبھی کوئی مشکل وقت آئے تو ہم وہاں سے بھاگ کر گزریں، اور پھر اس کاذکرنہ کریں کہ آتا ہے وقت، اور پھر گزر جاتا ہے۔ چنانچہ ان بڑے لوگوں کے قصے جب آپ بیان کرتے ہیں ہمارے اولاد، اور سابقوں کے، تو ان کی زندگیوں میں آپ کو سب سے اعلیٰ درجے کی سب سے ارفع چیزیں ملے گی کہ وہ اپنے گزرے ہوئے دکھوں کا، اور تکلیفوں کا ایسے اظہار نہیں کرتے تھے۔ بڑا انسان بننے کے لیے انسان کو وہ ثابت پہلو پیش کرنا چاہیے جو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ہم میں تھوڑی تھوڑی سی عادت پیدا ہو چکی ہے اب ہمارے ملک کے لوگوں کی، کہ دکھ تکلیف نا آسودگی کا اظہار بہت زیادہ Exaggeration کے انداز میں بہت زیادہ مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

قول اور نفس

ہم اہل زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔

قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے اور خوش ہوتا ہے، لیکن جب عمل کی صورت میں جانا پڑے، تو پھر گھبرا تا ہے، اور خدمت کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرتا۔ یہ ایسی بات تھی جو ہم کو سننی پڑی پہلی مرتبہ ذیرے پر جا کر، تو اس کا مفہوم کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پہلی بات یہ کہ ہمارے لیے نفس کا تصور ہی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ قول کیا ہوتا ہے۔ تیسرا یہ کہ خدمت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہم نے بابا جی سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا، آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا جی میں افسانے لکھتا ہوں۔ کہنے لگے وہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا، جی کہانیاں۔ میں وہ لکھتا ہوں۔ کہنے لگے یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی خوشی ہوئی، لوگ پڑھتے ہیں، سنتے ہیں۔ میں نے کہا، جی ہاں۔ کہنے لگے، آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں، اب تک۔ میں نے کہا کوئی سو کہانیاں لکھیں۔ کہنے لگے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ کہنے لگے سو کہانیاں تو بہت ہوتی ہیں، اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے لکھیں۔ مجھے یہ بتائیں، اس میں حال پر کتنی کہانیاں لکھیں۔ یہ میرے لیے ایک نیا لفظ تھا، جیسے آپ کے لیے بھی نیا ہے کہ ”حال پر“ کا کیا مطلب؟ وہاں ان کے سیکرٹری صاحب تھے انہوں نے کہا، بابا جی یہ پوچھتے ہیں آپ کے اوپر حال کی صورت میں گزری ہوئی کہانی جو آپ نے لکھی ہے، یعنی وہ آپ کی زندگی کا ایک حصہ ہو۔ آپ پر گزری ہوا آپ کا حال رہا ہو، آپ کی کیفیت رہی ہو، تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا، سر جس بات کا تعلق میرے حال سے ہے میرے مشاہدے سے نہیں، میرے مطالعے سے نہیں، بلکہ میری اندر کی ذات سے ہے وہ تو ان سو میں سے شاید تین بنتی ہیں۔ تین یوں کہ ایک دفعہ مجھے ایف۔ اے میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی، تو وہ بیچاری فوت ہو گئی تھی۔ وہ کہانی میں نے بڑے دروناک انداز میں لکھی تھی، جی وہ تو میرا ایک حصہ تھا۔ اس طرح سے دو اور کیفیات میں سے گزرا ہوں۔ تو کہنے لگے باقی ستانوے آپ نے کیسے لکھیں۔ میں نے کہا پڑھ پڑھا کے، اخبار میں کچھ چھپا کہ ملتا ہے

میں یہ ہو گیا، ساہیوال میں یہ کیفیت گزری پنوں عاقل کے لوگوں کے اوپر یہ ہوا، تو اس کی کہانی بناؤالی۔ کہنے لگے، نہیں یہ تو نفس کو دھوکا دینے والی بات ہے، اور قول کو ایسے ہی پھیلانے والی بات ہے۔ ہم سوچنے لگے غور کرنے لگے کہ نفس ہوتا کیا ہے۔ جناب نفس ایک اہم شے ہے۔ آپ نے کبھی وہ باجا دیکھا ہے جو پرانے زمانے میں ہوتا تھا، جس پر توے لگتے تھے۔ Disk چلتی تھی۔ پرانے گھروں میں ہوتا ہے۔ اس میں ہم چاہی بھرتے تھے، تو اس کے اندر ایک چار گٹور والا گورنر چلتا تھا۔ وہ سپیڈ کو باندھ کر رکھتا تھا۔ وہ کم ہونے دیتا تھا، نہ بڑھنے دیتا تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک سلکھے کا Regulator ہوتا ہے، اس طرح نفس بھی انسانی وجود کے اندر ایک Regulator ہے، اور وہ اپنی مرضی کے ساتھ وجود کا اتار چڑھاوے، گرمی سردی، مزاج مقرر کرتا ہے۔ جیسے آپ کے C.A. یونٹ میں ہوتا ہے۔ کبھی اس کو فین Fan پر کر دیتے ہیں، کبھی اس کو یونٹ پر کر دیتے ہیں، جیسے آپ کی کار کا سینیرنگ ہوتا ہے، جیسے آپ کے ہوائی جہاز کا Telescope ہوتا ہے کہ اوپنچانیچا ہونے پر وہ بتاتا رہتا ہے کہ کتنا اوپنچا گیا ہے۔ اسی طرح انسانی وجود کے اندر اس کا نفس ایک Telescope ایک سینیرنگ ہے، وہ اس کو بتاتا رہتا ہے کہ تو میری مرضی کے مطابق کام کر۔ اپنی مرضی کے مطابق یا جو تجھے احکام ملے، یہ مت کر، اور پھر ہم سوچتے ہیں یہ بدجنت کدھر سے آگیا۔ ہم نے نا سے بازار سے خریدا، نا سے رشتے داروں سے لیا، نا سے کہیں سے منگوایا ہے۔ تو دوسال کی عمر تک کے بچے کے اندر تو نفس موجود نہیں ہوتا۔ وہ بڑی خوشی کے ساتھ دوسرے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے کھلو نے شیر کرتا رہتا ہے، اور ان کے ساتھ لا ای کرتا ہے۔ چھینا چھٹی، بھاگا دوڑی، لیکن اس کے اندر کسی قسم کی منافقت یا رنجش پیدا نہیں ہوتی، پھر سے دوست بن جاتے ہیں، پھر کھلینے لگتے ہیں۔ وہاں پر اس کا نفس موجود نہیں، لیکن دوسال کی عمر گزرنے کے بعد ماہرین کہتے ہیں نفس کا نج بویا جانے لگتا ہے، اور یوں سمجھیں آپ کی آسانی کے لیے کہ یہ نفس کمزور ایسے ہی ہوتا ہے، جیسے آپ اپنے گھر میں مری جاتے ہوئے، سوات جاتے ہوئے، یا صحت افزام مقام پر جاتے ہوئے اپنے ملازم کو چھوڑ گئے ہیں، وہ گھر کی تکہداشت کرے۔ توجہ آپ لوٹ کر آئیں تو وہ ملازم گھر کا مالک بن جائے اور آپ سے پوچھئے، جناب آپ کیا چاہتے ہیں؟ کس سے ملتا ہے؟ وہ کہے، میری مرضی کے بغیر میری اجازت کے بغیر یہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو کنٹرول کروں گا۔ اس نفس کی جو سب سے زیادہ مرغوب غذا ہے وہ قول ہے، گفتگو سے یہ بہت موٹا ہوتا ہے اور یہ اپنی گفتگو کو عام کرنے میں لوگوں کو مرغوب کرتا ہے۔ اس کی مرغوب غذا تو قول ہے، لیکن لوگوں کو اپنے اختیار میں رکھنا، اور ان کو مرغوب کرنا یہ اس کا فعل ہے۔ تو یہ ذرا پیچیدہ سی بات شروع ہو گئی، کیونکہ بابا جی کا خیال آگیا تھا، قول کے ساتھ جب آدمی وابستہ ہوتا ہے، تو اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتا ہے۔ لوگوں کو بھی دھوکا دیتا ہے، جیسے سیاستدان۔ وہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ قول کی بات کرتے

ہیں کہ جب میں حکومت میں آگیا تو میں آپ کی تخلواہ دس ہزار روپیہ فی مہینا کر دوں گا۔ یہاں آگیا تو گھر بناؤں گا۔ آپ کے گھر دل میں دیواروں پر کارپٹ اور پردے لگاؤ دوں گا اور ہم لوگوں سمیت بھی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لختی اچھی بات کر رہا ہے۔ وہ شاید خود نہیں کر رہا ہوتا، اس کا نفس اس کے اندر چالی بھر کے کھڑ رہا ہوتا ہے کہ کہہ دے، کیونکہ میں نے یہ آزمائے، اور پرتا کے دیکھا ہے کہ گفتگو کرو دینا کافی ہوتا ہے۔ اس سے آدمی کبھی بھی تحقیق کی تھے تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ صرف کہتا اچھا لگتا ہے، مجھے ایسے ہی خیال آگیا جب ہم مدل میں تھے تو ہمارے ایک استاد تھے۔ وہ ہمیں جغرافیہ پڑھاتے تھے، لیکن وہ بہت موٹے تھے۔ ان کا جسم پلپلا تھا۔ کافی قد تھا۔ بچان کا کوئی نہیں تھا۔ صرف بیوی تھی۔ ڈاکٹر نے ان کو ورزش کرنے کو کہا تو انہوں نے ورزش کرنے کی ایک کتاب خریدی، جس میں ورزش کرنے کے بارے میں ہدایات تھیں۔ تو وہ چار پائی پر لیٹ کر اپنی بیوی سے کہا کرتے تھے کہ میری پیاری بیوی مجھے یہ کتاب پڑھ کر سناؤ اور وہ سناتی تھیں۔ ہم ان کے پاس جاتے تھے، تو ہم ان سے پوچھتے ماشر صاحب آپ یہ کیوں سنتے ہیں؟ کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک سائز کرنے کا حکم دیا ہے۔ میری بیوی پڑھتی جاتی ہے، اور میں غور سے سنتا جاتا ہوں۔ اب وہ سمجھتے تھے کہ اس کے قول سے اور اس کے کہنے سے ایک سائز ہوتی رہے گی اور میرا وزن کم ہوتا رہے گا اور میں سارث ہوتا رہوں گا۔ لیکن وہ بے چارے اسی موٹا پے میں فوت ہو گئے اور ان کی کوئی ایک سائز نہ ہو سکی۔ عمل اور قول میں یہ تضاد جو ہے نا، یہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، اور عام زندگی کا اگر آپ مطالعہ کریں تو لوگوں کو منافق کہنے سے پہلے یا ان کوڈبل شینڈرڈ کا کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیں کہ ہمارے اندر بیٹھے ہوئے اس طوطے کا یہ فعل ہے جو ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ قول اور عمل کو ساتھ ملا کر چلنے سے البتہ آدمی کی فلاج کے راستے نکلتے ہیں۔

ایک دفعہ بہت بادل سا چھا گیا لیکن اس میں بادل کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں اور میرا بڑا بھائی جو کہ کلاس میں بھی مجھ سے ایک سال بڑے تھے۔ ہم کتنی دیر سے چلے، اور گھر سے سکول کا فاصلہ ذرا زیادہ تھا۔ جس گاؤں میں ہم رہتے تھے فاصلے پر تھا، اور اساتذہ ہمارے سخت تھے تو اندیشہ اس بات کا تھا کہ ہم دیر سے سکول پہنچیں گے۔ میری عادت تھی کہ جلد پریشان ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا بھائی صاحب! سکول تک ہم نہیں پہنچ سکتے، بہتر یہی ہے کہ یہاں بیٹھ کر اللہ سے دعا کریں کہ اے خدا ہماری مدد فرم اور یہاں بیٹھ کر چاروں قل پڑھیں اس کا اچھا اثر ہو گا۔ تو میرے بھائی نے کہا، انھو تیز تیز بھاگتے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ قل بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ خالی بیٹھ کر پڑھنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ یہ چیز مکر کر دو۔ تو یہ بات نفس پر گراں گزرتی کہ یہ اتنی ساری چیزیں لے کر ساتھ کیسے چلا جائے۔ بلکہ یہ تو زندگی میں چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اب چونکہ مجھے اپنے گاؤں کی

بیک گرا و ندیا د آ گئی، وہاں ہماری بہت بڑی منڈی تھی، وہاں ہفتے کا دانہ آتا تھا، کیونکہ Agriculture لینڈ تھی، وہاں ہمارا ایک آرٹسی تھا، وہ بہت "وردمند" قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے گوداموں کو مونے مونے تالے لگا کر بھی لمبی چابیاں لگا کر کہتا رہتا تھا کہ یچارے غریبوں کا بہت براحال ہے۔ اب بھی آپ نے اکثر نا ہو گا، جس آدمی کے پاس بھی فارغ وقت ہوتا ہے، کہتے ہیں مہنگائی بہت ہو گئی۔ یچارے غریب کیا کریں گے؟ اب؟ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ میں تو کافی امیر ہوں میں تو گزارا کر لوں گا، یچارے غریب کیا کریں گے۔ آپ بھی روز گفتگو میں کہتے ہیں۔ ایسے ہی وہ کہا کرتا تھا، یچارے غریبوں کا براحال ہے۔ ان کو ایک وقت کی روٹی نہیں ملتی کیا کریں۔ وہ قول کی بات کرتا تھا، قول کے ساتھ وابستہ تھا، اس کی زندگی ایسی ہی تھی۔

اس کا پیٹا ہمارا ہم درد تھا۔ ساتویں آٹھویں میں پڑھتا تھا، اس کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کیونکہ جب بھی کوئی فقیر یا گدا گرا آتا اور کہتا کہ اللہ کے نام پر مجھے ایک سیر گندم دے یا مکنی دے، اس وقت سیر ہی وزن میں استعمال ہوتا تھا۔ تو وہ کہتا تھا، بھی یہ اللہ نے کیا کیفیت بنارکھی ہے، میں بڑا دکھی ہوں، تھی کو اور تیرے بچوں کو اللہ سلامتی عطا کرے، اور تمہارے گھر پر بارش ہو نعمت کی فراوانی کی۔ فقیر یچارا چلا جاتا تھا، اس کی باتیں سن کر۔ اس کا پیٹا اس سے ہمدرد تھا، تو اس نے ایک روز اپنے باپ سے کہا، بیاپو! تو ایسے کر کہ تو یہ جو لوگوں کی بہتری کا کام کرتا ہے تا، یہ میں کر دوں گا۔ اس نے کہا، تو کیسے کر دے گا۔ کہنے لگا، یہ گودام کی چابی مجھے دے دے تو دعا مانگتا رہ، میرے پاس چابی ہو گی۔ آرٹسی نے غصے سے کہا خبردار تو نے ایسی بات کی۔ دعا مانگنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اچھا اللہ بھلا کرے، لیکن چابی جو ہے وہ مضبوطی کے ساتھ لگی رہنی چاہیے۔ تو میں کہہ رہا تھا نفس کو ٹرینڈ کرنے کے لیے اور اس نفس کو صحیح راہ پر رکھنے کے لیے بزرگوں نے لوگوں نے سائنسدانوں نے سائیکوٹھر اپ نے بڑے طریقے ایجاد کیے ہیں، لیکن یہ قابو میں نہیں آتا، اور ہر وقت آدمی کو Vigilant ہو کے Attentive ہو کے، ہوشیار ہو کے، چوکس ہو کے اس کی طرف نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ آدمی کا انجام جو ہے، اچھا نہیں ہونے دیتا۔ شیطان اتنا نقصان نہیں کرتا۔ جتنا نفس کرتا ہے۔ اس کا بنیادی تعلق گفتگو کے ساتھ ہے اور بات کے ساتھ ہے اور یہ بات سے نکلنے نہیں دیتا۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہو گا اس وقت بھی اس سے پہلے بھی، جب اخبار نہیں چھپتے تھے، الیکٹر ایک میڈیا نہیں تھا۔ میرے جیسا پروگرام نہیں ہوتا تھا تو اتنی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ اب اخبار بھی چھپتے ہیں، ایڈیٹوریل بھی لکھے جاتے ہیں، کالم بھی روز آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، لیکن وہ سب کچھ جو ہونا چاہیے، وہ ہو نہیں رہا۔ یہ انسانی زندگی جو کہ ایک بڑا ناوار وجود ہے، اس کی ایک Entity کا ایک بوجھ ہے، اس کا سہارا نہیں ہے۔

ایک بادشاہ تھے، وہ شاید چین کے تھے یا کسی اسلامی دنیا کے تھے۔ ان کے ایک پیر تھے اور ان کے بہت بہت پیر و کار، اور مرید تھے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی، تو لوگ حیران ہوتے تھے اور وہ جس راہ سے جس گاؤں قریب سے گزرتے تھے مریدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ تو جب وہ دربار بادشاہ یا خلیفہ کے مقام پر پہنچ تو انہوں نے بڑی آڈ بھگت کی، اور ان کا بڑا جشن منایا تو تقریباً 50 ہزار ان کے پیر و کار جو تھے وہ کھلے میدان میں جمع ہو گئے اور وہ سب اپنے مرشد کے درش کرنے کے لیے دن رات وہاں بیٹھے رہے۔ بادشاہ نے بہت خوش ہو کر اس مرشد سے کہا آپ بہت خوش نصیب آدمی ہیں کہ آپ کے معتقدین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انہیں گناہ بھی نہیں جاسکتا، اور وہ کیسے کیا جم غیر بیٹھا ہے۔ لوگوں کے سر ہی سرد کھائی دے رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا، یہ جو سارے کے سارے بندے جو میرے مرید ہیں، اور یہ جو میرے معتقدین ہیں یہ سارے کے سارے قول کے آدمی ہیں۔

ان کا میری ذات کے ساتھ یا میرے وجود کے ساتھ یا میری روحانی درس و تدریس کے ساتھ کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ یہ مجھے مانے والے نہیں ہیں۔ بس چلے آ رہے ہیں میرے پیچھے پیچھے۔ آپ سرزاں پر نکل کر کھڑے ہو جائیں اور ایک طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھنے لگیں، آہستہ آہستہ ٹریک رکنے لگے گی اور کوئی نہ کوئی آدمی آپ کے ساتھ ساتھ منہ اٹھا کے ادھر دیکھنے لگے گا پوچھ جائیں کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ پھر ایک اور آجائے گا، اس طرح بے شمار لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ ویسے ہی لوگ ہیں، اسی طرح کے۔ انہوں نے کہا، میں یہ بات نہیں مانتا یہ تو بہت گھرے عقیدت منظر آتے ہیں۔ ان کی دل وجہ نہ کاہیں، آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ یہ کیسے کہتے ہیں، یہ خالی قول کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

انہوں نے کہا اگر آپ ٹیسٹ کرنا چاہتے ہیں تو یہ لیبارٹری ٹیسٹ ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہاں یہ جو پچاس ہزار آپ کو نظر آتے ہیں میرے مریدین میرے معتقدین، میری پیر وی کرنے والے، ان میں سے صرف ڈیڑھ شخص ایسا ہے جو میری عقیدت والا ہے اور مجھ پر جان ثاری کر سکتا ہے اور مجھ کو مانتا ہے، اور باقی کے ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے کہہ رہا ہے۔ یہ ڈیڑھ کیسے کہہ رہا ہے اور اس نے کہا، ٹیسٹ کیسے کریں؟ اس نے کہا ٹیسٹ ایسے کریں کہ ان کے نفس کا ٹیسٹ کریں۔

پرانے لوگ اپنے طرز پر ٹیسٹ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا، اسی میدان کے اوپر ایک شیلا ہے، اور اس نیلے کے اوپر مجھے آپ ایک جھونپڑی بنوادیں، فوراً رات کی رات میں بنوادیں، جیسے بزرگ لوگ جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ میں اس میں رہوں گا۔ تو بادشاہ نے جھونپڑی بنوادی۔ اس جھونپڑی میں اس بزرگ نے دو بکرے باندھ دیئے اور کسی کو پتا نہیں کہ اس میں دو بکرے باندھے گئے ہیں، اور پھر وہ جھونپڑی سے باہر لکلا اور کچھ دم درود اور وظیفہ کیا، اور اوچھی آواز میں کہا۔ ہے کوئی میرے سارے مریدین میں سے جو مجھ پر جان چھڑ کتا ہو؟ میری بات دل کی گہرائیوں سے مانتا ہو، اور میرے ساتھ ہر

بری اچھی میں ساتھ دینے والا ہو اگر کوئی ایسا ہے تو وہ میرے پاس آئے، اور میرے ساتھ رہے، جو قربانی اس سے مانگوں، وہ دے۔ بس سناتا چھا گیا۔ سب لوگ جہاں بیٹھے تھے دم بخود بیٹھے رہے۔ دم بخود بیٹھے رہے۔ کہ اللہ جانے یہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اب اس پچاس ہزار کے جم غفار میں سے صرف ایک آدمی اٹھا، وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈھیلے پاؤں رکھتے اس کے پاس گیا۔ اس نے کہا، تجھے میں یہ دم ختم ہے؟ اس نے کہا، ہاں ہے۔ کہا، آمیرے ساتھ۔ اس نے اس کی کلائی پکڑی اس کو جھلکی کے اندر لے گیا، اور وہاں کھڑا کر دیا، اور کہا خاموشی کے ساتھ کھڑا رہ۔ پھر اس نے ایک بکرے کو لٹایا، چھری نکالی، اور اسے ذبح کر دیا جھونپڑی کی نالی کے پاس۔ اور جب وہ خون نکلا تو پچاس ہزار کے گروہ نے دیکھا، اور وہ خون آلو چھری لے کر باہر لکا، اور کہا قربانی دینے والے شخص نے قربانی دے دی۔ میں اس سے پوری طرح سے مطمئن ہوں۔ اس نے بہت اچھا فعل کیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو حیران، اور پریشان ہو گئے۔ اب ان میں سے لوگ آہستہ آہستہ ہٹکنے لگے۔ کچھ جوتیاں پہن کر کچھ جوتیاں چھوڑ کر پیچھے بیٹھنے والے سوچتے ہوئے کہ اللہ جانے، یہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ کم ہونا شروع ہو گئے۔ جب کم ہونے لگے، تو انہوں نے کہا، اے لوگو! قول کے آدمی نہ بننا صرف مضبوطی، اور استقامت کے ساتھ کھڑے رہنے کی کوشش کرنا۔ یہ تو جو ہوا قربانی دینے والا اس کو توانا آپ نے بھی۔ اب میں پھر ایک اور صاحب سے کہتا ہوں، وہ بھی اپنے آپ کو قربانی دینے کے لیے پیش کرے، اور میرے پاس آئے، کیونکہ یہ اس کے نفس کا ثیہ ہے۔ تو سناتا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آگے نہ بڑھا۔ اس دوران ایک عورت کھڑی ہوئی۔ تو اس نے کہا۔ اے آقا میں تیار ہوں۔ اس نے کہا، بی بی آ۔ اس نے کہا، بسر و چشم۔ چنانچہ وہ بی چلتی چلتی جھلکی میں گئی، اس بیچاری کے ساتھ بھی وہی ہوا، جو پہلے کے ساتھ ہوا۔ اندر اسے کھڑا کیا، اور دوسرا بکرا ذبح کر دیا، اور اس کے پرنا لے سے خون کے فوارے چھوٹے۔ جب یہ واقعہ ہو چکا تو بادشاہ نے کہا کہ آپ صحیح کہتے تھے، کیونکہ وہ میدان سارا خالی ہو گیا تھا۔ پچاس ہزار آدمی، ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ انہوں نے کہا، میں نے کہا تھا میرے مانے والوں میں سے صرف ڈیڑھ شخص ہے جو مانتا ہے۔ بادشاہ نے کہا، ہاں میں مان بھی گیا، اور سبھی بھی گیا، اور وہ شخص تھا وہ مرد تھا وہ پورا تھا، جبکہ وہ عورت جو عورت تھی وہ آدمی تھی۔ اس نے کہا، نہیں بادشاہ سلامت یہ مرد آدھا تھا اور عورت پوری تھی۔ پہلا جو آیا تھا اس نے کوئی خون نہیں دیکھا تھا۔ اس بی بی نے دیکھا تھا، جو واقعہ گزرا، پھر بھی انہ کر آنے کے لیے تیار ہوئی تھی، اس لیے وہ سالم Entity پر ہے حا توں، اور آدھا وہ مرد ہے۔ میرے مانے والوں میں ڈیڑھ لوگ ہیں، باقی سارے نفس کے بندے ہیں۔ تو اس نفس کے ساتھ انسان کی اپنے طرز کی لڑائی رہتی ہے۔ کہیں کامیاب ہوتا ہے کہیں گرجاتا ہے۔ یہ وہ گیند ہے، جب زمین پر مارو تو اچھتا ہے، پھر زمین کی طرف آتا ہے۔ اللہ ہم آپ کو یہ تقویت عطا کرے۔ ہم

اپنے نفس کا معاشرہ کر کے اس کو قابو میں لانے کے لیے ان لوگوں کی تعلیم پر عمل پیرا ہو سکیں، جنہوں نے ہمیں بننے بنائے نہ دیئے ہیں کہ اس پر عمل کریں، اور جیسے نبیوں نے، جو انسانوں کی صورت میں نبی ہم کو ملتے رہے ہیں، انہوں نے ہمیں بنا بنا یا پروگرام دیا۔ اس پر عمل کرتے رہیے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے، اللہ حافظ۔

انسان اپنی خواہش پوری ہونے کی راہ میں خود حائل ہو جاتا ہے

اب تک کا وقت اچھا، اور بے حد خوش گزرا، اور ہماری ہر خواہش پوری ہوتی رہی۔ لیکن خواہشوں کے پورے ہونے کا لوگوں کو یقین نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں، جب ایک خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے تو باوجود واس کے کہ مہاتم بادھ نے بڑی شدت سے منع کیا تھا کہ خواہشوں کو پیدا نہ ہونے دینا ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، لیکن میں سمجھتا ہوں اور ہمارے بارے یہ کہتے ہیں کہ خواہش اگر دل میں پیدا ہوا اور آپ کی کوئی آرزو ہوا اور آپ نے کوئی دھارنا دھاری ہو، تو وہ ضرور پوری ہو کر رہے گی، رکتی نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ جب آپ کوئی آرزو دل میں جوان کرتے ہیں، اس کو پالتے پوستے ہیں تو جہاں پر یہ آرزو اپنے پورے دباو کے ساتھ پیدا ہوتی ہے وہاں پر ایک ویکیوم پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، اور جہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے اس کو بھرنے کے لیے تندو تیز، خوشنگوار ناخوشنگوار ساری ہوا میں اس کی طرف چلتی ہیں۔ آپ نے گولادی کیا ہوگا، کبھی آپ گاؤں میں رہے ہوں تو گاؤں میں زیادہ آتے ہیں، شہروں میں تو نکال ہی دیجے ہم نے۔

یہ بڑی تیزی کے ساتھ گھومتا ہے اور اس کے اندر بڑی شدت کا خلا ہوتا ہے، اور اتنا خوفناک کہ ہر قسم کے ڈبے روزے سرکنڈے کیا کیا کچھ نہیں اڑتا چلا جاتا اس کے ساتھ پورا ستون سا بن جاتا ہے بہت اونچا۔

میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، اور سکول سے آ رہا تھا جب ایک گولا میں نے دیکھا تو میں بمحبت اس کے اندر گھس گیا۔ اندر اتنی خاموشی اتنا سکون، اتنی صفائی، کوئی نیچے سے صفائی بھی کرتا چلا آتا ہے۔ میں اس کے اندر چلتا چلتا ایک سکون کی کیفیت میں چلتا آ رہا تھا۔ جب آرزو پیدا ہوتی ہے دل میں، آدمی چاہ رہا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تمجیل کو پہنچے تو اس کے حصول کے لیے قدرت بھی

چاروں طرف سے آپ کی مدد کرتی ہے، لیکن آپ کہیں گے کہ اشراق صاحب المثل بات کر رہے تھے۔ ہمارے دل میں اتنی آرزویں ہیں کہ کبھی ایک بھی پوری نہیں ہوئی، تو اس میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ خواہش کے پوری ہونے کی راہ میں آدمی خود کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ایک بلے باز کی طرح جو کرکٹ کا بیٹھتا ہے، اس مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے، جہاں اس کی خواہش کو آ کر پورا ہونا ہو، وہ آنے والے ہر خوش آیند، اور خوش گوار غضر (Element) کو، ہر اس تکمیل کو پہنچے والی چیز کو، بلے کے ساتھ پہنچنے مار مار کر وہاں سے بھگتا رہتا ہے۔

یہ عجیب انسانی فطرت ہے۔ کبھی آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ عجیب لگے گی۔ خاص طور پر کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب ہم نے خواہش پیدا کر دی تو وہ پوری ہو۔ لیکن تم نے اگر غور کیا، تو دیکھو گے، اس کے راستے میں اور کوئی بندہ حائل نہیں ہے، صرف آپ کی ذات، آپ کا وجود حائل ہے اور آپ بھی کوشش کر کے اسے لاشعوری طور پر جان بوجھ کرنے میں ہٹانے اور مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کے ذہن میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ اس کو فوراً پورا ہونا چاہیے۔ یہی ہے تا، کبھی آپ آنس کریم جہاں میں، آپ نے آنس کریم والی مشین تو دیکھی ہو گی تا۔ اب تو بجلی والی آگئی ہے۔ تو آنس کریم جہاں نے میتھیں تو خدا کے واسطے اس کا ڈھکنا بار بار نہ کھول کر دیکھتے رہیں کہ جی ہے یا نہیں۔ اس طرح تو وہ کبھی بھی نہیں جھے گی۔ آپ اس کی راہ میں کھڑے نہ ہوں۔ جب آپ نے تھیہ کر لیا ہے کہ اس کو بننا ہے، اس میں سارا مصالحہ ڈال کر مشین کو چلانا شروع کر دیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب وہ پائی تکمیل کو پہنچے۔

میری اور میری آپا کی ایک بڑی بے چینی ہوتی تھی کہ ہم نے اپنی چتری مرغی کے نیچے انڈے رکھے تھے کہ اس میں سے چوزے نکلیں گے اور ہم دونوں اس بات کے بہت شوقیں تھے۔ اب اس کے تین دن بعد چوزوں کو نکلنا تھا۔ ہم میں یہ خرابی تھی کہ ہر تیسرے چوتھے دن بعد ایک دو انڈے نکال کر انہیں سورج میں کر کے دیکھتے تھے، آیا ان کے اندر ایک یو بنا ہے کہ نہیں؟ تو خاک اس میں سے چوزا نکلتا تھا۔ بار بار انھا کے دیکھتے تھے، اور پھر جا کر رکھ دیتے تھے، آخر میں ہماری والدہ نے کہنا، خدا کے واسطے یہ نہ کیا کرو۔ اس لیے جب آپ نے پورے ایک فریم ورک کے اندر ارادہ باندھ کے چھوڑ دیا، پھر اس کو راستہ دو۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی آرزو کو راستہ دو، اچھی بری جیسی کیسی ہے اس کو راستہ دو۔ اس کے راستے میں کھڑے نہ ہوں، آپ اگر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہو گا کہ بہت سے مقامات پر آپ خود اس کے راستے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی ساری خوبیوں کو خود ہی خرابیوں میں تبدیل کر لیتے ہیں، اور پھر الزم دوسروں کو دیتے ہیں۔ اتنی تو آپ میں صلاحیت ہوئی چاہیے۔ یہ الزم مجھے اپنی ذات پر دینا چاہیے۔ دیکھیے آپ نے جب ایک چھٹی لیٹر بکس میں ڈال دی،

تو پھر اس کے پاس جا کر کھڑے نہ ہوں کہ کب نکلتی ہے۔ ذا کیا اسے کہاں لے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس خط کے ساتھ ساتھ چلنے لگے، تو پھر وہ سا ہیوال بھی بھی نہیں پہنچ سکے گی، آپ بار بار پوچھیں، بھی یہ کدھر لے جا رہا ہے، کس گاڑی میں چڑھا دیا ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تیز والی پر جائے۔ جب آپ کی خواہیں ہوتی ہیں، اس میں رخنے اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ آپ کرچکنے کے بعد بھی اس میں رائے اپنی دیتے رہتے ہیں۔ میں اکثر دیکھتا ہوں اور تکلیف بھی ہوتی ہے، مثلاً بچیوں کی شادیاں ایک بڑا مسئلہ ہے، اور بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس میں والدین کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ جلدی ہو اور یہ ہے بھی بات محکم۔ لیکن ایک مرتبہ آرزو کرچکنے کے بعد وہ پھر اتنا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں اور اس کو اللہ پر چھوڑنے کے بجائے یا اس آرزو پر چھوڑنے کے بجائے جو آپ نے اپنے اللہ کے ساتھ باندھ دی ہے، پھر اس میں اپنی ذات داخل کرتے رہتا، اور وہ آپ کی ذات اس میں داخل ہو کر بھی بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ میں آپ کو جیسے کہ پچھلی باتیں بتا رہا تھا اور آس کریم کی مثال دے رہا تھا، ہمارے گھر میں بچے اس وقت بڑے ہو چکے تھے۔ میں تو فرست ایر میں تھا۔ ہمارے گھر میں ایک کیمرا آیا، اس زمانے میں کیمرا آنا بڑی کمال کی بات تھی۔ باس کیمرے بہت کم ہوتے تھے۔ باس کیمرا آیا ہمارے قبے میں آیا۔ لوگ بڑی بڑی دور سے گھوڑوں پر بیٹھ کر دیکھنے آئے اور انہوں نے کہا کہ خان صاحب کے گھر کیمرا آیا ہے۔ انہوں نے کہا جی کہ تصویر کھینچنی ہے ذیلدار صاحب آئے اونٹ پر سوار ہو کے کہ تصویر کھینچنی ہے۔

بڑے بھائی بی۔ اے میں پڑھتے تھے، ان کو ابا جی نے باس کیمرا لادیا۔ اب اس میں فلم ڈال کے اس زمانے میں شیشے کی پلیٹ ہوتی تھی پتلی Negative کھینچنے کے لیے اس کو ڈال کے تصویر کھینچی، تو پھر ہم بھائی کے گرد جمع ہو گئے۔ ہمیں نکال کے دھائیں کیسی کیسی ہوتی ہیں۔ اس نے کہا، نہیں ابھی نہیں۔ ہم نے کہا، اس کا پھر کیا فائدہ۔ کیمرا تو یہ ہوتا ہے آپ نے تصویر کھینچی ہے اور ابھی پوری ہو۔ تو ہم کو یہ بتایا گیا کہ اسی وقت نہیں آتی ہے تصویر، لیکن آتی ضرور ہے، لیکن ہماری یہ تربیت نہیں تھی؛ ٹریننگ نہیں تھی، ہم چاہتے تھے ابھی ہوا ہے تو ابھی اس کا رزلٹ ہمارے سامنے آئے، اور ہم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آرزو کو، اپنی پیاری آرزو کو جو آپ کی زندگی کا بہت عجیب سہارا ہوتی ہیں، میں منع نہیں کرتا، ہونی چاہیں۔ پیدا ہوتی رہتی ہیں انسان کے ذہن میں ہوتی ہیں، قدرتی بات ہے، لیکن اگر آپ ان کے راستے میں خود ان کا راست روک کر کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کے پورے ہونے کی راہ میں حائل ہو جائیں گے، تو وہ کبھی پوری نہیں ہوں گی۔

یہ آپ تحریر کر کے دیکھ لیں، ہم بھی نہیں مانتے تھے اس بات کو، کہ آپ Relaxed (ڈھیلے) ہیں، اپنا آپ ڈھیلہ چھوڑ دیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں، اتنا ڈھیلہ چھوڑ دیں، جس طرح نہر کے اوپر

لکڑی تیرتی آتی ہے نا، ہر لہر کے ساتھ، کبھی اوپھی ہو جاتی ہے کبھی نچی۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی جب تک آپ Resistance دیتے رہیں گے، تو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آپ کی کامیابیاں بتدربنخ ناکامیوں میں تبدیل ہو جائیں گی حالانکہ آپ کا راستہ سامنے بنانا ہوا ہوتا ہے۔ پھر یہ ہو کر رہے گا اور آپ اپنی زندگی کا خود نظارہ کرتے جائیں۔ دیکھتے جائیں ان کے اندر بے شمار واقعات نظر آئیں گے، اور پھر آپ کو محسوس ہو گا، اور کئی مرتبہ آپ نے زندگی میں کہا بھی ہو گا کہ کاش میں نے یہ نہ کیا ہوتا۔ اور پچھتاوا بھی ہوتا ہے اس پچھتاوا سے بچنے کے لیے آپ ذہین آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ آپ جانتے ہیں، اس سے کس طرح اجتناب کیا جائے، اور کس طرح سے اپنا پھول اپنی مرضی سے کھلایا جاسکے۔ تو یہ بات اچانک بیٹھے بیٹھے آپ کو دیکھتے دیکھتے میرے ذہن میں آئی کہ آپ اپنی آرزوؤں کو اپنی حسرت کو تحریک کرنے کے لیے خود ہی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دیکھیے ایک بیچ کس کو ایک پلاس کو آری کو یا ایک برمے کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے، اور اسے کیا کرنا ہے۔ ایک ہاتھ آتا ہے، وہ بیچ کس کو اٹھاتا ہے، اور اس سے کمال کا کام کرتا ہے۔ ایک ہاتھ آتا ہے، اور اس آری کو اٹھاتا ہے۔ کمال کا کام لیتا ہے۔ اس کا ایک مستری ہوتا ہے، لیکن اگر آپ ان چیزوں کو جو آپ کی راہ میں آپ کی مدد کے لیے رکھی گئی ہیں، استعمال نہیں کریں گے، بلکہ اس حد تک کسی اور کو بھی استعمال نہیں کرنے دیں گے، تو پھر آپ کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔

آج کے بعد اگر آپ غور کر کے دیکھیں اور جائزہ لیں زندگی کا، ایمانداری کے ساتھ۔ مغرب کے بعد یوار کوڈھوگا کے جب دونوں وقت ملتے ہیں تو پھر اپنا جائزہ لیں کسی کوڈا ری پیش نہیں کرنی کسی کے آگے آپ نے بیان حلقوی نہیں دینا، خود اپنے سامنے، یہ بھی بڑا مشکل کام ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ نے کس طرح خوبصورت مرسوں کو آرزوؤں کو اپنے ہاتھوں پامال کیا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے کہ آدمی اپنا احصاب خود کرے۔ سب سے زیادہ آدمی ڈرتا ہے اپنا آپ کو فیس کرنے سے۔ اور اسی لیے بہت سے لوگ عبادت میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن خود احصابی میں داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔ اس لیے جو خود احصابی کرتا ہے، وہ وجود تو اس کے سامنے بیچ بولے گا اور بہت ساری باتیں ایسی ہیں، جنہیں آپ فیس Face کرنے کے لیے یامانے کے لیے تیار نہیں، لیکن یہ عمل اتنا ضروری ہے کہ جیسے آپ احصاب کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں اپنی ذات کے ساتھ احصاب کرنے کا تعلق ہے۔ یہ ضروری ہے۔

اور بزرگانِ دین ایک اور عجیب و غریب بات کہتے ہیں، اگر آپ اہل کتاب و شنید کے پاس جا کر بیٹھو گے، جیسے ہمارے لوگ ہوتے ہیں، تو لوگوں کی ذات میں کیڑے و کھائی دیں گے، اور اگر بزرگانِ دین کے پاس جا کر بیٹھو گے، تو اپنا حال روشن ہونے لگے گا۔ اور یہ بیچ ہے، اور بڑی عجیب و

غیر بات ہے، میں نے تجربہ کیا۔ اگر ان کے پاس جا کر بیٹھو تو ایک ایسی تسلی، اور تشفی بھی ملتی ہے کہ اپنی خرابی جو ہے باوجود اس کے آپ کو بھی پتا ہے، ان کو بھی پتا ہے، لیکن ایک سہارا ملتا ہے کہ یہ ساری کیاں یہ خرابیاں یہ ساری ہیومن ہیں، کوئی بات نہیں یہ گزر جائیں گی۔ ان بزرگان دین کے مقابلے میں مغرب کے لوگوں نے سائکو تھراپیٹ، اور سائکو انالسٹ تیار کیے ہیں، ان کو ڈھیر سارے پیے اور فیس دے کر لوگ ان کے پاس جاتے ہیں لیکن وہ ان کے ساتھ اس طرح سے ان کی ذات میں شامل نہیں ہوتے، جس طرح بزرگان دین ہوا کرتے ہیں، یا ان کو ہونا چاہیے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پہچانے کے لیے تھوڑا سا وقت ضرور نکالیں، مگر آپ نے کسی کو بتانا نہیں ہے۔ آپ کو خود اپنی اینٹیس لے کر خود گاراگا کے خود اپنی عمارت تیار کرنا ہے۔ آپ کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ آپ یہ ساری چیزیں بڑی آسانی کے ساتھ تیار کر کے اپنا بہت اعلیٰ درجے کا مکان یا اعلیٰ درجے کا پلازو بنا سکتے ہیں، جس میں اور لوگوں کو بھی دعوت دے سکتے ہیں کہ وہ آ کر رہیں۔ تو میں یہ درخواست کروں گا آپ سے اللہ نے آپ کو اچھے چہرے دیجے ہیں اچھے ذہن دیے ہیں اچھی روحیں دی ہیں کہ آپ ضرور ایسا کام کریں۔ آرزوئیں تو ہیں، لیکن خود ہی ان کی راہ میں آپ کھڑے نہ ہوں۔ آرزوئیں تو ہیں لیکن بار بار ان کا ڈھکنا اٹھا کرنے دیکھیں، بار بار اس کیسرے کو کھول کرنے دیکھیں کہ ریل کے اوپر کوئی ایپریشن آیا ہے کہ نہیں۔ جب آپ نے ایک بات طے کر دی، اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان یہ طے کر دیا کہ یوں ہونا چاہیے مجھے یہ چاہیے، پھر اگر اس کا فیصلہ میری خواہش، اور مرضی کے خلاف بھی کرے تو مجھے منظور ہو گا، کیونکہ تو میرا اللہ ہے۔ تو پھر دیکھیے کہ اللہ بھی بڑا مہربان ہو گا اور وہ کہتا ہے باوجود اس کے اس کی خواہش کچھ اسی پسندیدہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی یہ اس کی ہے، اس انعامی بادل میں سے دو لاکھ تو نہ دیں 30 ہزار روپیہ دے ہی دیں، اور مل ہی جاتا ہے، باوجود اس کے مل جاتا ہے۔ ایک کہانی مشنوی شریف کی ہے۔ یعنی مشنوی مولانا روم کی کہ حماقت سے آدمی کس طرح اپنی راہ میں کھڑا ہوتا ہے۔ وہ کوئی چور تھا، تو اس کے اندر کچھ پیسا بنانے کی خواہش پیدا ہوئی، کیونکہ وہ اپنی محبوب یہوی کو کچھ دینا چاہتا تھا اپنی ذات کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک رات ایک گھر کے روشن دان میں سے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی کہ یہ اچھا گھر ہے، اور مجھے یہاں سے کوئی مال و متاع ملے گا، لیکن جب وہ اتنا اونچا چڑھا، اور روشن دان کے اندر سے گزرنے کی کوشش کی تو وہ روشن دان جس کا چوکھا بظاہر تھیک نظر آتا تھا، ڈھیلا گا ہوا تھا۔ وہ بمعنی چوکھے کے اندر کے فرش پر سر کے بل آگرا، اور اس کو سخت چوٹیں آئیں، چنانچہ اس نے وہ چوکھا اٹھایا اور قاضی وقت کے پاس شکایت کے لیے لے گیا۔ دیکھیں کیا کمال کے آدمی تھے۔ اس نے کہا، جناب دیکھیں میں چوری کرنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ یہ کیسا نالائق مستری ہے جس نے ایسا چوکھا بنایا کہ یہ ثبوت گیا ہے، اور کر چیاں کر جیاں ہو گئی ہیں، تو اس

کو سزا منی چاہیے۔ قاضی وقت نے کہا یہ تو واقعی بڑی بات ہے۔ اس لکڑی بیچنے والے کو بلا یا گیا، چنانچہ وہ پیش ہو گیا۔ اس نے کہا، جناب اس گھر کی کھڑکی تو میں نے بنائی تھی۔ اس سے کہا گیا، تم نے اسی ٹقص قسم کی ناکارہ لکڑی لگائی۔ اس نے کہا، جناب اس لکڑی کو بھی دیکھ لیں کسی سے بھی شیش کروالیں، اس گھر کے دوسرا ہے دریچوں، دروازوں، روشن دنوں کو دیکھ لیں، کیونکہ یہ تواب ثوب گیا ہے تو اگر آپ اس میں کوئی نقش نکال دیں تو میں ذمے دار ہوں۔ حضور بات یہ ہے کہ اس میں خرابی ہماری لکڑی کی نہیں ہے۔ اس ترکھان کی ہے، جس نے یہ چوکھتا ڈائی مینشن کے مطابق نہیں بنایا۔ چھوٹا یا بڑا جیسا بھی بنادیا ہے، چنانچہ اسے کہا، تم کو معافی۔ انہوں نے ترکھان یا بڑھنی کو بلوایا، اور وہ پیش ہو گیا۔ انسانی زندگی کا تماشا دیکھیں کیا حضرت مولانا نے بیان کیا ہے۔ ترکھان نے کہا کہ میں نے چوکھتا بالکل صحیح بنایا ہے۔ آپ اس کو نقشے کے مطابق دیکھ لیں، یا جو بھی اس کی ریکوا رمنٹ ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ میرا قصور نہیں ہے آپ ماہرین کو بلوالیں، اور وہ بتا دیں گے کہ میرے چوکھے میں کوئی خرابی ہے کہ نہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں، یہ چوکھتا بالکل صحیح ہے۔ راج، معمار جس نے اس کو فٹ کیا تھا، جب وہ عمارت بنارہاتھا جب عمارت بن جاتی ہے تو پھر بیچ میں لگاتے ہیں۔ یہ ساری کوتا ہی اس کی ہے اس نے اس میں خرابی پیدا کی ہے ورنہ میرا چوکھتا تو بناء ہوا صحیح تھا۔ چنانچہ راج کو بلوایا یا گیا، وہ عدالت میں پیش ہو گیا۔ قاضی وقت نے کہا، اے نالائق آدمی بہت اعلیٰ درجے کا چوکھتا بناء ہوا ہے۔ ڈائی مینشن اس کی درست ہے۔ تو نے کیوں ”موکھا“ اس کا ڈھیلا بنایا۔ جب تو بلڈنگ بنارہاتھا، اور عمارت سازی کر رہا تھا تو نے اسے صحیح طور پر فٹ نہیں کیا تو اب راج بچھن گیا، اس نے سوچا واقعی عدالت صحیح پوچھ رہی ہے۔ چوکھے میں، اور دیوار میں فاصلہ تو ہے۔ اس نے کہا، حضور بات یہ ہے مجھے اب یاد آیا، جب میں چوکھا لگا رہا تھا اور میں سیرھی پر چڑھا رہا تھا، تو میں نے باہر سڑک پر دیکھا اس وقت ایک نہایت خوبصورت عورت نہایت اعلیٰ درجے کا لباس پہنے، بے حد نگین لہنگا، اور بے حد نگین دوپٹہ اوڑھے جا رہی تھی مزے سے انکھیلیاں کرتی ہوئی۔ تو میری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ جب تک وہ سڑک پر چلتی رہی میں اس کو دیکھتا رہا، اور میں پوری توجہ نہ دے سکا۔ اس چوکھے کو صحیح طرح سے نہ لگا سکا۔ انہوں نے کہا، اس عورت کو بلا وہ عورت کو تلاش کرنے لگے کہ کس نے اس دن ایسا لہنگا پہننا تھا۔ بتاؤ۔ شہر میں سب جانتے تھے جو تھی چھمک چھلو، کہ وہ وہی ہو گی۔ عدالت میں پیش ہو گئی۔ پوچھا گیا، تم یہاں سے گزری تھیں۔ کہا ہاں میں گزری تھی۔ اس نے کہا تم نے ایسا لہنگا ایسا غرار ہے پہننا ہوا تھا۔ تم نے کیوں پہننا تھا؟ حضور بات یہ ہے کہ میرے خاوند نے مجھے سے کہا تھا کہ یہ تم کیا ڈل سے ٹکر ز پہنچتی ہو، یہ کچھ اپنے نہیں لگتے تمہارے رخ زیبا کے اوپر یہ کپڑے سمجھتے نہیں ہیں۔ بہت اعلیٰ قسم کے شوخ، اور بھر کیلے قسم کے پہنچو۔ میں نے کہا، میرے پاس تو ہیں نہیں۔ اس نے کہا، میں تمہارے کپڑے رنگ کے دیتا ہوں۔

چنانچہ وہ بازار سے رنگ لایا۔ اعلیٰ درجے کی محبت کو استعمال کر کے انہیں رنگا اور مجھے دیئے۔ وہ کپڑے میں اس روز پہن کر جاہی تھی۔ عدالت نے کہا اس کے خاوند کو حاضر کیا جائے، چنانچہ وہ اس کے خاوند کو کپڑا کر لے آئے عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ خاوند وہی شخص تھا، جو روشن دان سے چوری کرنے کے لیے اڑا تھا۔ اس کی خواہش میں وہ خود کھڑا تھا۔

اتنا چکر کاٹ کے آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ وہ کہاں پر اپنی ہی آرزو اپنی ہی خواہش کے درمیان کھڑا تھا۔ ساری دنیا سے شکوہ کرتا تھا، جیسا کہ اس نے شکوہ سب لوگوں کے ساتھ کیا تو یہ بات بظاہر سیدھی سی لگتی ہے، لیکن بڑی باریک ہے، اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہم قومی زندگی کے 52 برس گزار چکے ہیں، اور ہم کو میپھور ہو جانا چاہیے، اور ہمیں اپنی سوچ کی لہریں جو ہیں، ان کو مضبوطی کے ساتھ خود بھی پکڑنا چاہیے، اور لوگوں کو بھی توجہ دلانی چاہیے۔ اب یہ وقت آگیا ہے ہم اپنی سوچ، جس کا ہم کو حکم ہے، تھفہ بھی کریں، اور تدبیر بھی کریں۔ آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے، اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

حقوق العباد کا بوجھ

میرے گھر کے فون پر فون کرنے والے کا جلی ہندسوں میں نمبر آ جاتا ہے اور نام بھی، کیونکہ اس میں نمبر نام کے ساتھ ریکارڈ کرنے کی سہولت ہے۔ مجھے پتا چل جاتا ہے کہ کس کا فون ہے اور اب مجھے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ میں نمبر دیکھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہوں کہ میں اس سے بات کروں یا نہ کروں۔ ایک ہمارا بہت ہی "گھنی" دوست ہے۔ وہ لمبی بات کرتا ہے، گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ۔ اس کا نام آئے تو میں کہتا ہوں کہ میں فون نہیں اٹھاتا۔ یہ میرے چیجھے ہی پڑ جائے گا۔ جان نہیں چھوڑے گا۔ اس طرح سے کچھ اور ایسے نمبر ہیں جن کے اوپر دل نہیں نکلتا کہ ان کو رپانس دیا جائے یا ان سے بات کی جائے اور جب مجھے کسی پسندیدہ شیلیفون کی آمد کا پتا چلتا ہے، تو میں بڑی خوشی کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ پرسوں، ترسوں، میری پوتی نے اسلام آباد سے فون کیا تو میں نے شیلیفون اٹھاتے ہی اور اس کی "ہیلو" سے پہلے ہی کہا "ہیلو ما! کیا حال ہے۔ کیا کر رہی ہو؟" اس نے کہا "داؤ! آپ بڑے سماں ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا "مجھے پتا چل جاتا ہے کہ ماں فون کر رہی ہے، یا اس کا ابو کر رہا ہے۔ اس لیے میں پہچان جاتا ہوں۔ میرے پاس ایک اعلیٰ درجے کا ستم ہے۔"

اس نے کہا "داؤ! یہ اعلیٰ درجے کا آئی ڈی کا لرنیں ہے، جس کی آپ بڑی تعریف کر رہے ہیں۔" میں نے کہا "اس نے مجھے بڑی آسانیاں عطا کر دی ہیں اور میں آسانش میں ہو گیا ہوں۔" اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب میں آپ کے سامنے بولتی تو نہیں۔ لیکن میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ فون کریں تو پھر آپ کیا کریں گے؟ یعنی اگر اس کے اوپر "God Almighty Calling" آجائے تو پھر آپ کیا کریں گے؟ اس طرح آپ کا کالر آئی ڈی اچھا نہیں ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آدمی کان سے فون لگائے اور پاٹلے کہ کون ہے؟" میں نے کہا "اگر اللہ میاں کا فون بھی آئے تو (ابھی تک تو آیا نہیں) مجھے پتا نہیں کہ میں کیا کروں۔" لیکن اگر آیا اور میں کام میں مصروف ہوا تو مجھ میں ایک خرابی ہے، مجھے ہمارے سارے ساتھیوں میں ہے کہ ہم عبادت کے ساتھ بہت مشغول ہوتے ہیں اور عبادت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں دراصل میں بھی کی بات سن کر ڈر گیا میں نے اپنے طور پر

سوچا اور اس کو نہیں بتایا۔ آپ کو خفیہ طور پر بتاتا ہوں کہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ اگر اللہ میاں کا فون آئے تو میں کہوں گا کہ اللہ میاں! میری بھی چار سنتیں رہتی ہیں وہ پڑھ لوں۔ تو پھر آپ سے بات کروں، حالانکہ وہ سنتیں بھی اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ عبادت اہم ہے، اللہ کی ذات سے بھی، جس نے مجھے عبادت کا حکم دیا ہے اور جس نے اپنے آپ کو برائے عبادت تھہرا�ا ہے۔ یہ غلط قسم کا خیال میرے ذہن میں آیا، کیونکہ میری تربیت اور طرح کی ہوئی ہے کہ یہ کام پہلے کرنا ہے، یہ کام بعد میں کرنا ہے۔ تو میاں نے مجھے کہا کہ یہ بات آپ یاد رکھیے کہ اس کا (اللہ میاں) فون آ جانا ہے اور آپ سے کوتا ہی ہو جانی ہے۔ اس لیے آپ الٹ ہو جائیں اور بہتر یہ ہے کہ ہی ایں آئی یا کا لر آئی ڈی اتروادیں۔ ایسے ہی رہنے دیں، جیسا پہلے تھا۔ یہ واقعی میرے لیے اس سے مشکل پڑ گئی۔ ایسے ہی جیسا کہ میں نے آپ سے ذکر کیا۔ عشاء کا وقت تھا۔ میں نماز پڑھ کر آیا تھا اور وتروں کے بعد آدمی کچھ اور طرح کا ہوتا ہے کہ یہ صحیح پڑھنے چاہئیں یا..... کچھ آتا رہتا ہے بدستور خیال۔ لیکن آدمی اس میں مصروف رہتا ہے۔ عشاء کا وقت ہوتا بھی ایسا ہے۔

میرے پڑوی کے چوکیدار نے آ کر کہا یہ گرمیوں کا واقعہ ہے کہ وہ سب میرے پڑوی حاجی صاحب فیملی تو گئی ہوئی ہے مری، صرف چھوٹے صاحب شاہد میاں، جو فور تھا ایز کا سنوڑت ہے، وہ گھر پر ہے۔ چوکیدار کہنے لگا کہ پتا نہیں اچانک اسے شاہد کو کیا ہوا کہ وہ پہلے تو تشنج میں بنتا ہوئے اور پھر ترپے اور پھر اچانک بے ہوش ہو گئے۔ انہیں ہسپتال لے جانا ہے۔ میں اکیلا ہوں آپ میری مدد کریں۔ میں نے کہا کہ دیکھو میاں میں اپنی نماز ختم کرلوں، پھر دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میں نماز پڑھ چکا، تو میں نے اپنے سلیپر پہنے، پنچابند کیا۔ پھر آرام سے باہر گیا کہ اسے پوچھوں کہ شاہد کو کیسے لے جانا ہے۔ باہر نکلا تو پتا یہ چلا کہ چوکیدار نے بتایا کہ ہم اسے لے گئے۔ یہاں ایک پنوں نام کا گدھا گاڑی والا ہے، جوڑ کے سے بورے میں رکھ کر ”چھلیاں“ (مکنی کے شے) بیچتا ہے۔ اس کی گدھا گاڑی میں رکھ کر ہسپتال لے گئے ہیں۔ ہسپتال والوں نے میکد و میکہ دیا اور انہوں نے کہا ہے کہ اسے بیہیں چھوڑ جاؤ، کل صحیح ہم آپ کو بتائیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ لیکن خیریت ہے آپ نے اسے وقت پر ہسپتال پہنچا دیا، ورنہ مشکل پڑ جاتی۔

میں نے چوکیدار سے کہا کہ چلو یہ اچھا ہوا۔ مایاں نے پوچھا پتا نہیں اسے کشف ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ میاں کا فون آیا ہے ہی ایں آئی پر۔ میں نے کہا نہیں ابھی تک تو نہیں آیا۔ کہنے لگی کہ دادا آیا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ بالکل آیا اور بڑی وضاحت کے ساتھ آیا اور اس نے آپ کو حکم دیا کہ یہ کرو۔ میں نے کہا تجھے یہ کیسے معلوم ہے؟ کہنے لگی کہ میری ایک تار آپ کے ساتھ بھی تو لگی ہوئی ہے۔ اسے پورے واقعہ کا تو نہیں پتا، لیکن اس کا دل کہتا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ بھی ایسا واقعہ گذر را

تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھئے آپ نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا پورا۔ آپ چھوڑ دیتے نماز، پھر پڑھ لیتے۔ آکے پڑھ لیتے۔ اگلے دن پڑھ لیتے۔ یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔ اس نے یہ مجبوری میرے ساتھ وابستہ کر دی کہ میں اسے اتروادوں اور میں ہر کال کو موصول کروں۔ اب کیفیت یہ ہے کہ وہ دیے ہی گئی ہوئی ہے اور مجھے فون کرنے والے کا پتا بھی چل جاتا ہے۔ لیکن کوتاہی اس کے ساتھ ساتھ ہی چلتی رہتی ہے کہ میں ایک نظر دیکھ کر کہتا ہوں کہ یہ فون سننے والا نہیں ہے۔ لیکن اب مجھے یہ کام کرنا پڑے گا۔

زندگی میں اور بھی کام ہوتے ہیں، لیکن انسانوں سے متعلق جو کام ہوتا ہے اس کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے اور وہ ناقابل برداشت ہوتا ہے، اٹھایا نہیں جاتا۔ پھر ایسے ہی میری پوتی کے کہنے کے مطابق ایک کال ہی کہہ لیجئے اسے اور آگئی۔ وہ بھی کافی مشکل تھی اور میں یہ سمجھتا رہا کہ میں حق بجانب ہوں۔ ہوا یہ کہ جس گھر میں میں رہتا ہوں اس سے دو تین گھر چھوڑ کر ایک بہت بڑی کوٹھی ہے اور اس میں بہت معزز لوگ رہتے ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں وہاں کھڑی ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں جب ایکشن کا کام چلا اور ایکشن میں یہ خوشخبری سنائی گئی کہ بہت ساری خواتین کو بھی ایم پی اے اور ایم این اے بنادیا جائے گا اور مبارک ہو۔ اس گھر کے باہر ایک بڑا ہمگھٹا لگ گیا۔ خواتین آتی رہیں جاتی رہیں۔ کاریں آتی جاتی رہیں، تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ مسزا کرم بھی ایم پی اے ہونے کی آرز و مند ہیں یا ایم این اے ہونے کی ہیں۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں بھی خوشی ہوئی کہ چلو ہمارے علاقے کی ایک بی بی ہو جائے گی اور یہ بھی وہاں جا کر دیسک بجائے گی (مسکراتے ہوئے)۔ ایک دن یہ ہوا۔ اس دن میں سا ہیوال جا رہا تھا، اپنی ہمشیرہ کے پاس۔ ہوا یہ کہ انہوں نے (مسزا کرم) بہت بڑی دعوت کا بندوبست کیا اور اس میں امیدوار خواتین، جو ایم این اے اور ایم پی اے شپ کی تھیں، وہ آئیں۔ بہت معزز لڑکیاں Colour Full قسم کے کپڑے پہنے ہوئے۔ اس نے اعلیٰ درجے کے کھانے بھی تیار کیے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کھانا شامی کباب بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ہی اچھے بنے ہوئے تھے۔ وہ شامی کباب ان کے خانسماں نے بنا کر بجائے میز کے اوپر رکھنے کے نیز کے نیچے رکھ دیئے۔

ان کا کتنا جیکی بہت چھوٹا سا پیارا کتنا۔ وہ آیا اس نے جناب ایک شامی اٹھایا اور آدھا تو گٹ گٹ کر کے کھا گیا اور آدھا منہ میں دبا کر کھڑا تھا کہ مالکن اور دیگر بیرے خانسماں آئے اور دیکھاتو کہا کہ روکواں کو پکڑو پکڑو۔ خیر کتا ان کی نظروں کے سامنے کھا گیا، یا خراب کر گیا۔ اب اصل دعوت شروع ہوئی۔ ظاہر ہے خواتین خوش گپیوں میں مصروف ہوں گی۔ اپنے سنہرے مستقبل کی باتیں کر رہی ہوں گی۔ پروگرام طے کر رہی ہوں گی کہ کیسے سیاست میں جانا ہے اور اسمبلی میں کدھر سے داخل ہونا ہے۔ یقیناً ایسی باتیں ہوئی ہوں گی۔ جب وہ کھارہی تھیں اور اختتام کو پہنچیں اور سویٹ ڈش کھارہی تھیں، تو ان کے مالی نے آ کر روتے ہوئے یہ کہا کہ نیکی مر گیا ہے اور وہ سڑک کے اوپر مراپڑا ہے۔

اب مالکن جان گئی کہ اس نے جو کباب کھایا ہے، اس میں کوئی زہر ملی چیز تھی۔ گھر کی مالکن نے کہا کہ سب دوزہ بھاگوال اللہ کے واسطے۔ سب نے بطرف ہسپتال موڑوں میں چھلانگیں لگادیں۔ وہاں ان کے گلوں میں بھی بھی نالیاں ڈال کر ان کی واشنگٹن شروع کی گئی۔ جتنا اچھا کھانا کھایا تھا، وہ تنک مختلف ہسپتالوں نے نکالا اور سب نے دعا کی کہ یا اللہ! ہم اگر زندہ وسلامت فتح جائیں، تو تیری بڑی مہربانی ہوگی۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بیگم صاحب نے خوشی میں دو دلکشیں داتا صاحب بھجوائیں کہ اللہ تیرا نفضل ہے کہ میں اس ناگہانی مصیبت سے بکل آئی۔ میں یہ ہنگامہ دیکھ کر ہی ساہیوال جارہا تھا اپنی گاڑی میں۔ وہاں کسی وقت مقررہ پر جانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں پانچ دس پندرہ میں منٹ کے لیے زک بھی سکتا تھا، لیکن میں چلا گیا اور دوسرے تیرے دن وہاں سے واپس آیا۔ واپس آ کر میں نے مزار کرم سے کہا کہ بڑا افسوس ہے۔ مجھے آپ کے کتنے کافسوں کرنا تھا۔ وہ آپ کا اتنا پیارا کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ ہاں بھائی صاحب! یہ ہمارے ساتھ تو بڑی ترجیحی ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ جب وہ ٹرک بیک کر رہا تھا۔ ٹرک بیک کرتے ہوئے ٹرک کا لوہا کتے کے سر پر لگا اور وہ وہیں ”چوں“ کر کے ختم ہو گیا۔ مجھے ان لوگوں کو جا کر بتا دینا چاہیے تھا کہ یہ کتاب کس وجہ سے فوت ہوا ہے۔ لیکن میں نے ان کو نہیں بتایا۔ میری پوتی مایا کہتی ہے کہ دادا! ایک ٹرک کاں آپ کو اور آگئی ہے اللہ میاں کی۔ وہ بھی مس ہو گئی۔ اس لیے کہ آپ کو یہ بات ان تک پہنچانی چاہیے تھی۔ کوئی سی اچھی بات ہو۔ خیر کی بات ہو۔ یہ بتائی جانی چاہیے۔ حضور نبی کریمؐ کے پاس ایک صحابی تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ کوئی بیمن سے آئے تھے۔ انہوں نے پتا نہیں کس صحابیؐ کو دیکھا اور حضور نبی کریمؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپؐ کے یہ صحابیؐ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آنحضرت نے کہا کہ آپؐ نے ان کو یہ بات بتا دی ہے کہ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جی نہیں۔ میں نے تو شرم سے ایسا نہیں کیا۔ وہ صحابی اس وقت تک جا چکے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ آپ بھاگ کر ان کے پیچھے جائیں اور انہیں گلے ملیں اور بتائیں کہ آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس کا اظہار کیا جانا بہت ضروری ہے۔ ہم جو جھوٹی مولیٰ شرمندہ سے ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ ضرور کہیں اپنے پڑوئی سے ہمسارے سے آپ کا فلاں بچ مجھے پیارا لگتا ہے اور اس سے بھی کہیں کہ ماشاء اللہ بیٹی آپ کس کے بیٹی ہیں۔ وہ کہے گا کہ جی میں شش الدین کا بیٹا ہوں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ کہے گا کہ وہ یہ کرتے ہیں۔ آپ اس سے کہیں بیٹی آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ کہاں پڑھتے ہیں؟ فلاں فلاں۔ یہ بات کی جانی چاہیے۔ اپنے تک مدد و نہیں رکھنی چاہیے۔ نہ کہ میری طرح سے اگر میں ساہیوال جانے سے پہلے انہیں سب کچھ بتا دیتا تو آگے اتنی بڑی کہانی نہ چلتی اور ان بیچاریوں کا اتنا اچھا کھایا ہوا کھانا یوں نو نیاں ڈال کرنے کاں دیا جاتا۔ تکلیف دہ بات ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ بڑے بڑے انداز میں بڑے روپ میں آپ کے پاس آتا ہے۔ میرے پاس آتا ہے اور وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جو کچھ اس نے فرمادیا ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے اور بالکل یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے، لیکن ہم نے اپنی ذات کے ساتھ ایسی سی ایں آئی لگائی ہوئی ہے کہ سب کچھ جانتے ہو جتھے ہوئے بھی یونہی اللہ کا وہاں نمبر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کوئی نہیں پھر ان سے بات کر لیں گے۔ پہلے یہ دنیاداری کا کام پورا کر لیں۔ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس میں زیادہ لفغ ہے۔ اللہ کی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ آج نہیں تو کل پوری ہو جائیں گی تو اس سی ایں آئی کا یقیناً کوئی فائدہ نہیں جو مجھے اور آپ کو اس راوے سے روک دے کہ ہمارا راستہ نہایت پھولوں بھرا اور گل فروشوں کی گلی بنا ہوا ہے۔ اس میں سے نہ گزریں اور انک کے بیٹھے رہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں خواتین و حضرات جب آپ ان پر غور کریں یا غور نہ بھی کریں، اسکے بیٹھے ہوئے سوچیں، تو آپ کو اس میں سے بڑی اچھی چیلنجز یاں بڑے پھول اور شگوفے نظر آنے لگیں گے۔ آپ اس پر عمل نہ بھی کریں، لیکن اس سے وابستہ ہو کر بیٹھ رہنا اور بیٹھنے کی عادت ڈالنا اور اس شعور کے ساتھ کہ میں اس اللہ کی دھرتی اس اللہ کے آسمانوں تک موجود ہوں، جو اللہ نے خصوصی طور پر میرے لیے بنایا ہے اور میں اس کا احساس رکھ کر اس کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے کچھ ایسی جگہ لپکنا چاہتا ہوں، جہاں میری پہنچ آج تک ہو ہی نہیں سکی۔ تو پھر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عجیب و غریب راستے کھلیں گے۔ بعض اوقات تو انسان یقین نہیں کرتا کہ میں ایسے راستے کو اپناؤں یا ان اپناؤں، لیکن ایسے راستے کھلتے ضرور ہیں۔

مجھے میں یہ کمی ہے کہ مجھے ایسا وقت نہیں ملتا۔ ایسی دھوپ نہیں ملتی۔ ایسا لان نہیں ملتا کہ جہاں پر میں ہوں اور میراپا لن ہار Creator ہو اور کچھ نہ کچھ اس سے بھی بات ہو۔ عبادت اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، لیکن اللہ خود فرماتا ہے کہ جب تم نماز ادا کر چکو تو پھر میرا ذکر کرو۔ لیٹھے ہوئے بیٹھے ہوئے پہلو کے بل۔ یعنی یہ بھی اجازت دی کہ جس طرح سے چاہو مرضی کرو۔ لیکن آدمی ایسا مجبور ہے کہ وہ اس ذکر سے محروم رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سوچیں کہ اس وقت میرا اللہ کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ شرگ کے پاس تو ہے ہی، لیکن میں کیوں خالی خالی محسوس کرتا ہوں۔ تو پھر بھی آپ کو ایک آواز سے ایک واپریشن سے جسے بدن کا ارتشاش کہتے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے۔ یہ بڑے مزے کی اور دلچسپ باتیں ہیں، لیکن ہم اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ ہم اس طرف جا ہی نہیں سکتے اور اللہ نے چاہا تو جوں جوں وقت آگے بڑھتا جائے گا، ہمارے اندر شعور کی لہریں اور بیدار ہوتی چلی جائیں گی۔ ہم پہنچیں گے ضرور، جس طرح سے کے ٹو، کی برفوں سے بہنے والا ایک چھوٹا سا نالہ دھکے کھاتا ہوا، جغرافیہ جانے بغیر، نقشہ لیے بغیر سمندر کی طرف جا رہا ہوتا ہے اور ایک دن سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم بھی ان شاء اللہ اپنے سمندر کے ساتھ جا کر ضرور ہمکنار ہوں گے۔ اللہ خداوند تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

خواب اور مجزہ

مجزہ کیا ہے، ایک عرصے سے مجھے یہ بات ستارہ ہی ہے کہ میں مجزہے یا کرامت کا تعین کیسے کروں، یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ مجزہ، کرامت یا اعجاز کس چیز کا نام ہے؟ اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ یہ بات پوچھنے والے اور بتانے والے کے لیے پریشان کن ہے کہ مجزہ، کرامات، اعجاز، جادوگری سائنس اور تماشا کے درمیان لائن کہاں سے کھینچنی جائے؟ میں نے بہت عرصہ قبل ریڈ یو سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت ہم آزاد کشمیر سے پروگرام کرتے تھے اور یہ پروگرام بڑے توجہ طلب ہوتے تھے۔ ان دنوں اچھی تخلوہ تھی نہ اچھے حالات، اس کے باوجود وہاں کئی اچھا لکھنے والے جمع ہو گئے تھے جن میں ممتاز مفتی، اعجاز بیالوی جیسی شخصیات شامل تھیں۔ ایک دن دو پہر کو شارت دیویز نو 48.4 پر ایک پروگرام چل رہا تھا، جس میں میدم نور جہاں ”سب جگ سوئے ہم جا گیں“ تاروں سے کریں باتیں“ گانا گارہ تھیں۔ اچاک گانا چلتے چلتے رُک گیا اور آواز گنجی：“روپینہ کتنے گئی اے۔ کل وی چلی گئی ای۔ آج وی چلی گئی اے۔ چاہیاں وی نال لے گئی۔“ غرض کبھی ”چاند نی راتیں تاروں سے کریں باتیں“ کی آواز آنگتی، کبھی یہ مداخلت۔ ہم سب حیران ہو گئے کہ یہ سوریا آواز (STRAY NOISE) کہاں سے آگئی۔ یہ سائنسی لفظ ہم نے استعمال کر کے جان چھڑا لی، لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا تو پھر یہ آواز کہاں سے آگئی، کیا یہ کوئی مجزہ تھا، کرامات، جادوگری یا کچھ اور!!

میں ایسے واقعات پر غور کرنے لگا اور سوچنے لگا کہ آیا ایسا کہیں اور بھی ہوتا ہے؟ تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ لندن میں ایک گٹار بجانے والا جب ہزاروں کے مجمع میں شیخ پر آیا اور گٹار بجانے لگا تو اس کے گٹار میں سے بی بی ای کے پروگرام کی نشریات شروع ہو گئیں اور جب تک پورا بلین ختم نہ ہوا، گٹار سٹ چپ چاپ پریشان کھڑا انتظار کرتا رہا اور شوکا وقت ختم ہو گیا۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ہم سوچتے رہے کہ یہ کیا مجزہ ہوا، یہ کیا کرامت ہوئی، اسے کس کھاتے اور کس خانے میں رکھیں اور اس واقعہ کو کیا معانی پہنا میں۔

ایسے واقعات میں نے اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کر دیئے۔ ایک بار میرے ایک دوست نے اپنے ساتھ ہونے والا ایک واقعہ بتایا اور کہا کہ آپ اسے بھی اپنی ڈائری میں لکھیں۔ اس وقت نبی نے سوئی گیس دریافت ہوئی تھی۔ ایک شخص جو میرے دوست کا ملنے والا تھا، وہ اسے لاہور میں ایک کوکنگ ریٹچ تھنے کے طور پر دے کر گیا۔ وہ میر پورے تعلق رکھتا تھا۔ میر پورا اس وقت امیر علاقہ سمجھا جاتا تھا، کیونکہ وہاں سے بڑی تعداد میں لوگ ولایت گئے ہوئے تھے۔ جب وہ کوکنگ ریٹچ گیس کے ساتھ خلسلک کر کے چلانی لگی تو اس میں نہ اکت علیٰ سلامت علی گانے لگے اور ان کی آواز میں آئیں۔ ان صاحبان کا پروگرام کراچی سے نشر ہوتا تھا اور آدھ گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ پروگرام مسلسل کوکنگ ریٹچ پر چلتا رہا۔ جس پر دوست کی بیوی ڈرگی اور سوچا کہ اس میں ولایت سے کوئی بھوت وغیرہ آگیا ہے۔ سمجھانے کے باوجود وہ نہ مانی اور اس نے کہا کہ وہ تو اپنا چولہا لکڑیوں سے ہی جائے گی۔

امریکہ کی ریاست نیکساس کا ایک نوجوان ذہنی طور پر ڈسٹریب ہو گیا۔ وہ کارخانے میں کام کرتا تھا۔ کام کے بعد گھر جاتا تو چلتے ہوئے اس کے منہ کے اندر، حلق میں ریڈ یو پروگرام چلنا شروع ہو جاتا۔ یہ سوچ کر وہ نفیا تی مرنی پس بن گیا کہ اس کے اندر کوئی بھوت پریت سرائیت کر گیا ہے۔ کچھ ماہ بعد ڈاکٹروں نے اسے مجذہ قرار دیا۔ اسے اپنے حلق سے پورے پروگراموں کی آواز آتی تھی۔ خبریں گانے سب کچھ چلتا تھا۔ اس شخص کو ماہرین نفیا تی کے پر دیکیا گیا۔ اس امریکی لڑکے پر بڑے بڑے تجربات کیے گئے۔ آخر کار ایک الیکٹرانک انجینئر نے کہا کہ یہ لڑکا چونکہ ریگ مال کی فیکٹری میں کام کرتا ہے، جس سے ریگ مال کے باریک ذرات اس کے منہ کے اندر چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک دانت کی جگہ سونے سے Filling کرائی ہوئی تھی۔ جس طرح ہم بچپن میں کریل ریڈ یو سیٹ بنایا کرتے تھے جس میں سرے کی ڈلی لے کر اس کو باریک تابنے کے تار سے باندھ دیا کرتے تھے۔ اسے ایک طرف سے Earth کر دیتے تھے اور اس پر ہیڈ فون لگا کر بڑی آسانی کے ساتھ پورا پروگرام سن لیا کرتے تھے۔ اس الیکٹرانک انجینئر نے کہا کہ لڑکے کے منہ میں چونکہ ذرات چلے جاتے ہیں اور سونے سے ان کا ایسا تعلق بن جاتا ہے کہ اسے آوازیں آتی ہیں۔ بعد ازاں اسے کریل ریڈ یو سیٹ بنایا کر باقاعدہ طور پر دکھایا گیا۔ جب اس کے باقاعدہ دانت صاف کروائے گئے تو آوازیں آنابند ہو گئیں اور اس مجرزے کی حقیقت کھلی۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔

امریکہ کے علاقے نیو جرسی میں دو پہلوان سٹچ پر آ کر کسرت کرتے اور جب ان کا جسم بالکل تن جاتا اور ان پر ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی، تو وہ دو تاروں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتے تھے، جس سے پورے کا پورا آرکسٹرا بجنہا شروع ہو جاتا تھا۔ اسے صرف سائنسک حوالوں سے ہی نہیں دیکھنا چاہیے،

بلکہ اس میں بندوں کا مسلز سے کام لینا، اپنی روحانی کیفیت سے کام لینا اور سب چیزوں کو ملا کر اپنی میکینکل چیزوں سے ملا دینے کا نتیجہ تھا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مججزہ یا کرامات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں جتنی ہمارے افسانہ نگار ذہن نے پیدا کر دی ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ البتہ خواب کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس بارے میں قرآن پاک کے اندر سورہ یوسف میں حوالہ بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ خواب کے بارے میں ضرور چاہتا ہے کہ ہم جانیں۔ بدستی سے ہمارے کسی بزرگ عالم یا روحانی پیشوائے اس طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر فراہیڈ نے اس پر تحقیق کی، لیکن وہ بیچارا بالکل اٹھی راہ پر چل نکلا۔ البتہ اب ولایت میں اس پر کام ہو رہا ہے کہ خواب کی اہمیت ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا سہارا نہیں لیں گے، جس نے خواب کو معانی عطا کیے ہیں، اس وقت تک وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اب میں آپ کو ایک مججزہ نما خواب کی بابت بتاتا ہوں۔

خراسان میں ایک غریب آدمی علی شادر ہتا تھا کہ وہ ایک وقت کی روٹی سے بھی محتاج تھا۔ وہ بیچارگی کی آخری سیچ پر پہنچ گیا تو ایک رات اسے خواب آیا کہ ”تو یہاں سے ہندوستان کا سفر کر“۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ اسے کہا گیا کہ ”اُنک کا پل آئے گا وہاں تک پہنچ۔ اُنک پل کے آخری سرے پر جہاں پل کے ستون ہیں، وہاں کے آخری پانے پر داہنے ہاتھ پانی کے اندر پوری بادشاہت کا خزانہ ملے گا۔“ وہ غریب آدمی پا پیدا وہ چل پڑا، مہینوں کی منزلیں برسوں میں طے کرتا ہوا نہایت شنگستی میں وہاں پہنچا۔ پل پر انگریز کا پھرہ تھا۔ جب پہریدار اس سے کچھ پوچھنے کے لیے قریب آتے تو وہ ڈر کے مارے ڈور بھاگ جاتا۔ آخر ایک ماہ بعد ایک سپاہی نے پل سے نیچے اتر کر اس حالت کی وجہ پوچھی تو اس غریب آدمی نے سپاہی کو اپنا خواب سنادیا۔

اس پر پوچھنے والا قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور کہا کہ کیسی احتکوں جیسی بات کرتے ہو اور کہا کہ مجھے پچھلے دو سال سے خواب آ رہا ہے کہ خراسان میں ایک فقیر ہے اور اس کے گھر کے چولہے کے پیچھے ٹین کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہے اور اس ٹکڑے کو اکھاڑو تو اس کے نیچے سات بادشاہوں کا خزانہ ہے۔ غریب نے فقیر کا نام دریافت کیا تو سپاہی نے علی شاد ہتا یا۔ غریب آدمی واپس بھاگا اور گھر پہنچا۔ اس نے نہیں اکھاڑا تو اسے خزانہ مل گیا۔

اس طرح خواب کی اہمیت اور معانی رکھتی ہے اور معجزات کی باتیں زیادہ توجہ طلب نہیں ہیں۔ میں نے اپنے بابا سمیں صاحب سے پوچھا کہ مججزہ کیسے ہوتا ہے؟ کہنے لگے کہ کمایہ سے قول آئے ہیں اور یہ جھوٹے قول ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے چوکی بھرنی ہے، جبکہ ان کے پاس ایک ہی طبلہ ہے اور ان کے ہار موئیم سے ہوا نکل جاتی ہے اور یہ اب ہمارے سامنے قولی کریں گے۔

ان کے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں۔ اگر ان قولوں کا کچھ بن گیا تو اسے معجزہ کہیں گے، نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ اس لیے معجزہ ہمیشہ بندے کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اگر بندے کا کچھ بن گیا تو معجزہ ہو گیا۔

اب آپ خدا کے لیے معجزے کی تلاش میں انک کے پل کی طرف نہ چل پڑنا۔ خواب کی اہمیت مسلم ہے۔ میری خواہش ہے کہ علماء اس پر توجہ دیں۔ اس پر توجہ دی جاتی رہی ہے، لیکن سائنسک طریقے سے اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اگر توجہ دی جائے تو اس سے بہت سے مطالب اور معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مغرب والے اس پر جتنی بھی تحقیق کریں، وہ کسی مقصد تک نہیں پہنچ پائیں گے، کیونکہ ان کا رُخ الٹا ہے۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

زبانی دعوے اور ضمیر کی آواز

بڑا چھا موسم ہے اور بڑے اچھے دن ہیں، لیکن جو خوشی دلوں کے اندر ناچلتی ہے اور چہروں پر رقص کرتی ہے، وہ عام لوگوں میں مفقود ہے۔ پتہ نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ کسی سیانے سے پوچھیں تو وہ بھی اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ کسی اکانومسٹ سے دریافت کریں تو وہ اپنی تمام علمیت کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہماری انسانوں کی بھری پُری دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی معموم ملول اور پریشان اور وردمند رہتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دن بھی کچھ سکھانے کے لیے ہوتے ہیں اور جب آدمی سیکھ جاتا ہے تو بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بڑی باتیں آپ کے سامنے آ جاتی ہیں، بشرطیکہ آپ غور کریں۔

رمضان شریف سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں اپنے گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ ایک عجیب و غریب آواز سنی جو اس سے پہلے کبھی سنائی نہیں دی تھی۔ وہ آواز کچھ کچھ پرندے کی لگتی تھی اور کچھ کچھ مشین کی لگتی تھی اور کچھ کسی سیارے کے اوپر سے آنے کی سکون، گک، گک، سکون میں پریشان ہوا اور میں نے انٹھ کر صحن کا چکر لگایا۔ آواز بدنستور آتی رہی تھی، لیکن پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔ پھر میں انٹھ کر باور پی خانے میں گیا، وہاں سے بھی ایسی ہی آواز آ رہی تھی، لیکن ذرا مددھم تھی۔ باور پی خانے کے ساتھ ایک کوھڑی ہے، جہاں بانو کھانے پینے کا سامان یعنی سوکھی رسد وغیرہ رکھتی ہیں۔ وہاں بھی ویسی ”گک“ کی آواز آ رہی تھی، پھر میں باہر نکلا اور محسوس ہوا، جیسے یہ آواز میرا پیچھا کر رہی ہے، جس طرح میں جاتا ہوں میرے ساتھ چل رہی ہے۔ میں خاصا پریشان ہوا۔ اس عمر میں آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اتفاق سے میرا بینا جو اپنی فائل بھول گیا تھا، دفتر سے گھر آیا تو میں نے کہا، یا رتم دیکھو یہ عجیب سی آواز آتی ہے اور پھر رُک جاتی ہے اور بڑی دیر تک نہیں آتی۔ وہ کہنے لگا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے یہ آواز ہماری سڑک سے کچھلی سڑک پر جو سر و نش کوارٹرز کی جو کالوںی ہے، اس کے پیچھے سڑک بن رہی ہے۔ اس طرف سے آ رہی ہے اور زمین کو ہموار کرنے والے بلڈوزر کی

ہے۔ میں نے کہا کہ بلڈوزر کی آواز تو اور طرح کی ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ ایو بلڈوزر جب ریورس کرتا ہے تو پھر یہ مخصوص قسم کی آواز دیتا ہے۔ خطرے کے طور پر کہ چیجھے کوئی ہے تو نہیں محتاط ہو جائیں۔ میرا بینا چلا گیا، لیکن میں سوچنے لگا کہ یہ سامنہ دان لوگ بھی کیا کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔

انہوں نے ماڈیت سے اتنا کچھ نہیں سیکھا، جتنا روحانیت سے سیکھا ہے اور میرے اندر بھی یہ دارنگ کا سگنل اکثر اسی آواز میں چلتا ہے اور چلتا رہا ہے۔ اس کو آپ ضمیر کی آواز کہہ لیں، اس کو آپ احساس گناہ کا نام دیں، میرے اندر کی آواز سے فائدہ اٹھا کر ہی سامنہ دانوں نے اپنی مشینوں میں اسی طرح کی آواز بھر دی ہے، جیسے ضمیر کی آواز ہوتی ہے تاکہ آدمی کو پتہ چلتا رہے کہ وہ کیسی غلطی کر رہا ہے اور کیوں ریورس چارہ ہے اور یہ کہ اسے خداوند تعالیٰ نے آگے جانے کے لیے حکم دیا ہے۔ وہ بیک کیوں جارہا ہے۔ میرے ذہن میں یہ ساری بات آئی تو بہت ساری گزشتہ باتیں اور کیفیتیں جو آدمی کے ذہن پر طاری ہو جاتی ہیں وہ طاری ہو گئیں۔ مجھے اللہ کی ایک بات یاد آئی، جس کی میں نے ہمیشہ ہی حکم عدوی کی اور جس کو نہیں مانا۔ یہ کہ اللہ کہتا ہے کہ وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں اور بہت دفعہ کہا ہے۔ میری یہ کیفیت رہی ہے اور شاید میرے ساتھیوں کی بھی ہو کہ ہم جب سچ پر بیٹھے ہیں یا گھروالوں یا دوست احباب میں بات چیت کرتے ہیں تو ضرور ایسی باتیں کرتے ہیں، جن پر ہمارا عمل نہیں ہوتا۔

میرے ایک استاد تھے اور میں خود بھی ٹیچر رہا ہوں۔ وہ اپنے طلبہ اپنے ساتھیوں اور سارے ملنے والوں کو اکثر بتایا کرتے تھے کہ ”نبی اکرمؐ اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، اپنے گرتے کو خود پیوند لگاتے تھے، اپنے جو تے گانٹھ لیتے تھے اگر جگہ صاف نہ ہو تو جھاڑ دیتے تھے اور اگر بھی کوئی کارکن، کارندہ یا خادم سویا ہو تو اسے کبھی نہیں جگاتے تھے۔“ لیکن میں تو اکثر یہ پوچھتا ہوں کہ بھی وہ بشیر اکھاں ہے۔ پتہ چلا کہ سویا ہوا ہے تو کہتا ہوں اسے جگاؤ اور اسے بولو کہ میرے لیے چائے کی ایک پیالی بنائے۔ میری طرح میرے بعد آنے والے استاد پھٹے ہوئے کپڑوں کو پیوند لگانے یا جوتا گانٹھنے کی بات اکثر کرتے ہیں، لیکن میں نے کبھی کسی استاد کو آج تک سکول میں نہیں دیکھا کہ اس نے اپنی قمیض کو کوئی پیوند یا ”ٹاکی“ لگائی ہو۔ یہ ہم کہہ ضرور دیتے ہیں، لیکن کتنی بری اور نقصان دہ بات ہے کہ میرا عمل نہیں ہے، لیکن میں اسے زبردستی دھکیلے چا جاتا ہوں کہ آپ اس پر عمل کریں، میں قبول کروں یا نہ کروں، یہ تکلیف دہ بات ہے۔

پچھلے دنوں میں لی وی پر ایک تقریر سن رہا تھا، لی وی پر سمجھدار لوگوں کا ایک پیمنہ کہ رہا تھا کہ دیکھتے ہمارے اسلام میں تو عورت کو خداوند تعالیٰ نے اتنی آسانیاں دی ہیں اور اس کے لیے ایسے قانون طے کر دیئے ہیں، جو دنیا کے کسی معاشرے اور مذہب میں نہیں ہیں۔ اس کو پوری آزادی دی ہے۔ ولایت والیاں تو اب بڑی مشکل سے وہاں پہنچی ہیں، جو آج سے 14 سو برس قبل اللہ نے عورت کو دے

دیا تھا۔ بیان تو یہ ہو رہا ہے، لیکن جب میں عمل کی طرف لوٹا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو وہ کہتے ہیں کرتے کہاں تک ہیں۔ میرے ایک عزیز ہیں بچاڑا بھائی۔ وہ بڑے نیک مولوی آدمی ہیں اور ہمیں اچھی فصیحتیں کرتے ہیں۔ ان کی رسم یارخان میں زمین ہے، جس میں باغ بھی ہے، بارہ مرتع زمین ہے، وہ ایک بھائی اور بہن ہیں، ان کے ابا جی حیات تھے تو وہ سب کام سنجا لئے تھے۔ جب وفات ہو گئے تو بڑی سیدھی سی تقسیم تھی کہ آٹھ مرتع بھائی کے اور چار مرتع بہن کے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اس میں کوئی بار بھی بھی نہیں تھی تو وہ بھائی صاحب جو بار بار یہ کہتے تھے کہ اللہ نے طے کر دیا ہے انہیں جب چار مرتع زمین دینے پڑے (ایک مرتع کی آمدی تقریباً 4 لاکھ روپیہ سالانہ تھی) اور 16 لاکھ روپیہ سالانہ بہن کو جانے لگا تو ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ خدا اور رسول کے فرمان بتاتے تو بڑے تھے لیکن عمل نہیں تھا۔ میں نے کہا، یا رُ تو تو ہمیں سمجھایا کرتا تھا، اس لیے آپ کا جو حصہ بتتا ہے اسے دو۔ کہنے لگا نہیں میں ظالم نہیں ہوں، سنگدل نہیں ہوں، میں بڑی احتیاط اور سنjal کے ساتھ اس کے مرتع کا انتظام بھی کرتا ہوں۔ میں نے کہا تو دفع کر۔ ایسا نہ کر۔ اس کا خاوند جانے وہ جانے۔ کہنے لگا نہیں میں اس کی بہتر مدد کر سکتا ہوں اور میں اس کا خرچ چلانے کے لیے گزارے کے طور پر دو ہزار روپے ماہانہ دے رہا ہوں۔

دیکھئے جب یہ سب کچھ ہو گیا تو میں نے ایک روز اپنے اس بھائی کو دیکھا، خواتین و حضرات لا ہو رہیں ایک جگہ ہے شاہ جمال کا لوئی، وہاں پر سڑک کے کنارے ایک چڑی مار بیٹھا تھا۔ یہ طو طے چڑیاں پکڑ کر بیچنے والے ہوتے ہیں۔ وہاں میرے بھائی کھڑا تھا اور اس نے اس چڑی مار سے کہا، سو چڑیاں چھوڑ دے اور بتا کتنے کی آتی ہیں۔ اس نے کہا کہ پانچ روپے کی ایک چڑی ہے۔ میرے بھائی نے کہا کہ یہ لوپانچ سورہ پے چڑی مار نے جنگل کا دروازہ کھول دیا اور چڑیاں پھر پھر اڑنے لگیں۔ میں گاڑی میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا بتاؤ طوطا کتنے کا ہے۔ اس چڑی مار نے جواب دیا، پچیس روپے کا۔ میرے بھائی نے کہا کہ چلوں طو طے چھوڑ دو۔ یہ پیسے دے کر میرا بھائی سمجھا کہ اللہ کے حکم پر اس نے عمل کر لیا ہے اور جو لوگ وہاں کھڑے تھے وہ سب کہہ رہے تھے کہ کتنا نیک دل آدمی ہے، جو جانوروں پر اس قدر رحم کرتا ہے تو بندوں پر کیوں نہیں کرتا ہوگا۔ اس طرح کی کوتا ہیوں میں ہم سب شامل ہیں، کسی نہ کسی طور پر۔ میں زور لگاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ یا اللہ اسی کوئی بات منہ سے نہ نکلے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جو بندہ محفل میں بیٹھا ہے، وہ معتبری بنانے کے لیے چاہے گا کہ اس کی واہ واہ ہو۔ رہا اس کا عمل تو اسے کون دیکھنے جاتا ہے۔ اس طرح آدمی کو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

میں نے شاید آپ کو پہلے بھی یہ قصہ سنایا تھا کہ ہمارے سکول میں دوڑ کے آپس میں اڑ پڑے

پرنسپل نے انہیں سکول سے نکال دیا دونوں لڑکوں کے والدین میرے پاس آگئے اور کہا آپ صاحب عقل ہیں، پرنسپل صاحب کو منایے۔ میں پرنسپل کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں اور انہیں سکول سے نکال دیا اور اس سختی سے نکلا کہ وہ لڑکے کسی اور سکول میں داخلہ ہی نہیں لے سکتے تھے، یعنی ان کا کیریئر ہی تباہ کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ صبح Prayer کے وقت ایک نے دوسرے گودھ کا دیا اور وہ آپس میں لٹا پڑے۔ بس اتنی بات تھی۔ میں نے پرنسپل سے درخواست کی کہ آپ تو معاف کر دینے والوں میں سے ہیں تو کہنے لگے ہاں ہم اپنے بچوں کو معافی کا درس دیتے ہیں۔ میں نے کہا، سر! جب تک آپ معاف کرنے کا علم نہیں عطا کریں گے تو انہیں لفظ کے معافی کی سمجھ نہیں آئے گی۔ آپ انہیں آگے بڑھنے کا مقابلہ کرنے کا سبق سکھاتے ہیں تو معاف کرنے کا بھی سکھادیں۔ یہ کیسے آئے گا۔ یہ سکول سے ایسے ہی نکل گئے اور انہیں کسی نے معافی کا درس نہ دیا اور اتفاق سے جا کر کسی ضلع کے ڈپٹی کمشنز بن گئے تو انہیں تو معاف کرنے کا پتہ ہی نہیں چلے گا۔ انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہو گا، جیسے میں نے باسنگ کافن نہیں سیکھا۔ اگر کوئی مجھے اکھاڑے میں کھڑا کر دے تو میں تو مارا جاؤں گا۔ کہنے لگے نہیں دیکھئے اس کا کورس میں ذکر ہے اور ایک ماشر صاحب سے کہا کہ آپ بھاگ کر وہ کتاب لا کیں اور اسے اشفاق صاحب کو دکھائیں۔

اس میں لکھا تھا کہ ایک بدجنت بڑھیا مکہ شریف میں حضور نبی اکرم پر ہر روز کوڑا پھینکا کرتی تھی اور آپ اپنی زفیں سراور کپڑے جھاڑتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ یہ کہانی آپ لوگ جانتے ہیں۔ ایک دن یہ سب کچھ نہ ہوا تو آپ کو پتہ چلا کہ وہ عورت یہاں بے آپ عیادت کے لیے اس کے گھر گئے اور فرمایا کہ بی بی کیا حال ہے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ پرنسپل صاحب کہنے لگے دیکھئے کتنا اچھا معاف کرنے کا سبق ہے۔ میں نے کہا کہ جی یہ تو کہنے کی بات ہے۔ کہنے لگے نہیں ہم پڑھادیتے ہیں۔ اگلے سبق میں پڑھئے جب حضور نبی اکرم طائف میں تشریف لے گئے تھے وہاں پر شرینو جوان پیچھے پڑ گئے اور آپ کو تکالیف دیں تو نبی پاک نے دعا دی کہ ”اے اللہ! یہ لوگ جانتے نہیں۔“ فرشتہ جبراہیل ان کے پاس آیا اور کہا آپ چاہیں تو ہم پہاڑوں کو ہلادیں۔ یعنی فرشتے کو تکالیف ہوئی کہ یہ کم بخت لوگ کیا کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا ”انہیں کچھ نہ کہنا۔ انہیں پتا نہیں ہے جب پتا چل جائے گا تو.....“

اچھا ہم سارے یہ بات بتا تو دیتے ہیں، لیکن ہم اس پر کسی طور عمل نہیں کرتے اس لیے بہتر یہ ہے کہ جب تک عمل نہ ہو سکے بتا میں بھی نہیں۔ جب بات کریں تو لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی ایسا ضرور آتا ہے زندگی میں جو اس کک، کک سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کا ضمیر جب اس کو روکتا ہے اور کہتا ہے کہ ریورس میٹ چل تو وہ ریورس سے رُک جاتا ہے۔ آواز سب کو آتی

ہے، پاسب کو چلتا ہے۔ لیکن وہ خوش قسمت ہوتا ہے۔

آپ کو ایک واقعہ سناؤں بربیلی کے کوئی رئیس تھے۔ وہ میرضامن کے مرید بھی تھے۔ ان سے بیعت تھے۔ ان کے ہاں ایک دفعہ چوری ہو گئی تو لوگوں کو اکٹھا کیا۔ ایک بے چارہ جولا ہاں وہاں موجود تھا جو بڑا ذرپوک قسم کا کارندہ ہوتا ہے۔ اس کو بلا کر ڈرایا دھمکایا تو وہ تحریر کا پنے لگا۔ لوگوں نے کہا کہ جناب! یہی چور ہے۔ اس کی شکل دیکھیں پہلی رنگت ہو رہی ہے۔ اس پر انہوں نے اس کو تین چار بید مارے وہ ترپا اور چلا یا۔ رئیس جب گھر آیا تو اسے خیال آیا کہ اس کے پاس کوئی ثبوت تو تھا نہیں۔ میں نے ایسے ہی اسے بید لگادیے۔ وہ وہاں سے نکلے اور مولوی صامن صاحب کے پاس گئے جو اس وقت اپنے کمرے میں تھے اور معمولات میں مصروف تھے۔ خادم نے رئیس سے کہا کہ وہ اس وقت نہیں مل سکتے۔ رئیس نے کہا کہ آپ مولوی صاحب سے کہہ دیجئے کہ یا تو وہ ملاقات کر لیں یا پھر میں اپنا منہ کالا کروں یا جھیل میں ڈوب کر مرجاؤں کیونکہ میں واپس گھر نہیں جاؤں گا۔ اس پر پریشان ہو کر مولوی صامن نے انہیں اندر بلایا اور کہا میاں کیا شور مچا رکھا ہے۔ اس نے کہا کہ جی مجھ سے یہ کوتا ہی ہو گئی ہے۔ مولوی صامن نے کہا کہ اس میں شور مچانے والی کیا بات ہے۔ اس شخص سے جا کر معافی مانگ لو۔ رئیس کہنے لگا یہ تو مشکل ہے (کیونکہ وہ بڑا آدمی تھا) مولوی صامن نے کہا کہ بس خود کشی کرنے، مرنے یا خود کو ایذا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہی حل ہے کہ معافی مانگو۔ وہ واپس آیا۔ گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور جولا ہے کو بھی بلایا۔ وہ بے چارہ پھر ڈرائے سردار نے پھر بلایا ہے۔ رئیس نے کہا کہ یا تو مجھے اتنے بید مارو، نہیں تو میں تجھے اس گاؤں سے جانے نہیں دوں گا۔ تیرا گھان بچھ (خاندان) مار دوں گا۔ وہ کہنے لگا، خواہ مجھے آپ جان سے مار دیں، آپ رئیس ہیں اور ہمارے سردار ہیں میں آپ کو بید کیسے مار سکتا ہوں۔ رئیس نے کہا کہ نہیں یہ تو تجھے مارنے پڑیں گے۔ وہاں جھکڑا ہو گیا۔ لوگوں نے کہا حضور! یہ بیچارہ غریب آدمی ہے اور آپ سے خوفزدہ ہے۔ یا اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتا ہے۔ آپ معافی مانگ لیں، کافی ہے۔ وہ رئیس گھننوں کے بل جھک کر جولا ہے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا کہ مجھ سے کوتا ہی ہو گئی۔ اس پر اس جولا ہے نے کہا کہ جی میں نے آپ کو معاف کیا۔ جب رئیس گھر پر آئے تو پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا کہ پتا نہیں معافی ملی ہے یا نہیں۔ مجھ سے بڑی کوتا ہی ہوئی۔ گویا رئیس کے اندر بلڈوزر کی "سک گک گک" چلی آ رہی تھی اور وہ اس کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر رئیس نے جولا ہے کو بتائے بغیر اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک خادم بنالیا۔ صح اٹھتے تو بھی لے جاتے اور اس کے گھر والوں سے کہتے کہ بازار سے جوسدا منگوانا ہے، مجھے بتاویں۔ بیبوں کے مزے ہو گئے۔ وہ دوسرے چینی، سیر آٹا، پیاز اور مولیاں وغیرہ سب کچھ منڈی سے خرید کر انہیں لادیتے۔ جب تک زندہ رہے وہ ایک خادم کی حیثیت سے اس گھرانے کا کام کرتے رہے۔

یہ تو خوش قسمت لوگوں کی کہانی ہے کہ انہوں نے جو کہا اس پر عمل بھی کیا، کیونکہ مجھ سے یہ ہوتا نہیں ہے اور میں کافی کوشش بھی کرتا ہوں۔ اسلام کی برتری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان بڑے لوگوں کی مثالیں ہم دیتے ہیں کہ جن کے قریب تک پہنچنے کا ہم میں یار نہیں ہوتا، ہمت نہیں ہوتی اور انہیں ہم کسی بھی صورت مقابل میں لانہیں سکتے۔ جب اللہ یہ کہتا ہے اور وضاحت سے کہتا ہے ”تم کیوں ایسا کہتے ہو؟ جو کرتے نہیں ہو۔“ یہ بڑی غور طلب بات ہے۔ اس میں یقیناً تھوڑی سی بے رونقی ضرور آئے گی، لیکن جس بات کا میں نے پہلے تذکرہ کیا کہ دلوں کے اندر خوشی کا سامان ضرور مل جائے گا، جیسے اس رسمیں کے اندر رہوا۔

میں جو بھجھ سکتا ہوں کہ ہماری معاشرتی کمزوری ہے کہ ہم لوگ ہم سارے کے سارے اعلیٰ درجے کی مثالیں دے کر اسے اپنی زندگی کے اوپر حادی نہیں کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رات کو اپنے دفتر کا حساب کر رہے تھے۔ دیوار و شن تھا۔ دوست باتیں کرنے لگا تو آپ نے پھونک مار کے دیا گل کر دیا اور کہا کہ یہ قوم کا تیل تھا، جس سے یہ چل رہا تھا۔ ہم آپس میں ذاتی باتیں کر رہے تھے اس لیے یہ دیا نہیں جلے گا۔ اندھیرے میں بات کرو۔ ہم یہ بات جب کہتے ہیں تو سننے والا بھی بیچارہ اور ہم خود بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید ہم بھی اسی رنگ میں ہیں حالانکہ ہم قومی یا سرکاری سرمائے کو بلا دریغ جو استعمال کرنے میں ہرگز کوئی برائی نہیں سمجھتے۔ اس دن کی رویوں کی گلک گلک میرے اندر بڑی شدت سے چل رہی ہے۔ گوئیں ابھی اس گلک پر دیے قابو نہیں پاس کا، جیسے میرضامن علی صاحب کے مرید رہیں نے پایا تھا۔

میں آپ کو دعا دیتا ہوں کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

دوستی اور تاش کی گیم

میں اس سے پہلے بھی گفتگو کے اسی سلسلے میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر کہوں گا کہ میں اور میری بیگم بانو قدیمہ درجے کے اچھے لوگ ہیں۔ بہت اچھے تو نہیں، لیکن ایک خرابی ایسی ہے جو ہمارے درمیان چلی آ رہی ہے اور اس کا کوئی سد باب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تاش کھیلنے کی عادت ہے۔ مجھ میں تو نہیں تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ تاش کیے کھیلی جاتی ہے، لیکن میرے سرال والے اس کھیل میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ میری ساس جو تمیں اگر کوئی ساتھی نہ بھی ہوتا تو وہ اکیلے ہی تاش کھیلتی رہتیں۔ میری بیوی نے بھی سمجھی، لیکن اس کے بعد تاش ہمارے گھرانے میں آگئی۔ ہم دونوں صح سویرے بیڈنی لیتے ہیں اور ہماری بیڈنی یہ ہے کہ ہم خود ہی چائے بناتے ہیں۔

صح بچ سوئے ہوتے ہیں۔ ہر طرف ہو کا عالم ہوتا ہے۔ ہم دونوں اس وقت باور پی خانے میں اکیلے ہوتے ہیں۔ چائے کی ایک ایک پیاری پی کر ہمیں جو وقت ملتا ہے، اس میں ہم تاش کھیلتے ہیں اور پچوں کے جانے سے پہلے تاش کھیل کر سمیٹ لیتے ہیں، تاکہ انہیں پتا نہ چلے۔ جب ملازم آتے ہیں تو ان کے آنے سے بھی قبل ہم تاش سمیٹ لیتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک خوبصورت ڈبہ ہے جس کے چاروں طرف بہت خوبصورت جنگلی پچوں بنے ہوئے ہیں۔ اس ڈبے کے ڈھلنے پر نہایت خوبصورت ایک ہرنی ہے جو چڑا گاہ میں چر رہی ہے اور اس ہرنی کے ساتھ اس کا ایک جھوٹا سا بچہ ہے، جو ابھی دو دھ پیتا ہے اور گھاس کھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بہت پیاری تصویر ہے۔ اس کے اندر ہم نے اپنے پتے رکھے ہوئے ہیں۔ میں تو ان پچوں کو پھینٹ نہیں سکتا، کیونکہ میری پریکش نہیں ہے۔ میری بیوی ہی انہیں پھینٹتی ہے اور وہ پتے چونکہ مختلف قسم کے ہیں اور ان کا سائز ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ملتا نہیں ہے اس لیے اس بات کی مشق میری بیوی ہی کو ہے۔ پھر تاش بانٹی جاتی ہے۔ جس کے پاس آخری پتا آتا ہے اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس پتے کو دیکھ کر بتائے۔

اس تاش کا میں کچھ حصے لے آیا ہوں جس کا سائز کچھ اونچا کچھ نیچا ہے۔ یہ جو پتے ہیں میں

آپ کے سامنے رکھوں گا اور شاید آپ کو نظر بھی آئیں۔ یہ ہماری تاش ہے جو ہم اپنے پاس رکھ کر ہر روز صحیح کھلیتے ہیں۔ یہ عید کارڈ ہیں جو پچھلے سال ہمیں موصول ہوئے تھے اور جن کی تعداد تقریباً تین یا ساڑھے تین سو ہے۔ ہر روز ان پتوں کو نکالنا اور چھانٹنا اور پھر اس گم کوشروع کرنا کافی مشکل اور چیزیں کام ہے۔ جب آپ شروع کریں گے تو آپ کو بھی خاصی وقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر ایک پتا جو میری بیوی اٹھاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ عید کارڈ پچھلے سال یونی صاحب نے بھیجا تھا۔

مشتاق یونی ہمارے دوست ہیں۔ ہم دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یونی صاحب جہاں بھی ہوں اور جس مقام پر بھی ہوں اور جیسے کیسے بھی ہوں، ان پر ان کے گھروالوں پر، ان کی بیگم پر، ان کے بچوں اور پوتوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرم اور پھر اس کے بعد جوان کی ذات سے واپسی کچھ باتیں یاد آتی ہیں، ان کو بھی ہم ذہراتے ہیں تاکہ یہ سلسلہ نہ ٹوٹے اور سال بھر کا کم از کم جو رشتہ ہے وہ اسی طرح سے قائم رہے۔ پھر میری بیوی مجھے بتاتی ہے کہ جب وہ کسی بڑی تقریب پر قطر گئے تو مشتاق یونی نے ان سے بانو قدیسہ سے کہا تھا کہ آپ بڑی رائٹر ہیں، لیکن ایک بات کا خیال رکھئے کہ زوال نعمت سے پہلے ریٹائرڈ ہو جانا بہت ضروری ہے۔ آپ بہت عروج پر پہنچ جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ میں اس مقام پر پہنچا تو بحمدہ آدمیوں کا یہ تقاضا ہے کہ اس نعمت کو آخزوں وال تو آنا ہی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ فیلڈ چھوڑ دینا چاہیے۔ اور پویسین میں واپس جا کر اپنا بارکھ دینا چاہیے کہ اللہ تیری مہربانی۔

یونس جاوید نے ہمیں ایک کارڈ بھیجا تھا۔ وہ میں اٹھاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ بہت اچھا نوجوان ہے اور اس نے ہم کو یاد رکھا اور اس کے اپنے گھروالوں پر بہت احسان ہیں اور اس نے میری سے عملی زندگی شروع کی اور ایم اے تک پہنچا۔ یہ ہمارا ذہن ہیں اور یہ ہے۔ اے اللہ اس کو اس کے دنیاوی مقام پر بھی پہنچا اور دنیی مدارج بھی طے کرو اور اس کو دین اور دنیا میں سرخو کر۔ جتنے بھی ہمیں الفاظ اس وقت یاد آتے ہیں اس تاش کے کھلیں میں ہم کھلیتے ہیں اور بڑے شوق اور محبت اور جذبے کے ساتھ کیونکہ اس وقت کوئی ڈسٹریپ کرنے والا، خلل ڈالنے والا نہیں ہوتا۔

پھر پہنچ میں سے ایک کارڈ نکل آتا ہے۔ ظہیر کا مہراب پور سندھ سے۔ یہ کون آدمی ہے؟ ہم نہیں جانتے ظہیر کچھ ایسی محبت والا آدمی ہے۔ عجیب و غریب کہ بھی بھی اس کی طرف سے ایک پیکٹ بھی موصول ہوتا ہے جو کوریز کے ذریعے آتا ہے۔ ہم اسے کھولتے ہیں تو سلوو کے ایک خوبصورت ذبے میں گاجر کا حلوا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے آپا جی! یہ گاجر کا حلوا میں نے خود پکایا ہے اور میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ آپ چونکہ شوگر کی مریضہ ہیں تو اس میں چینی زیادہ نہ ہو تو آپ تحریک کر کے مجھے بتائیں کہ مجھے گاجر کا حلوا بنانا آتا ہے کہ نہیں۔ ہم اس سے ملے تو نہیں، لیکن خط و کتابت یا شیلیفون کے

ذریعے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ حلوہ بہت اچھا تھا۔

اب ایک رضوانہ ہیں، جس نے لاڑکانہ سے ایک عید کارڈ بھیجا ہے۔ اب رضوانہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ پتا نہیں، مگر ظاہر ہے کہ ہماری دعا نہیں اس کے لیے ہیں۔ وہ کتنی بڑی ہے، کتنی چھوٹی ہے، اس کی شکل صورت کیسی ہے؟ ہم نہیں جانتے۔ اس نے اپنا پتا بھی نہیں لکھا، جیسے عیسیٰ خان نے کوہاٹ سے خط لکھا اور وہ تین چار روز پہلے ڈبے سے نکلا تو میری بیوی چونکہ سرتاش کی باری اسی کی بنتی تھی تو اس نے کہا کہ یا اللہ! عیسیٰ خان جہاں بھی ہوا گر شادی شاہ ہے تو اس کے بیوی بچوں پر تیری رحمتوں کی بارش ہو، اگر ابھی تک کنوارا ہے، دکاندار ہے، پڑھر ہاہے تو اس اکیلے پر اس کے ماں باپ پر اپنی رحمت فرم۔

اس قسم کی کہانیاں چھوٹے چھوٹے افسانے بننے رہتے ہیں اور تاش کی یہ گیم چلتی ہے۔ اب یہ کہ کچھ مانوس لوگ ہوتے ہیں، کچھ نامانوس، کچھ ہمارے دوست ہیں، جن کو ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں، کچھ دوست نہیں ہیں۔ ان کا رڈز کی وجہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ دوست کون ہوتا ہے ملاقاتی کون ہوتا ہے نامانوس ملاقاتی کون ہوتا ہے؟ لیکن اس کا تعلق اور اس کا رشتہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا دوست کا!!

پچھلے دنوں متاز مفتی صاحب کا ایک کارڈ نکل آیا۔ پرانا کارڈ آ کر شامل ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ وہ تو اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جب بھی مجھے یاد کرو تو ایک مرتبہ الحمد شریف اور تین مرتبہ قل شریف پڑھ کر مجھے بخشا کرنا۔ تو ہم نے کہا تھیک ہے۔ یہ خواہش تو بہت آسان ہے۔ ہم پوری کردیتے ہیں تو کر دی۔ پھر میں نے کہا کہ مفتی صاحب مزاج کے بہت سخت تھے۔ جلدی غصے میں آ جاتے تھے۔ ہم اکٹھے کام کرتے تھے۔

خواتین و حضرات میں آزاد کشمیر ریڈ یو سے مسلک تھا۔ مری سے ہمیں آرڈر ہو گیا 1952ء میں کہ یہ شیش بند ہوتا ہے، شام کی جوڑا نمیش ہے وہ پنڈی سے چلے گی۔ ہم لوگ بڑے مزے سے وہاں رہتے تھے۔ ہمارا خیال بھی نہیں تھا کہ شیش میں اتنی جلدی تبدیلی ہو جائے گی۔ بہر حال قرض پر زندگی چل رہی تھی۔ جو لوگ نوکری پیشہ ہوتے ہیں اور ان کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے وہ دودھ والے کے مقروض ہوتے ہیں وہ ہوٹل والے کے بھی مقروض ہوتے ہیں، جہاں سے نان آتے ہیں۔ ہم سارے کے سارے کسی نہ کسی انداز میں قرضے کے بوجھ تکے تھے، تو میں نے متاز مفتی سے کہا، کیونکہ وہ احتیاط سے چلتے تھے، ان کو کمرہ بھی الات ہوا تھا، جبکہ ہم ہوٹل میں رہتے تھے۔ ان سے میں نے کہا کہ میں تو گز نہیں سکوں گا، کیونکہ ہوٹل والے نے کہا تھا کہ ریڈ یو کے بندے جارہے ہیں اور جہاں سے لاری پر بیٹھتے ہیں، وہاں وہ اپنا بندہ بٹھا دے گا، جو لائھی بردار ہو گا۔ لہذا آپ مجھے پانچ سورو پر ادھار دیں تو انہوں نے کہا تھیک ہے لے لو۔ میں نے ان سے پانچ سورو پر لیے اور گواں کا مل 80 یا 90 روپے کا ادا کیا، پھر ہوٹل والے کے 231 روپے تھے وہ بھی ادا کر دیئے اور کچھ قرضے دینے تھے وہ

بھی دیئے۔ میرے پاس چالیس روپے بچ گئے تو خوشی سے مزے سے سیٹی بجاتے راولپنڈی پہنچ گیا اور وہاں رہنے لگا۔ اب جب میں نے چونکہ ان سے قرض لیا تھا لہذا ان سے دب کے رہتا تھا۔ وہ میرے بڑے عزیز دوست تھے اور ہماری آپس میں توں تراک قسم کی بے تکلفی تھی۔ پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ جب وہ کوئی بات کرتے تھیں یا تھیں نہ ہوتی، میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ اب جناب بات یہ ہے کہ ہم نے ولڈ بینک سے قرض لیا ہے جو آئی ایم ایف کہہ دے کہ جناب بھلی کا بل 2 روپے 35 پیسے کے بجائے سات روپے لینا ہے تو ہم کہتے ہیں جی حضور آپ تھیک کہتے ہیں۔ جس نے بھی خدا نخواستہ قرضہ لیا ہو یہی تکلیف رہتی ہے کہ ہمیشہ اس کے سامنے دم ہلانا پڑتی ہے۔

میں جب بھی مفتی صاحب کوئی بات کرتے کہتا سمجھان اللہ آپ واقعی تھیک کہتے ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی تھے۔ ایک دن چڑھے۔ کہنے لگے دیکھو تم میری ہر بات کے ساتھ Agree کرتے ہو، ہر بات کو Yes کہتے ہو، تم کبھی میری بات سے ناقابلی کا ظہار نہیں کرتے اور یہ سمجھتے ہو کہ جو میں کہہ رہا ہوں، تھیک کہہ رہا ہوں، تو آئندہ سے اس بات کا خیال رکھو جیسے میرے ساتھ پہلے بولا کرتے تھے جیسے میری سیٹ منٹ پر پہلے تنقید کیا کرتے تھے، دیے ہی کرو ورنہ میرے پائچ سو روپے واپس کر دو۔ میں نے کہا کہ میں وہ بھی ان شاء اللہ واپس کر دوں گا۔ انہوں نے ایسی وحکی دی تھی مجھے حوصلہ نہیں ہوا۔ تو ایسے پیارے پیارے دوست ان کے ایسے پیارے پیارے پتے ہم کو ایک نی گیم کھیلنے کے لیے دے جاتے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی یاد بھی جڑی رہتی ہے۔

میں ذکر کر رہا تھا کہ دوست ملاقاتی اور ساتھی کا جو ایک فرق ہے وہ سمجھ میں آنے لگا ہے۔ ان عید کارڈوں کی آمد سے کچھ ہمارے صحیح سوریے متوجہ ہو کر بیٹھنے سے کچھ ان لوگوں کے ساتھ ایک رابطہ قائم کرنے سے جسے کمیونی کیشن کہتے ہیں۔ آپ کسی کے لیے بھلانی کا کام کریں۔ کسی کے خلاف آپ کو غصہ ہو جیسے میں اپنی بچیوں سے کہتا ہوں جواب بھوئیں بنی ہیں کہ اگر ساس کو تم نے سزادی ہے اور اس کا بہت بڑی طرح ”مکو ٹھپنا“ ہے تو اس کے حق میں دعا کیا کرو دیکھو وہ کتنی بے چین ہو گی، بجائے اس کے کہ اس سے جھگڑ کر اپنی ماں کے پاس دوڑتی ہوئی جاؤ کہ اماں اس نے مجھے یہ کہا ہے تو تم تجربہ کر کے دیکھو تو اس میں کیا حرج ہے، چالیس دن کہو کہ اللہ تعالیٰ میری ساس کو سلامت رکھ لانکہ ساس بڑی بلا ہوتی ہے اور تند بھی، کیونکہ میں نے تو بھی سنائے۔ میری ایک بھانجی کی بیٹی کا برداشت کاوا تھا۔ ہم دیکھنے گئے تو اس نے کہا نانا ضرور جائیں۔ میں نے کہا کہ میں تو تجربہ نہیں رکھتا، میں کیا کروں گا؟ تو اس نے کہا، نہیں نانا آپ کو ضرور جانا ہو گا۔ آپ نے جا کر یہ دیکھنا ہے اور خبر لے کر آئی ہے کہ میری نندیں کتنی ہیں۔ میرے لیے بڑا مشکل ہو گیا کہ کیسے پوچھیں کہ بھی تیری بہنیں کتنی ہیں؟ یہ تو پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں، کہاں ہوتے ہیں؟ پھر میں نے طریقے طریقے سے معلوم کر لیا۔

میں نے واپس آ کر شازیہ کو بتایا کہ بھی پانچ ہیں۔ وہ کہنے لگی اور ہوا! ذرا لعنت میں تو کبھی وہاں شادی نہیں کروں گی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ تند واقعی خوفناک چیز ہوتی ہے۔ ہم مردوں کو تو اس سے وارطہ نہیں پڑتا اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر دعا کریں تو دل چاہے کتنا ہی جلا ہوا کیوں نہ ہو؟ پھر بھی آپ کو فائدہ پہنچ جائے گا، بلکہ زیادہ پہنچ گا، چاہے تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ بجائے غصہ یا نفرت کے اظہار کے اور یہ جو ہم کاشنکوفوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہیں، خواہ کتنی بھی کرتے چلے جائیں، یہ کام ختم نہیں ہوگا۔ ایک دن دعا کے لیے بینچ جائیں، بڑا سکون آجائے گا اور رحمتوں کا نزول ہونا شروع ہو جائے گا۔ اب ان پر حمتیں رکی ہوتی ہیں۔ جس دن آپ ہاتھ سے کاشنکوف چھوڑ دیں گے اور دعا شروع کر دیں گے رحمتوں کا نزول شروع ہو جائے گا۔

ابھی بات ہو رہی تھی کہ دوست کون ہوتا ہے؟ اور ملاقاتی کون ہوتا ہے؟ میں تو یہ دسویں جماعت میں سکول میں پڑھتا تھا، ہمارے دو پھر ماشر حشمت علی اور ماشر قطب الدین ہوا کرتے تھے۔ دونوں ریاضی کے بہت ماہر تھے۔ انہیں خدا نے اس بارے بڑی صلاحیت دی تھی۔ ہمارے ضلع سے باہر اور ذرودور کے مقامات سے ہندو سکھ استاد ان سے الجبرا اور چونکہ یہ ہے ہی مسلمانوں کا علم کے مشکل مسائل پوچھنے آتے تھے اور وہ دونوں استاد سکول ٹائم کے بعد لان میں بیٹھ کر ریاضی کے مسائل حل کیا کرتے تھے جو ہماری سمجھ سے باہر ہوتے تھے۔ ساتھ رہنا، اکٹھے کھانا، ایک دوسرے کے گھر کے ساتھ گھر، سیر کو اکٹھے جانا، اکٹھے سکول آنا۔ کبھی ہم نے انہیں الگ الگ نہیں دیکھا تھا۔ ان کے درمیان اتنی گہری دوستی تھی کہ آپ جتنا بھی ذہن میں اس کا تصور کریں، وہ کم ہے۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ ڈویڈ غل انپکٹر آف سکولز نے ماشر حشمت علی کی تبدیلی کر دی اور وہ ہمارے ضلع کی کسی اور تحصیل میں چلے گئے۔ دونوں دوستوں کے درمیان اس تبدیلی سے جو خلیج پیدا ہوئی، وہ تو ہوئی، ہم جو طالب علم تھے یا جو دوسرا شاف تھا، ان کے لیے بھی بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ ہم سب نے وہ تکلیف دو لمحات محسوس کیے۔ میں نے ماشر قطب الدین سے کہا، کیونکہ میں ذرا سمجھدار بچ تھا، آپ کی حشمت علی صاحب سے بڑی دوستی تھی؟ کہنے لگئے ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے کہا ان کے جانے سے آپ کی طبیعت پر بوجھ پڑا؟ کہنے لگئے ہاں پڑا ہے، لیکن زیادہ نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ آپ حیران کن بات کرتے ہیں۔ وہ تو آپ کے بہت عزیز دوست تھے، قریب ترین تھے۔ کہنے لگئے اشراق میاں بہت عزیز تھے، بہت قریب ترین تھے۔ لیکن آپ اس کو اعلیٰ درجے کی معیاری دوستی فرادریں دے سکتے۔ پیش ہمارے معمولات اکٹھے تھے، اکٹھے کھاتے پیتے تھے اور کوئی لمحہ بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزار لیکن یہ دوستی کی نشانی نہیں ہے۔ دوستی کی نشانی یہ ہے کہ جب تک آدمی اکٹھے بیٹھ کر روانے نہ اس وقت تک دوستی نہیں ہوتی اور ہم کبھی اکٹھے بیٹھ کر روانے نہیں تھے اس لیے آپ نہیں کہہ سکتے کہ ہم دوست تھے۔

ہمارے پاس جو کارڈ ز آتے ہیں ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے ساتھ ہم اتنے قریب تو نہیں ہوئے جتنے ماضی قطب الدین صاحب نے کہا تھا، لیکن ہم ایک اور رشتے سے ایک اور ناتے سے ان کے ساتھ ہیں۔ عید آتی ہے تو ہمارے لیے یہ بڑی خوشیاں بھی لے کر آتی ہے اور ایک طرح کا بوجہ بھی کہ اب نئی تاش نئے ذبے میں بند ہو گی اور پھر ہم کو یہ گیم کھیلنا پڑے گی؛ جس کی خوشی بھی ہے؛ جس کی ذمہ داری بھی ہے اور جس کا بوجہ بھی ہے۔

اب یہ بات میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ہم کو یہ گیم جاری رکھنی چاہیے یا اسے بند کر دینا چاہیے؟ آپ بھی حیران ہوتے ہوں گے کہ یہ عجیب سا گھرانہ ہے اور عجیب سا جوڑ ہے۔ یہ کیسی عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ہم دونوں کافی حد تک خود غرض لوگ ہیں اور ہم نے یہ دیکھا ہے کہ اصلاح کی بات کرنے میں جی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں رہنے سے ہم بڑی مرادیں پاسکتے ہیں۔ آپ کو رحمت للعالمین کا خطاب دنیا والوں نے نہیں دیا، آپ کو ”کل عالموں کے لیے رحمت“ کا خطاب اور پرسے ملا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تو ان کے نقش پا کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر انی کی بات کو ہی پکڑ لیا جائے کہ رحمت، شفقت، محبت اور عطا سے میری ذات کو فائدہ ہو گا تو ہم تو خود غرض لوگ ہیں۔ لہذا اپنی ذات کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہم نے یہ طریقے اختیار کر رکھے ہیں اور اس سے ہمیں واقعی فائدہ ہوا ہے، ہورہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہوتا ہے گا۔

میں دنیاوی فائدے کی بات کر رہا ہوں، آگے بھی شاید ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، لیکن آگے فائدہ ضرور ہو گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

انسانی عقل اور رضاۓ الہی

بعض اوقات زندگی میں کچھ ایسے مشکل مرحلہ آتے ہیں جن کے لیے انسان تیار نہیں ہوتا۔ ایک مشکل مرحلہ میرے سامنے تھا۔ پچھلے آٹھ دس روز سے مشکل میں اضافہ ہو گیا، کیونکہ وہ بوجھ تو پہلے ہی موجود تھا، لیکن سوال کرنے والے چند نوجوانوں نے اس میں اضافہ کر دیا۔ پوچھا گیا کہ ہم زندہ قوم ہیں، پاسندہ قوم ہیں، کیا قوم کا تصور محض افراد کے سانس لینے کا نام ہے؟ میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ ہاں یہ افراد کے سانس لینے ہی کا نام ہے اور جن افراد کے سانسوں کے اوپر پہرے ہیں اور جن کے سانس گھوٹ دیئے گئے ہیں وہ زندہ قوم نہیں۔ جتنی زندہ قومیں آپ کو اپنے گرد نظر آئیں گی، ان کی خوبیاں تو بعد میں دیکھیں گے، پہلے اس بات کی آپ کو تسلی کرنا ہو گی کہ کیا وہ سانس لے رہی ہیں، پورا سانس اندر لے جاتی ہیں اور پورا باہر چھوڑتی ہیں؟

میرے ملک میں ایک گروہ انسانی جس میں، میں بھی شامل ہوں، بڑی آسانی کے ساتھ بہت اچھی سانس لیتا ہے اور بڑی آرام دہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں، خوشحال ہیں، لیکن باقی کے 14 کروڑ جو ہیں، ان کی اکثریت سانس لینے کی بات تو بعد میں ہے، ان کو ان کی عزت نفس بھی نہیں لوٹائی گئی۔ بحیثیت انسان کے اور اللہ کی تخلیق کے وہ ایک عزت لے کر آتے ہیں۔ پیسہ نہ دیں، ان کو روٹی نہ دیں، کپڑا مکان نہ دیں، لیکن ان کی عزت تو ان کا حق ہے۔ میں اپنی نواسی سے کہتا ہوں کہ یہ جو آپ کا دراصل یورپ ہے، آپ اس کو رمضان صاحب کہہ سکتی ہیں۔ ”نہیں نانا میں نہیں کہوں گی، یہ تو رمضان ہے ہمارا ملازم“، وہ کہتی ہے۔ گویا یہاں آ کر کام رک گیا ہے۔ اسی طرح آپ عام زندگی میں دیکھ لیں، دفتروں میں، گھروں پر اگر وہ سانس ہی تھیک طور پر نہیں لے رہے تو پھر زندہ قوم کیسے ہو گئی؟ کسی نے پوچھا کہ بابا یہ بتاؤ کہ کچھ لوگ بڑے امیر ہوتے ہیں اور کچھ بڑے غریب ہوتے ہیں۔ جو غریب ہوتے ہیں وہ شکل و صورت سے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ داش کے اعتبار سے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ پڑھائی اور خاندانی اعتبار سے بھی اچھے ہوتے ہیں اور جو لوگ امیر ہو جاتے

ہیں، بعض اوقات وہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ ان میں نہ عقل نہ دانش نہ شکل نہ صورت، لیکن دیکھیں پھر بھی وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے کہا یہ تخصیص اور تقسیم جو آپ نے متعین کی ہے یہ محض آپ کو بے چین رکھنے کے لیے ہے۔ ہم سب کے دل میں یہ مشکل اور مصیبت قائم ہے۔ میرا پوتا کہہ رہا تھا کہ میرے ابو کہتے ہیں کہ یہ شخص سول لائن امریا میں جہاں افسروگ رہتے ہیں وہاں بڑے ایک درخت میں کیل محوک کر شیشہ لٹکا کر وہاں دوچار آنے میں جامت بناتا تھا۔ اب اس کے تین پلازے اسلام آباد میں ہیں، دو یہاں ہیں، پانچ گاڑیاں ہیں اور سونے چاندی کے زیورات سے اس کی بہوں میں بیٹیاں لدی ہوئی ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہاں پر آ کر اس کے پھسلے اور ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ڈپریشن کی جتنی بھی یماری چل رہی ہے وہ محض اسی وجہ سے چل رہی ہے۔ اگر آدمی اللہ کو مان لے شرک کے بارے میں کہتے ہیں کہ جی قبروں پر سر جھکانا اور تعویذ گزدہ کرانا یہ شرک ہے۔ یہ شرک اگر ہے تو بہت معمولی درجہ کا ہے۔ اصل شرک وہ ہے جب اللہ کے کئے ہوئے کام کے اندر بندہ بیٹھ کر نفس نکالے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ یہ تھیک نہیں ہے، فلاں کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہوا۔ اب ان بچوں کو کوئی کیسے بتائے کہ ایک تمہاری دانش ہے، ایک تمہاری عقل ہے، ایک تمہارے انصاف کے تقاضے ہیں، ایک اللہ کی دانش ہے، اس کے لیے دانش سے بھی بڑا فقط چاہیے۔ وہ علیم مطلق ہے۔ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کیا کرنا ہے؟ میں یہ نہیں جانتا۔

میں چونکہ ان کی آسانی کے لیے یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اللہ کے بالکل واضح الفاظ ہیں اور وہ بیتخار مرتبہ فرماتا ہے اور جگہ جگہ فرماتا ہے کہ جیشک اللہ ہی روزی دینے والا ہے اور وہی بڑی مضبوط قوت والا ہے اور اللہ جس کی چاہتا ہے روزی فراخ کرتا ہے اور جس کی چاہتا ہے روزی تنگ کرتا ہے۔ اب اس میں ہم کیا ہیں؟ وہ شخص بڑا ہی خوش نصیب ہے جو مسکرا کر پہلے ” سبحان اللہ و بحمدہ تبارک الذی کمالہ ” پھر تو وہ نوٹ کر لے گیا کذی اور پر سکون ہو گیا اور اللہ کے بندوں کی صفائی میں شامل ہو گیا۔ اگر اس نے بیٹھ کر یہ کہا کہ ” اللہ میاں (نعوذ بالله) ادھر بیٹھو سامنے میں آپ سے دودو ہاتھ کر لوں کہ تو نے یہ کیا انصاف کیا۔ ” پھر وہ مارا گیا یعنی وہ اپنی ذات کے لیے مارا گیا، اپنے سکون کے لیے مارا گیا۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے۔ دیکھئے اس آیت میں کہ ” جو لوگ ایمان لائے بچ جو اور مومن ہو گئے وہ ایسی بات نہیں کرتے ان کے لیے ایک نشانی ہے۔ ”

میرے جیسے لوگ جو سلطی علم رکھتے ہیں وہ ضرور اعتراض کرتے ہیں۔ ایسی بات خداوند فرماتا ہے ” اے حضور نبی اکرم فرمادیجئے کہ میرا پروردگار اپنے بندوں کے لیے جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو اس کا عوض ضرور دیتا ہے ” اور عکوما ” خرچ کرتے ہو ” کے ساتھ جو ترجمے ہوتے ہیں ان میں بریکٹوں میں یہ لکھا ہوتا ہے ” اور جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو ”

اس کا عوض دیتا ہے۔“

میں سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ خرچ کروز و پسیہ ایک جگہ پر پڑا نہ رہے، کیونکہ یہ کھاد کا جوڑ ہیر ہوتا ہے ”روڑی“ جسے کہتے ہیں؛ اگر اسے کھیتوں میں پھیلا دیا جائے تو یہ سونا ہے اور اگر اسے ایک جگہ پر جمع رکھا جائے تو یہ بدبو کا گھر ہے، کوئی گاؤں اس کے قریب بس نہیں سکتا۔ یہی دولت کا حال ہے کہ جب اس کو پکڑ کر رکھ لیا، میرے جیسے لوگوں نے اکاؤنٹ بھی کھول لیا، نمبر بھی مجھے 41-22007 یاد ہے اپنا، تو پھر جب دولت گھومتی نہیں ہے لوگوں کے ہاتھوں میں تو مشکل پڑ جاتی ہے۔ اللہ کہتا ہے خرچ کر دو، کسی جگہ بھی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ میری سوچ ہے کہ اس کو خرچ کر دو لگا دو اور خود اس سطح پر آ جاؤ جس سطح پر اور لوگ موجود ہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے میری ہی عمر کے۔ اللہ بخشنے وہ فوت ہو گئے۔ شروع سے ہی اللہ نے اس کی ایسی طبیعت بنائی تھی۔ کراچی کی بات ہے وہاں الفتنش سریٹ میں شام کو ففتر سے فارغ ہو کر ایک ریستوران میں بیٹھ جاتے چاۓ کی پیالی پینے کے لیے۔ ان کاروں کو دیکھ کر وہ بڑے خوش ہوتے کہ بھئی یہ بڑی خوبصورت ہیں۔ کئی کاروں پر جا کر ہاتھ پھیرتے اور کہتے یار آج میں نے کمال کی ایک کار دیکھی۔ میں نے کہا بد بخت تیرے دل میں نہیں آتا کہ تیرے پاس بھی ایسی کار ہو تو کہتا، نہیں یہ کار کراچی ہی میں ہے، جب چاہیں گے دوبارہ دیکھ لیں گے۔ وہ تو بہت اچھی ہے۔ وہ میری عمر کا ہو کر فوت ہوا۔ بڑا خوش و خرم بہت آسان زندگی میں رہنے والا بندہ تھا۔ اب اللہ کی مرضی کے سامنے ”اڑ“ کے بیٹھ جانا درست نہیں۔ میں یہ مشکل آپ سے بیان کر رہا تھا کہ ایک چیز پھنسی ہوئی تھی، سورہ حمل میں جسے آپ بڑی محبت اور شوق سے سنتے ہیں اور قاری باسط کی تو ماشاء اللہ قرأت بھی اچھی ہے، اس میں ایک آیت آتی ہے کہ اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔ اس پر میں ہمیشہ رکتا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ ”اور اللہ کو ہر دن ایک انوکھا دھنہ ہے۔“ وہ پرانے زمانے کا ترجمہ کرتے تھے بہت پیارا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کہتے ہیں اپنے ترجمے میں ”اور اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔“ فتح محمد جالندھری نے لکھا ہے کہ ”اور اللہ کو ہر روز ایک کام ہے،“ تو میں اپنے طور پر بہت حیران ہوتا تھا اور ہوتا رہا ہوں کہ اللہ کو ہر روز کیا کام ہو سکتا ہے۔ بڑی پریشانی ہوتی، کئی تقاضیں دیکھیں، سمجھے میں بات نہ آئی۔ الحمد للہ جب یہ بچے مجھ سے مل تو ایک ایسی کتاب جس کی جلد پھٹی ہوئی تھی اور پتہ نہیں تھا کہ کس کی ہے؟ کیسی ہے، اس کو میں ایسے ہی دیکھ رہا تھا تو اس میں ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے سوال کیا کہ اللہ نے یہ جو کہا ہے کہ مجھے ہر روز ایک نیا کام ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ تو وزیر بیچارے کا یہ سن کر رنگ فتح ہو گیا۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ ایک بفتح کے اندر جواب دو، ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔

وزیر روتا ہوا گھر آ گیا۔ بڑا رنجور اور پریشان اور دردمند۔ اس کو سوال کے معانی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک روز وہ بازار میں گیا۔ اس جگہ ایک عمارت بن رہی تھی۔ ایک سیاہ قام مزدور اس زمانے میں وہ عرب افریقہ کا ہو گا، چنانی کے لیے گا راتیار کر رہا تھا۔ اس نے وزیر کو دیکھا اور پوچھا وزیر سلامت آپ کیسے پریشان میٹھے ہیں، کیا بات ہے؟ وزیر نے کہا کہ بادشاہ نے مجھ سے یہ پوچھا ہے اور اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مزدور نے کہا اس کا مطلب میں بتا دیتا ہوں۔ وہ سیاہ قام جو پوچھا بھی پڑھا لکھا نہیں تھا، اس نے کہا لیکن تمہیں نہیں بتاؤں گا، یہ تو بادشاہ سلامت کو ہی بتاؤں گا ان کے سامنے۔ وزیر اسے بادشاہ کے دربار میں لے گیا اور جا کر کہا کہ حضور یہ ایک بندہ ہے، یہ مطلب بتائے گا۔ بادشاہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا، کیونکہ وہ پہنچے پرانے کپڑوں میں خستہ حالت میں تھا۔ مزدور نے کہا، حضور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر روز ایک نئے کام میں داخل ہوتا ہے۔ صحمدن آدمی کو بیمار کر دیتا ہے، بیمار کو صحمدن کر دیتا ہے، غنی کو محاج کر دیتا ہے، محاج کو غنی کر دیتا ہے، پتہ نہیں کل ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنادیتا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اپنا الباس اتار کر اسے پہناؤ۔ آج سے یہ وزیر ہو گا، تم نالائق ہو۔ مزدور نے کہا کہ دیکھا آپ کو آج کیا ہو گیا۔ میں آپ کے حکم کے مطابق ایک بار لباس پہن لیتا ہوں، لیکن اسے اتار کر پھر وزیر کو دوں گا، کیونکہ یہ تو اللہ کے کام ہیں۔

آپ کو زندگی میں عجیب و غریب واقعات پیش آئیں گے۔ میں جلدی سے آپ کو آپ کے دور کی ایک ماڈرن کہانی سناتا ہوں، کیونکہ اس کی آپ کو زیادہ سمجھائے گی۔ ایک لڑکا تھا پیشہ ہیں کوک، وہ گاؤں میں غربت سے دھکے کھارہا تھا۔ مال باپ اس کے تھے نہیں۔ وہ شکا گو میں آ گیا۔ وہاں آ کر اس نے دیکھا کہ اس زمانے میں بھیاں چلتی تھیں، موڑیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ گھوڑے سڑکوں پر لہا سفر کرتے تو بھاگتے ہوئے اکثر مر جاتے تھے۔ کار پوریشن اس وقت انہیں اٹھانے کا ذمہ نہیں لیتی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر میں مرے ہوئے گھوڑے اٹھالیا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تو اس کے لیے آپ کے بڑے شکر گزار ہوں گے۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ گاڑی بنالی اور دن بھر گھومتا۔ جہاں اسے مردہ گھوڑا نظر آتا تھا، وہ اس کو ہاتھ گاڑی میں ڈال لیتا اور سریش فیکٹری، جہاں گھوڑے کے غدوہ اور ہڈیوں سے گودا نکال کر سریش بناتے ہیں، میں جا کر اسے مہنگے بھاؤ پیچ دیتا۔ اس کا خرچ کچھ ہوتا نہیں تھا۔

چلتے چلتے ایک وقت ایسا آیا کہ وہ اتنا امیر ہو گیا کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ اس دولت کا کیا کرے۔ جب اس کے پاس کچھ بیٹن ڈال رجع ہو گئے تو اس نے کہا میں یہ کام چھوڑتا ہوں، لیکن مجھے جیسا کہ گھوڑوں سے ایک طرح کی محبت ہے، اس نے ایک اعلیٰ درجے کا گھوڑوں کا فارم بنایا۔ اس میں

بڑی نسل کے وشیرے اور وشیریاں منگوائے اور ریس کے میدان میں داخل ہو گیا۔ گویا وہ ریس کھیلنے کا اور اس کا سارے امر یکہ میں شہرہ ہو گیا کہ ریس کا جوڑیک اس بندے نے بنایا ہے اور جو اصطبل اس کا ہے اور جو 180 گھوڑے اس نے رکھے ہیں ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ریس کھیلتا رہا۔ جتنی زندگی اس نے ریس کھیلی اور جتنے اعلیٰ درجے کے گھوڑے اس نے بھگائے ان میں ایک بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ گو کہ گھوڑے اعلیٰ نسل کے تھے اور بہت اچھا بھاگتے تھے، لیکن وہ ہر دوڑ میں ہار جاتا تھا اور ہارتا چلا جاتا تھا۔ پھر اس نے بینک سے قرضہ لیا اور اس سے گھاٹ پورے کئے، لیکن اس کا براحال ہو گیا۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔ اب اس کے لیے زندہ رہنا ہی مشکل ہو گیا۔ وہ پھر انہی سڑکوں پر گھونٹنے لگا، جہاں سے اس نے اپنا آغاز کیا تھا۔ وہ مرے ہوئے گھوڑوں سے ارب پتی ہو گیا اور زندہ گھوڑوں سے پھر فقیر ہو گیا۔ تو اللہ جو چاہتا ہے، جو تھیک سمجھتا ہے کرتا ہے، یا جو اس کی مرضی ہوتی ہے وہی کرتا ہے اور ہمارا سرستیم اس کے آگے خم ہے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ پیشہ ہیں کوک اسی سڑک پر کسپہری کے عالم میں مراپڑا ہے، جہاں سے وہ مردہ گھوڑے اٹھایا کرتا تھا، چنانچہ لوگوں نے اسے اٹھایا اور ویسی ہی ہتھ ریڑھی میں اس کوڈال کر لے گئے۔

اب اس پر آپ اپنا کیا فیصلہ دیں گے؟ اسے کیا کہیں گے؟ میں یہ ساری کہانی اس لیے عرض کر رہا تھا کہ آپ کو آسودگی کے ساتھ رہنا ہے، خوشی کے ساتھ رہنا ہے تو اس کا ایک ہی راز ہے کہ اللہ کے کاموں میں آپ دخل نہیں دے سکتے، کیونکہ اللہ پریم ہے۔ وہ جو کرتا اور فرماتا ہے، وہی تھیک اور بہتر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کی تحقیقات اپنی انسانی عقل نے کریں گے تو وہ آپ کے بس کاروگ نہیں۔ میں پرسوں پڑھ رہا تھا، جرمنی کا ایک بہت بڑا کانون مست پیشہ ماہیگر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ملکوں کی اکانومی فیل ہوتی ہے تو اس کی اسے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہم سارے لوگوں نے سر جوڑ کر دیکھا ہے کہ اتنی اعلیٰ درجے کی اکانومی اتنی اوپر جاتی ہے اور جب عروج پر پہنچتی ہے تو خود بخود سڑنا لگنا شروع کر دیتی ہے اور اس کو زوال آ جاتا ہے۔ اعلیٰ درجے کی چڑھی ہوئی بادشاہی، جس کو دیکھ کر انسان حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور کہتا ہے کہ یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ اس بادشاہی کو زوال آ جائے خود بخود اس کے اندر ایسا نظام اور عمل شروع ہو جاتا ہے کہ اسے زوال آ جاتا ہے۔ آپ نے مغلیہ خاندان کی سلطنت کے زوال کا تو پڑھا ہوگا۔ ہم بعد میں نکتے نکلتے ہیں کہ یہ کیوں ایسا ہوا تھا کس لیے ہوا تھا۔ جس طرح سے گیند کو ہوا میں بہت اونچا پھینکتے ہیں اور اونچا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ اونچا گیند خود بخود زمین پر گرتا ہے۔ اسی طرح سے معیشت کا حال ہے۔ اسی طرح سے ساری چیزوں کا حال ہے۔

اللہ کو مانتے ہوئے اس کے احکامات کو تسلیم کرتے ہوئے یہ مان لینا ضروری ہے کہ جو تو نے

فرمایا ہے ٹھیک ہے اور اللہ کے احکامات کو بجالانا تو خوش قسمت لوگوں کے اختیار میں ہے اور ہوتا ایسے ہی ہے جیسے اللہ کرتا ہے۔ لیکن ہم کمزور لوگ ہیں؛ ہم اپنی عقل و دانش کو ضرور اس میں ٹھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں اس میں معافی دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم لاپچی لوگ ہیں۔ ہم کو سکون بھی دیا جائے جو کبھی اس طرح سے نہیں ملتا زیادہ میں میخ نکالنے سے بلکہ اس طرح ملتا ہے جیسے میرا موڑوں کو پسند کرنے والا دوست تھا۔

میرے ایک اور دوست لاہور میں جی پی او کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور کار میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر نفرت کا اظہار کرتے اور کہتے ان کی شکلیں دیکھو! اس کی پکوڑے جیسی ناک ہے اور کتنی اعلیٰ درجے کی کار میں جا رہی ہے۔ میں نے کہا اب کیا کریں؟ کہنے لگا، بس میرے جی میں آتا ہے کہ میں اسے توپ سے اڑا دوں۔ توپ سے اڑانے والی ذہنیت اپنی اپنی جگہ پر ہم سب میں ہے لیکن اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو لامچ کے ساتھ زندہ رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اللہ پر یہ ہے اور جو اس نے چاہا ہے وہ ہو گا اور میں اس کے ان بندوں میں سے ہوں جو اس بات کو مانتا ہوں کہ وہی ہو گا، جو اللہ چاہے گا، لیکن کام کرتے رہنا انسانیت کا شرف ہے وہ میں ضرور کروں گا۔ جیسے بد صورت عورت بھی میک اپ ضرور کرتی ہے تو میں بھی میک اپ کروں گا۔ اے میرے پیارے اللہ تعالیٰ امیں کسی بات کو اس کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا کہ میری دانش، میری عقل اور میری کوشش کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ میں ناچتر ہوں گا اپنا کشکول ہاتھ میں لے کر۔ اگر اس میں کچھ پڑنا ہے تو پڑ جائے، لیکن میں اپنا ناقچ نہیں روکوں گا، جو تیری بارگاہ میں چوبیس گھنٹے ہوتا رہے گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!

اللہ کا فضل

آج کل ہمارے اردوگرد جو باتیں ہڑی شدت سے ہونے لگی ہیں کہ یہ دنیا ہڑی Materialistic ہو گئی ہے، ہم مادی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں، لاچی ہو گئے ہیں اور ہماری توجہ روپے پسے کی طرف زیادہ ہے۔ پہلے شاید ایسا زمانہ نہیں تھا، لیکن میں سوچتا ہوں اور اپنے بچپن کی طرف لوٹنا ہوں اور اس مسئلے پر غور کرتا ہوں؛ تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ہڑی دیر سے ہماری Material اور مادے کے ساتھ دا بستگی چلی آ رہی ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ جو اتنی دا بستگی نہیں ہونی چاہیے تھی، پھر بھی موجود ہے، پتا نہیں کیوں؟

اس دا بستگی کی بیشمار وجوہات ہوں گی، لیکن میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ ہڑا عجیب ہے اور میں اسے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کہ آپ بھی اس پر غور کریں اور سوچیں۔ جب ہم بچپن میں لڑکپن میں جمع کی نماز پڑھنے جاتے تھے تو اپنے ابا جی کے خوف کے باعث جاتے تھے۔ وہ تیار ہو کر کپڑے بدلتا ہمیں بھی نئے صاف کپڑے پہنا کر جمع پڑھانے لے جاتے تھے۔ میڑک تک ہم نے تقریباً ایسا ہی جمع پڑھا ہے، زور زبردستی۔ لیکن جب میں فرست ایر میں آیا اور یہاں آگیا، بڑے شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے تو پھر عجیب بات ہے کہ جمع مجھے اچھا لگنے لگا اور میں اس میں اپنی مرضی ایما اور دل کی خوشی سے داخل ہو گیا اور جمع پڑھتا رہا۔ پڑھائی کا دو ختم ہوا۔ نئی زندگی میں داخل ہوئے میں نے تو کری شروع کر دی۔ پھر بھی جمع کا چلن دیے ہی رہا اور جمع کے بارے میں اللہ کا یہ حکم ہے: اس کا مفہوم میں بیان کرتا ہوں:

”اے مومنو! جب نماز کی اذان دی جائے تو جمع کی طرف دوڑ اور خرید و فروخت بند کر دو اور جب نماز او کر چکو تو پھر دوڑ و پھیل جاؤ اور اپنے اللہ کے فضل کی تلاش شروع کر دو۔“

اس میں اللہ کے فضل کا جو بریکٹوں میں ترجمہ عام طور پر دیا جاتا ہے، وہ یہی ہے کہ تم پھر اپنی روزی کی تلاش کی طرف لگ جاؤ۔ ہم بھی یہی سمجھتے رہے اور اب تک بھی یہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ پچھلے

چند سال کی بات ہے میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی قریب اکثر جمعہ پڑھنے آتے تھے۔ میری ہی عمر کے تھے، لیکن میں نے ان سے بھی کچھ پوچھا ہی نہیں۔ بھی علیک سلیک بھی نہیں ہوئی، لیکن ہم ایک دوسرے کی طرف متناہی طور پر ضرور متوجہ ہوتے تھے۔ ایک دن جب وہ نماز ادا کر چکے اور نکلنے لگے اور ہم جوتے پہن رہے تھے، تو میں نے کہا، صاحب! آپ کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟ اس نے کہا میں سکول پیچر ہوں اور ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ میں نے کہا، میں بھی ریٹائرڈ ہوں۔ جو آدمی ریٹائرڈ ہوتا ہے وہ بہت بے چین ہو جاتا ہے، نبی نوکری تلاش کرنے کے لیے۔ اس میں اتنا خوف پیدا ہو جاتا ہے ریٹائرمنٹ کے قریب کہ وہ گھر کے کام کا نہیں رہتا اور لڑائیاں کرتا ہے اور جلدی فوت ہونے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میرا نوکری کا کام تو ختم ہو گیا، گھروالے بھی اسے بڑا نالائق سمجھتے ہیں کہ یہ خواہ مخواہ ریٹائرڈ ہو کر گھر پہنچ گیا ہے۔

ہم دونوں تقریباً اسی کمیگیری میں تھے۔ میں نے کہا، اب آپ کیا کرتے ہیں؟ اس نے کہا، میں جمعہ کی نماز پڑھ کر پھیل جاتا ہوں اور اللہ کے فضل کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ میں نے کہا، اللہ کے فضل کی تلاش تو یہ ہے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں جمعہ پڑھ کے میں اس زمانے میں ریڈ یو میں ملازم تھا ذور دوڑ رتک تو نہیں پچھلتا تھا، کیونکہ میرا کام لاہور تھی میں ہوتا تھا۔ میں امریکن سفارتخانے کو جمعہ کے دن انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی سے تراجم کر کے دیتا تھا اور معقول معاوضہ حاصل کرتا تھا، پھر انہیں واں آف امریکہ میں پکھر ریکارڈنگز کی ضرورت تھی تو ظاہر ہے کہ میں وہ کام بطریق احسن کرتا رہا۔ میں جمعہ پڑھنے کے بعد اللہ کے فضل کا سہارا لیتا تھا اور جمعہ سے قبل خرید و فروخت بند کر دیتا تھا۔

میں نے اس سے کہا آپ نے کچھ طنہیں کیا ہوا، پہلے سے پتا ہونا چاہیے کہ آپ کو جا کر کیا کرنا ہے۔ آڑھت منڈی جانا، اکبری منڈی یا سورت منڈی میں جا کر کام کرنا ہے۔ انہوں نے کہا میں تو بس فضل کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جب میں نے جمعہ کے حوالے سے یہ قرآنی آیات پڑھیں تو میرے دل پر یہ وارد ہوا کہ اللہ کا فضل خالی روزی ہی نہیں اور رزق خالی کھایا جانے والا ماش کی دال، ححلکے والی، بغیر ححلکے والی، گرم مصالحہ (لوں)، (نمک) مرچ ہی نہیں، اللہ کے فضل کے بڑے رُوپ ہیں۔ اس نے کہا کہ جب میری شادی ہوئی اور میری ماں نے لڑکی کو تلاش کیا تو میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا، کیونکہ پہلے دیکھنے کا اس وقت روانج ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا اماں! کیسی ہے؟ اس نے کہا کہ بس صحیک ہے۔ تھوڑی سی اس میں کسر ہے، ذرا بھٹکنی ہے۔ تم اسے برداشت کرنا کہ یہ اللہ کا رزق ہے اور تمہیں اس میں اللہ کا فضل تلاش کرنا ہے۔ لڑکی کی شکل صورت میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے کہا صحیک ہے، مجھے منظور ہے۔

جب میں نے اپنی بیوی کو دیکھا تو اس کی شکل تقریباً ملکہ نور جہاں سے ملتی تھی۔ بہت

خوبصورت تھی اور اس کی آنکھوں میں کوئی "میرہ ویرہ" (بھینگاپن) بھی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اس سے مجھے بڑا شاک ہوا کہ اماں نے میرے ساتھ اچھا نہ ادا کیا ہے۔ میں نے کہا، اماں وہ تو محیک ٹھاک ہے۔ کہنے لگی، یہ تو تجھ پر اللہ کا فضل ہو گیا اور وہ تیری بیوی نہیں، وہ اللہ کا فضل ہے۔

اب میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ نکل سکتا ہوں۔ اس نے کہا زاراً ورنک آپ پیدل چلیں گے؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ پیدل چلتا رہا، مجھے تو اتنی پریکش نہیں تھی اس لیے میں منہ میں گولی رکھ کے چلتا رہا۔ یہ جو عمران خان کا ہسپتال ہے، ہمارے لاہور میں شوکت خانم یہ کھلی جگہ ہے۔ وہاں قریب ہی بہت ساری جگلیاں ہیں چنگڑوں کی اور ان کے بچے جو ہیں وہ پرانے لفافے اکٹھے کرتے ہیں۔ ہم وہاں پہنچنے تو ان کے چودوں پندرہ سو لے سال کے بڑے اچھے کڑیل قسم کے لڑکے جو لفافے اکٹھے کرنے کا پیشہ کرتے تھے، بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر ہاتھ ہلا کر کہا "آ گئے آ گئے آ گئے" اور خوشی سے نمرے مارے۔ میرے ساتھ جانے والے نے اپنی جیب سے نکال کر سیٹی بجا کی۔ وہ سارے آٹھ لڑکے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا چیز تیار ہے۔ لڑکوں نے کہا نہیک ہے۔ انہوں نے کہا وہیں لگاؤ اور پھر وہاں کرکٹ کا میچ شروع ہو گیا اور یہ امپائر بن کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، یہ کئی مہینوں سے کرکٹ کھیلتے تھے اور ان بیچاروں کو کوئی امپائر نہیں ملتا تھا، تو لڑتے تھے۔ میں جب اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلا تو میں نے دیکھا وہ تو یہاں پڑا ہے۔

وہ بڑے سخت امپائر تھے اور بڑی سختی کے ساتھ فیصلہ دیتے۔ جب انہوں نے ایک لڑکے کو ایں بی ڈبلیو دیا تو میرے اندازے میں وہ غلط تھا، لیکن جب انہوں نے انگلی اٹھائی تو بیش میں وہیں بلا چھوڑ کر چلا گیا۔ انہوں نے ایسے ڈپلن والے بچے تیار کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ جوانہیں کھلانے والا تھا، وہ کسی اور بچ پر کھیل رہا تھا اور وہ بچ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں ہر جمعہ یہاں آ جاتا ہوں۔ میراں کے ساتھ وعدہ ہے اور اس طرح میں اللہ کے فضل کی تلاش میں نکلتا ہوں اور مجھے اس کا فضل کثیر صورت میں نصیب ہوتا ہے۔

اب میں ان سے بڑا شرمندہ ہوا کہ میں تو جا کر ترجیح کرتا تھا اور پیسے کماتا تھا، کیونکہ بریکٹ میں یہیں لکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ جب میں نے آیات کے ترجیح میں پھیل جانا پہلی بار پڑھا تو مجھے اس پھیلنے کا یہی مطلب ملا کہ چلتے جاؤ، چلتے جاؤ۔ سوا شفاق صاحب میں چلتا گیا چلتا گیا اور ریلوے سگنل کے پاس پہنچ گیا، جہاں پر میرے رشتے کی ایک بھانجی رہتی تھی اور وہ بیچارے غریب لوگ تھے۔ تھی تو وہ میری بچا زاد بہن کی بیٹی، لیکن چونکہ وہ امیر نہیں تھے اور ہم نے ان کی جانب توجہ نہیں دی اور کبھی ملے ہی نہیں۔ جب چلتے چلتے اس کا گھر آ گیا تو میں اندر چلا گیا، تو اس نے خوشی سے چینیں ماریں

کہ ”ماما جی آ گئے“، اور اپنی دو بیٹیوں کو بلا لیا کہ یہ میرے ماما جی ہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ لپٹ گئیں اور کہنے لگیں ماما جی! آپ ہمارے پاس آتے کیوں نہیں؟ میں نے کہا میں جمعہ پڑھنے کے بعد اس کے فضل کی تلاش میں نکلا ہوں، تو آج مجھے یہ فضل نصیب ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے اپنی بھانجی کے گھر جا کر پتا چلا کہ میری بھانجی کی بیٹیاں اور وہاں کی پانچ لاکیاں پرائیویٹ کالج سے ایف ایس سی کر رہی تھیں اور کسی بڑے کالج نے انہیں جمعہ کی شام کو پریکٹیکل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ چونکہ سب ایکی ہوتی تھیں اور علاقہ بہت ذور کا تھا تو وہ ذرتی تھیں اور جاتی نہیں تھیں۔ لہذا جب مجھے پتا چلا تو میں ان کا سپاہی بن کر ہر جمعہ انہیں کالج لے بھی جاتا تھا اور لے کر بھی آتا تھا۔ یہ میری ڈیوٹی مجھے اس آیت کی وجہ سے لگی رہی۔ میں خوش رہا۔ میں زندگی میں اتنا خوش بھی نہیں ہوا جتنا کہ اللہ کا فضل ملے کے بعد رہا۔

ایک دن میری بھانجی نے کہا کہ ماما جی! آپ آتے تو رہیں گے یہاں کہ نہیں؟ میں نے کہا میں یہاں ضرور آتا رہوں گا۔ بھانجی نے کہا کہ عقیلہ اور بھیلہ کا بندوبست ہو گیا اور کالج نے کچھ چندہ کے عوض ایک دین کی سہولت دے دی ہے۔ میں نے کہا نہیں پھر بھی آتا رہوں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے ربط کے ساتھ نہیں آ سکوں گا، مجھے کوئی نوکری یعنی اللہ کا فضل تلاش کرنا پڑے گا یہ فضل کی نوکری بڑے مزے کی ہوتی ہے یہ بیٹھے بھائے ہر کسی کو نہیں ملتی۔ کہنے لگے کہ یہ بھی اللہ کی بڑی مہربانی رہی کہ میں بھانجی کو ملنے وہاں جاتا رہا اور مجھے ایک کھوئی ہوئی بھانجی مل گئی۔ بھانجی نے کہا کہ ماما جی! یہاں قریب ہی ایک خاتون ہیں جو معدود رہتی ہیں۔ چلنے پھرنے سے اور اکیلی ہی رہتی ہیں۔ انہیں سودا وغیرہ لانے کا کوئی انتظام نہیں ہے یہ ڈیوٹی ذرا سخت تھی۔ تو میں جمعہ کے بعد ان کے پاس گیا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، لیکن طبیعت کی سخت تھیں۔ کہنے لگے میں نے ان سے کہا کہ جی سودا میں لادیا کروں گا۔ اس خاتون نے پہلے میری شکل غور سے دیکھی اور کہنے لگی، دیکھو! تم مجھے پر مہربانی کرنے آئے ہو، لیکن میں تمہیں پہلے پیسے نہیں دوں گی۔ تم سودا لادیا کرو اور حساب کر دیا کرو تو پھر میں پیسے دوں گی، کیونکہ کئی لوگ دھوکہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں جی، یہ تو میری توہین ہے۔ میں کیوں بے ایمانی کروں گا آپ کے ساتھ۔ میں تو پہلے پیسے لوں گا۔

جب میں اڑ گیا تو خاتون نے میرے چہرے سے بھانپ لیا کہ ما سٹر کریم شرارت کے طور پر ایسا کر رہے ہیں۔ اب اس خاتون نے پتوکی سے پھولوں کے نیچ منگوائے۔ پتوکی جہاں بہت پھول ہوتے ہیں، پتوکی سے ہم پھول ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ یہ بھی حریت کی بات ہے کہ پتوکی جیسا علاقہ خشک بے آب و گیاہ۔ کڑوا پانی۔ وہاں اللہ نے اتنے پھول پیدا کر دیے ہیں کہ ہم وہ ولایت کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ وہ خاتون ہر بار سودے اور چیزوں کا بغور جائزہ لیتی تھیں۔ کبھی کہتی یہ دارچینی

تو اتنے کی نہیں ہوتی، تم تین آنے زیادہ دے آئے ہو یہ سوکھا دھنیا جو بھی کچھ ہوتا تھا، ان کی قیمتوں کا سخت جائزہ لیتی تھیں اور اس سخت طریقے سے بار بار چیک کرتی تھیں اور میں نے کئی دفعہ یہ ارادہ کیا۔ میں اس "فضل" کو چھوڑ دوں، لیکن جب جمع کی اذان ہوتی تو میں ووڑتا ہو انماز کے لیے آتا تھا اور نماز پڑھ لیتا تھا، تو میرے کانوں میں یہ گونجے لگتا تھا کہ "تم پھر اللہ کی زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو" تو میں پھر رہنہیں سکتا تھا اور اس سخت اور کڑوی خاتون کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔

میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے فضل کی ایک ہی شکل نہیں ہے اللہ کا فضل تو وسیع ہے۔ یعنی میری اور آپ کی سانس سے لے کر کبھی کبھی آدمی نا شکرا ہوتا ہے کہ مجھے زندگی میں کیا ملا۔ یہ یہ بیاں ہوتی ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر چڑھاتی ہیں۔ میری پوتی ناراض ہو کر جب دروازے میں چاہی ڈالتی ہے تو وہ کھلتا نہیں پھر چڑھاتی ہے اور کہتی ہے ناما! یہ مجھ سے کیوں نہیں کھلتا ہے؟ بس ذرا سی بات پر رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بیچارا محل رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں کہوں کھل جاسسم تو یہ جھٹ سے کھل جایا کرے۔ میں نے کہا اللہ نے تم کو اتنی نعمتیں دی ہیں۔ کہنے لگی، نہیں نہیں کوئی نعمتیں نہیں دیں۔ میرے پاس کون سی نعمت ہے بتائیں؟ میں نے کہا کہ ہم نے مریض یز لینی ہے یہ نیوونا کرو لا تو فضول چیز ہے۔ میں نے کہا دیکھو یہ اللہ کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ تم کو سب سے قیمتی چیز مفت مل رہی ہے۔ وہ آکیجن ہے۔ دنیا کی بیش قیمتی چیز اگر تمہیں ہر صبح جا کر خریدنی پڑے تو کتنی مشکل ہو۔ قتل و غارت گری ہو، کچھ کنٹروں ہی نہ ہو۔ اللہ جو ہمیں پانی دیتا ہے اور میں پانی کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ یا اللہ تعالیٰ تو نے یہ کیسے بنایا اور ہمارے کتنے کام اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہمارا کام مقام افت چلا جا رہا ہے۔ تو اللہ کے فضل کے بڑے روپ ہیں۔

یہ "زاویہ" پروگرام تو آپ سے ملاقات کا ایک بہانہ ہے۔ میں اسی لیے عرض کرتا ہوں اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے بھی۔ میرے اندر ایک چڑھتی ہے اور میں ایک سخت گیر آدمی ہوں اور ایک انسان میں چک ہوئی چاہیے۔ وہ میرے اندر نہیں ہے اور اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے میں آپ کا سہارا لیتا ہوں کہ اے اشFAQ احمد! اللہ کا فضل تو بڑے مختلف روپ میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے تو بھی غور نہیں کیا کہ جب آپ کرکٹ کا کوئی میچ دیکھنے بنیتے ہیں، تو بڑا فضل بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی Tension میں بتا ہو جاتے ہیں کہ "اوہ" اگر اس کا چھکا لگ جاتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ اچھا شوکت خانم کی جھگیوں کے پاس جواہر کوں کی شیم ہے، وہاں چوکے کے تک کی تو اجازت ہے، چھکے کی نہیں ہے۔ اب دیکھنے امپائر نے کتنی سخت شرط لگائی ہوئی ہے، چھکے کی اجازت اس لیے نہیں ہے کہ چوکے کے باہر اردو گروہیاں شروع ہو جاتی ہیں اور چھکے سے خطرہ ہوتا ہے کہ بال ان کے شیشوں میں جان لگے، لیکن اگر کوئی چوکا چھکے کی اہمیت کا ہوتا امپائر جو پاکستان کا واحد امپائر ہے، جو دونوں ہاتھ کھڑے کر کے چھکے کا

فیصلہ دے دیتا ہے اور اس کے فیصلے کو دونوں ٹیکمیں تسلیم کر لیتی ہیں، کسی کو اعتراض نہیں ہوتا سؤ جناب اللہ کی مہربانیوں کے بڑے رُوپ ہیں۔ اگر ہم سارے تھوڑی اسی لچک پیدا کر کے چڑنا چھوڑ دیں، جتنا بھتنا چھوڑ دیں تو آسانیاں اور اللہ کا فضل حاصل ہو سکتا ہے۔ ذرا ذرا اسی بات پر چڑنا کہ بس لیٹ آتی ہے، دیر ہو جاتی ہے، فلاں کام ہماری مرضی سے نہیں ہوا۔

ایک ناپینا بابا بس سے اتر اور میں نے ہی اسے مدد کر کے اتارا۔ عین اسی وقت جب ناپینا بزرگ کو میں اترنے میں مدد دے رہا تھا، ان کے ساتھ ہی اترنے والے ایک صاحب کے Cell Phone پر فون آگیا۔ انہوں نے کہا ”ہیلو!“ تو ناپینا صاحب نے بھی کہا ”ہیلو!“ اس صاحب نے کہا کیسا حال ہے؟ ناپینا صاحب کہنے لگے اللہ کا شکر ہے۔ وہ صاحب تو اپنی بات کر رہے تھے، لیکن ناپینا صاحب اسے پورا ٹھیک جواب دے رہے تھے۔ وہ صاحب فون پر کہنے لگے کل آپ نہیں آئے؟ ناپینا صاحب کہنے لگے کل آپ نے مجھے کب بلا یا تھا۔ وہ کہنے لگے تم نے وعدہ کیا تھا۔ ناپینا صاحب کہنے لگے نہیں میں نے وعدہ نہیں کیا۔ اب میں درمیان میں کھڑا ہوں اور سوچ رہا ہوں زندگی میں کیسے کیے عجیب و غریب واقعات سامنے آتے ہیں۔ آپ اگر غور سے سفر کریں تو ایسی عجیب و غریب چیزیں ملتی ہیں۔

میں جو آپ سے عرض کرتا ہوں یہ یہیں کہیں وہیں سے اکٹھی کی ہوئی باقیں ہوتی ہیں، لیکن ہم نے چونکہ ایک سخت قسم کا اور سنگ راستہ بنالیا ہوا ہے اور ہم سارے سرگ میں چلنے کے عادی ہیں۔ کھلے راستوں کے عادی نہیں رہے، اس لیے یہ سارے واقعات اور اللہ کے فضل اور حمتیں نظر نہیں آتیں، ورنہ اللہ کا فضل تو مسلسل جاری ہے۔ اب یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ ہماری آنکھیں سلامت ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو فضل کی تلاش میں زیادہ آسانیاں عطا فرمائے اور اتنی آسانیاں عطا فرمائے کہ آپ انہیں تقسیم کریں اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کریں اور انہیں آگے تقسیم کر سکیں۔ اللہ حافظ!

صبر، ڈسپلن اور آزادی کشمیر

ہم گھر میں کل تین بڑے تھے۔ ایک دادا، ایک دادی اور ایک بہو اور ارسلہ۔ اور ارسلہ بڑی بیماری تھی۔ وہ برس کی عمر کی ایک نہایت پیاری خوبصورت سنبھارے بالوں والی بچی۔ اسے شدید بخار تھا اور موسم بھی سرد یوں کا تھا۔ بخار اتر نے کا نام نہیں لیتا تھا اور ڈاکٹروں نے بڑی کوشش کی۔ بڑی انیشی باسیوں دی تھیں، لیکن وہ ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ارسلہ بڑی بے چین تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑی تیز تھی۔ وہ صرف دادا کے ساتھ چمٹ کر ہی تھوڑی دیر آرام کر سکتی تھی۔ میں اس وقت جوان تھا، بھی سانچہ برس عمر کا نہیں ہوا تھا۔ بھی پانچ ماہ کم تھے اور میں ”تگڑا“ تھا۔ ارسلہ کا سب سے بڑا تقاضا یہ تھا کہ وہ میرے سینے کے ساتھ لگ گئی؛ جس طرح چٹان پر کوئی مینڈک چپکا ہوتا ہے۔ میں پیچھے کی طرف جس قدر بھی زاویہ بناسکوں تو نہیں۔ لیکن اگر سیدھا کھڑا ہوتا یا عمود اتو پھر وہ رونے لگتی تھی۔ اتنی دیر تک پیچھے کو جھک کے کھڑے رہنا کافی مشکل تھا۔ لیکن اس کی خوشنودی اور آرام مقصود تھا۔ اتنی سردی میں اس کا پسند اس کی ناک سے اس کے ماتھے سے نکل رہا تھا۔ میرے نیلے کرتے پر اور بڑے سردی کی پڑتال سے اپنی دادی کے پاس جاتی تھی۔ اپنے بستر پر نہیں لیتی تھی۔

کیونکہ وہ اپنی ماں پر اعتماد کرتی تھی نہ اپنی دادی کے پاس جاتی تھی۔ اپنے بستر پر نہیں لیتی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ میں کری پر بیٹھتا ہوں اور مجھے میں وی لگادیں اور اس کی آواز بند کر دیں۔ تصویریں گزرتی رہیں گی میں دیکھتا ہوں گا اور میرا دل لگا رہے گا۔ اس زمانے میں میں وی رات بارہ بجے تک چلنے لگا تھا۔ وہ وقت بھی گزر گیا اور میں اور ارسلہ ایک کرے میں بیٹھے رہے۔ میری بیوی بڑی پریشان تھی اور ارسلہ کی ماں بھی۔ میرا بیٹھا بھی بار بار آتا اور کہتا کہ ابوآپ کو تکلیف ہو رہی ہے، میں نے

کہا مجھے اپنی تکلیف سے زیادہ اس کی تکلیف کا خیال ہے کہ میں اس کی کیسے مدد کروں کہ اس کی تکلیف کسی طرح سے ذرا سی کم ہو جائے اور مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ میں اپنے عہد کا بڑا لائق آدمی تھا۔ لائق پڑھانی لکھانی کے اعتبار سے نہیں، میری بابی بھی تھی کہ میں مشینوں کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ اس عمر میں میں اپنی گاڑی کا تیل گھر پر بدلتا۔ آپ تو تیل تبدیل کر دانے جاتے ہیں، میں گاڑی کے نیچے لیٹ کر بڑے رشیخ سے کھول کر ڈب رکھ کے تیل بدلي کر لیتا تھا۔ میں پرانی نوٹی پھولی سولہ رواز کوٹا نکے نیچے لگا کر پھول کولوکل ریڈ یو سیٹ بنادیتا تھا۔ لا ہور شیشن بجتا تھا اس کے اوپر۔ میں نہایت Sensitive ٹرانسٹرز کو بغیر گلے کپڑے میں پکڑے نائکے لگا دیتا تھا اور تھیک رہتا تھا۔ یہاں میں پریشان تھا کہ کچھ نہیں ہو رہا اور میں کئی دفعہ ایسی کفر کی حالتوں میں سے گزر اکہ یا اللہ یہ کیا ہے؟ ایسا کس لیے ہے؟ اور وہ میری بہت پیاری پوتی تھی اور ہمیں ڈر تھا کہ اگلا بیٹا نہ ہو جائے۔ مجھے کم از کم ڈر تھا۔ ہمارے گھر میں ماشاء اللہ بہت سے بیٹے تھے اور ہمیں آرزو تھی کہ پوتیاں ہوں۔ میں نے کہا اللہ میاں مجھے پوتی سے نواز اور پھر اللہ کی مہربانی ہوئی اور جب ارسلا پیدا ہوئی تو میں نے اس کا نام ارسلار کھا، یعنی ارسال کی ہوئی۔ تو پھر مجھے خیال آیا کہ دیکھ میں کیسی چیز میں ایجاد کر لیتا ہوں۔ مجھے اللہ نے یہ خاص صلاحیت دی ہے۔ میں اب اس کے ساتھ لینا ہوا ہوں اور وہ چھوٹا سا مینڈک میرے بینے کے ساتھ چکا ہوا ہے۔ مجھے طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔ ان میں کچھ ثابت بھی تھے، کچھ منقی بھی۔ اللہ کے شکرانے کے بھی اور ناراضگی کے بھی۔ عجیب و غریب خیالات اور اس کی کیفیت تھیک نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے یاد آیا، جب میں روم میں رہتا تھا اور میں یونیورسٹی جاتا تھا۔ تو صحیح ناشتے میں ہر روز میں ایک چیز سینڈوچ لیتا تھا وہ پانچ روپے کا ملتا تھا اور چائے میں اپنے کمرے میں بنایتا تھا۔ وہاں چائے کا روانج نہیں ہے، کافی پی جاتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ پانچ روپے کا تو بڑا مہنگا ہے۔ اس میں تھوڑا سا CHEESE اور دو سلاس ہوتے ہیں اور وہاں میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ جس سے میں ہر روز سستے بھاؤ ایک سینڈوچ تیار کر سکتا۔ میں نے ایک دن یوں کیا کہ وہاں سے دو سلاس لیے اٹھ آنے کے دو سلاس اور آٹھ آنے بھی کا تقریبی CHEESE کا نکڑا بھی لے لیا اور اپر کمرے میں آ گیا۔ میں تھنڈا کھانے کا عادی نہیں تھا۔ گرم کھانے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ اسے گرم ہونا چاہیے۔ میں نے اس جگہ کے اوپر رکھا، جہاں میں اپنی ٹائی اور سوت استری کیا کرتا تھا۔ میں نے استری گرم کی اور اسے ان سلاسیز کے اوپر رکھا، جس سے بہتر کن چیز سینڈوچ تیار ہو گیا اور اب مجھے وہ ایک روپے کا پڑنے لگا۔ آپ کو بھی بتا دوں کہ استری سے CHEESE سینڈوچ بڑا اچھا بن جاتا ہے۔ جب میں نے یہ بات سوچی تو میں نے کہا، میں ارسلا کی مدد کیوں نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ ہی چونکہ میں ٹیکنیکل چیزوں کے ساتھ بہت وابستہ تھا، جو بھی چیز یعنی سب سے پہلے اس کا مینول مطالعہ کرنا کہ یہ کیا کہتا

ہے۔ اکے مطابق ہی اسے استعمال کرتا تھا۔

لا ہو رہیں سب سے پہلے شیپ ریکارڈر جس میں آواز بھرتے ہیں وہ میں نے ہی خریدا تھا۔ وہ اس وقت یہاں کے سٹوڈیوز میں بھی نہیں تھا۔ اتنا شوق تھا ان چیزوں کا۔ میں سوچ رہا تھا اللہ مجھے معاف کرے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا مینول کیوں نہیں آتا۔ میری آرزو تھی ایک دل کی پکار تھی کہ یا اللہ اس کا بھی کوئی مینول ہو اور میں دیکھوں کہ کہاں خرابی ہے۔ یہاں نا انکال گانا ہے، یہاں نئے سرے سے بیچ کنا ہے اور یہ میرے سامنے بیٹھ کے کھلنے لگے گی، لیکن کوئی مینول ایسا نہیں آتا جو اس کے جسمانی عارضوں کو دور کر سکے۔ ایک مینول آتا ضرور ہے، جو انسان نبی اللہ کی مہربانی سے ہم کو دیتا ہے۔ نبیوں نے بتایا ہے کہ زندگی کیسے بر کرنی ہے۔ ہم کو تو اللہ نے بنادیا بغیر ہمارے پوچھتے ہمیں بنادیا اور جب ہم بن گئے تو پھر ہم نے پوچھا کہ اے کوڑہ گرتونے یہ جو کوڑہ بنایا ہے اس میں ڈالنا کیا ہے ہمیں تو یہ بھی نہیں پتہ۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہارا پر چڑھتے کیب استعمال، نبیوں کے ذریعے دے دیا ہے تو اس کے مطابق کرو جو خوش قسمت ہوتا ہے وہ اس پر چڑھتے کیب استعمال کو استعمال میں لے آتا ہے جو ہمارے جیسا کوتاہ بین ہوتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں اپنے اس مینول کے بارے میں بھی غور کرتا رہا، لیکن پوتی کو کچھ افاق نہ ہوا۔ پھر ایسے ہی دوسری رات آگئی۔ پھر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ علم جو میرے پاس نہیں ہے وہ مجھے عطا کیا جا رہا ہے۔ یا نا انکال نے یا گاڑی کا تیل بد لئے کام نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کسی مینول ہینڈ لنگ سے کوئی تعلق ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ مجھے اور ارسلان دونوں دادا پوتی کو ایک صبر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ صبر کیا ہوتا ہے اور اس کے اندر سے انسان کیسے گزرتا ہے اور گزر سکتا ہے اور اس کیسے گزرنا چاہیے؟ اس میں غصہ بھی آتا ہے، آدمی چڑھتا بھی ہے اور وہ کہتا ہے "Why Me" میری پوتی جب کسی سے چڑھتی ہے تو کہتی ہے دادا "وائی می"۔ میری پوتی نے تیزی بلکہ بہت ساری تیزی کو اپنا لیا ہے۔ لیکن صبر انسان کو ڈسپلن سکھاتا ہے اور یہ کس طرح سے انسان کو ادب کی تعلیم دیتا ہے اور ایک ایسی تزکیب میں سے گزارتا ہے کہ وہ ڈسپلن کی جانب آتا ہے۔

میں آپ اور ہمارا ملک اس لیے پسمند ہے کہ ہم میں ڈسپلن نہیں ہیں۔ ہم منظم نہیں ہیں۔ کیا نام ہے؟ ٹورنٹو ریڈ یوکی بہت خوبصورت آواز۔ ہاں یورپی انڈر یوتا می اتنا وہ نسر ہے۔ وہ مسلمان ہو گیا۔ جب میں کینیڈا میں تھا تو میں نے اس کا ایک کیسٹ سنا۔ وہ بہت حیران ہے۔ کہتا ہے کہ وہ سورۃ روم سن کر مسلمان ہوا ہے۔ جس میں ہے کہ دنیا نے یہ کہا کہ ایران فتح ہو گیا اور ایران فتح بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اللہ کہتا ہے یہ غلط ہے۔ روی ہمارے نہیں فتح یا ب ہوئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ چھوٹن کے بعد ہی پانسہ پلت گیا اور روی فتح یا ب ہو گئے۔ یورپی کے دل پر پھر کچھ ایسی گزری کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ خیر! میں

یوری سے ملنے گیا اور اس سے کہا کہ تم اسلام کو کیسے دیکھتے ہو گے؟ کہنے لگا "The Future of world is Islam it belongs to Islam." میں نے کہا کہ کیسی بات کرتے ہو؟ ہمارے ہاں بھی ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کی کوئی بنیاد کوئی منطق نہیں ہے۔ اس نے کہا ہاں! اس کے پیچھے کوئی منطق نہیں ہے۔ لیکن اس کے پیچھے ایک اور چیز ہے۔ اسلام ایک اور طرح کامنہ ہب ہے۔ تم لوگ اس کو نہیں سمجھو گے۔ تم نے پتا نہیں کیوں یہ مذہب اختیار کر رکھا ہے۔

وہ کہنے لگا، جب امریکہ کے دو ہزار شہرے بالوں والے گورے مسلمان ہو جائیں گے کا لے نہیں، اور ایک ہزار کینیڈین، چھ سو سینٹے نیوین ممالک کے مسلمان ہو جائیں گے، تو پھر ہمارا قافلہ چل نکلے گا اور ہم لوگوں کو بتا دیں گے کہ اسلام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہماری تعداد تو ماشاء اللہ اکیلے ہی چودہ کروڑ ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ Sorry آپ غیر منظم ہیں اور ایسے غیر منظم لوگ اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھاسکتے۔ تب میرا دل ڈکھ سے بھر گیا کہ اتنی بڑی اسلام کی فتح ہو گی۔ بھی ہو گی۔ میں آپ شاید اس وقت ہوں نہ ہوں، لیکن کیا ہم اس میں شریک نہیں ہوں گے؟ میں نے یوری سے کہا، یار! یہ تو ہمارا بہت پیارا دین ہے، تو تم اکیلے ہی کامیاب رہ جاؤ گے۔ دنیاداری میں بھی اور جب یہ وقت آئے گا تم گورے ہی کامیاب رہو گے۔ اس نے کہا، کیا کریں بس اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا حصہ کچھ نہیں؟ کہنے لگا، نہیں! تم پھر ایسے کرنا تم ہاتھ اوپر اٹھانا اور اونچی آواز میں کہنا، I am also muslim تو ہم تم سے کہیں گے، اچھا "خلی بسترا" اٹھا کے پیچھے پیچھے چلتے آؤ، تم سے ہونا تو کچھ نہیں۔ ڈسپلن تم میں نہیں، تم ناج سکتے ہو یا قتل ہو سکتے ہو یا قتل کر سکتے ہو۔

اللہ صبر سکھاتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر محسوس کیا۔ اسلام بڑی ہو گئی ہے اور اب تو ماشاء اللہ وہ اٹھا رہ برس کی ہے۔ وہ نیوکلیئر فرنس کی بڑی اچھی طالبہ ہے اور میں اس سے کہتا ہوں، اللہ کے واسطے یہ نیوکلیئر فرنس نہ پڑھ۔ تمہیں پکڑ دی نہ لیں۔ بہر کیف یہ ایک تیسری بات ہے۔ وہ کہتی ہے، نہیں دادا! یہ مجھے بہت پسند ہے۔ ایک صبر ہوتا ہے جو مجبوری کا ہے کہ کیا جاتا ہے ہاں ٹھیک ہے جی، خیر کوئی گل نہیں اللہ نے کہیا تے فیر صبرا ی کر لینے آں، یہ صبر نہیں ہے یہ تو ڈسپلن نہیں سکھاتا۔

میں اس ڈکھ میں سے گزرتا تھا، پھر اللہ نے فضل کیا اور مجھے یہ بات سمجھ میں آئی۔ میں دفتر آیا ہوا تھا کہ میری بیوی نے شیعیوں کیا کہ اسلام کا بخار اتر گیا ہے اور وہ منشی کے محلوں جو آپ نے اس کے لیے بھاولپور سے منگوائے تھے، ان سے کھلیں رہی ہے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہ آئی کہ اس کا بخار اچانک کیسے اتر گیا۔ میں اس وقت دفتر میں سارا کام چھوڑ کر بھاگا آیا اور حیران رہ گیا کہ یہ کیسے ہوا؟ میں نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ میری وہ ساری باتیں معاف کی جائیں اور یہ خداوند تعالیٰ جو آپ نے درس دیا ہے، میں معلوم نہیں کہ ثابت قدمی سے اس پر قائم رہ سکوں گایا نہیں۔ مجھے اس کا اندازہ ہو گیا ہے۔

اس طرح آج میں دیکھتا ہوں۔ اسی ارسلانی کی طرح میرا ملک بھی خدا نے مجھے ارسال کیا تھا۔ یہ ہماری کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے، ہم نے کچھ بڑے کام نہیں کیے ہیں۔ یہ اس کی مہربانیاں تھیں۔ یہ اللہ کا فضل تھا جو اتنا بڑا ملک اتنے بڑے وسائل کے ساتھ اتنے خوبصورت موسوس والا، ایسے چھلوں، پھولوں والا، نہیں مل گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب جب میں دکھ کی بات آپ سے کرتا ہوں وہ یہ کہ جو میرے سینے سے چمٹی ارسلانی وہ پوری طرح سے اترنہیں سکی ہے اور اس سے زیادہ تکلیف میں مبتلا بچے کی طرح کشمیر بن کر میرے سینے کے ساتھ لپٹی ہے اور کسی آدمی کے پاس ایسا سینہ نہیں ہے جو اس مریض پامال، خوار، پریشان اور دردمند کشمیر کے لیے اپنا سینہ پیش کر سکے اور اس مشکل میں سے گزر سکے۔

آپ یقین نہیں کریں گے کہ کشمیر آج سے دکھوں میں نہیں گھرا۔ یہ بڑے طویل عرصے سے ڈوگرہ راج کے زمانے سے تکلیفیں سہتا چلا آ رہا ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ جس قدر محبت کرنی تھی، وہ ہم کرنہیں سکے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اس کے لیے درمحسوں کیا، لیکن جس طرح سے ایک دکھی دادا، اپنی ارسلان کے لیے محسوس کرتا ہے، یا کرتار ہا ہے۔ ویسے ہم نہیں کر سکے۔ بڑی آرزو یہ ہے کہ سیاستدان اور لیڈر وہ تو ایسی محبت عطا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے کچھ اور کاموں میں لگے رہتے ہیں، لیکن لوگ اگر اجتماعی طور پر اپنی محبت کو جمع کر کے اپنے اپنے گھر بیٹھ کر اپنی اپنی دل بستگی کے ساتھ اس کشمیر کے لیے دعا ہی کریں تو بہت کچھ ممکن ہو جائے۔ ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا۔ ہم نے اپنی اپنی زندگی ساری طویل زندگی میں کسی رات کبھی نوبجے بیٹھ کر خالی اس کشمیر کے لیے دعائیں کی، جہاں پچھلے دس برس میں ایک ہزار نئی قبریں بن پھیلی ہیں، تو اس پر کچھ گز ری ہے ناں! کچھ ہوا ہے!!

ہم جذباتی، روحانی، نفسیاتی اور قلبی اثر یقیناً وال سکتے ہیں اور جب ہم سب مل کر ایسا کریں گے، اپنے خالی لمحات میں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر ہر گھر میں یہ شیلیفون بجے گا کہ کشمیر آزاد ہو گیا ہے اور اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا ہے، جو پھولوں کی صورت میں اس کی ساری واوی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کئی دنوں کا میرے دل پر بوجھ تھا، جو میں نے آج آپ کی خدمت میں بیان کر کے اتار دیا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

بabe، جسم اور خیال کا کلا

یہ سوال میری روح اور میرے ذہن کے ساتھ اکثر مکررا تا ہے؛ جس میں لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ آپ ”بابوں“ کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمیں تو ”بabe“ کوئی ملتے نہیں ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک اچھیٰ اونچی کرسی رکا کر گھر میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی بابا پکڑ کے لا او اور ہماری خدمت میں پیش کرو ایسا تو ہوتا نہیں ہے۔ اس کے لیے تو کچھ مختلف Effort کوشش جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جیسے آپ اور دوسرے کاموں کے لیے کرتے ہیں۔ میں اب لوٹ کر بہت پیچھے کی طرف جا رہا ہوں۔ میری عمر میں پہنچ کر پرانی باتیں زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد آتی ہیں اور کل کیا کھایا تھا، وہ نہیں پتا چلتا۔ مثلاً میں راستے میں سوچتا آرہا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کل کیا کھایا تھا، تو میں لی وی کے دروازے پہنچ کے یاد آیا کہ آلومنز کھائے تھے۔ لیکن زیادہ پرانی باتیں مکمل وضاحت اور تفصیل کے یاد ہیں۔

میرا گاؤں گاؤں نہیں بلکہ ایک قصبہ تھا؛ جس کی آبادی کوئی پہنچ ہزار کے قریب تھی۔ وہاں ہم رہتے تھے، لیکن وہ پہنچ ہزار کا قصبہ جنوری کے مہینے میں دس تاریخ کے بعد تین لاکھ کا قصبہ بن جاتا تھا؛ وہاں ایک میلہ لگتا تھا۔ اسے ہم ”ماڈھی“ کا میلہ کہتے تھے۔ جنوری کی دس بارہ تیرہ چودہ اور پندرہ تاریخ کو ضلع سے پولیس آتی تھی۔ ذور دوسرے تباش تھیز آتے تھے جو اپنی زندگی میں میں نے دیکھے اور ان سے برا فائدہ اٹھایا کہ مجھے ذرا مدد لکھنا آنے لگا۔ وہ تھیز اور طرح کے ہوتے تھے، لیکن ان کے پس منظر میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو پرانے پارسی تھیزروں میں تھا۔ اس میلے میں دو بڑے سرکس آیا کرتے تھے۔ میں چونکہ چھوٹا تھا اور میری عمر پانچ سال تھی، اس وقت سرکس میں زیادہ دھیان دیتا تھا۔ جانوروں کے ساتھ وابستگی ہوتی تھی۔ وہاں ایک رتبائی گرینڈ سرکس بھی آتا تھا۔ ایک رتبائی بنگالی عورت وہ کرتب بھی کرتی تھی اور اس سرکس کی مالک بھی تھی۔ وہ اتنا بڑا جوڑا کر کے اور پلس فور پہن کے پاؤں میں چڑے کے جوتے اور دردی اور ہاتھ میں ہنر پکڑے ہوتی تھی۔ اس سے سارے جانور دیکھتے تھے۔

میں نے کوئی ایسا رنگ ماسٹر اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا جو شیروں کے ساتھ جا کر پاناخ مار کے بات نہ کرے بلکہ وہ موتا "نگا" ان کے منہ پر مارے اور ان سے کام کرائے۔ رتابائی کے سات ہاتھی تھے جو بڑے وزنی تھے۔ میں بڑی بہادری کے ساتھ اس کے سامنے جا کر کھڑا تو ہو گیا، لیکن جب ہاتھی آ گئے کو جھکا تو میں ذر کے مارے پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میرے ساتھ میرے والد صاحب بھی تھے جو ویٹر نزی ڈاکٹر تھے اور ہاتھی کا نپر پیچر لینے آئے تھے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ اس کی سوند پکڑو، لیکن میں ذرا۔ اس پر میرے باپ نے پوچھا کہ تم اس سے ذرے کیوں؟ میں نے ان سے کہا کہ میں ذرا اس لیے ہوں ابو کہ یہ ہاتھی جس "کلے" کے ساتھ باندھا گیا ہے، وہ بڑا کمزور ہے اور میرا خیال ہے کہ زمین میں فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ گہر انہیں ہے۔ یہ اگر زور دے تو یہ اسے اکھاڑا پھیکھے گا۔ میرے والد نے کہا یہ ایسا کرنہیں سکتا، کیونکہ یہ "کلے" کے ساتھ نہیں بندھا ہوا، یہ اس خیال کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ "کلا" مضبوط ہے۔ اگر یہ اپنے خیال میں تبدیلی لائے تو پھر البتہ یہ ضرور کلے کو اکھاڑے گا۔

میں نے کہا ابو سے اب یہ خیال کیوں نہیں آتا تو انہوں نے کہا کہ جب یہ چھوٹا تھا تو اسے اس "کلے" کے ساتھ باندھا گیا۔ اس نے اپنا پورا زور لگایا، پوری طاقت آزمائی تھی، لیکن یہ اسے اکھاڑا نہیں سکا تھا۔ اس جدو جہد میں اس کے تفریبا پانچ چھ سات ماہ گزرے، پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ میری طاقت سے اکھڑنہیں سکتا اور اب وہ اسی خیال اور اندازے پر قائم ہے۔ تاہم وہ بات جب کی تھی اور اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کے بعد یہ تصور میرے ذہن میں ابھرنے لگا ہے کہ ہم خیال سے کس قدر بند ہے ہوئے ہیں اور مائنڈ میسر یعنی جسم کے اوپر کتنی حکمرانی کر رہا ہے۔ اگر مائنڈ طاقتور ہو تو آپ کا جسم آپ کی مرضی کے مطابق عمل کرنے لگے گا۔ لیکن آپ کہتے ہیں میں سگریٹ چھوڑنہیں سکتا۔ سگریٹ چھوڑنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ایک خیال نے آپ کو اس بات کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔ میں اپنی نواسی سے کہہ رہا تھا کہ "تون لڑایا کراپنی سکنال" (آپ اپنی ساس سے نہ لڑا کرو) کہنے لگی، نہیں میں ساس کے ساتھ لڑنے سے رہنہیں سکتی۔ نانا میرا خیال یہ ہے کہ بس یہ بڑی کمینی عورت ہے۔ میں نے کہا، تو اپنے خیال کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ ساس کے ساتھ بندھ کے دیکھ بڑا امزہ آئے گا۔ اس نے کہا کہ دفعہ ذور میں نہیں بندھتی! زندگی میں اور جتنے مسائل میں وہ ایسے ہی ہیں۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ امریکہ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہیلین کیلے تھا۔ وہ مادرزاد اندھی تھی اور مادرزاد بہری بھی تھی اور اس طرح پیدا شئی گونگی بھی، لیکن وہ ایک صحیت مند لڑکی کی طرح پرورش پار ہی تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب کیس تھا۔ اس نے یہ تہیہ کیا کہ میں تعلیم حاصل کروں

گی۔ اس نے اپنے آپ کو اپنی ذات کو اس ”کلے“ کے ساتھ نہیں باندھا۔ وہ اب نہ کچھ بیان کر سکتی تھی کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں نہ دیکھ کے ہتا سکتی ہے کہ وہ کیا کرنے کی آرزو رکھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ طلب پیدا ہوئی اور یہ طلب اتنی شدید ہوئی کہ اس کی ایک سیلی کی خالہ تھی۔ اس کا باز واں نے کچڑ کر اس طرح سے دبایا کہ اس خالہ نے محسوس کیا کہ یہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے بڑی مدت کے بعد زور لگا کر ایک Language (زبان) Ship کا الفاظ آیا۔ لیکن اس لڑکی کو شپ یا جہاز کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کی استاد نے کہا کہ شپ سمندر میں چلتا ہے۔ اب اسے سمندر کا بھی کوئی پہنچنیں تھا۔ لیکن اس لڑکی نے کہا کہ وہ علم ضرور حاصل کرے گی اور اس کا خیال اس پر حاوی نہیں ہوگا اور میں خیال کو خود پر حاوی ہونے نہیں دوں گی۔ چنانچہ اس لڑکی نے سارا وقت اور ساری توجہ اپنے ذہن کے ساتھ جدوجہد کرنے میں گزار دی اور اپنے ماسنڈ کو حکم دیا کہ میرے بدن پر اپنے آپ کو اپلانی کر۔ مجھے وہ علم عطا کر جو دوسرے لوگ اپنی جسمانی ساخت پوری ہونے کے سبب حاصل کرتے ہیں اور اس نے یہ کیا اور پائچ کرتا ہیں اس نے نکھیں۔

وہ یہاں لاہور بھی آئی تھی پاکستان بننے کے بعد اور ہم بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے گئے تھے۔ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اپنے استادوں کے مخصوص طریقے سے سوالات کے کھٹ کھٹ کر کے مخصوص انداز میں جواب دیتی تھی۔ وہ اپنی آنوبائی گرافی میں ایک کمال کی بات لکھتی ہے کہ دیکھو میں بہت خوش ہوں کہ میرے خدا نے میرے اوپر بڑا کرم کیا ہے۔ اگر یہ ساری چیزیں یہ ساری نعمتیں اندھے ہونا، بہرے ہونا، گونگے ہونا مجھے نہ ملی ہوتیں تو میں دنیا کی ایک نامور عورت نہ ہوتی، بلکہ ایک معمولی سی گھریلو عورت ہوتی۔

اللہ کی نعمت کے کیا کیا روپ ہیں، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور شabaash ہے اس بی بی پر جس نے اسے نعمت کہہ کر پکارا۔ جب آپ کو کوئی خیال پکڑ لیتا ہے اور آپ اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو معاملہ گڑ بڑ ہوتا ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ بھی کبھی بینہ کر جب وقت مل تو ضرور غور کیا کیجئے کہ آیا مجھ کو کسی ”کلے“ یا ”سنگل“ نے پکڑا ہوا ہے یا کسی خیال نے پکڑا ہوا ہے۔ جب یہ بات آپ کے ذہن میں آجائے گی، آپ بڑی آسانی سے اپنا مسئلہ خود حل کر لیں گے۔ خیال کی طاقت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد میں کالج میں ایم اے کے چوتھے سال میں پڑھتا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس سال آدمی بڑا لائق فائدہ اور ذہن ہوتا ہے۔ اس جیسا دنیا میں اور کوئی ہوتا ہی نہیں اور ہم یہی سمجھتے تھے۔ میرے والد اور میرے ماں میں کو خاص طور پر میرے ماں میں کو اس بات کی بڑی خواہش تھی کہ میں نماز پڑھا کروں۔ چنانچہ وہ دونوں بیچارے اپنے طریقے سے کوشش کرتے تھے۔ لیکن میں اپنے خیال

میں اتنا پڑھا لکھا تھا کہ میں باقاعدہ دلائل دیتا تھا کہ نماز میں کیا رکھا ہے۔ اللہ کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جیسے پڑھے لکھے لوگ کہا کرتے ہیں۔

وہ کچھ کہتے نہیں تھے۔ وہ مجھے پکڑ کر ایک مولوی صاحب کے پاس لے گئے، جو ہمارے شہر لاہور میں نیلا گنبد کی مسجد کے علاقے میں تھے۔ وہ مولوی صاحب وہاں بیٹھے پکھر دے رہے تھے اور ان کے پاس تین پہلوں کی چیز تھی۔ وہ چل نہیں سکتے تھے۔ ان کی ایک ناگ پر بڑی خوفناک یہماری کا حملہ تھا، جسے ”غمبیر“ وغیرہ کہتے ہیں۔ میرے والد نے کہا کہ جی! یہ میرا بیٹا ہے۔ وہ کہتے لگئے ماشاء اللہ بڑا اچھا ہے۔ لاائق، ذہین، خوبصورت اور فتنیں لڑ کا ہے۔ میرے والد صاحب نے ان سے مجھے کچھ سمجھانے کا کہا، تو وہ کہنے لگے، نہیں پھر کسی دن آپ لوگ آئیں گے تو تلقین کریں گے۔ آج موقع نہیں ہے اور تلقین زیادہ کرنی بھی نہیں چاہیے۔ یہ آتا رہے ملتا ملاتا رہے۔ مجھے ان کی شخصیت نے بڑا متأثر کیا، لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی نوجوانوں کے پاس کہاں وقت ہوتا ہے ایسے کام کرنے کا شرافت کا یا عبادت کا۔

میں نے کالج میں اپنے دوستوں کو بتایا تو انہوں نے کہا، نا، نا، خبردار! اس چکر میں نہ پھنس جانا۔ ہمیں دنیا بنانی ہے، ترقی کرنی ہے۔ ایک ہمارا ساتھی مولوی سے پڑھتا تھا۔ اس نے فوراً ایک آیت قرآنی کا ترجمہ پڑھا، ”کوشش کرو دنیا کی طرف۔“ خیر وقت گزر تارہا اور میں کبھی کبھی مولوی صاحب کے پاس جا کر ملتا رہا۔ ان مولوی صاحب کا نام تھا مفتی محمد حسن۔ وہ بڑے جید عالم تھے۔ انہوں نے بڑے اوپنچے اوپنچے کام کیے تھے۔ آپ نے فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ دیکھا ہوگا۔ اس کی بنیاد مفتی محمد حسن نے ہی رکھی تھی اور ان کی ہی نگرانی میں اتنی بڑی یونیورسٹی بنی۔ ان کے جو مرید ہیں تھے اور ان کے جو چاہنے والے تھے جن میں میرے ماموں بھی شامل تھے۔ مولوی صاحب بار بار ان سے کہتے تھے کہ یہ ناگ اب ٹھیک نہیں ہوگی۔ کافی پڑے گی۔ اس سے ان کے چاہنے والوں کو بڑی تکلیف تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب سے ناگ کاٹنے پر بہت زور دیا اور کہا کہ اگر ڈاکٹر ناگ کاٹنے کا کہتے ہیں، تو پھر اس میں کیا مضافاً تقدیم ہے۔ میں آپ کو ناگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا واقعہ بتا رہا ہوں۔ اس زمانے کے بہت اعلیٰ درجے کے سرجن کریل امیر الدین ہوا کرتے تھے۔ وہ بڑے نامی گرامی سرجن تھے۔ انہوں نے بھی ناگ کے کاٹنے کی ہی رائے دی۔

آخر کار ناگ کاٹنے کا وقت مقرر ہو گیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر لوگ کرتے ہیں۔ صحیح کے وقت ان کی ناگ کاٹی جانی تھی اور اس سرجری میں ڈاکٹر کریل عطاء اللہ، ڈاکٹر ریاض قدیر اور کریل امیر الدین نے حصہ لینا تھا۔ سب بڑی محبت اور پیار اور عقیدت اور تپاک کے ساتھ مفتی صاحب کو لے کر آئے۔ اب ایک لاائق بے ہوش کرنے والا Anaesthetist چاہیے تھا، جو بالکل ہم وقت مستعد رہے تاکہ اس عمر

کے شخص کی زندگی کو کوئی خدشہ یا اخطرہ نہ ہو۔ اب Anaesthesia کو بلا یا گیا، انہوں نے کہا مفتی صاحب آپ کو تھوڑی سی تکلیف ہو گی، کیونکہ ایک انجکشن دینا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ یہ کیوں دیتے ہو تو انہوں نے کہا کہ جی اتنا بڑا کام کرنا ہے تو اس وجہ سے بے ہوش مقصود تھی۔ مفتی صاحب نے کہا کہ آپ مجھے بے ہوش کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جی! آخر تنگ کاٹنی ہے۔ اس میں چاقو، چھری اور آری کی بھی ضرورت پڑے گی۔ مفتی صاحب کہنے لگے، ڈاکٹر صاحب! آپ ایسا کریں کہ آپ مجھ کو ایسے ہی چھوڑ دیں اور Anaesthesia وغیرہ نہ دیں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ یہ خل انداز ہو گا میرے ذہن پر اور میں اپنا ذہن سوائے اللہ کے اور کسی کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ تو آپ اپنا کام کریں، میں اپنا کام کرتا ہوں۔

انہوں نے کہا، سرا آپ اپنا کام کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا، جو بھی میرا کام ہوا کروں گا اور منہ پر کپڑا لے کر لیتے گے۔ اب ناگُ کٹ رہی تھی اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر جلدی ناگ کے لگا رہے تھے اور کرنل عطاء اللہ وہ نبض پکڑے بیٹھے ہوئے تھے تاکہ پتا چلتا رہے کہ ان کا بلڈ پریشر کہاں چلا گیا ہے۔ کام ختم ہوا اور جب پی باندھ دی گئی اور تینوں ڈاکٹر جیران پریشان کھڑے ہو گئے تو پھر مفتی صاحب نے ان سے پوچھا، ”میاں ہو گیا کام؟“، انہوں نے کہا، جی ہو گیا۔ تب مفتی صاحب نے کہا، ”بہت بہت شکریہ! میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔“ جو شخص اپنے خیال پر حاوی ہو جائے اور خیال اس کے تصور میں گرفت میں آجائے اور انسان یہ جان لے کہ over matter کیسے درک کرتا ہے تو یہ ساری مشکلات جو روزہ روزہ زکوٰۃ یہ تو عبادات میں آجائی ہیں اور ہم ہاتھی جتنا ڈیل ڈول لے کر اپنے ”کلے“ سے ڈرتے رہتے ہیں جو ایک فٹ کا بھی نہیں ہوتا اور ساری مشکلات پیٹ کے ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے لیے علم کا اور غصہ کرنے کا، ”تفکر کا“ فکر کرنے کا بڑا حکم آیا ہے کہ غور کریں، اب تفکر کرنے کے طریقے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ یہ تو عبادات میں آجائی ہیں۔ تفکر کرنے کے لیے آپ کو الگ سے جیسا کہ اللہ چاہتا ہے کہ جب نماز میں ادا کر چکو تو تب میرا ذکر کرو۔ دیکھنے ناکہ ذکر سے مفتی محمد محسن کہاں پہنچ گئے اور کیسے انہوں نے تقویت حاصل کر لی کہ میڈیکل ہسٹری میں یہ بات درج ہو کر رہ گئی۔

اگر آپ اور ہم سب اس باریکی کو سمجھنے لگیں کہ ماں نڈ کے اوپر جسم کا اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا ماں نڈ کا اپنا ہوتا ہے تو پھر آپ ان مشکلات سے خود بخوبی نکل آئیں گے۔ آپ کو کسی بابے کی، کسی پیر کی، کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!

چیزوں کی کشش اور ترک دنیا

ہمارے ہاں ڈینفس کا لوٹی بہت خوبصورت کالوٹی ہے اور اس میں بڑے شاندار گھر ہیں، جو دید کے قابل ہیں۔ ایک روز ہم وہاں بیٹھے تھے۔ ایک نہایت خوبصورت گھر میں۔ ایک نہایت اعلیٰ درجے کے فانوس کے نیچے۔ وہ سامان و اسباب سے بھرا ہوا گھر ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے اچانک خیال آیا کہ ہوائی جہازوں کی ایجاد کا ایک سو سال پورا ہو گیا ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی زندگی میں داخل ہوئے تو اس کا جشن منایا گیا۔ اس جوالے سے ہم نے اخباروں میں بھی پڑھائی وہی پر بھی دیکھا اور ان گزرے سو برسوں پر ہم اپنے اپنے بیان دے رہے ہیں۔ میں برسوں سے ہوائی سفر کا مسافر ہوں۔ کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ بہت خفیہ بات ہے اور آپ تک ہی رہنی چاہیے کہ 1947ء میں جب پاکستان بنا اس کے تین ماہ بعد اگست، ستمبر، اکتوبر اور نومبر میں لا ہور میں ایک بہت بڑا ریلو جی پناہ گزین یکم پ تھا۔ میں وہاں پر ہیڈلکر کے طور پر ملازم ہو گیا۔ کہیں نوکری ملتی نہیں تھی۔

تفصیل کے بعد بھارت سے بڑی بے چینی کے عالم میں آئے تھے۔ میں اس وقت بی اے کر چکا تھا۔ ایسپلاسمنٹ ایکچیخ کا دفتر وہ نوکری نہیں دیتا تھا۔ میں وہاں پر جا کر کہتا کہ جی میں بی اے پاس ہوں۔ وہ کہتے ہم اس کا کیا کریں؟ پھر میں نے ایک ٹرک کیا اور وہاں جا کر کہتا کہ جی میں میٹرک پاس ہوں فرست ڈویژن میں تو انہوں نے کہا کہ بسم اللہ اور فوری مجھے نوکری مل گئی۔ ایک آدھ مہینہ کام کیا، پھر نہر و اور لیاقت علی خان پیکٹ کے مطابق یہ طے پایا کہ جو یہاں کے سکھ اور ہندو شرمنار تھی (پناہ گزین) ہیں، وہ بذریعہ ہوائی جہاز بھارت جائیں گے، انہیں لانے کے لیے۔ ہندوستان سے ہوائی جہاز آتے تھے۔ ہمارے پاس تو تھا کوئی نہیں۔ وہ جہاز وہاں سے مسلمان پناہ گزینوں کو بھی لے کر آئیں گے، خالی نہیں آئیں گے۔ یہاں مسلمانوں کو اتار دیں گے اور پھر راولپنڈی سے پشاور سے لا ہور اور ملتان سے اپنے مطلوبہ مسافر بھر کر لے جائیں گے۔

اس زمانے میں سول ایوی ایشن کا ادارہ تھا اور اعوان صاحب اس کے انجام رکھتے تھے۔ والش

ایئرپورٹ پر ان کا دفتر تھا اور وہ پرمٹ ایشون کرتے تھے کہ جو جہاز بھارت سے آیا ہے اس میں واقعی مسلمان پناہ گزیں آئے۔ یہاں پر خالی ہوا اور اب یہ آگے جا رہا ہے۔ پھر لا ہو آئے گا اور پھر اسی طرح واپس جائے گا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ انہوں نے سارے والٹن کمپ میں اپنے ادھرا وھر دیکھا، انہیں میں بڑا سمارٹ ساکلر نظر آیا۔ کہنے لگے میاں! تم نے میٹر کی ہوئی ہے۔ بڑے پڑھے لکھے ہو۔ وہ مجھے سوی ایوی ایشن میں لے گئے اور میری سروز ایوی ایشن کے لیے مستعار لے لیں۔ وہاں میری کرسی لگادی چھاؤں میں اور کہا کہ تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ میں بہت محنت سے وہ کام کرتا رہا اور پرمٹ ایشون کرنے لگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ خدا کلر کو اتنی عزت دے تو اس کا دماغ کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ونگ کمانڈر اعوان صاحب نے مجھے بتا دیا کہ یہاں جہاز کا نمبر بھروسہ یہاں یہ کرو وہ کرو اور پھر پرمٹ ایشون کرو۔ اب میرے پاس میں پچیس تیس پرمٹ ہیں۔ یہ پرمٹ کیا ہیں گویا کلاشنکوفیں ہیں۔ اس وقت کینیڈین اور انگریز پائلٹ آتے تھے اور میں انہیں پرمٹ ایشون کرتا تھا۔ دو تین دن تو میں نے دیکھا، پھر میں نے کہا کہ یہ تو میرے مطیع ہیں۔ میں انہیں ایسے کیسے جانے دوں۔ ایک کینیڈین سے کہا کہ پناہ گزیوں کو یہاں ڈرال کر دیا ہے اور جہاز خالی جا رہا ہے، تو میں تمہارے ساتھ راولپنڈی چلوں گا۔ یہ میری پہلی فلاست تھی۔ اس نے کہا: ”لیں سر!“ اس کی جان تو میری مسحی میں تھی۔ اس نے مجھے اعلیٰ درجے کی سیٹ دے دی اور کھانے پینے کی چیزوں بھی۔ اس طرح میں آتا رہا جاتا رہا اور ظلم جو ہوا، جس کی میں معافی مانگتا ہوں کہ میرے وہاں جانے میں اور آنے میں واپسی پر چار چار جہاز لیندہ ہو کر کھڑے تھے۔ انہیں چونکہ پرمٹ نہیں ملا تھا وہ کیسے فلاٹی کرتے۔ تو کلر بادشاہ جو ہوتا ہے اور اس کی جو طاقت ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں۔

میں نے عام طور پر جب بھی ہوائی سفر کیا، اس میں اللہ کی مہربانی میرے ساتھ یہ رہی کہ پتا نہیں کیوں میں منزل مقصود پر خیر و عافیت سے پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اکثر ویژٹر میرا سامان نہیں پہنچتا تھا، یہ 1950ء میں روم سے میدرڈ گیا۔ میدرڈ پہنچا اور وہاں اترات تو انہوں نے کہا کہ پتا نہیں آپ کا سوت کیس کہاں رہ گیا۔ بہر حال ہم اسے ٹریس کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں تو فلاں ہوٹل میں ہوں، مل جائے تو پہنچا دیجئے گا۔ اب میں ہوٹل میں تین کپڑوں میں بیٹھا ہوں۔ ایسے ہی تین کپڑوں میں جیسے خواتین کہتی ہیں کہ میرے خاوند نے مجھے تین کپڑوں میں گھر سے نکال دیا ہے۔ اسی طرح میرے ہوائی جہاز نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

اس وقت میرے پاس ایک پتلون تھی۔ ایکر لک کی۔ وہ نئی نئی چلی تھی جیسے پیاز کا چھلکا ہوتا ہے۔ بہت پتلی شاید آپ کو یاد ہو۔ وہ کھنا کھٹ دھل جاتی تھی اور استری کرنے کی ضرورت بھی نہیں

پر تی تھی اور ایک شرٹ اور ایک بنیان تھی۔ کل تین کپڑے تھے۔ رات کو تو میں زیر جامدہ ہی میں سو گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ صبح اٹھ کر وہ کپڑے پہن لیے اور میدرڈ کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ شام کو ہوٹل آ کر لیٹ گیا۔ دوسرے دن وہ کپڑے خراب ہونے کی فکر لاحق ہوئی۔ سنک میں ڈال کر پہلے پتلوں کو دھویا، پھر شرٹ پھر بنیان کو دھو کر وہاں لٹکا دیا اور سوتے وقت یہ دعا کی کہ یا اللہ! یہ صبح اٹھنے تک سوکھ جائیں۔ تین دن اسی طرح گزرے۔ مجھے اصل میں قرطبه جانا تھا۔ وہاں میدرڈ سے لا ری جو پرانی وضع کی تھی، قرطبه جاتی تھی۔ لا ری کے اندر ہی انہوں نے بکرے ذبیحہ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس لا ری میں سفر کیا۔ قرطبه پہنچنے تو میں نے کہا کہ یا اللہ! جو میں پہنچنے ہوئے ہوں اب مجھے قرطبه میں دنیا کی عظیم ترین مسجد میں جانا ہے۔ کچھ اور طرح کی کچپی بھی طاری تھی اور میرے پاس صاف کپڑے بھی نہیں۔ وہاں نہا بھی نہیں سکتا تھا۔ مسجد موجود ہے اور میں وہاں پر نماز ادا نہیں کر سکتا۔ حکم ہی نہیں اس کا۔ یہ ساری تکالیف میرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں، لیکن ایک بات کا مجھے احساس ہوا جواب تک ہے وہ یہ کہ اگر انسان کے پاس چیزیں اور سامان نہ بھی ہو تو بھی زندگی گزر سکتی ہے اور وہ سات دن میں نے اس خوشی میں اور اس سکون و آرام میں گزارے کہ نہ مجھے کسی چیز کے چوری ہونے کا خوف نہ مجھے اس بات کی پرواکہ کچھ میرے اوپر کیا گزرے گی۔ اتنے آسودگی کے دن کسی بہت بڑے صوفی نے تو گزارے ہوں گے۔ میری زندگی میں بس وہ سات آنحضرت ہی تھے۔

میں لوٹ کر روم آیا تو ہوٹل میں میرا سوت کیس پہلے سے آیا ہوا تھا۔ میں پھر انہی لوازمات میں غرق ہو گیا جن میں ہم سب غرق ہیں۔ ہمیں ان چیزوں نے پکڑا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ممتاز مفتی صاحب نے یوں لکھا ہے: ” حاجی لوگ جو حج کرنے جاتے ہیں، وہ بیچارے چیزوں کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی جان عذاب میں ہوتی ہے۔“ اور ہم پاکستان کے لوگ اپنی چیزوں کے ساتھ خواتین خاص طور پر اتنی مسلک ہو جاتی ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے لوگ جن کی میں تعریف تو نہیں کیا کرتا، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ عام روزمرہ کی چند چیزیں رکھتے ہیں اور باقی نہ ان کی کوئی کوٹھیاں ہیں نہ مریعے ہیں نہ سامان نہ کچھ۔ میں امریکہ میں ایک ”روزی“ کھرے سے قیمتی اور بالکل صحیح حالت میں لیپٹاپ لایا تھا۔ امریکہ میں ہمارا بھی کام تھا کہ صحیح سورے روڑی پر چلے جاتے تھے۔ ایک انتہائی اعلیٰ درجے کا صوفہ وہاں پڑا تھا، لیکن میں کیا کرتا۔ دیکھ دیکھ کر ڈکھی ہوتا تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر جھولے لے کر آ جاتا تھا۔ لیکن لیپٹاپ میں اٹھا لایا۔ بالکل چلتا ہوا۔ نیا ماڈل آنے پر کسی نے پھینک دیا ہوگا۔ ہم ابھی تک چیزوں کے ساتھ بہت بری طرح سے وابستہ ہیں اور آگے پیچھے ہمارے چیزیں ہی چیزیں ہیں جو جان کا عذاب بنی ہوئی ہیں۔ میں نے جو چند روز بغیر چیزوں کے گزارے وہ میرے کمال کے دن تھے۔

جب میں اس کوٹھی میں بیٹھا ہوا تھا، جس کا میں نے ابتداء میں ذکر کیا تھا اور جو بہت خوبصورت تھی اور کمرے میں ایک اعلیٰ درجے کا فانوس لٹک رہا تھا، جس کے نیچے ایک نوجوان لڑکا اپنے اوپریوں کی تیاری کر رہا تھا اور اس کا ٹینور سے پڑھار رہا تھا، تو ماں لک مکان داخل ہوا۔ اس نے آ کر کہا، دیکھا اشفاق صاحب! (اس نے چیزوں سے بھرے کمرے کے بارے میں کہا) کیا کمرہ اور اس کی سجاوٹ پسند آئی؟ میں نے کہا، جی سجان اللہ ایسی چیزیں تو آدمی خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔ وہ ماشر سے کہنے لگا، آپ بھی اپنا بوریا بستر انداختا کر اس کمرے میں آگئے ہیں۔ اس نے کہا، جی! یہاں روشنی بہت اچھی ہے۔ پڑھانے میں آسانی رہتی ہے۔ میرے دوست نے کہا، وہ تو نحیک ہے لیکن آپ یہاں بغیر میری اجازت کے آگئے ہیں۔ یہ اتنا اعلیٰ درجے کا فانوس ہے اور ایسی خوبصورت روشنی جو جملی کی طرح ہے یہ ان کے الفاظ تھے ہمارے اشفاق صاحب بھی اس کی گواہی دے رہے ہیں۔

اس نے کہا، ماشر صاحب! یہ ساری روشنی جو آپ کے لیے ہے یہ صرف ایک سمیٹر کے لیے ہے، پھر تو آپ نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ جتنا انبوارے کرنا ہے کر لیں۔ وہ استاد تھا تو غریب سا آدمی مگر اس نے کہا، صاحب! یہ آپ بالکل نحیک فرمائے ہے ہیں۔ یہ ایک ہی سمیٹر کے لیے ہے، پھر تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔ مگر آپ کے لیے بھی یہ سامان زیادہ سے زیادہ چند سمیٹروں کے لیے ہے۔ آپ کے دو ہو جائیں گے، تین ہو جائیں گے۔ ہم دونوں بھی اسی طرح دراصل ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے ہیں۔ اس کی بات مالک کو بری لگی، لیکن بات تھی اتنی مل کر مالک کہنے لگے، کوئی بات نہیں آپ آرام سے بیٹھیں۔ اتنے ناراض نہ ہوں۔

توجہ تاب! یہ چیزیں انسان کو ایسا پکڑتی ہیں اور ان میں یہ بڑا کمال ہے کہ آدمی انہیں جتنا بھی جھکٹے، جس طرح سے "گوکھڑا" کے کھیت میں سے "پکھڑا" کپڑوں کے ساتھ چھٹ جاتا ہے۔ آدمی اسے فوری نہیں جانتا، لیکن بعد میں یہ آپ کو تجھ کرتا ہے۔ آدمی طبعی طور پر بہت اچھا ہوتا ہے۔ بڑے پیارے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ ان سے مل کر دیکھیں، لیکن ان کے اوپر چیزوں اور دکھاوے کا اتنا بوجھ پڑ جاتا ہے، جیسے خالی کنسرٹ "چبا" ہو جاتا ہے۔ وہ "چبے" ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگوں پر نگاہ ڈالیں وہ لوگ جو طبعاً بہت اچھے ہوتے ہیں، مزاجاً بھی اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن دکھاوے نے ان کے اوپر بڑا بوجھ ڈال رکھا ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ اچھی اور قیمتی دلکش خوبصورت چیزوں کا ہی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایک اور طرح کی چیزیں بھی اپنا بخضہ جمالیتی ہیں۔

جب ہم نور والے ذیرے پر ہوتے تھے تو ہمارے بابا جی کے پاس ایک نوجوان آیا۔ بڑا اچھا پڑھا لکھا۔ اس نے کہا، جی! میں نے دنیا ترک کر دی ہے اور میں نے رہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور میں ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟ میں وہاں بیٹھا تھا۔ نوجوانی کے

زمانے میں اتنی تیز نہیں ہوتی کہ بزرگ یا جس کو مخاطب کیا گیا ہے، وہی جواب دے اور وہی جانتے ہیں کیونکہ علم والے ہوتے ہیں۔ بس میں بھی بول پڑا۔ میں نے کہا، تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم تو جوان ہو۔ کچھ کرنا چاہیے۔ ہمت سے جدوجہد سے کوشش سے یہ تم کیا کر رہے ہو، تمہیں پتا ہے تمہارے اسلام میں دنیا ترک کرنے کی اجازت ہی نہیں اور تم ترک دنیا کر رہے ہو۔ کتنی بڑی بات ہے۔

میری ساری گرم جوشی دیکھ کر بابا جی مسکرائے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، بسم اللہ! بسم اللہ! جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں ضرور کریں۔ آپ کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہوگا۔ میں حیران ہوا کہ اتنے بڑے بزرگ ایسے بابا جی اور کیا رائے دے رہے ہیں۔ وہ نوجوان چلا گیا۔ مجھ میں جرأت ہوتی تھی بات کرنے کی، میں نے کہا بابا جی! آپ نے یہ کیا کہا؟ کہنے لگے، کوئی بات نہیں۔ ان کو آسانیاں جو عطا کرنی ہیں (یہ ان کا مقولہ تھا) اس طرح ہی آسانیاں عطا ہوتی ہیں۔ آپ نے جو کہا وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن آسانیاں عطا کرنی بھی لازم ہیں۔ جیسے وہ نوجوان خوش ہو وو پیسے ہی ٹھیک ہے۔ دو تین ہفتے بعد وہ نوجوان پھر آیا اور بڑی خوشی کے انداز میں کہنے لگا، لو بابا جی! اللہ کے فضل سے سارا کام ٹھیک ہو گیا۔ ترک دنیا کے لیے میرا تھیہ اور میری ڈیٹ ساری فنکس ہو گئی۔ میرا ایک سوٹ رہ گیا ہے۔ میں نے کہا، کون سا سوٹ؟ کہنے لگا، میں نے بوری کا سوٹ پا جامہ اور کرتہ بوری کا بنایا ہے۔ وہ بن جائے تو اس کے بعد میں جنگل کو نکل جاؤں گا اور پھر کہنے لگا، میرا کشکول بھی آ گیا ہے۔ یہ کالے رنگ کا جو کشکول آپ نے دیکھا ہے یہ جرمنی میں بنتا ہے جو عام فقیر لیے پھرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ڈیپارٹمنٹل شور والے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے ملتا ہے؟ کہنے لگے، جی ہم جرمنی سے امپورٹ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ”کھوڈتے“ (لٹھ) کو بھی گھنگھر ولگ گئے ہیں۔

جب اس نے یہ چیزیں گنوائیں تو میں نے کہا بابا جی! آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ مگر یہ نوجوان تو ایذاذاب میں پڑ گیا ہے۔ یہ تو چیزوں کے چکر سے نکل ہی نہیں سکا۔ یہ تو ایسا چیزوں کو جمع کر رہا ہے۔ انہی چیزوں کو جنمیں چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ اس نے تو دوسرا بمالگے میں ڈال لی ہے۔ جب اس نے چیزوں کی تیاری کی بابت اظہار کیا تو بابا جی نے کہا، اتنی ”ھیچل“ (مشقت) جو کرو گے، اتنی مشکل جو اٹھاؤ گے، ایسے ہم سے ذوری اختیار کرو گے تو دفع کر دو ترک دنیا کو اور دفع کر دو رہبہانیت کو جیسے بیہودہ ہم ہیں ویسے تم ہو جاؤ۔ میں رہا کر ولنگر کھایا کرو اور چین کی نیند سویا کرو۔ تب اس کی سمجھ میں آئی بات۔

انسان بعض اوقات یہ سوچتا ہے کہ جناب اگر میں یہاں سے جگہ چھوڑ کر اسلام آباد چلا جاؤں تو ساری مشکلات کا حل نکل آئے گا یا پچھے کی شادی ہو جائے تو معاملات حل ہو جائیں گے۔ جب آپ اسلام آباد جائیں گے تو آپ اپنا آپ بھی تو ساتھ لے جائیں گے نا۔ جوان ساری چیزوں

کو اپنی جانب کھینچتا ہے، کشش رکھتا ہے۔ آپ تو دراصل مقناطیس ہیں اور مشکلات تو وہ الوہ کے ذرے ہیں، جو آپ سے چھٹے ہیں۔ شہر بدلنے سے، لباس تبدیل کرنے سے، مزاج بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک خاص طرح کی رحمت ہوتی ہے، جو بندہ اللہ سے درخواست کرے کہ مجھ پر خصوصی فضل فرمایا جائے، تاکہ میں اس عذاب سے نکلوں۔ تب نجات ملتی ہے، لیکن چیزیں تبدیل کرنے سے یا چھوڑنے سے یا نئی چیزیں اختیار کرنے سے ایسے ہوتا نہیں۔ یہ بات تھی جو میرے ذہن میں آگئی۔ تو میں نے آپ کے حضور عرض کر دی۔ آپ کی محبت اور توجہ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

”دل کا معاملہ“

”زاویہ“ اب محض پروگرام نہیں رہا۔ اس میں کچھ اندر کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اندر کی باتیں اتنی اہم اور ضروری نہیں ہوتیں لیکن گھروالے چونکہ گھروالے ہوتے ہیں اس لیے اندر کی باتیں چلتی رہتی ہیں جیسے گھروں میں چلتی ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں شروع ہی سے لاپتی اور خود پرست انسان رہا ہوں۔ میری ماں ہم سب بھائیوں کو لوکاٹ، بیر، گندیریاں، جامن بانٹا کرتی تھیں تو میری یہ عادت ہوتی تھی کہ مجھے زیادہ ملیں اور کسی نہ کسی طریقے سے میں یہ کوشش بھی کرتا تھا کہ مجھے یہ چیزیں زیادہ ملیں۔ آج بازار سے گزرتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ تب میں حلوائی کی دکان کے آگے سے بہت آرام اور آہستگی سے گزرتا تھا اور چیزوں کو اس وقت تک گردون گھما کر دیکھتا تھا جب تک وہ نظروں سے اوچھل نہ ہو جاتیں اور عید کے روز تو میں ہر بڑے بزرگ کو خواہ مخواہ سلام کرتا تھا اور انہیں بھی جنمیں میں جانتا بھی نہیں تھا تاکہ عیدی مل سکے۔ زندگی ایسے ہی چلتی رہی۔ پچھلے سال یہ خواہش بڑی تیزی سے پیدا ہوئی کہ کیا میں بھی کوئی سروں کر سکتا ہوں یعنی میں بھی کسی ”خدمت“ کی جانب رجوع کر سکتا ہوں۔ میرے سے چھوٹے بڑے کام کر رہے ہیں۔ ہسپتال بنارہے ہیں اور تعلیمی ادارے کھول رہے ہیں اور رفاقت کام کر رہے ہیں۔ مجھ سے آیا یہ کام ہو سکے گا۔ میری قسم میں ایسا کرنا لکھا ہے یا نہیں۔ مجھے اس بات کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

گزشتہ دنوں بالائیں دسمبر کو بہت دھنڈ پڑی اور ساری رات ہمارا علاقہ شدید دھنڈ میں لپٹا رہا۔ لا ہور اور سیالکوٹ خاص طور پر۔ میں اپنے کمرے میں رات کے وقت بالکل اکیلا تھا۔ باقی سارے گھر کے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں کھڑکی کھول کر دھنڈ کا نظارہ کرتا رہا اور میرا خیال تھا اور مجھے یقین تھا کہ جب میں اکیلا ہوں اور بہت ہی اکیلا ہوں اور رات کا وقت جس کی بڑی تعریف کی گئی ہے، ہو تو مجھے میرے سوال کا جواب موصول ہو گا۔ میں اس وقت اپنی محبوب چائے ”کیمو ملائی“ پر رہا

تھا۔ یہ چائے بڑی مفید ہوتی ہے۔ اس سے ایک توڑہن کے پردے کھلتے ہیں اور کچھ روح کے پردے بھی کھلتے ہیں اور ان میں کچھ عجیب طرح کی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میں اٹلی میں تھا چون، پچھپن برس پہلے تو ایک واقعہ پیش آیا۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرے باس نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جو برداشت نہیں ہوتیں۔ دیار غیر میں کسی اور حکومت کی نوکری کرتے ہوئے کچھ ایسا تاثر پوچھا جائے کہ ”آپ کے قبیل کا کوئی اور شخص آپ کے ملک میں موجود ہے جسے ہم اگلے سال ٹرانی کر سکیں“، یعنی مجھ سے ہی پوچھا جا رہا ہے کہ تمہاری جگہ کسی اور کو لا سکیں۔ میں بہت دکھی تھا حالانکہ میں اپنی لیاقت کا پورا اظہار کر رہا تھا، لیکن ہمارے باس کی اپنی محبوب سے کچھ لڑائی ہو گئی تھی اور جو پہلا بندہ اس کی راہ میں آیا وہ میں تھا حالانکہ نہ میں نے لڑائی کروائی تھی نہ میرا کوئی قصور تھا۔ تو وہ ایک تکلیف وہ شام تھی جب میں گھر آیا تو میں نے اپنی لائن لوگن (Line Living) سے پوچھا کہ مجھے کوئی اچھی سی Pill لکھ دیں۔ مجھے تو پتہ نہیں۔ وہ کہنے لگی تمہیں یہ کیوں چاہیے۔ میں نے کہا میں آرام سے سونا چاہتا ہوں۔ میں تکلیف میں ہوں۔ اس نے کہا ہم تو نیند کی گولیاں نہیں استعمال کرتے۔ ہم نہیں جانتے یہ تو ولائت انگریز لوگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا جب تم پر کوئی مشکل آجائے تو پھر آپ لوگ کیا کرتے ہو؟ کہنے لگی ہم تو ”کیمولانی“ پی لیتے ہیں اور آرام سے سو جاتے ہیں۔ تم بھی پوچھا رہے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔ اس نے اپنا اور کوٹ پہننا اونی جو تے پہن کر نیچے سیرھیاں اتر گئی اور جا کے کیمولانی کا ایک سائے خرید لائی اور مجھے اس میں گرم پانی ملا کر ایک پیالی دیدی۔ میں نے اسے پیا تو نیند آنے سے پہلے، اب یہ تصور کی بات آپ کہہ لیجئے میں بیٹھا تھا اپنی کرسی پر تو مجھے بڑا چھا سالگا اور میں نے کہا میں کل صبح اپنے باس کو جا کر بتاؤں گا کہ ہاں میرے جیسے تین آدمی اور بھی ہیں وہاں پر اور آپ انہیں بلا سکتے ہو تو بلا لو۔ میں نے کہا یہ تو کمال کی چیز ہے۔ اس وقت سے لے کر میں اب تک جب بھی اچھی کیفیت کی ضرورت محسوس کرنا چاہوں تو ”کیمولانی“ پی لیتا ہوں۔ میرے دوست مجھے وہاں سے بھیجتے ہیں اب یہاں بھی یقیناً ملتی ہوں گی۔ نہ بھی ملے تو میں آپ کو یہ بات تفصیل سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ کیمولانی آپ خود بھی پی سکتے ہیں۔ یہ ہمارے عطار کے ہاں سے ایک روپے کا اتنا پڑا بھر دیتے ہیں اسے ”بابونہ“ کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں اگنے والی جڑی بوٹیاں ہیں۔ گل بابونہ آپ مع اس کی شاخوں کے لے کر اسے چورا کر کے ممل کی پوٹی میں باندھ کر چائے میں غوطہ دیں۔ تو اس دھنڈ کی رات کو میں اپنی پیاری کیمولانی بھی پی رہا تھا اور ”بابونہ قہوہ“، بھی۔ پھر بھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی تھی جو آرزو تھی کہ پیدا ہو اور جب کبھی مجھ پر یہ خواہش طاری ہوتی ہے تو دھنڈ کے جو دیز پر دے چھٹ جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے دھنڈ کو بہت قریب سے ملاحظہ کیا ہو تو دھنڈ ساری کی ساری ایسے نہیں چھائی رہتی جیسے ہمارے ذہنوں پر چھائی رہتی ہے۔ یہ دھنڈ جو اصلی والی ہے اس کا رنگ کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔ یہ رول

کرتی ہے اور روکرنے کے بعد اس کی دباؤت جب کم ہو جاتی ہے تو درمیان میں سے ایک لائٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتہ نہیں وہ لائٹ کہاں سے آتی ہے۔ آپ دھنڈ کو دیکھیں، چاہے گاڑی میں بیٹھے ہوں دیز دھنڈ کو دیکھیں تو اس میں ایک لمحہ ایک وقفہ لائٹ کا ضرور آئے گا۔ پھر دھنڈ گہری ہو جائے گی اور آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔

دھنڈ کو دیکھنا اور اس کے ساتھ وابستگی پیدا کرنا ان مراحل کو طے کرنے میں بڑی آسانی عطا کرتا ہے اگر لوگ باطن کے سفر کو اختیار تو نہیں کرتے میری طرح سے بیٹھے کے دیکھتے ضرور ہیں۔ میں جب وہاں بیٹھا تھا تو مجھے میرے اس سوال کا جواب تو نہیں ملا کہ میں رہنے والوں میں سے بھی ہو سکتا ہوں یا نہیں یا میں کوئی بڑا کام کر سکتا ہوں یا نہیں۔ البتہ مجھے اپنے اندر سے ایک حکمنامہ ضرور جاری ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ کوئی لمبا اور بڑا کام نہیں کیا جاسکتا، لیکن تم اپنے افعال کو اپنے ارادوں کو لمحات میں، حصول میں بانت سکتے ہو۔ قدم ایک اٹھانا ہے پھر رکھنا ہے اور پھر اس کے بعد تمہیں نیا قدم ملتا چلا جائے گا۔ لیکن اس ایک قدم میں شرط یہ ہے کہ تمہیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جو کام کرنے لگو اس کام کے اندر دل بھی ہے کہ نہیں۔ کام ایک وجود والی چیز ہے اور وجود کا ایک دل بھی ہوتا ہے۔ اگر اس کا دل نہیں ہے، پھر اس کی تلی ہے، جگر ہے، دماغ ہے تو پھر اس کو نہ کرو۔ اگر اس میں دل کی مشا موجود ہے تو پھر اس میں داخل ہونے کی کوشش کرو، بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو دل کے بغیر کیے جاتے ہیں اور چلتے ہیں، نہ کام میں دل ہوتا ہے نہ اس فعل میں دل ہوتا ہے نہ آپ کے آگے آنے والی چیز میں دل ہوتا ہے۔ اب تو سانندان کہتے ہیں کہ دل بھی سے لیکر ہاتھی تک ہر ایک میں ہوتا ہے دائرہ تک میں ایک چیز ایسی ہوتی ہے جس کو آپ دل سے مشابہ کر سکتے ہیں۔ اگر اس میں دل ہے تو پھر کسی کام میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم خلوص اور نیک نیت سے داخل ہو گے کسی بھی چھوٹے کام میں تو پھر آپ کو ایک Step اور ملے گا چھوٹے انداز میں اور یہ جڑتے جائیں گے اور وہ بڑا کام جس کا تم ذکر کرتے ہو یہ ان سے بھی بڑھ جائے گا۔

میں اس وقت سوچنے لگا میرے چھوٹے کام تو بس اتنے ہی ہیں کہ کبھی کبھی میں دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے انداز میں کسی کو بتائے بغیر میوزیم میں چلا جاتا ہوں اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم پھر کرسانے نکل پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں چاہے Fasting Buddha نہ ہو یہ میرا عمل ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ میں لا ہور کے سب سے بڑے قبرستان میانی صاحب میں چلتا جاتا ہوں تھک جاتا ہوں تو کسی قبر کے چھوٹے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کبھی کوئی کتبہ پڑھ لیا کبھی نہ پڑھا۔ اس عمل سے مجھے بڑی طہانیت حاصل ہوتی ہے اب تو عمر کی وجہ سے میں اس طرح سے نہیں جا سکتا پھر میں اپنی پوتی مایا جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ میرے

بڑے بھائی ہیں کے پوتے پوتیوں کے ساتھ تھوڑا وقت گزار لیتا ہوں۔ بچوں کو اپنے بڑوں کے بارے میں جانے کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ وہ کیسے تھے۔ کیسے رہتے تھے؟ میں انہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے دادا کو جانوروں کا بڑا شوق تھا اور انہیں ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ڈیدی کہتے ہیں کہ انہوں نے کتنے رکھے ہوئے تھے میں نے کہا کہ ہاں بڑے خونخوار کتنے تھے یہ ان کا شوق تھا اور عام سے سیدھے سادے کتنے گلی کے وہ بھی ان کے پاس آ جاتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ چلو تم بھی آ جاؤ۔

میں نے کہا وہ تمہارے دادا تھے یعنی میرے بڑے بھائی تھے اب بچے ان کے بارے میں اور جانتا چاہتے ہیں۔ مایا کہتی ہے دادا وہ سنابے کتنے لڑاتے بھی تھے۔ میں نے کہا ہاں کتنے لڑاتے بھی تھے اب میرے اور آپ کے ذہن میں جا گئی ہے کہ ہم رحم دل لوگ ہیں اور اخبار میں ہم پڑھتے ہیں کہ بڑے جا گیردار زمیندار لوگ کتنے لڑاتے ہیں اور وہ بڑے خونخوار انداز میں لڑتے ہیں تو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کتوں کی لڑائی ایسی نہیں ہوتی جیسے ہماری ذہن میں ہے یہ بات میں مایا کو بھی بتاتا ہوں۔ گاؤں میں تین چار ہزار کا ایک بڑا کھلا "پڑا" ہوتا ہے۔ کھلا میدان چھوڑا ہوتا ہے، کرکٹ کے میدان جتنا۔ ایک شخص اوہر سے کتابے کرتا ہے جو اس نے بڑی محنت کے ساتھ پالا ہوتا ہے۔ بادام چھوہارے، گھنی، مکھن کھلا پلا کے۔ دوسرا اپنی طرف سے لے کر آتا ہے لیکن وہ عام سے دیسی کتنے ہوتے ہیں جو انہوں نے پالے ہوتے ہیں پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں اور پھر وہ ان کی سندھی (زنجر) کھول دیتے ہیں اور کتنے آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔

میں نے جب تک یہ لڑائی نہیں دیکھی تھی کہ کتنے جھینٹے کس طرح سے ہیں اور وہ کیسے ایک دوسرے کی کھال ادھیڑ دیتے ہیں اور برا حال ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن اور تصورات میں ایسی تصویریں بنتی تھیں لیکن خواتین و حضرات جب وہ کتنے آپس میں لڑتے ہیں تو ایسے لڑتے ہیں جیسے اکھاڑے میں پہلوان لڑتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی گردان میں داشت بھی گاڑتے ہیں جس سے تھوڑا بہت خون بھی نکلتا ہے لیکن وہ کتنے بس اکھاڑے کے پہلوانوں کی طرح ہی لڑتے ہیں۔ ایک کتاباں دایاں پنجا اٹھا کر دوسرے کے گلے میں ڈالتا ہے اور اسے گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا چھپلی دو تانگوں پر کھڑا ہو کر اس کو دھکیل کے پیچے کر دیتا ہے وہ دانتوں سے بہت کم کام لیتے ہیں اور اس طرح پنجوں سے بھی کم کام لیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی جسمانی طاقت سے لکراتے ہیں۔ جیتنے اور ہارنے کی شرط یہ ہوتی ہے کہ جو کتا گر جائے اور اس کی زمین پر پیٹھ لگ جائے جسے "کند" لگ جانا کہتے ہیں وہ ہار جاتا ہے اور دوسرا جیت جاتا ہے اور پھر ڈگ ڈگ ڈھول بختا ہے اور دوسرا ہارا ہوا کتا شرمende سا وہ دبا کے مالک کے ساتھ جا رہا ہوتا ہے۔ مالک بھی شرمende سا ہو کے جاتا ہے۔

- جب میں بچوں کو یہ بتا رہا تھا کہ تمہارے دادا کتوں کے ایسے ہی شو قین تھے اور انہیں اسی قسم کے کتنے پسند تھے تو مایا کہتی ہے دادا یہ برا فضل ایسا ہے جو نہیں کیا جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ جانور سے محبت کے انداز اور مظہر ہیں۔ اب دیکھ لو کہ یہ مظہر چیج چیج آپ کے اندر موجود ہے یا کہ نہیں کیونکہ جب تمہارے دادا ایک اور عمر کو پہنچے جو بالکل آخری عمر ہوتی ہے تو بے شمار چیزیاں ان کے باٹھ پر بیٹھ کر ان کے باٹھ سے آتا چھین لیتی تھیں۔ تقریباً تمیں تمیں چیزیاں ہاتھ کے اوپر بیٹھ کر آتا کھانے کے لیے لڑائی کر رہی ہوتی تھیں۔ یہ بھی ساری کہانی سنانے کا میرا مقصد یہ تھا کہ جب آپ بات کرتے ہیں تو ایک تعلق پیدا ہوتا ہے ایک رشتہ بنتا ہے بچے کے ساتھ یا کسی بندے کے ساتھ اور آپ اس بات میں اتنا ذوب جاتے ہیں کہ وہ اس کہانی کا دل بن جاتا ہے۔ سننے والے کے لیے بھی اور سنانے والے کے لیے بھی۔ تو پھر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ہاں اب آپ کو اس کے بعد ایک Step یا ملٹے والا ہے اور آپ اس میں داخل ہو سکتے ہیں ورنہ میری آپ کی روئیں وہی رہے گی جو چلتی آئی ہے اور چلتی آرہی ہے۔ اس دھنڈ کے اندر یہ ایک سیاہ اور دیز پر دوں کے اندر سے جب یہ روشنی پیدا ہوتی ہے ایسے انسان کی زندگی میں بہت دیز اور بڑی گہری دھنڈ کے بعد روشنی کا ایک سپاٹ آتا ہے جس میں بڑی آسانی کے ساتھ جا کر وہ اپنی جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ کریز کے اندر آسکتا ہے۔

زندگی میں کام کرنے کے لیے اپنی کریز کے اندر رہ کر کھینے کی ضرورت ہے۔ آپ ہر وقت چھکا نہیں مار سکتے۔ ہر وقت چوکا نہیں مار سکتے لیکن آپ اپنی کریز کے اندر رہ کر بہت مدد و دکریز کے اندر رہ کر بہت بڑا امظا ہرہ کر سکتے ہیں۔ 22 دسمبر کو اس دھنڈ کی وجہ سے یہ بات کھلتی گئی اور چلتی گئی ظاہر ہے کہ اس میں ”کیمولائی“ کا بھی ضرور اڑ تھا اور اس سوچ کا بھی جو میرے ساتھ چمٹی رہتی ہے۔

میں نے اب تمہارے کیا اور میں آپ کی خدمت میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آپ نے بھی تھہ کیا ہو گا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں نیا سال شروع ہونے والا تھا جواب شروع ہو گیا ہے۔ تو اس کے لیے کوئی بڑا اپلاں بنانے کی، کوئی اونچا تاج محل تیار کرنے کی، کوئی عظیم پا سٹیل بنانے کی چند اس ضرورت نہیں کیونکہ ہم سب ایسا سفر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر کوئی یہ کام نہیں کر سکتا۔ بہت ہی چھوٹے کام ایسے ہیں کہ آدمی کتنے دلوں کو خوش کر سکتا ہے ”نہ ہینگ لگنے پھٹکری“ نہ آپ کو زکوٰۃ مانگنی پڑنے کسی کے پاس جانا پڑے گا نہ آپ کو کوئی اونچا کام کرنا پڑے گا۔ جسمانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے کام ہو رہے ہیں تعلیم دی جا رہی ہے، ہسپتال کھل رہے ہیں، ہسپتال ہمیں جسم عطا کر سکتے ہیں، ہمیں ”جھمارا“، ”بھولو“ اور ”انوکی“ بنانے کے لیکن آدمی تو کچھ اور بھی مانگتا ہے۔ آدمی خالی جسم کا تقاضا نہیں کرتا۔ بھیس خالی جسم ہے۔ بند زینولا، چوہا، ہاتھی، زرافہ، شیر، بھر شیر یہ ایک جسم ہیں۔ انسان جواشرف المخلوقات کھلاتا ہے یہ خالی جسم نہیں ہے۔

دھنڈ کے اندر سے جور و شنی کا ایک سوال لگتا ہے وہ ہے کہ ہمیں بالکل چھوٹا ایک کام کرنا ہے۔ اپنے ارد گرد کے بندوں کو نہایت چھوٹے بندے کو یہ تسلی اور تنقی عطا کرنی ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم میرے ساتھ ہو اور اس ساتھ کے اندر ایک انگڑا چلا کہ ہمیں آگے چلتا ہے۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم نے کچھ بڑا کام نہیں کرنا ہم نے کچھ چندے اکٹھے کر کے پھر چھپا کے ایسا کچھ نہیں کرنا ہے لیکن ہمیں چلتے رہنا ہے آپ نے بھی دکانداروں کو دیکھا ہوا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو دکاندار بہت زیادہ بیک مار کینگ کرتا ہے اس نے آتوں کے چھوٹے چھوٹے کارڈ چھپوا کے رکھے ہوتے ہیں (یہ میں نے اس رمضان شریف میں دیکھا ہے) ایک طرف درود شریف چھپا ہوتا ہے کچھ حل المشکلات کی آیات ہیں وہ آپ کو ساتھ ضرور دیتا ہے۔ ہم نے کارڈ نہیں چھپوانے، ہمارے دل کا کارڈ جب نکل جب ہی نکلے۔ ضروری نہیں ہر وقت نکلے۔ کئی دفعہ ہم اسی کیفیت میں بھی ہوتے ہیں جیسے میں تھا میں اور اس خاتون نے مجھے چائے پلاٹی اور مجھے آرام سے بستر میں چھپا کر سلا دیا۔ بڑی مہربانی، اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

بaba رتن ہندی کا سفر محبت

یوں تو زندگی کے ہر کام کو پایہ تھکیل تک پہنچانے کے لیے کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اور آدمی بغیر کوشش کے کہیں پہنچ نہیں سکتا لیکن کسی بابے کو پانا یا کسی روحانی شخصیت کو تلاش کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ آپ اس طرح نہیں کر سکتے کہ مزے سے پنگ پر بیٹھے حصہ پیتے یا میز پر بیٹھے کر چائے کی چسکیاں لگاتے رہیں اور بابا چل کے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔ بابے کو تلاش کرنے کے لیے آپ کو کچھ محنت، کچھ کوشش کرنی پڑیں گی اور کچھ آرزو بھی رکھنا پڑیں گی اور کچھ نہیں تو ایک یقین مکمل اور پختہ ارادہ، ایک سچی تمنا ضرور چاہیے چونکہ تمنا ہو تو پھول کھلتا ہے۔ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اشغال صاحب کسی "بابے" کا نسلیقون نمبر بتائیں یا اس کا موبائل ہمیں دے دیں۔ بھئی ایسے تو نہیں ہوتا نہ ان کا کوئی نمبر اور نہ پوٹل ایڈر لیں۔ آپ جی ان ہونگے اور جب بہت دور آگے نکل جائیں گے تو پتا چلے گا کہ یہ تو اندر سے ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر یہاں میک سامنے آ جاتا ہے اور آپ کو اندر کی باتیں بتاتا ہے اور اندر ہی کی باتیں سکھاتا ہے اور انسان کے دل میں ذہن اور روح میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ میں کسی ایسی شخصیت سے ضرور ملوں جو ہر حال میں اور ہر رنگ میں مجھ سے بہتر ہو اور ارفع ہو۔ پھر انسان کے ذہن میں یہ آرزو پیدا ہونے لگتی ہے کہ جیسے لڑکیاں میک اپ کرتی ہیں، میں بھی میک اپ کروں لیکن اندر کا میک اپ ہو۔ ویسے باہر کا بھی ہونا چاہیے، یعنی اپ شک، نیل پالش، مسکارہ وغیرہ وغیرہ۔ بسم اللہ یہ ساری چیزیں بھی استعمال کریں جو بندہ استعمال کرتا ہے کہ اچھا لگے۔ پھر ایک سچی ایسی بھی آ جاتی ہے کہ اسکو اپنا اندر اچھا نہیں لگتا اور اس کی آرزو ہوتی ہے کہ میں اندر کا میک اپ کر کے کسی مقام تک پہنچوں اور پھر ایسی روح کے ساتھ ساز اور تعلق رکھوں جو بہت ارفع و اعلیٰ ہو۔

ہمارے یہاں قریب ہی بھارت میں ایک جگہ ہے جسے بھنڈا کہتے ہیں۔ یہ بڑا مشہور شہر ہے کیونکہ ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے۔ تقریباً جتنی بھی گاڑیاں بھارت کے شمالی علاقوں میں چلتی ہیں وہ سب کی سب یہاں سے ہو کر جاتی ہیں۔ جو میری عمر کے لوگ ہیں وہ اس محاورے کو بھی جانتے ہوں گے

کہ ”اس نے A VIA BATHINDA کیا ہے۔“ اس لیے کہ وہ آسان بی اے ہوتا تھا۔ کوئی مشی فاضل، مولوی فاضل کے صرف انگریزی کا امتحان دیکرا ایک لوگی لغڑی بی اے کی سند حاصل کر لیتا تھا اس اعتبار سے بھی بھنڈا بہت مشہور تھا، لیکن میری نگاہوں میں اس شہر کا رتبہ ان ساری چیزوں سے بلند ہے۔ کسی زمانے میں صد یوں پہلے اس شہر میں ریت کے میدان میں شام کو نوجوان اکٹھے ہوتے تھے اور اپنی اس زمانے کی (بہت عرصہ بہت صد یاں پہلے کی بات کر رہا ہوں) کھلیں کھیلتے تھے اور ”لٹھ گھماتے“، ”گد کا کھیلتے“، اور ”بلم“ کے کھلیں دکھاتے تھے۔ پھر تھک ہار کے، کیونکہ یہ جوان اور کڑیں کھلیں ہوتی تھیں، چاندنی رات میں اسی ریت پر بیٹھ کر کہانیاں کہتے، ایک دفعہ کہانیاں کہتے کہتے کسی ایک نوجوان لڑکے نے اپنے ساتھیوں سے یہ ذکر کیا کہ اس دھرتی پر ایک ”اوتاب“ آیا ہے لیکن ہمیں پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے ایک ساتھی ”رتن نا تھے“ نے کہا: ”تجھے جگہ کا پتا نہیں ہے، اس نے کہا مجھے معلوم نہیں لیکن یہ بات دنیا والے جان گئے ہیں کہ ایک اوتاب اس دھرتی پر تشریف لا یا ہے۔

اب رتن نا تھے کے دل میں یہ ”حمد بد“ شروع ہو گئی کہ وہ کون سا علاقہ ہے اور کہا یہ اوتاب آیا ہے اور میری زندگی میں یہ کتنی خوش قسمتی کی بات ہو گی اور میں کتنا خوش قسمت ہوں گا اگر اوتاب دنیا میں موجود ہے اور اس سے ملوں اور اگر ملاشہ جانے تو یہ بہت کمزوری اور نامرادی کی بات ہو گی۔ چنانچہ اس نے اردوگرد سے پتہ لیا، کچھ بڑے بزرگوں نے بتایا کہ وہ عرب میں آیا ہے اور عرب یہاں سے بہت دور ہے۔ وہ رات کو لیت کر سوچنے لگا کہ بندہ کیا عرب نہیں جا سکتا۔ اب وہاں جانے کے ذرائع تو اس کے پاس تھے نہیں لیکن اس کا تھیہ پکا اور پختہ ہو گیا۔ اس نے بات نہ کی اور نہ کوئی اعلان ہی کیا۔ کوئی کتاب رسالہ نہیں پڑھا بلکہ اپنے دل کے اندر اس دیوتا کا روپ اتنا لیا کہ میں نے اس کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا ہے اور میں نے یہ خوش قسمت آدمی بننا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی مضبوط موٹی ”ڈاگ“ لی۔ اس کو تیل پلا یا، اس پر ”کھر کے“ لگائے اور اس کے آخر پر بلم (برچھی) لگائی، خونخوار خوفناک جانداروں سے بچنے کے لیے۔ اپنا تھیلا لیا، دو جو تے موٹی کھال کے اور موٹے تلے کے بنائے اور ڈاگ کند ہے پر رکھ کر چل پڑا۔

وہ چلتا گیا، چلتا گیا، راستے پوچھتا گیا اور لوگ اسے بتاتے گئے۔ کچھ لوگوں نے اسے مهمان بھی رکھا ہوا لیکن ہمارے پاس اس کی ہستہ میں موجود نہیں ہے۔ وہ چلتا چلتا مہینوں کی منزلیں ہفتون میں طے کرتا ہوا مکہ شریف پہنچ گیا۔ غالباً ایران کے راستے سے اور اب وہ اپنی بولی میں وہاں تر پہنچتا ہے کہ میں نے سنائے کہ ایک ”اوتاب“ آیا ہے۔ اب کچھ لوگ اس کی بات کو لفظی طور پر تو نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کی ترپ سے اندازہ ضرور لگاتے تھے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ وہ یہاں نہیں ہے بلکہ وہ یہاں سے آگے تشریف لے جا چکے ہیں اور اس شہر کا نام ” مدینہ“ ہے۔ اس نے کہا میں نے اتنے

ہزاروں میل کا سفر کیا ہے یہ مدینہ کوں سادور ہے، میں یہ چھ سو کلو میٹر بھی کر لون گا۔ وہ پھر چل پڑا اور آخر کار مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ بہت کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں اور کہیں بھی اس کا ذکر اس تفصیل کے ساتھ نہیں آتا جس طرح میں عرض کر رہا ہوں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب میں ایک جملہ لکھا ہے کہ ”بایار تن ہندی“، حضور نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا پھر معلوم نہیں کہ اس کا کیا ہوا، لیکن غالب گمان ہے اور عقل کہتی ہے اور ہم اندازے سے یقین کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں کہ وہ مدینہ شریف میں حضور نبی اکرمؐ کی خدمت میں رہا اور حضورؐ کے پسندیدہ لوگوں میں سے تھا۔ اب وہ کس زبان میں ان سے بات کرتے ہوں گے، کیسے رابطہ کرتے ہوں گے یہ رستے بھی بڑی آسانی سے کھل گئے ہوں گے اور تن کس طرح سے مدینہ شریف میں زندگی بسر کرتا ہوگا؟ کہاں رہتا ہوگا، اس کا ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے لیکن وہ رہتا وہیں تھا اور وہ کب تک وہاں رہنا اس کے بارے میں بھی لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طلب تھی اور اس کی خوش قسمتی تھی اور خوش قسمتی ہمیشہ طلب کے واسطے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کی طلب نہ ہو تو خوش قسمتی خود گھر نہیں آتی۔

وہ اتنے معزز میزبان کا مہماں تھا اور وہاں رہا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب رسول پاک نبی اکرمؐ مدینہ شریف تشریف لے گئے تو وہاں کی لڑکیوں نے اونچے نیلے پر کھڑے ہو کر دف پر گانا شروع کر دیا کہ ”چاند کدھر سے چڑھا“، وہ خوش قسمت ا لوگ تھے، ایک فلشن رائٹر کے حوالے سے میں یہ سوچتا ہوں کہ اس وقت کوئی ایسا حکمہ پیلک سروں کمیشن کا تو نہیں ہو گا نہیں، اس وقت کوئی پیلک ریلیشن یا فوک لور کا ادارہ بھی نہیں ہو گا کہ لڑکیوں سے کہا جائے کہ تم نیلے پر چڑھ کے گانا گاؤ۔ وہ کون سی خوش نصیب لڑکی ہو گی جس نے اپنے گھر والوں سے یہ ذکر سنा ہوگا۔ رات کو برلن مانیجنمنٹ یا لکڑیاں بجھاتے ہوئے کہ رسول اللہ تشریف لارہے ہیں اور اندازہ ہے کہ عقریب پہنچ جائیں گے اور پھر اس نے اپنی سہیلیوں سے بات کی ہو گی اور انہوں نے فیصلہ کیا ہو گا کہ جب وہ آئیں گے تو ہم ساری کھڑی ہو کر دف بجا کیں گی اور گیت گائیں گی۔

اب جب حضورؐ کے آنے کا وقت قریب آیا ہو گا تو کسی نے ایک دوسری کو بتایا ہو گا کہ بھاگو چلو، محکم تو ہے کوئی نہیں کہ اطلاع عمل گئی ہو گی، یہ طلب کون سی ہوتی ہے، وہ خوش نصیب لڑکیاں جہاں بھی ہوں گی وہ کیسے درجات لے کر بیٹھی ہوں گی۔ انہوں نے خوشی سے دف بجا کر جو گیت گایا اس کے الفاظ ایسے ہیں کہ دل میں اترتے جاتے ہیں۔ انہیں آنحضرتؐ کو دیکھ کر روشنی محسوس ہو رہی ہے، پھر وہ کون اسی جگہ تھی جسے بایار تن ہندی نے قبول کیا اور سارے دوستوں کو چھوڑ کر اس عرب کے در تیلے میدان میں وہ اپنی لاثی لے کر چل پڑا کہ میں تو اوتار سے ملوں گا۔

بہت سے اور لوگوں نے بھی رتن ہندی پر ریمرچ کی ہے۔ ایک جرمن سکالر بھی ان میں

شامل ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ ہمارے ایک دوست اکرام چغتائی ہیں وہ بڑے تحقیق کے آدمی ہیں انہوں نے مجھے جرمک زبان میں رتن ہندی کے بارے ایک رسیرچ سٹائی کر رتن ہندی کون تھے؟ کتنی دیر وہاں رہے، کہاں رہے، کیسے تھے؟ کب چلے۔ دیکھتے یہ باہر کے لوگ بھی کمال کرتے ہیں، ہمیں تو پہتہ تک نہیں۔۔۔ رتن ہندی بھی کمال کا آدمی تھا کیوں اس نے خود کوتاریخ میں آنے نہیں دیا؟ کیوں کہ اس نے شورچا کرنیں کہا کہ میرا نام بھی درج کرو لیکن یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اب رسول اللہ سے محبت ہو تو اونچی آواز میں بولنے لگیں، ایک دوسرے کو بتانے لگیں۔ یہ کام تو رتن ہندی ہی کر سکتا تھا۔

جب یہ سب کچھ میں دیکھ چکا اور پڑھ چکا تو پھر میرے دل میں خیال آیا کہ بعض اوقات ایسی حکایتیں بن بھی جایا کرتی ہیں، لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ میں بڑی پریشانی میں رہا کیونکہ مجھے ایسا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تھا جس کا سہارا لے کر میں ان کے روٹ کو جس راستے سے وہ گئے تھے پہچان سکوں۔ یہ پہتے چلتا تھا جرمک رسیرچ سے کہ وہ حضور کے ارشاد پر اور ان کی اجازت لے کر واپس ہندوستان آگئے۔ ہندوستان آئے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے گاؤں ہی گئے ہوں گے اور مٹھنڈا میں ہی انہوں نے قیام کیا ہوا گا۔ میری سوچ بھی چھوٹی ہے۔ درجہ بھی چھوٹا ہے، لیوں بھی چھوٹا ہے پھر بھی میں نے کہا اللہ تو میری مدد کر کہ مجھے اس بارے کچھ پہتے چل جائے۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے میں مٹھنڈا جا بھی نہیں سکتا اور پوچھوں بھی کس سے چودہ سو بر س پہلے کا واقعہ ہے۔

ایک مرتبہ میری داڑھ میں بلا کا درد ہوا اور رات بھر میں بیٹھا رہا تکلیف کے عالم میں۔ اب ہمیں کسی معروف دندان ساز کا پتہ بھی نہیں تھا۔ بہر حال صحیح میری یہوی گلبرگ میں مجھے ڈاکٹر مسعود کے پاس لے گئیں۔ ان سے ملے۔ بڑے خوش اخلاق اور اعلیٰ درجے کے سرجن اور اس وقت کی ہماری کرکٹ ٹیم کے ڈاکٹر تھے۔ پھر ان کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ ان سے ملنا ملانا ہو گیا، وہ گھر آتے رہے ملتے رہے، ان کے والد سے بھی ملاقات ہوئی وہ کسی زمانے میں سکول ٹیچر رہے تھے اور اب بھی اسی سال کی عمر میں سائیکل پر بیٹھ کر ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ اتنے بڑے سرجن کے باپ، ٹیوشن پڑھاتے تھے لیکن مفت۔ الجبراے کے بہت اچھے ٹیچر تھے میں ان سے کہتا تھا کہ چھوٹی سی گاڑی خرید لیں، کہنے لگے ”نہیں، مجھ سے سائیکل چلتی ہے اشراق میاں میں تھیک جاتا ہوں، آپ گھبرائیں نہیں“۔

ایک دن باتوں میں انہوں نے بتایا کہ میں کافی سال مٹھنڈا کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر رہا ہوں۔ میں نے کہا یا اللہ یہ کیسا بندہ آپ نے ملوا دیا، میں نے کہا آپ یہ فرمائیں ماشر صاحب کہ وہاں کوئی ایسے آثار تھے کہ جن کا تعلق بازار تن ہندی کے ساتھ ہو۔ کہنے لگے ان کا بہت بڑا مزار ہے وہاں پر اور وہاں بڑے چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ ہندو مسلمان عورتیں مرد آتے ہیں اور تمہارا

یہ دوست جو ہے ڈاکٹر مسعود میرے گھر 13 برس تک اولاد نہیں ہوئی، میں پڑھا لکھا شخص تھا، ایسی باتوں پر اعتبار نہیں کرتا تھا جو ان پڑھ کرتے ہیں، لیکن ایک دن جا کر میں بابا رتن ہندی کے مزار پر بڑا روایا۔ کچھ میں نے کہا نہیں نہ کچھ بولا، پڑھے لکھے سیانے بندوں کو شرک کا بھی ڈر رہتا ہے، اس لیے کچھ نہ بولا اور مجھے ایسے ہی وہاں جا کر بڑا از بر دوست رونا آ گیا۔ ان کی کہانی کا مجھے پڑھا کہ یہ مدینہ تشریف لے گئے تھے۔ مزار پر جانے کے بعد میں گھر آ گیا۔ رات کو مجھے خواب آیا کہ جس میں ہندوستانی انداز کے سفید داڑھی والے بابا جی آئے اور کہنے لگے ”لے اپنا کا کاپڑ لے“ (لے اپنا بچہ لے لو) یہ اللہ میاں نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ میں نے کہا جی یہ کہاں سے آ گیا، ماسٹر صاحب نے بتایا کہ جب میں نے خواب میں وہ بچہ اٹھایا تو وہ وزنی تھا۔ میں نے پوچھا ”بابا جی آپ کون ہیں“ تو وہ کہنے لگے ”میں رتن ہندی ہوں، کیا ایسے بیوقوفوں کی طرح رویا کرتے ہیں، صبر سے چلتے ہیں، لمبا سفر کرتے ہیں، ہاتھ میں لاٹھی رکھتے اور ادب سے جاتے ہیں“

ماسٹر صاحب کہنے لگے مجھے سفر اور لاٹھی بارے معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا باتیں ہیں، میں نے ان سے کہا کہ جی اس کا مصالحہ میرے پاس ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ لڑکیاں جو حضورؐ کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھیں وہ خوش قسم تھیں۔ ہم کچھ مصروف ہیں۔ کچھ ہمارے دل اور طرف مصروف ہیں۔ ہم اس سفر کو اختیار نہیں کر سکتے لیکن اس سفر کو اختیار کرنے کی ”تائگ“ (آرزو) ضرور دل میں رہنی چاہیے اور جب دل میں یہ ہو جائے پکا ارادہ اور تہیہ تو پھر راستہ ضرور مل جاتا ہے۔

ہم زیادہ سے زیادہ کوئی وظیفہ وغیرہ کر لیتے ہیں۔ یہ وظیفہ کرنا اچھا ہے لیکن یہ راستہ نہیں ہے۔ راستہ تو وہی ہو گا جو ایک چھوٹے موڑ نوٹے پھوٹے گھروں سے نکل کر اس ٹیکے کی طرف جاتا ہو گا جہاں وہ لڑکیاں کھڑی ہو گئی، انہیں کیا علم اور پتہ تھا۔ انہوں نے کوئی کتابیں نہیں پڑھ رکھی تھیں لیکن ان کے دل کے اندر ایک آرزو ضرور تھی جو نور کی صورت میں آگے بڑھتی چلی گئی اور ان کو دنیا میں بھی ایک اوپر اخراج ملا اور آخراج میں بھی یقیناً ان کا بہت اوپر اخراج میں ملا۔ اس کے لیے میں اپنے آپ سے فارغ اوقات میں یہ ضرور کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اپنے آپ سے بھی مخاطب ہوتا ہوں کہ پڑھنے سے علم حاصل کرنے سے تو یہ سب کچھ نہیں ہو گا، یہ تو میری معلومات میں اضافہ کرے گا، مجھے معلومات حاصل ہو جائیں گی، لیکن محبت کا راستہ اور ہے جبکہ معلومات کا راستہ اور ہے۔

آپ ملاحظہ کرتے ہوں گے کہ آج کل ہم معلومات کے راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ یہ انفارمیشن کی صدی ہے اور ہم اس صدی میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں، لیکن محبت کا راستہ دوسرا ہے جو ہم کو بہت اور پرے جاتا ہے اور محبت کا راستہ حاصل کرنے کے لیے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اپنے اردو گرد کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ چلیں محبت نہ کی

جائے، چلیں انہیں کچھ دیا نہ جائے۔ نبی کریمؐ فرماتے ہیں کہ مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔ کبھی بھی اسے جاری کر دیا کریں۔ نہ کے بول پڑو، لیکن ہمارے ہاں یہ بھی مفتود ہو گیا ہے۔ حسد ہو گیا، لڑائی ہوئی، بھگڑے ہو گئے۔ ہم محبت تو ایک طرف رہی مسکراہٹ بھی کسی کو ادا نہیں کر سکتے حالانکہ جب آپ کسی سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، گھوری ڈالتے ہیں، ماتھے پر سلوٹس ڈالتے ہیں تو آپ کے چہرے کے 72 مسلز یعنی عضلات کام کرتے ہیں اور اگر مسکراہٹ کسی تو صرف دو مسلز ٹینشن میں آتے ہیں یا Tension Feel کرتے ہیں۔ لتنا آسان کام ہے لیکن ہونہیں پاتا۔

مجھے یہ سارے راز معلوم ہیں، لیکن مجھ سے ایسا ہوتا نہیں۔ اندر کی بات چھوڑ کے ہم تو صرف سامان ہی اکٹھا کرنے پر لگے ہیں، لیکن یہ سامان کم بخت کسی کام نہیں آتا بالکل کام نہیں آتا، اگر آپ سوچیں تو میرے پاس ایک بار کچھ پیے جمع ہو گئے ایک لاکھ تیرہ ہزار روپے اب میں عمر کے آخری حصے میں ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہاں خرچ کروں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ذات پر خرچ کروں، دھوپ میں بینہ کر مولی کاٹ کر ”لوں“ لگا کر اسے کھاؤں، مگر ایسا کرنہیں سلتا، ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔ تھوڑی سی محبت، تھوڑی سی الفت، تھوڑی سی مسکراہٹ جاری کرتے رہتا چاہیے یہ چیک کیش کرانے پر کوئی خرچ نہیں آتا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!